

خاندان بھر کے لیے

ماہنامہ

ریشم

November, 2012



عید الاضحیٰ مبارک



"روٹ ہمراہ ہے" کی آخری قسم

خاندان بھر کے لیے

ماہنامہ



جلد نمبر 13 شمارہ نمبر 03 نومبر 2012ء

ABC Certified



رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

شعبہ اشتہارات

ہارکینگ نیچر کلابی برائین ہرور

سلیم قریشی

یورجیف اسلام آباد

ایڈیٹر ملک محمد حجاب، حاتقہ بخاری

ہارکینگ نیچر کلابی، ڈیپارٹمنٹ آف ریلیشنز

0323-4731751
0307-4400851

0333-7853837

فونوگرامز طاہر چوہدری
0321-4320844

قانونی مشیر: ایڈووکیٹ ہانی کورٹ

کرنامہ علی خان

لے آؤٹ: شہزاد علی

ہینجگ ایڈیٹر: بشری مسرور

ایڈیٹر: محمد عرفان رائے

سب ایڈیٹر: مشعل فاروقی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: کشائش مسرور

بزنس ایگزیکٹو: محمد طلحہ مسرور

سرکولیشن منیجر: علی شیر

0321-7053753



نوٹ:

قیمت فی پیچہ (پاکستان) 60 روپے، (سعودی عرب) 20 ریال یا سادی

متحدہ عرب امارات 20 درہم، زرمسالانہ (اندرون ملک) 700 روپے

ایڈیٹر و پبلشر بشری مسرور نے زاہد شیر پرنٹرز سے چھپوا کر لاہور سے شائع کیا۔

Suite#1, 4th Floor, Block No.12 Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore
Ph (042) 36280130 Email: Rayshamdigest@gmail.com

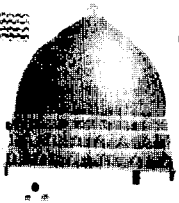
کاروان حرم مدینہ

کریڈٹ ایڈ ٹورز (پرائیویٹ لمیٹڈ)

حج و عمرہ کے معیاری اور سستے
پیکیج کے لئے رابطہ کریں

چیف ایگزیکٹو الحاج عبدالوحید ناصر

0322-7508623



پریس چیمبر

تمام قومی اور لاکل اخبارات میں

خبریں اور اشتہارات

کیلئے رجوع کریں

063-2279981

روزانہ احساس شیں آباد

روزانہ قیادت بہاولپور

روزانہ نیا دور پٹان

شمار نیوز سبجیکٹ اسلام آباد

روزانہ حیرت مٹان

روزانہ نوائے وقت مٹان

روزانہ دن لاہور

0322-7508623

0300-2882125

063-2279981

العزیز پراپرٹی کنسلٹنٹ

ہمارے ہاں مکانات، ہوٹلات، زرعی رقبہ، پلاٹ
اور کمرشل پلاٹ کی خرید و فروخت کیلئے مشورہ لائیں

ہمارے ہاں انویسٹر موجود ہیں

ڈاکٹر محمد اشرف جاوید سمیرا

0300
3948115

مقام جلالی سول انجینئر

نوٹ

ایڈوائزر

بلڈرز



انصاریہ

انسان کی کم ظرفی اس کی گھٹی میں پڑی ہے.....!

ہم لاکھ نیکو کار سہی، زاہد و متقی سہی لیکن رویوں کی تقسیم میں ہماری فطرتی کم ظرفی عود آتی ہے.....
ہم اعمال کے پلڑے سے انصاف نکال دیتے ہیں..... نفرتوں کو ابال دیتے ہیں..... لہجے کو
اشتعال دیتے ہیں اور بدلے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے.....!

بٹوارہ مسکراہٹ کا ہو یا مال کا..... وہاں بھی ہم ذاتی رویوں، رواداریوں، وضع داریوں اور
وفاداریوں پر پورے اترنے والوں کو بھرپور نوازتے ہیں اور جن سے بد مزگی، بدکلامی اور بد خلقی
کے واسطے ہیں، انہیں ہم نفرت کی آنکھ سے دیکھ کر اپنی راہ بدل لیتے ہیں..... شاید اس لئے کہ کم
ظرفی ہماری گھٹی میں پڑی ہے.....!

ہم خالق کائنات کے نظر آنے والے اس درس کو نظر انداز کر دیتے ہیں..... کہ جب وہ اپنی
رحمتوں کی بارش اُن پر بھی برساتا ہے جو اُس کے پیروکار ہیں اور اُن پر بھی جو بے کار اور خطا کار
ہیں..... ہمیں صرف اپنے حصے کی خوشی عزیز ہوتی ہے، یہ خوشی کبھی ہماری خواہشوں کے پیچھے
سے جھلکتی ہے..... کبھی دل کے اندر سے..... کبھی مسکراہٹ کی روزن سے تو کبھی پلکوں کے
جھروکوں سے.....! خوشی کے بے شمار روپ ہیں اور بے حساب رنگ..... لیکن ہر رنگ خوشی نہیں
ہوتا..... نہ ہر گھڑی مُسرت ہوتی ہے..... اگر ہم اس معمولی سے فرق کو محسوس کر لیں تو شاید اس
عید پر اُن کو بھی گلے لگالیں جو ہمارے دل میں میل کی صورت بیٹھے ہیں اور یہ میل دھل جائے تو
یہی زندگی کی خوشی ہے اور یہی ہمارے اعمال کی عیدی بھی.....!

بشری مسرور

عید الاضحی مبارک



193

دوسرا جنم

مید قیہ

[Redacted]

189

بیات تو جیون خوش

ارشدی

[Redacted]

166

اجنبی راستے

مدرین حسن

[Redacted]

226

میرا پہلا آدم خود چیتا

خیال جنگ اور طوطی

[Redacted]

271

کہانیاں زندگی کی

تجربہ و رسم رشتہ کی

[Redacted]

209

ٹوٹے خواب کی کڑیاں

حاجر و غفر

[Redacted]

252

دنیا نے رنگ نور

ساحل رادی

[Redacted]

246

واپسی

[Redacted]

[Redacted]

239

کنارہ

[Redacted]

[Redacted]

261

ریشی سندھے

[Redacted]

[Redacted]

260

خواص

[Redacted]

[Redacted]

256

یشم کا باورچی خانہ

[Redacted]

[Redacted]

267

آپ کے اوراق

[Redacted]

[Redacted]

265

خود کلامی

[Redacted]

[Redacted]

263

نمکین مشاعرہ

[Redacted]

[Redacted]

278

باتیں محسوس کی

[Redacted]

[Redacted]

273

رنگ خیال

[Redacted]

[Redacted]

271

بابا کی بیٹی پیر

[Redacted]

[Redacted]

283

الف تا جی

[Redacted]

[Redacted]

282

روحانی معالج

[Redacted]

[Redacted]

280

شخصیت

[Redacted]

[Redacted]

یا محمد
صلی اللہ علیہ وسلم

یا اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حمد باری تعالیٰ

زبانوں پہ سب کی ذکر تیرے یارب
کہ سب کے ہیں جان و جگر تیرے یارب
تری بندگی میں ہیں مشغول سارے
پرندے چرندے بشر تیرے یارب
چمکتے ہیں شمس و قمر آسمان پر
زمین میں ہیں لعل و گوہر تیرے یارب
حسیں چاندنی کے ہیں دلکش نظارے
سمندر میں مد و جزر تیرے یارب
جدھر میں نے دیکھا ادھر تو ہی تو ہے
چمن پھول برگ و ثمر تیرے یارب
تری دسترس میں ہے سارا زمانہ
شب و روز و شام و سحر تیرے یارب
یہ شاہد کہاں اور کہاں شان تیری
ہیں اس کے قلم میں اثر تیرے یارب
(غضنفر علی شاہد، منگا کینٹ)

یا محمد ﷺ

یا اللہ ﷻ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نعت رسول مقبول ﷺ

عشق سے سرشار ہونا چاہیے
آپ کا دیدار ہونا چاہیے

ذہن و دل میں بس گئی یادِ نبی
لب سے بھی اظہار ہونا چاہیے

آپ پر لکھے گئے ہر لفظ کو
صورت مہکار ہونا چاہیے

نعت اپنی آپ ہی نکھوائیں گے
سوچ کو بیدار ہونا چاہیے

ذکرِ احمد کے لیے راشد ہمیں
ہر گھڑی تیار ہونا چاہیے

(راشد ترین، مظہرِ گُڑھ)

سالانہ ممبر شپ فارم

کی سالانہ خریداری
پر زبردست رعایت

ماہنامہ
ریشم ڈائجسٹ

خوشخبری

-380/- روپے کی یقینی بچت

اگر آپ کے گروپش میں ماہنامہ ریشم کا کوئی ایجنٹ موجود نہیں تو فکر مند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کو ریشم ڈائجسٹ کے تمام شمارے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک بھیجیں گے۔

12 شماروں کی قیمت	ڈاک خرچ	کل رقم	بچت	سالانہ قیمت
720/-	360/-	1080/-	380/-	700/-

برائے مہربانی یہ فارم پر کرنے کے بعد ایک لفافے میں بند کر کے سرکولیشن منیجر ماہنامہ ریشم ڈائجسٹ کو نیچے دیئے گئے پتہ پر ارسال کر دیجئے۔ (شکریہ)

نام

پتہ

فون نمبر

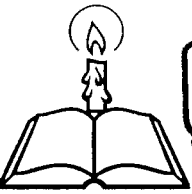
میں ریشم ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار ماہ سے بذریعہ ڈاک بننا چاہتا ہوں اور Rs

کامی آرڈر/بینک ڈرافٹ "Monthly Raysham" کے نام ارسال کر رہا ہوں۔

Suite#1, 4th Floor, Block No.12 Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore

Ph (042) 36280130 Email: Rayshamdigest@gmail.com

ماہنامہ
ریشم ڈائجسٹ



دین اور دنیا



اسلام میں قربانی کا تصور

میں نیت محرک ہوتی ہے اور محرک سے عمل جنم لیتا ہے۔

نیت ہی اعمال کے ثمرات کی بنیاد ہے

اپنی ہیئت کے اعتبار سے عمل کی بے شمار صورتیں ہیں

لیکن ان میں فرق و امتیاز نیت کرنے والوں کی نیت کی بناء

ہی کیا جاسکتا ہے اس کی ایک مثال نماز ہی کو لے لیجئے۔ ایک

بندہ نماز کو اللہ کی رضا و خوشنودی اور اس کے لطف و کرم کے

حصول کا ذریعہ سمجھ کر پڑھتا ہے۔ خشوع و خضوع اور رقت

کی کیفیت دل پر طاری ہوا اور وہ نماز کے تصور میں نیوں دو

ہوا ہو کہ اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ رہے۔

ہوں تو ایسی نماز اسے مولا کا قرب عطا کر دے گی اور رحم

ایزدی کے دروازے اس پر کھل جائیں گے۔ نماز میں جتنے

عاجزی و انکساری آئے گی اتنی ہی رضائے خداوندی اسے

نصیب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کی کیفیت اور ذوق کو دیکھتا ہے جس

میں ڈوب کر بندہ نماز پڑھ رہا ہے۔ وہ فرشتوں کو حکم دیتا

کہ میرے اور میرے اس بندے کے درمیان جتنے پردے

حائل ہیں وہ اس نماز کی برکت سے ہٹا دیے جائیں، میں

نہیں چاہتا کہ کوئی دوری باقی رہے لہذا میرا قرب اسے ع

کر دیا جائے۔ اب دوسری طرف نگاہ دوڑائیے ایک بندہ

پڑھ تو نماز ہی رہا ہے اور اسی طرح رقت کی کیفیت اس

طاری ہے۔ دیکھئے والا یہی گمان کرتا ہے کہ کتنا عبادت گزار

بندہ ہے لیکن اس کا یہ عمل محض ریا اور دکھلاوے کا عمل ہے اور

اپنے آپ کو محض نمازی کہلوانے کے خیال سے عبادت کر

ہے۔ ایسی نماز سے کچھ حاصل نہیں ہوتا وہ اللہ کی رضا

خوشنودی سے دور رہتا ہے۔ ایسی نماز جس میں اس کا دل نماز

میں نہیں بلکہ مکر و بات دنیا اور اپنے نفس کی بزرگی و برتری میں

مگن ہے اس کے منہ پر مادی جائے گی۔ اس لئے حسن نیت

حسن نیت ہر عمل کی روح ہے

یوں تو ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کی

ہیئت (Form) اور دوسری اس کی روح۔ روح کا تعلق اس

کے عقیدے اور نیت کے ساتھ ہے جبکہ ہیئت کا تعلق ظاہری

شکل و صورت سے ہے۔ کسی بھی عمل کے پیچھے جو باطنی نیت

کا رفاہ ہوتی ہے اس سے وہ مقبول، نامقبول، پسندیدہ غیر

پسندیدہ ٹھہرایا جاتا ہے۔ الغرض حسن نیت ہی عمل کی روح

ہوتی ہے۔ اس کو ایک عام فہم مثال سے یوں واضح کیا جاسکتا

ہے کہ ایک شخص راستے سے گزر رہا ہے اور اسے سڑک کے

درمیان ایک پتھر بڑا دکھائی دیتا ہے وہ اسے اٹھا کر دور

پھینک دیتا ہے۔ اب عمل ایک ہے لیکن اس کی نیت اس عمل

کی جہت اور رخ کو بدل کے رکھ دیتی ہے۔ اگر اس شخص

نے گزرگاہ عام سے پتھر اس لئے بنایا ہے کہ اسے شک گزرا

ہے یا کسی ذریعے سے اسے پتہ چلا ہے کہ اس کے نیچے کوئی

رقم چھپی ہوئی ہے۔ وہ اس پتھر کو ہٹاتا ہے، رقم جیب میں

ڈالتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اب دیکھئے والے نے اس کا پتھر

ہٹانے کا عمل دیکھا ہے لیکن اس عمل کے پیچھے چھپی ہوئی

نیت کو نہیں دیکھا کہ نیت کو ظاہری آنکھوں سے دیکھا نہیں

جاسکتا۔ اب ایک دوسرا شخص آتا ہے اس نے پتھر کو اس

لئے ہٹایا کہ تھوڑی دیر میں رات کا اندھیرا چھانے والا

ہے۔ کہیں کوئی راہی بے خبری میں اس سے ٹھوکر کھا کر نہ گر

جائے۔ اس کا پتھر ہٹانے کا عمل کسی کو تکلیف اور گزند سے

بچانے کیلئے تھا۔ بادی النظر میں دونوں کا عمل دیکھنے والے

کے لئے یکساں ہے اور اس میں رتی بھر فرق نظر نہیں آتا

لیکن نیت جو دونوں کے عمل کے پیچھے تھی اس نے نتائج

کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔ اصل

اور اخلاص والاعمال ہی قرب الہی کا ذریعہ بنتا ہے اور اس میں علماء اور پابکاری آجائے تو وہ قابل قبول نہیں رہتا۔

قربانی اور حضرت آدم کے بیٹوں کا ذکر

نماز میں نیت اور اخلاص کی طرح یہی حال قربانی کے عمل کا ہے قرآن مجید نے اس تناظر میں حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں قربانی کی قبولیت کا ایک طریقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا، جس سے فوراً پتہ چل جاتا کہ آیا پیش کردہ قربانی قبول ہوئی ہے یا نہیں۔ وہ یوں کہ قربانی کر کے جانور کو ایک جگہ رکھ دیتے ہیں۔ جس کی قربانی قبول ہونا ہوتی اسے آسمان سے آگ آ کر جلادیتی اور جس کی قربانی کو آگ آ کر نہ جلاتی اس کے بارے میں یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ قبول نہیں ہوئی۔ یہ ایک معیار تھا جس سے قربانی کی قبولیت یا عدم قبولیت کا پتہ چل جاتا تھا۔ ایک جگہ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے حوالے سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے پیغام کی حقانیت و صداقت کی یہ دلیل ہوگی کہ وہ قربانی کریں گے اور جس کی قربانی کو آسمانی آگ آ کر جلادے گی وہ اللہ کا مقبول بندہ ہوگا اور جو نافرمان ہوگا اس کی قربانی کو آگ نہیں جلائے گی۔ چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل نے قربانی پیش کی تو ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی رہ گئی، جس کی قربانی قبول نہ ہوئی وہ اپنے بھائی سے کہنے لگا۔ کہ ”میں تجھے قتل کئے بغیر نہ رہوں گا“۔ اس ارادہ قتل کے اظہار کے پیچھے وہ نیت کا رفرما بھی جس کی بناء پر ایک بھائی کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ کسی کا قتل قربانی قبول ہو گیا اور کسی کا نہ ہوا اس پر کسی کو تعارض کرنے کا کوئی حق نہیں کہ قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ کا کام ہے اور اگر کوئی اس بناء پر کسی کے قتل کے درپے ہوتا ہے تو اس قتل کا مطلب یہ ہے کہ اس کے عمل قربانی کے پیچھے اللہ کی رضا اور خوشنودی کا کوئی جذبہ کا رفرما نہ تھا بلکہ اس کا محرک ہی کچھ اور تھا جس نے اسے حسد میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ جس کی قربانی قبول ہوگئی تھی اپنے بھائی کے منہ سے یہ بات سن کر کہتا ہے تو مجھے کیوں قتل کرنے کے درپے

ہو گیا ہے اس میں میرا کیا قصور ہے قربانی کی قبولیت تو من جانب اللہ ہے۔

اِنَّمَا يَنْتَقِبُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ۔
(المائدہ، ۵: ۲۷) ”اللہ تو صرف ان کی قربانی قبول کرتے ہیں جو تقویٰ ہوتے ہیں۔“

جن کے دل میں ذاتی ہوس و مغادر، ریاکاری اور نمود و نمائش کا کوئی خیال نہیں ہوتا اور جن کی زندگیاں تقویٰ اور پرہیزگاری کے حسن سے مزین ہوتی ہیں۔ اللہ انہی کی قربانی کو شرف قبولیت عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر کسی کے ظاہر پر نہیں بلکہ اس کے دل میں چھپی ہوئی نیت پر ہوتی ہے۔

قبولیت و عدم قبولیت کا قرآنی فلسفہ

وہ بندگان خدا جن کے دل میں کسی کے بارے میں حسد، بغض اور عناد نہیں ہوتا اور جو اپنا حق من حصن اور اپنی جان کا نذرانہ اللہ کی بارگاہ میں صرف اس کو راضی کرنے کے لئے پیش کر دیتے ہیں ان کے اعمال، سند قبولیت سے نوازے جاتے ہیں۔ انہیں ان کی حسن نیت کا پھل ملتا ہے اس لئے حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”فرمایا! بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری طرف اور تمہارے اموال کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو تمہارے دل کی نیت کو دیکھتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی نظر نہ تو بندوں کی صورتوں کو دیکھتی ہے اور نہ ان کے مال و اموال کو بلکہ ان کے دلوں میں چھپی ہوئی نیتوں کو دیکھتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ کوئی دیکھنے میں خوش شکل اور بھلا لگے، اس کے اعمال بھی دیکھنے میں اچھے لگیں لیکن ان کے اعمال کے پیچھے اچھی نیت کا رفرما نہ ہو اور اس کے مقابلے میں ایک شخص بھدا، بد نما، ناقص اور کم تر دکھائی دے لیکن اس کی نیت اور اخلاص کا یہ عالم ہو کہ اس کے اعمال کو قبولیت کے اعلیٰ درجے پر فائز کر دیا جائے۔ چنانچہ اس معیار قبولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے آدم کے اس بیٹے نے جس کی قربانی قبول ہوئی تھی اپنے بھائی سے کہا۔

”کہ اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ میری طرف بڑھاؤ گے تو پھر بھی میں جواب میں تیری طرف ارادہ قتل

قربانی کے گوشت کی تقسیم کا طریقہ

اور اس میں کارفرما حکمت

گوشت کی تقسیم کے معاملہ میں اس تقسیم کو طوطا رکھنا لازم ہے کہ اس کا ایک حصہ غرباء، مساکین میں صدقہ کر دیا جاتا ہے۔ ایک حصہ عزیزوں، رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ تیسرا حصہ ذاتی استعمال کے لئے رکھا جاتا ہے۔

اگر قربانی خالصتاً صدقہ ہوتا تو اسے سارا کا سارا غریبوں میں تقسیم کرنے کا حکم ہوتا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ یہاں تک اجازت ہے کہ کنبہ کے افراد زیادہ ہوں تو سارے کا سارا گوشت گھر میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس لئے قربانی سے مقصود محض گوشت کی تقسیم نہیں بلکہ اس کے پیچھے کارفرما حکمت قربانی کے جانور کا اللہ کے لئے خون بہانا ہے۔ اس طرح عید الاضحیٰ یا عید قربان کا بنیادی فلسفہ اللہ کی رضا کا حصول ہے جس کے لئے قربانی کی جاتی ہے اور اس میں حسن نیت اور اخلاص کا ہونا بنیادی شرط ہے۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ قربانی کا عمل اگر چہ قلیل تر ہی کیوں نہ ہو۔ صدقہ و اخلاص سے کیا جائے تو قبولیت پہنچتا ہے اور اگر یہ عمل صدقہ و اخلاص سے خالی ہو تو قربانی کے چاہے پہاڑ کی طرح انبار لگا دیئے جائیں بارگاہ الہی میں ان کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ قربانی میں تقویٰ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے اس بات کی طرف بندے کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ قربانی کے عمل کو اعزہ و اقرباء اور محلہ داروں میں اپنی حیثیت کا رعب جمانے اور اپنی بڑائی کا تاثر قائم کرنے کے لئے بروئے کار لاسکتا ہے۔ اللہ کے ہاں کوئی بڑا نہیں، سب انسان برابری کی سطح پر ہیں۔ عین ممکن ہے خدا کے ہاں کوئی خرقہ پوش فقیر زیادہ قدر و منزلت کا حامل ہو۔ ایسے بھی اللہ کے بندے ہیں جو نان شبینہ کے محتاج ہیں لیکن ان کا دل چاہتا ہے کہ کاش ہمارے پاس اتنے وسائل ہوتے تو ہم اللہ کی راہ میں قربانیوں پر قربانیاں کرتے چلے جاتے۔ ممکن ہے کہ انہیں قربانی نہ کرنے کے باوجود محض حسن نیت کا اتنا ثواب مل جائے

سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔

قرآن حسن عمل اور تقویٰ کی تلقین کرتا ہے اور اگر کوئی زیادتی کرتا ہے اور وہ اس زیادتی کا جواب زیادتی سے دینے کی بجائے حمل، ضبط اور درگزر سے کام لیتا ہے تو اس کے پیچھے یہ جذبہ محرک ہوتا ہے کہ کہیں میرا مولا مجھ سے ناراض نہ ہو جائے تو اس کا یہ عمل اسے تقویٰ کے اعلیٰ درجے پر فائز کر دیتا ہے۔ اس سے یہ بات مترشح ہوئی کہ انسانی اعمال میں سے اللہ تعالیٰ انسان کے تقویٰ اور خشیت الہی کی کیفیت کو قبول فرماتا ہے اور وہ اعمال جو محض دکھاوے کے لئے کئے جائیں انہیں شرف قبولیت نہیں بخشتا۔

اللہ تعالیٰ کی بابرکت ذات یہ نہیں دیکھتی کہ وہ جانور جو قربانی کے لئے پیش کئے گئے ان کی مالیت اور جسامت کیا ہے بلکہ وہ قربانی کرنے والے دلوں کی کیفیت پر نگاہ رکھتا ہے۔ کیا یہ تو نہیں کہ قربانی کرنے والے کی نیت کوئی مادی منفعت یا محض نمود و نمائش کا اظہار ہے، اللہ رب العزت کو ایسی قربانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اس قربانی کو قبول کرتا ہے جس کی اساس تقویٰ پر رکھی گئی ہو۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا۔

”اللہ کو ہرگز ان کے گوشت پہنچنے میں اور نہ ان کے خون مگر اسے تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کو قربانی کے جانور کے گوشت پوست اور جسامت سے کوئی غرض نہیں اس تک تو صرف وہ تقویٰ پہنچتا ہے جو قربانی کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ وہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ قربانی کرنے والے میں خوف خدا اور پرہیزگاری کی کیا کیفیت ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

”صدقہ و اخلاص سے قربان کئے جانے والے جانور کے خون کا پہلا قطرہ جو نبی زمین پر گرتا ہے اس قربانی کو بارگاہ الوہیت میں قبول کر لیا جاتا ہے۔“

وہ تو بندے کی نیت کو دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قربانی سے مقصود گوشت نہیں بلکہ قربانی کے جانور کے حلقوم پر بسم اللہ اکبر کہہ کر چھری چلا دینے کا نام قربانی ہے۔

جو ریا کاری کی قربانی والے کو کبھی میسر نہ ہو۔

قرآن میں شعائر اللہ کی تعظیم کا بیان

حسن نیت اور تقویٰ و اخلاص کے باب میں قرآن

حکیم نے یوں ارشاد فرمایا:

”اور جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری سے ہے۔“

اس آیت کریمہ میں تقویٰ کو دل کی کیفیت قرار دیا گیا ہے۔ قربانی کرنا تو دور کی بات سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے قربانی کے جانوروں کو بھی شعائر اللہ یعنی اللہ کی نشانیوں سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ان کو ذبح کرنے سے ان کی نسبت اللہ کی طرف ہو جاتی ہے۔ یہ اونٹ اور دوسرے جانور جنہیں قربانی کے لئے ذبح کیا جاتا ہے، اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں اور اس سے پہلے والی آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی تعظیم کرنے والوں کا شمار اللہ کی بارگاہ میں ان لوگوں میں ہوگا جن کے دل تقویٰ سے بہرہ مند ہو چکے ہیں۔

قربانی کے آداب اور سنت محمد ﷺ

تمام احکام اللہ جو قرآن مجید میں قربانی کے ذیل میں بیان ہوئے ہیں ان میں بنیادی اہمیت حامل قربانی میں چھپے ہوئے تقویٰ اور حسن نیت کا حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس بارے میں جو سنت اختیار فرمائی ہے اس کے مطابق قربانی کا عمل اس وقت تک تقویٰ قلوب کے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک قربانی کو اپنے ہاتھ سے نہ کیا جائے۔ اپنے ہاتھ سے جانور کو ذبح کرنے سے خون گرانے کا عمل جو قربانی کی روح ہے پورا ہو سکے گا۔ اس لئے حضور ﷺ کی سنت مبارکہ یہی رہی کہ جانور کی قربانی اپنے ہاتھ سے کرتے اور یہ آپ کا زندگی بھر معمول رہا۔ آپ رحۃ للعالمین ﷺ تھے اور جانور کو ادنیٰ سی تکلیف بھی برداشت نہ کرتے تھے لیکن قربانی ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے قربانی کا بکرا منگوایا اور مجھے فرمایا کہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) چھری لے آئیں، آپ ﷺ نے چھری کو دیکھ کر فرمایا کہ اسے پتھر پر

اچھی طرح تیز کر کے لے آ۔ میں نے آپ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں ایسے ہی کیا تو آپ ﷺ نے اس چھری سے قربانی کا جانور ذبح فرمایا، حضور ﷺ کے اس عمل میں قضاویوں اور دیگر قربانی کرنے والوں کے لئے انتباہ ہے کہ وہ قربانی کے جانور کو تیز چھری سے ذبح کریں تاکہ اسے حتی المقدور کم سے کم تکلیف ہو۔ اسلام اتنی رحمت والا دین ہے کہ وہ جان نکلنے وقت جانوروں کی اتنی سی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتا۔ اسے یہ کب گوارا ہوگا کہ وہ انسان کے ہاتھوں انسانوں کا ناحق قتل برداشت کر سکے اور زندہ انسانوں کے جان و مال اور عزت نفس کو بے دریغی سے تلف ہوتا دیکھ سکے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا طریقہ قربانی بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ آپ نے قربانی کا جانور خود زمین پر گرایا اور اسے قبلہ رو کر کے چھری سے ذبح کیا تاکہ جب اس کا خون نکلے تو خون کی دھار کا رخ جانب قبلہ ہو۔ حضور ﷺ نے اپنا قدم مبارک جانور کے پہلو پر رکھا اور ذبح کرتے ہوئے بسم اللہ اکبر کہا اور یہ کلمات ادا فرمائے۔

”اے اللہ قبول کر محمد (ﷺ) کی طرف سے، آل محمد (ﷺ) کی طرف سے، امت محمدی (ﷺ) کی طرف سے پھر آپ نے قربانی کی۔“

اس پر محمد بن کرام اور فقہان دین کا کہنا ہے کہ اس طرح حضور ﷺ نے اپنی پوری امت کو قربانی کے ثواب میں شامل کر لیا۔ آپ ﷺ وہ سراپا رحمت نبی ہیں کہ عمل قربانی کے دائرے میں بھی چاہتے ہیں کہ ان کے سارے امتی شریک ہو جائیں۔ ایک حدیث مبارکہ میں ذبح کرتے وقت آپ سے یہ الفاظ منسوب فرمائے گئے ہیں۔

”یہ میری طرف سے، میری آل کی طرف سے اور میری امت کی طرف سے ہے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا باری تعالیٰ یہ قربانی میری طرف سے ہے اور یہ قربانی میرے ان امتیوں کی طرف سے ہے جو افلاس کی وجہ سے قربانی نہیں کر سکتے۔ ہمیں بھی قربانی کرتے وقت نبی کریم ﷺ کو اس میں شریک کرنا چاہئے اور یہ محبت کا تقاضا بھی ہے۔

☆.....☆.....☆



ریشمی دستک

بشری مسرور

ریشمی بہن بھائیو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ سب کو گزشتہ عید الاضحی مبارک ہو۔

آج کل قربانی کرنا کتنا دشوار امر ہے اس کا اندازہ ہمیں ہے۔ قربانی کے جانور کی گردن پر چھری پھیرنے سے پہلے مہنگائی کی کند چھری سے خود ذبح ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جنہیں اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماتا ہے وہ اس کی راہ میں اپنا مال جائز طریقے سے ضرور خرچ کرتے ہیں اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔

اور جنہیں اس عید پر قربانی کی توفیق نہیں ہوئی وہ اپنی خوشیاں، اپنے ارمان اور تشنہ تمناؤں قربان کرتے ہوئے پاک پروردگار کی رضا میں راضی رہتے ہیں۔ اب ان کی خوشیوں کا خیال رکھنا اور قربانی کے گوشت کا جائز اور شرعی طریقے سے حصہ لگانا ان لوگوں کا فرض بنتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے عید قربان کی خوشیاں منانے اور قربانی کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔

ریشمی ساتھیو! موسم بے حد تیزی سے بدل رہا ہے اور موسم کا کام ہی بدلتے رہنا ہے مگر کچھ لوگوں کا مزاج بھی بل بل پل رنگ بدلتے موسموں کی طرح ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں کی پسند و ناپسند اور رفاقتیں بھی ناپائیدار رہتی ہیں اور ان سے مخلص ہونا گویا خود سے دشمنی کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ تو ایسے اطراف میں موسموں کی مانند مزاج بدلتے لوگوں کو پرکھیے اور مستقل مزاج، اور مخلص دوستوں کی رفاقتوں کی قدر کیجئے اور کبھی کبھار تنہائی میں ایک بار اپنا جائزہ بھی لیجئے کہ..... کہیں آپ کا مزاج تو بدلتے موسموں جیسا نہیں.....!

آئیے دیکھتے ہیں آج کی پہلی دستک کس نے دی ہے۔

☆☆☆

اشفاق شاہین، کراچی 0345-2118945

محترمہ بشری صاحبہ!

صحرا میں آ کے اس کا ڈھونڈوں مکان کیسے

اس نے کہا تھا آگن پھولوں سے بھرا ہو گا!

اک مہربان کی ریشمی تلاش ہمیں کھینچ کر آپ کے در پر لے آئی ہے اور یہ کیا، اس نے تو کچھ اور کہا تھا جبکہ یہاں تو برا آگن ہی پھولوں سے بھرا ملا ہے اور نہیں ہے تو وہ مہربان نہیں ہے، کہاں گیا اسے تلاشنے میں آپ ہی ہمارے لیے کچھ کیجئے گا۔ وہ خود کسی اوٹ میں ہوں تو سامنے آ جائیں، کچھ نہیں کہا جائے گا۔

محترمہ! آپ سوچ رہی ہوں گی سلام نہ دے، ہو گئے شروع، پاگل جو ہوئے۔ بس جو من میں آیا کہہ ڈالا اور کہہ رہے ہیں کہ ”ریشم“ ہمیں بہت پیارا اور ملل لگا، اگست کا شمارہ لیٹ ملا تھا۔ اس بار آج 16 کو ملا اور آج ہی خط بھی لکھ رہا ہوں اس ڈر سے کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں، خط لکھنے کی ڈیڈ لائن کا بھی تو پتہ نہیں، اسی لیے پہلی دستک تبصرہ کے بغیر ہی ہے، آئندہ سے ہجر پور شرکت ہوگی۔ امید ہے کہ آپ کو اور تمام دوستوں کو ہماری آمد بھلی لگے گی اور ہماری کوشش ہوگی کہ ہر دل عزیز نہ سہی تو چلو کچھ دل عزیز تو ضرور ہونا ہی چاہیے۔

ربا ہمارا تعارف تو رسالوں سے بہت پرانی یاری، اب اس محفل میں بھی کئی احباب سے ہیلو ہائے ہے، ارض وطن کے ساحلوں کے نگہبان ہیں ہم (Navy) تعلق ہمارا اوکاڑہ سے ہے اور شادی لاہور میں ہوئی ہے (اور بیوی کا نام بشری، اسی لیے آپ کو باجی کہنا مشکل لگا)

دوستوں کی نوک جھونک نہ صرف اچھی ہوتی بلکہ محفل کی جان ہوتی اور ہم بھی جلد حاضر ہوں گے انشاء اللہ، روف عدم کا خط زبردست تھا، مجید جانی جگہ جگہ نظر آتے، گڈ، بہن کے لیے دعائے صحت، فریدہ فری، ریاض تبسم بہت سی دعائیں ریشمی دستک میں شامل تمام احباب کو خصوصی سلام اور ایک شعر کے ساتھ اجازت، اس امید کے ساتھ کہ تمام احباب جی آیاں نوں کہیں گے اور مجھے برتی پیغامات کا بھی انتظار رہے گا!

گزنوں کی طرح بانٹ زمانے میں اجالا
خوشبو کی طرح پھیل گلابوں سے نکل کر

☆☆☆

ایم ارشد وفا، گوجرانوالہ 0312-7706374

محترمہ باجی بشری مسرور!

السلام علیکم:

اکتوبر کا ریشم میں نے آپ کے آفس سے لیا بہت خوشی ہوئی۔ اتنا محبت کرنے والا اور پیار کرنے والا شاف جی چاہتا ہے ان کو سلام کروں۔

عرفان رائے، علی شیر اور کمپوزر شہزاد بھائی سے ملا بہت خوشی ہوئی۔ علی بھائی نے اکتوبر کا ریشم لا کر دیا۔ اپنی تحریریں پڑھی کافی خوشی ہوئی۔ آپ کے دل میں ہمارے لیے اتنی محبت اور پیار ہے میں آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں۔

تحریریں تو سب کی اچھی ہی ہیں، کیونکہ جن کا شاف اتنا اچھا ہے، ان کے قارئین بھی تو اسی طرح کے ہوں گے اور امید ہے کہ اس شمارے میں میری کہانی پیارے توجیوں خوش بھی شامل اشاعت ہوگی۔

بس ہمارا آپ سے یہی وعدہ ہے کہ جب تک رہیں ساتھ رہیں۔

آخر میں اشفاق بٹ، بشارت اقبال، بھائی عرفان رائے، علی شیر، شہزاد بھائی کو دل کی گہرائیوں سے سلام۔

شام سورج کو ڈھلنا سکھا دیتی ہے

شمع پروانے کو جلنا سکھا دیتی ہے

گرنے والوں کو تکلیف تو ہوتی ہے

ٹھوکر انسان کو چلنا سکھا دیتی ہے

مانا کہ دوستی نبھانا مشکل ہے لیکن

دوستی انسان کو جینا سکھا دیتی ہے

آخر میں سب شاف کو اور قارئین کو دلوں کی گہرائیوں سے سلام۔ اگر سانسوں نے وفا کی تو بہت جلد حاضری دوں گا۔ اللہ

حافظ۔

☆☆☆

ارشاد محمود ارشد، سرگودھا 0333-9801168

پیاری آئی!

السلام علیکم:

امید واثق ہے کہ رب ذوالجلال کے فضل و کرم سے آپ بخیریت ہوں گی۔

کچھ ذاتی مضروفیات اور کچھ طبیعت کی ناسازی کی بنا پر کچھ عرصہ ریشم سے رابطہ برقرار نہ رہا جس کا بہت افسوس ہے

کوشش کروں گا کہ آئندہ ایسا نہ ہو تمام ریشمی دوستوں کی خدمت میں سلام۔

☆☆☆

شاہ روم خان ولی، کراچی
بہت پیاری بشری مسرور آپی!
السلام علیکم:

امید کرتا ہوں آپ اور آپ کی فیملی خیریت سے ہوں گی سب سے پہلے تو میں آپ سے اور اپنی قلم فیملی سے اور اپنے خواہ صورت قارئین سے معذرت کروں گا کہ میں اتنے مدت سے تبصرہ نہ کر سکا ویسے صرف تبصرے میں شریک نہیں ہو سکا پر چہ ہر ماہ پڑھتا رہا ہوں پرچے میں کافی تبدیلی نظر آئی جو کہ بہت اچھی بات ہے۔ اور جن دوستوں نے مجھے اپنی دعاؤں میں شامل رکھا میں ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ آپ سب کو سلامت رکھے آج کے لیے صرف اتنا ہی انشاء اللہ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو اگلے ماہ سے شمار سے یہ تبصرہ کروں گا۔ میری طرف سے نگہت غفار آپی، زہبت آپی، اور ان کی فیملی، غزالہ خلیل، ارشد محمود ارشد، شاہجہاں مغل، نعیم بھٹی، ہما شاہ، دوست محمد، شائستہ ساجد، پرنس افضل شاہین، امین اذیریانی، نگہت اکرم، غضنفر علی شاہد، راغب عثمان کیانی، قدیر رانا، راشد ترین، میثم علی آغا، امان اللہ نیئر شوکت، عائشہ خان آفتاب خان، افتخار فلک، عرفان رائے اور ریشمی دستک میں تمام نئے آنے والے دوستوں کو سلام اور خوش آمدید کہوں گا۔

☆☆☆

محمد دلدار، چٹوکی ضلع قصور 0341-4165002

باجی بشری مسرور:

ریشم کی سالگرہ کے موقع پر میں آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور تمام قارئین کو جنہوں نے اسے پروان چڑھایا۔ عبدالرؤف عدم صاحب بہت بڑا نام ہے۔ اللہ ان کو بھی سلامت رکھے۔ سالگرہ کے گفت کا انتظار کر رہا ہوں۔ چٹوکی میں ریشم کے ڈسٹری بیوٹر جو ہیں ان کا بانیو ڈینا بتائیں۔ تمام ریشم کے رائٹرز کو بھی سلام اور مبارکباد۔ مجید احمد جانی کی بہن کے لئے دعا اللہ ان کو صحت دے۔ باجی سالگرہ نمبر اگر آپ بھیج سکیں چٹوکی تو میں مشکور ہوں گا آپ کا۔ میں اور میرے کزن سب مل کر آپ کی ترقی کے لئے دعا گو ہیں۔

☆☆☆

صالحہ عزیز صدیقی، کراچی

جناب عرفان رائے صاحب اور بشری جی صاحبہ!
السلام علیکم:

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ نے افسانہ ریزہ ریزہ ہوئی محبت شائع کر کے حوصلوں کو مزید تقویت دی اور مزید لکھنے پر مجبور کر دیا امید ہے حوصلہ افزائی ضرور کریں گے یاں ایک چیز ہے وہ یہ کہ وقت بہت لگتا ہے لیکن اس بات کی خوشی زیادہ ہوتی ہے کہ آپ کے یاں افسانوں کی دوئنگ ہوئی ہے جب ہی بیسٹ رائٹر ایوارڈ بھی دیا جاتا ہے اچھی چیز ہے۔ مجھے انہی اداؤں نے لوٹ لیا یقین کریں ریشم ڈائجسٹ واقعی ادب سے خالی نہیں ہے بس یوں سمجھیں کہ پڑھ کر کوئی نہ کوئی ورڈ سیکھ جاتے ہیں اور کچھ سکون بھی مل جاتا ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔

☆☆☆

محمد ندیم عباس ڈھکو، ساہیوال 0306-5868379

پہلی دستک کے جواب میں خوش آمدید
محترم محمد عرفان اینڈ محترمہ بشری صاحبہ!
السلام علیکم:

امید واثق ہے۔ سبھی قارئین اسٹاف اور آپ خیریت سے ہوں گے۔ سدا خوش رہیے (آمین) ریشم اکتوبر، سالگرہ بابا کو خوش ہوئی۔ مجید احمد جانی کی مہربانی کہ انہوں نے اتنے، اچھے، پیارے ڈائجسٹ کی طرف راغب کیا۔ شکر یہ مجید احمد جانی صاحب۔ واقعی ریشم ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ ریشمی احباب ریشم کی طرح چمکیں، صاف اور عمدہ ذہن کے مالک ہیں۔ سبھی لوگوں کو آسنے سامنے بیٹھنے باتیں کرتے پایا۔ ریشمی دستک، خود کلامی، رنگ خیال، زبردست کالم ہیں۔ ریشمی سندھیے کے کیا کہنے۔

افسانے ایک سے بڑھ کر ایک زبردست ہیں۔ خوشی کی بات یہ کہ جواب عرض کے لوگ بھی اس طرف حاضری دے رہے ہیں۔ جن میں ملک عاشق حسین، ایم اشفاق بٹ، دوست محمد خان اور میرے عزیز مجید احمد جانی ملتا ہیں۔ اب انشاء اللہ! میں بھی مستقل حاضری دیتا رہوں گا۔ ریشم ہر لحاظ سے مجھے پسند آیا ہے۔ مجھے تو بے حد افسوس ہو رہا ہے کہ اتنا عرصہ ریشم سے کیسے دور رہا حالانکہ مجید احمد جانی برابر کہتے رہے۔

ریشم پڑھ کر تبصرہ کرتا تو لیٹ ہو جاتا۔ مجید بھائی ریشمی دستک دے رہے تھے تو میں نے بھی حاضری دینا لازمی سمجھا۔ آپ نے جگہ دی تو حاضری ہوتی رہے گی۔ باقی محمد منظور اداس، اللہ دتہ بے درد، محمد جرائیل آفریدی، عمر دراز عرف بادشاہ کو سلام..... آپ بھی ریشم کی طرف آئیے۔ بہت ہی زبردست ڈائجسٹ ہے جناب آخر نیک خواہشات اور دھیروں دعائیں سبھی قارئین ریشم کے لیے۔

زندگی نے وفا کی تو مستقل حاضری دیتا رہوں گا۔ انشاء اللہ

☆☆☆

مجید احمد جانی آف ملتان، ملتان 0301-7472712

محترمہ بشری مسرور صاحبہ!

آداب:

مزاج گرامی! عید الاضحی مبارک۔

حسب روایت ہزاروں، کروڑوں، اربوں، کھربوں دعاؤں کے گلدستے لیے حاضر خدمت ہوں۔ امید واثق ہے۔ ہنستے مسکراتے، خوشبوؤں کے گلستان میں بستے ہوں گے۔ جہاں رہیے خوش رہیے اور ہمارے لیے ریشم سجاتے رہیے۔ (آمین ثم آمین)

سب سے پہلے سبھی ریشم قارئین، اسٹاف، رائٹروں، بہن، بھائیوں کو عید الاضحی مبارک۔ جب ریشم ہمارے ہاتھوں میں آئے گا تو عید تیز چلی ہوگی۔ پھر بھی امید ہے آپ نے اپنی خوشبوؤں میں غریبوں، مسکینوں، یتیموں کو شامل کیا ہوگا۔ کسی کو خوشی دینا، چہرے پر مسکراہٹ سجانا، میرے نزدیک بہت بڑی نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ سبھی کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین) واہ، بھائی واہ اس مرتبہ سالگرہ نمبر اور وہ بھی ریشم کی سالگرہ..... ہائے ہمیں تو کسی نے بتایا تک نہیں..... حاجی ہمارے حصے کا کیک کہاں ہے؟ دیجئے ناں..... سرورق پر خوبصورت حسن، خوبصورت لباس زیب تن کیے ہوئے کھڑی مسکراتی رہی تھی اور ساتھ ساتھ سالگرہ کیک رکھا ہے۔ ہم تو اسی سے مانگتے رہے..... لیکن بڑی نخرے والی سے یہ تو..... ذرا سائیکل چمکنے کو کبھی نہیں دیا..... اچھا کوئی بات نہیں۔ ریشمی دوستوں نے ہمیں یاد کیا..... ہماری سانسیں بڑھ گئی..... ہم کھلکھلا اٹھے..... دیکھو کیسے مسکرا رہے ہیں ہم بابا بابا..... بابا بابا 11 اکتوبر کو ملنے والا ریشم تمام تر عنایتوں کے ساتھ موصول ہوا۔ دل سے کہہ رہا ہوں..... اس دفعہ کا ریشم بہت بہت پسند آیا..... تھینکس محمد عرفان رائے بھیا..... تھینکس حاجی بشری صاحبہ مسکراتا چمکتا لگتا۔ ادارہ میں جا پہنچا۔ حاجی سالگرہ کے حوالے سے بہت سے عہد کروا رہی تھی لوجی ہم بھی آمین کہہ دیتے ہیں۔

حمد باری تعالیٰ۔ نعت رسول مقبولؐ نے دل منور کیا..... دین اور دنیا میں پہنچے۔ سید افتخار حسین حضور اکرم ﷺ کے اوصاف و اخلاق احادیث کی روشنی میں بے کراۓ تھے۔ بہت خوب، زبردست۔ ویڈیو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضور اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ریشی دستک میں نعیم رضا بھی مختصر دستک کے ساتھ انعام لے اڑے تھے۔ مبارکباد کے گلدستے قبول کیجئے..... ناز سلوش زشتے میر پور، مسٹر ایم ارشد وفا بھی پیچھے نہیں تھے۔ لوجی آپ کو بھی۔ رس گلے، برنی..... کھولو، کھولو..... منہ کھولو..... بام..... مزہ آیا..... اب ہر بار ایسے تبصرے لکھنا مٹھائی کے ساتھ تختیں غری..... بابا بابا

غضنفر علی شاہد، شہزاد خاور، محمد حسن نظامی قولہ شریف، دوست محمد وٹو، محمد سلیم اختر، مبشر حسن، سیدہ ہما شاہ، فیضہ آصف، خوب تبصرے کے ساتھ انتر تھے۔ بہت اچھے لگے۔ محمد جان انجم..... ویرجی..... آپ تو بھول بیٹھے ہیں۔ ہم ایس ایم ایس کر تو لیتے ہیں۔ سنائیے کیسے ہیں۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش صاحب کیسے ہیں آپ..... ویسے آپ ڈاکٹر ہیں کس کے؟ ایم اشفاق بٹ آیاں تے چھا گیا ایں سونیاں..... دستک کے ساتھ ساتھ افسانہ بھی ویلڈن..... مبارک باد لوجی..... پچھلے دنوں لالہ موسیٰ جانا ہوا لیکن آپ نجائے کہاں چھپے تھے..... ملے ہی نہیں..... ویسے ٹھیک ٹھاک ہیں ناں..... ملک عاشق حسین ساجد اور راشد ترین صاحب کیسے ہیں آپ..... اب تو کان ترس گئے ہیں۔ سریلی آواز سننے کو..... مہربانی کیجئے ناں۔

ایٹن مراد انصاری، بے شک میرے تبصرے آپ کو پور لگتے ہیں کیا کریں ان سے پوچھیے جو کہتے ہیں مجید بھائی اب کی بار بہت کم بلکہ تھوڑا سا تبصرہ کیوں لکھا؟ بھائی..... کسی کے چہرے پر مسکراہٹ پچھانا بہت بڑی نیکی ہے۔ ہماری تعریف سے وہ بھی گلی، کوئی مسکراتا ہے تو ہمیں اور کیا چاہیے۔ آپ کو اعتراض ہے، مرضی آپ کی..... کہتے ہیں تو آئندہ تبصرہ نہیں کرتے لیکن ریشی دوستوں سے پوچھ کر بتائیے گا.....

جن دوستوں نے میری بہن کے لیے دعائیں کی۔ میرے غم میں شریک ہوئے..... مجھے حوصلہ دیا۔ ان سب کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں..... ساگرہ سروے زبردست رہا۔ ویسے ہم تو ساگرہ مناتے ہی نہیں..... اتنے پیارے، پیارے عظیم لوگ ریشم پڑھتے ہیں واہ بھائی..... واہ۔

ٹھہریے جی..... کہاں چل دیئے۔ یہ دیکھو ریشی ستارے بشری باجی نے تو اس مرتبہ کمال کر دیا۔ عظیم رائٹروں کے بارے میں پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ میرے لیے تو سبھی عظیم لوگ ہیں۔ سیما انصار، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب کرے۔ (آمین)

سبھی سے ہیلو ہائے کرنے کے بعد افسانوں کی نگری میں غوطہ زن ہوا تو اشفاق بٹ ساگرہ مبارک کہہ رہے تھے۔ ویلڈن جناب..... جواب عرض سے ریشم میں آگئے۔ ویلکم جی آیاں نوں..... اب یہاں سے جانا نہیں۔ میری طرف سے بھی آپ مبارک باد قبول کریں ناں.....

محمد عرفان رامے صاحب بہت شکر۔ بہت مہربانی آپ ریشم رائٹرز کا مختصر سا تعارف لے کر آئے۔ زبردست رہا محمد حسن نظامی صاحب آپ تو کمال کر گئے بھائی بھی ہمیں بتایا نہیں کہ آپ اتنے عرصے سے لکھ رہے ہیں ملک عاشق حسین صاحب آپ تو چھپے رستم نکلے۔ ارے بھائی بتایا نہیں کہ آپ سکول میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور کتاب گھر بھی ہے..... جرمانہ لگ گیا آپ پر..... بھجوا بھی سی سے کتاب.....

بارش کے بعد اختتام پذیر ہوئی۔ محمد عرفان رامے صاحب زبردست میری طرف سے مبارکباد اور ہاں نیا سلسلے وار ناول کب لارہے ہیں۔ بہت انتظار نہیں کروانا..... ٹھیک ہیں ناں۔

کچے کے رشتے ناؤٹ نظارت نصر خوب تحریر تھی۔ ساحل اور پتوڑ محمد حسن نظامی واہ جی۔ یہ ریشم تو تھی..... ٹینشن میں ڈال دیا آپ نے یار میں کس کس ریشم کو یاد رکھوں۔ ریشم اداکارہ، ریشماں گلوکارہ اور پھر جو میرے ہاتھوں میں پھر پڑا رہا ہے یہ بھی تو ریشم ہے ناں۔ ننھا سادماغ اور یہ کام.....

اس دفعہ ہم جرمی سیر کرنے نہیں گئے..... کیوں..... پوچھ رہے ہیں۔ ارے بھائی باجی نے روٹ ہمراہ ہے اس بار لکھا ہی نہیں ہے۔ اکیلے جاتے پھر..... شاید موسمی حالات خراب تھے۔ فلائٹس منس کر بیٹھے ہیں.....

افسانے پڑھنے باقی ہیں۔ سو سووی۔ افسانے پڑھتا تو ریشمی دستک کیسے دیتا..... رنگ جہاں میں عاؤ الدین کے بارے پڑھا۔ ہم تو صرف بندش دیکھ پائے ہیں باقی فلمیں پتہ نہیں تھا..... فلمی

ستارے جو ڈوب کر چمکے..... واقعی..... انسان کو ہمت نہیں باری چاہیے۔ حوصلے بلند ہوں تو منزلیں قدم ضرور چومتی ہیں جو تھک بار کر بیٹھ گئے انہوں نے پہچنتایا ہے..... باوچی خانہ میں کچے کیلے کے لذیذ کباب اور قیمہ بھرے کر کیلے پسند آئے..... بجٹ آؤٹ ہو گیا۔ اچھے طریقے بنائے گئے لیکن ہم تو مہینہ کماتے ہیں اور ایک دن میں سیلری ختم ہو جاتی ہے..... امرود کے بارے میں اکریم خوب سمجھا رہی تھی۔ کیا امرود کے درخت دیکھے ہیں۔

ریشمی سندھیے، خود کھائی، آپ کے اوراق، بی بی کی بیوٹی ٹیس، رنگ خیال، باتیں سخت کی، مسکراہٹ آپ کو پرکشش بناتی ہے، اور روحانی معالج اچھے رہے۔ فٹنس کے راز پڑھیں اور ایک راز ہم بھی بتاتے ہیں۔ پانچویں نمازیں باقاعدگی سے پڑھنے سے یہ واکنگ، جاگنگ، سائیکلنگ، رقص، ٹیس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جسمانی فٹنس کے ساتھ ساتھ، روحانی فٹنس بھی..... کیا خیال ہے..... اک تیر سے دو شکار..... تو عہد کریں ہم کوئی نماز قضا نہیں کریں گے..... فرح طاہر قریشی سے ملاقات اچھی رہی۔ نجانے کیوں لگا کہ میرے ہی حالات اور واقعات بتائے جا رہے ہیں۔ آپ ملتان سے ہیں خوش ہوئی ہے جب میرے شہر سے کوئی رائٹر، ریشم میں حاضر ہوتا ہے ویسے کیسا ہے ملتان..... آج کل..... ہم تو پردیسی گھبرے ناں۔

الف سے اچھے ب سے بچے۔ لالچی مچھیرا خوب سبق تھا۔ بڑے لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ بچوں اور جو مرلیض ہوں اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں جلدی قبول فرماتا ہے۔

آئیے مسکرائیں..... لبوں پر مسکراہٹ بکھرے ہم بھی آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ تھوڑا سا تبصرہ کر لیا ہے آپ بھی کہیں گے اور اور بے جا تبصرہ ہے۔ ہم نے تو بڑی کوشش کی کہ مختصر لکھیں۔ کہاں تک کامیاب ہوئے آپ ہی بتا دیجئے۔

☆☆☆

شائستہ ساجد، لاہور

ڈیز سویت آپی جی!

السلام علیکم:

کہیے کیسے مزاج ہیں۔ موسم بدل رہا ہے۔ سردیاں آرہی ہیں یقیناً مزاج بھی اچھا ہوگا۔ میں اپنے بارے میں بتاؤں کہ بہت خوش ہوں۔ ساجد آگئے ہیں نا..... تو پھر خوش تو ہونا ہی ہے۔ اتنی زیادہ مصروفیت ہے لیکن میں نے کہا مصروفیت جتنی بھی ہو لیکن ریشم سے ہیلو، ہالے نہ کی نا تو ہمارا مہینہ اچھا نہیں گزرے گا۔ اس لیے بجلی والوں کو کوسے ہوئے گیٹ کے پاس ہی کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئی کہ چلو کچھ روٹی تو آتی ہے نا۔ اوپر سے بشری آئی آپ نے کہہ دیا کہ اب سب رائٹر، قارئین خوش خطی سے لکھا کریں۔ میں تو سوچ میں پڑ گئی میری لکھائی تو اتنی اچھی نہیں۔ یہ نہ ہو کہ ریشم سے آؤٹ ہو جاؤں۔ اچھا اب اگلے مہینے سے کمپوزنگ کے کیل کر دیا کروں گی۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑیں پرچے پہ بات کرتے ہیں۔ ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ بس گزارہ کر لیا تھا۔ حمد و نعت کے بعد ادارہ یہ پہنچے پھر آگے بڑھتے گئے ریشمی دستک میں خوب رونق لگی تھی۔ نعیم رضا بھٹی کو ایوارڈ یافتہ دستک کی مبارکباد قبول ہو۔ ناز سوسن زشتے، بار آپ کا نام بہت مشکل اور بڑا سا ہے آپ کو بھی انعامی دستک کی مبارکباد۔ مسٹر ایم ارشد کو پہلی دستک پر خوش آمدید ہماری طرف سے بھی۔ غنفر علی شاد کی مختصر دستک بھی پرچھی۔ آپ کو کتاب کی اشاعت کی مبارک ہو۔ محمد خاں انجم بھائی جی کوچھیں مجھے روٹیاں بنانی نہیں آتیں بس گزارہ ہی کرتی ہوں۔ کبھی اتفاق سے آپ آگئے تو گزارہ کر لیجئے گا۔ محمد حسن نظامی کی چھوٹی سی شکایت بھری دستک بھی پڑھ ڈالی۔ دوست محمد خان آپ کی دستک پڑھ کر ہم پھر ہنسے لگے۔ ایسے ہی ہنسے مسکراتے آتے رہے۔ معاویہ غنیر بھائی..... میں تو آپ کو بہن بھتیجی رہی، میاں معاویہ پڑھا تو یقین ہوا کہ آپ بھائی ہیں ورنہ مجھے پتہ نہیں چلتا تھا آپ کا..... باقی سب بہن بھائیوں کی دستک جلدی جلدی پرچھی..... فہیمہ آصف، مجید احمد، شہزاد خاور، امین مراد، ڈاکٹر طارق محمود اور سید ہما شاہ سب نے بھرپور دستک دی اور چھائے رہے۔ ارے ریشم رائٹر کا تعارف عمدہ تصاویر اتنا پسند آیا کہ بتائیں سکتے بہت اچھا لگا پڑھ کر بشری آپی نے جو رائٹر کے بارے میں لکھا ہے وہ پڑھتی گئی اور خوش ہوئی گئی۔ اتنا اچھا لگا۔ آپ نے سب کے بارے میں رائے دی بہت مفرد و سادہ لگا۔

آپی ہم کتنے صابر و شاکر ہیں ذرا ساجد سے پوچھیے گا پتہ چل جائے گا (بابا بابا) بہر حال آپ کی رائے میرے بارے میں اتنی اچھی ہے بہت شکریہ مجھے اچھا لگا۔ سالگرہ مبارک بہت اچھا افسانہ لگا حقیقت میں ایسا ہوا تو کمال ہوا ہے یہ بارش کے بعد کا خوبصورت اختتام ہوا..... لیکن تھوڑی اداس بھی کہ اتنا اچھا ناول جلدی ختم ہو گیا۔ باتونی افسانہ بھی مزے کا تھا۔ خام خیالی افسانہ خام خیالی سا ہی لگا۔

ناولٹ دونوں ہی اچھے تھے۔ کہانیاں زندگی کی بھی اچھی تھیں۔ باورچی خانے میں جا کر تو بھوک لگنے لگتی ہے۔ رنگ خیال اور خود کلامی میں بھی سارے انتخاب اچھے تھے۔ کشائش بھی ہمیشہ کی طرح اچھی کہانیاں لائیں۔ لوجی..... ریشم تو سارا پڑھ لیا..... اب اندھیرا بہت ہو گیا ہے۔ مزید لکھنا نہیں جا رہا اب اجازت دیجئے۔ سب کو بڑی عید بہت بہت مبارک ہو۔ خدا سب ریشمی بہن بھائیوں کو خوش رکھے اور ریشم کو بہت ساری ترقی دے (آمین)

☆☆☆

فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

ڈیر بشری!

السلام علیکم:

اکتوبر کا سالگرہ نمبر ملا ریشم کو سالگرہ ہے حد مبارک ہو۔ تمام دوستوں اور قارئین کو بے حد سلام اور دعا نعت رسول مقبول اور حمد پڑھ کر دی سکون ملا اس مرتبہ ہمیشہ کی طرح افسانے اور ناول بہترین لگے۔ خاص کر ایں امتیاز صاحب کا افسانہ کا مٹی منفرد تحریر لگی۔ ویلڈن امتیاز صاحب ایسے ہی لکھتے رہو۔

دوسرے نمبر پر کے کے رشتے نظارت نصر کا ناولٹ واہ کیا ناولٹ ہے پڑھ کر مڑا آ گیا خوش رہو۔ افسانہ خام خیالی صفیہ سکل کا بہترین تحریر لگی۔ بارش کے بعد کی آخری قسط پڑھی واہ عرفان راے جی یہ تو ہمارا فورٹ سلسلہ تھا ایسا ہی کوئی قسط وار ناول پھر سے شروع کریں۔ انجم انصار کا افسانہ پڑھ کر بے حد ہنسی آئی یہ تو ہماری بے حد فیورٹ رائٹر ہیں۔ روٹ ہمراہ کی کئی بہت محسوس ہوئی۔ عبد اللہ عرفان کی گرفت بھی سبق آموز تحریر تھی۔ مدیحہ عدنان، سباس گل اور رضوان قیوم کو ان کی تحریروں پر ایوارڈ مبارک ہو۔ ساحل اور پیٹوار، شہرے خواب، خلش بے حد اچھے لگے رنگ خیال میں نگینہ راشد کی غزل بہت ہی زیادہ اچھی لگی۔ سناہ علی، مجید احمد جانی، نگہت اکرم، ہما شاہ، محمد حسن نظامی، تمثیلہ لطیف، محمد اسلم، جاوید مرزا شبیر اور سب کی شاعری بھی بے حد اچھی تھی۔ خود کلامی میں سب کے اشعار پسند آئے۔ اداکار علاؤ الدین کا انٹرویو اچھا لگا۔

کشائش مسرور بے حد اچھا لکھ رہی ہے اسے بے حد پیار۔ آپ کے اوراق میں سب کی تحریریں الا جواب تھیں۔ شائستہ ساجد بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں بے حد دعا اور سلام پیچھے ماہ میں تبصرہ نہ کر سکی ڈاکٹر طارق محمود کا افسانہ بے حد پسند آیا تھا۔ بھائی میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں بس کبھی کبھی لکھنا بھول جاتی ہوں آپ بہن بھائیوں کی وجہ ہی سے تو میری لکھنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ آپ کو بے حد دعا اور سلام..... راشد ترین بھائی تصویر میں بہت بینڈ سم لگ رہے ہو اللہ نظر بد سے بچائے۔

سب کو دعا اور سلام سب کے تبصرے پسند آئے ریشمی رائٹرز کے تعارف اور ریشمی ستارے۔ سالگرہ سروے سب بہت ہی اچھا لگا واہ ریشم جی شکریہ۔ فیصیحہ جی کیسی ہیں۔ شائستہ جی اور فوزیہ جی سباس گل، غزالہ جی دعا اور سلام تمثیلہ لطیف آپ کی والدہ کی وفات کا بے حد دکھ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس عطا کرے۔ (آمین)

☆☆☆

ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ 0335-4669590

بیاری آپی بشری مسرور صاحبہ!

آداب:

امید ہے کہ آپ ہنس بھی رہی ہوں گی اور مسکرا بھی رہی ہوں گی۔ دعا ہے آپ ہمیشہ خوش و خرم رہیں۔ کوئی غم کوئی پریشانی بھول کر بھی آپ کے دروازے پر دستک نہ دے۔ (آمین تم آمین)

اکتوبر 2012ء کا ریشم گیارہ تاریخ کو ملا میں سوچ ہی رہا تھا کہ پتہ نہیں مجھے ریشم کب ملے گا۔ مجھے بڑی شدت سے ریشم کا انتظار تھا۔ کیونکہ میرے بھائی ملک عاشق حسین ساجد نے مجھے میری سنووری گلے کی مبارکباد دی تھی میں نے کہا کہ مجھے تو ابھی تک ریشم ملا ہی نہیں بعد میں ایم ارشد وفا نے بھی مجھے کال کر کے مبارکباد دی۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی ریشم کو دیکھنے کی۔ آخر گیارہ اکتوبر کو پوسٹ میں نے میری شاپ کے سامنے آنکراپنا سائیکل کھڑا کیا۔ تو مجھے ایک دم پتہ چل گیا کہ یہ ضرور ریشم لے کر آیا ہے۔

اس نے مجھے ریشم والا پیکیٹ پکڑا یا اور پیڈل مارتا ہوا۔ ہوا ہو گیا۔ میں نے جلدی جلدی لفافے کے پرچے اڑا کر ریشم کو بند لفافے سے باہر نکالا پتہ نہیں کب سے ریشم بے چارہ مجھ سے ملنے کو بے تاب ہوگا۔

ریشم پر نگاہ پڑتے ہی دل خوش باش ہو گیا۔ کیونکہ ایک مغرور حسینہ بڑی ہی قاتلانہ نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی اور بڑی خوبصورت ساڑھی باندھے ریشم کی سالگرہ کے لیے ایک سجائے اور پانچ بڑی بڑی موم بتیاں جلائے ریشم کو پسینہ برہے ڈے تو ریشم کہہ رہی تھی۔ پھر فیس فریش، کیئر کریم لگاتے اور اپنا رنگ گورا کر تے کرتے شمع کو کنگ آئل، نعت، بنا سستی میں کھانا پکا کر کھایا اور پھر ایک لیٹر پٹرول لیا اور پھر آگے چل پڑے اور ہمدردی کے سہاگین کھسا کر گلے کو صاف کیا اور آپنی کے ادارہ کو پڑھا اور آپنی کے ساتھ مل کر ریشم کی سالگرہ منائی اور دعا کی کہ ریشم زیادہ سے زیادہ ترقی کرے اور ہم ہر سال اکتوبر کے مہینے میں ریشم کی سالگرہ منائیں۔ پھر کبھی کہانیوں پر نگاہ دوڑائی۔ اور سب سے پہلے اپنی کہانی پڑھی پھر زرجس افروز کی حمد باری تعالیٰ، محمد اعظم کی نعت رسول مقبول۔ سید افتخار حسین نے دین اور دنیا میں آنحضرت ﷺ کے اوصاف و اخلاق احادیث کی روشنی میں بیان کیے یہ وہ ہستی ہے جس کے بارے میں جتنا لکھا جائے اتنا کم ہے۔ سالگرہ سروے میں کافی ساری ہستیاں دیکھنے کو ملیں اور ان کے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی اور ریشم ستارے بھی جگمگاتے نظر آئے۔

حورین حسن کا تعارف بہت ہی دل چسپ تھا۔ بڑے بڑے عظیم رانٹروں کا دیدار ہوا جن میں ملک عاشق حسین ساجد، محمد حسن نظامی، عطیہ زاہرہ، سلیم اختر، غنیمت علی شامدے ملاقات کے بعد محمد عرفان رائے کے سلسلے وار ناول بارش کے بعد کی میں نے آخری قسط نہیں پڑھی کیونکہ میں نے ستمبر میں تو ریشم شروع کیا ہے پڑھنا اس لیے آخری قسط پڑھنا تو کچھ بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔

صفیہ جل شاہ کی خام خیالی، اے پگل لڑکی اگر باپ کے ہوتے ہوئے اس کی کچھ خدمت کر لیتی تو آج تم کو پہچنتا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ والدین ہمیشہ اسے بچوں کے لیے بہتر سوچتے ہیں ماں باپ کا سایہ ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہوتا ہے۔ نظارت نصر کا ناول کچھ پتلے رشتے اچھی تحریر تھی۔

ایس اتیار کی تحریر کا منی، بڑا ہی مزا آیا کا منی سنووری پڑھ کر۔ واقعی صحیح کہتے ہیں کہ پیار کبھی مرتا نہیں، مرتے ہیں انسان مرتے ہیں انسان۔

محمد حسن نظامی کی تحریر ساحل اور پتواری۔ صابر اور ریشم کا پیار سا تھا یہ چاہنا اور چاہے جانا کا تصور بڑا ہی عجیب ہوتا ہے۔ ریاض احمد جسٹس کی تحریر سنہرے خواب، جمیل نے واقعی یہ ثابت کر دیا کہ وہ سیرت سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ جمیل نے جو کچھ کیا سیرت کی محبت کی خاطر کیا سیرت کے خاندان کا علاج کر دیا۔

سہرینا خان کا ناول خلش، شایان اگر اپنے والدین کی بات مان لیتا تو اسے بعد میں پہچنتا نہ پڑتا۔ کبھی کبھی جلد بازی میں کیے گئے فیصلے انسان کے لیے زندگی بھر کا روگ بن جاتے ہیں ویسے شایان کے لیے آملین ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔

پاکستان کے پہلے عوامی اداکار علاؤ الدین کے بارے میں کافی ساری معلومات ملیں۔ ریشم کا باورچی خانہ میں کچے کیلے کے لذیذ کباب، قلم بھرے کر لیلے، انالین پستہ حیدر آبادی ڈش، کھانیں بڑے ہی مزیدار پکوانے تھے۔

یسری اکرم کا پیش کیا ہوا امر و دکھایا جو کہ بڑا ہی مزیدار تھا۔ کافی بیماری ختم ہوئی جو کہ لگی ہوئی تھی۔
ریشمی سندھیے میں میرے روٹھے ہوئے دوست محمد خان انجم کی تحریر اچھی تھی۔ زر پرستوں کے نام، ایم ارشاد وفا،
ملک عاشق حسین ساجد، مجید احمد جانی سب نے بڑے اچھے سندھیے بھیجے۔ ثار احمد حسرت اب ابھی جاؤریشم میں ہم سب
آپ کے منتظر ہیں۔

فرح طاہر قریشی سے ملاقات کی اچھی لگا۔

خود کلامی میں، امبر عامر کا شعر انعامی قرار دیا گیا! امبر جی مبارکباد ہوں۔ شائستہ ساجد، سہاس گل، محمد فائز، حنا
عروج، صائقہ فیصل ان سب نے خوب خود کلامی کی۔ آپ کے اوراق، بیوٹی ٹیس، رنگ خیال میں راشد ترین کی تصویر
دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

بانی سب کا اچھے ہیں اجازت دیں۔



مبشر حسن، ہیڈ بکاشی 0312-6401351

سویت بشری باجی!

السلام علیکم:

اس بار ریشم 12 اکتوبر کو ملا تھا اس لیے خط لکھنے میں لیٹ ہو گیا۔ مائل پر سرسری نظر ڈالی حسینہ بہت خوبصورت تھی۔
اس کے بعد دین اور دنیا پڑھا اور پھر اپنی محفل ریشمی دستک میں آ گئے۔ کرسی صدارت پر اس بار نعیم رضا بھیجی کو بیٹھے ہوئے
دیکھا تو دل نے کہا کہ ہائے بھی مبشر تیرا نمبر بھی لگتا خیر اللہ مالک ہے کوشش میں تو ہیں اللہ بہتر کرے گا۔ انشاء اللہ اس کے
بعد اپنا خط دیکھا تو دل باغ باغ ہو گیا اور ریشم کے لیے یہ بات دل سے نکلی جیسے فریدہ فری غزل میں کہتی ہے۔

میرے دل کے آئینے میں بھی جھانک کر بھی دیکھو

ایک تم ہی جلوہ گر ہو ریشم میگزین دیکھنے تو آؤ

فریدہ فری سے معافی کے ساتھ۔ اس کے بعد راشد ترین صاحب کا تبصرہ نہیں تھا چلو خیر اگلے نومبر کے شمارے میں
ترین بھائی لازمی لکھنا۔

خاور شہزاد جان کیسے ہو بھائی! کبھی ایس ایس کا جواب دے دیا کرو مگر بانی ہوگی اور جب ہمارے آگے سے گزرو
تو پلیز مسکرا دیا کرو ہم آپ کے راستے میں اس بے کھڑے ہوتے ہیں کہ آپ کی مسکراہٹ دیکھ سکیں۔

امین مراد بھائی آپ ریشم میں شرکت کرتے ہیں بہت اچھا لگتا ہے۔

معاویہ عمر صاحب کیسے ہیں مزاج ٹھیک ہیں وٹیکم کہنے کا شکر یہ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ (آمین)

شائستہ ساجد آپ کا تھک چکا تھا خوش ہوئی ہم تو سمجھے تھے کہ آپ کو کچھ زیادہ ہی چوٹ لگی ہے چلو اللہ خیر کرے اپنے
تبصرے کو یقینی بنا میں اچھا آتی ہیں۔

فہیمہ آصف جی کیسی ہیں۔ ٹھیک ہیں چلو ٹھیک رہیں، ہمیں یاد کیا اپنی تحریر میں جگہ دی تھیں کس خوش رہیں۔ کبھی کبھی یاد
کر لیتی ہیں اچھا لگتا ہے ضرور لکھا کریں اچھا آتی ہیں ویلڈن اینڈ گڈ

باقی ریشمی ستاروں کو دیکھا ان کے بارے میں پڑھا بہت ہی اچھا لگا کہ بڑے لوگ بھی ادب سے محبت رکھتے ہیں
اور ریشم پڑھتے ہیں۔ واقعی ریشم ایک بہترین ڈائجسٹ ہے اور اس دور میں محبت کا بڑا ذریعہ ہے۔ ویلڈن ریشم ویلڈن اللہ
اس کو بہت ترقی دے۔ (آمین) ہماری دعا اس کے ساتھ ہے اور نیک خواہشات بھی۔ معیاری لوگ معیاری
میگزین ہوتے ہیں۔

کہانیوں میں حسن نظامی صاحب کی سائل اور پتوار اور سنہرے خواب اچھی لگیں مختصر میں معاویہ وٹو صاحب کی تحریر اچھی
تھی۔ ویلڈن

رنگ خیال میں ترین صاحب کی خوبصورت تصویر دیکھ کر اچھا لگا۔ نعیم رضا فریدہ فری اور نگینہ راشد کی غزلیں بھی اچھی

گلیں۔

باتیں صحت کی اچھا سلسلہ سے اس بند نہیں ہونا چاہیے۔
الف سے اچھے ب سے بچے بھی اچھا تھا میری بیٹی اسے شوق سے پڑھتی ہے۔ باقی تراش خراش بھی گڈ تھی ویری گڈ
تمام صاف کی محنت اور لکھن سے یہ معیاری پر چر شاخ ہوتا ہے ان کو سلام ان کی محنت کو بھی سلام۔
☆☆☆

مار یہ ملک، لاہور مانگا منڈی

پیاری باجی بشری!

السلام علیکم:

ریشم میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں امید کرتی ہوں کہ مجھے ضرور ویلکم کہا جائے گا۔ ریشم کو میں نے ایک دوست
کے گھر دیکھا پڑھا بہت ہی معیاری پرچہ ہے اور گھر میں پڑھے جانے کے قابل ہے۔ تمام ٹیم کو میری طرف سے ویلڈن
..... مختصر خط لکھ رہی ہوں اگر شائع ہو گیا تو اگلی مرتبہ تفصیل سے لکھوں گی۔ باجی میں اپنی کہانیاں اور شاعری آپ کو کہتی ہوں
گی امید ہے آپ مجھے نا امید نہیں کریں گی۔ (شکریہ)

☆☆☆

شہزاد خاور، مظفر گڑھ

محترمہ بشری مسرور صاحبہ!

محترم محمد عرفان رائے صاحب!

السلام علیکم: امید ہے ادارہ ریشم اور قارئین ریشم بالکل خیریت سے ہوں گے۔

دین اور دنیا ایک بہت اچھا سلسلہ ہے۔ جس میں ہمیں دین کے بارے میں بہت معلومات ملتی ہیں۔ یہ سب سید
افتخار حسین صاحب کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ نعیم رضا بھی صاحب مبارکباد قبول کریں۔
ایم ارشد وفا صاحب کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ اشفاق بٹ صاحب کی ویلکم انٹری بہت اچھی لگی۔ جی
آیاں نوں جناب!

ملک عاشق حسین ساجد صاحب آپ کے افسانے کا بے چینی سے انتظار ہے۔

محترمہ جمیلہ لطیف صاحبہ آپ کی والدہ کے انتقال کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے۔

(آمین)

محترمہ فیضی آصف خان صاحبہ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ساگدہ سروے میں تمام سیاستدانوں، اداکاروں کے
انٹرویوز بہت اچھے لگے۔

ریشمی رائٹرز کا تعارف ایک بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اسے چلتے رہنا چاہیے۔ نظارت نصر کی تحریر کچے کچے رشتے بہت
اچھی لگی۔ دل کر رہا ہے کہ اسے بار بار پڑھوں۔ ویلڈن

اکبر نواز حسن صاحب کوئی رابطہ نہیں ہے کہاں غائب ہو گئے ہیں جناب؟

ناٹل پر گلے کیک کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے میرے سامنے ٹیبل پر رکھا ہے۔ لیکن کیا کروں کھایا نہیں جا رہا۔ وہ
کیا کہتے ہیں، ہاں یاد آیا انکور کھتے ہیں۔ میری طرف سے تمام رائٹرز قارئین ریشم کو بکرا عید مبارک ہو۔

آخر میں تمام دوستوں کا بے حد مشکور ہوں۔ جو میرے کزن کی وفات پر میرے ساتھ رابطے میں رہے۔

اللہ تعالیٰ ہم پر ہمارے والدین کا سایہ تا زندگی قائم رکھے۔ جہاں رہیں خوش و خرم رہیں۔ زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ

حاضر ہی یقینی ہوگی۔

☆☆☆

محمد حسن نظامی، قبولہ شریف
قابل قدر بہنا! خلوص پیکر!!

سلام مسنون!

امید ہے مزاج گرامی خیر و عافیت ہوں گے۔ ساحل اور پتوار ”روی کاغذ“ اور تقدیر کے بعد سلسلہ حاضر خدمت ہے۔
جعلی اور نام نہاد پیروں کے موضوع پر لکھی جانے والی یہ تحریر طمانچہ ہے معاشرے کے ایسے لوگوں کے منہ پر جو دولت
کی ہوس پستی پر ایسا راستہ اپنا کر سادہ لوح لوگوں کو بھرتی کرتے ہوئے خود ملک عدم سدھار جاتے ہیں اور نئے آسے
والے اس ”سلسلہ“ کو نئے انداز سے آگے بڑھا کر اپنے آپ کو دوزخ کا ایندھن بنانے لگتے ہیں۔
تحریر پسند آئے اور معیاری ہو تو ریشم کے ریشمی اور انمول صفحات کی جلد زینت ضرور بنانا۔

☆☆☆

فصیح آصف خان، ملتان

ذیہ بشری آلی!

السلام علیکم: خوش رہیں:

مزاج بخیر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں کے سبب بہت بہتر حالت میں ہوں۔ ریشم کا
ساگر نمبر قدرے دیر سے ملا، تاہم وقت نکال کر مطالعہ کرتی رہی، یوں کچھ نہ کچھ تبصرہ کرنے کے قابل ہو سکی۔
سورق سوائے ماڈل کے بہتر ہیں لگا۔ ”فیس بیوٹی“ دکھائی نہ دی۔ بہت گھبرنے اور دیکھنے کے باوجود بھی تاہم لباس
کا رنگ پسند آیا، کیک کی مہک بھی دلفریب رہی، کینیڈل نے خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ حمد و لغت کی پالیزہ و روحانی محفل
میں دل انک گیا۔ گستاخان رسولؐ کے لئے دل سے بدعانتی ہے۔ ان کا ذکر تو اللہ پاک نے بلند ترین رکھا ہے، ہمیں
زیادہ سے زیادہ درود پاک کا ورد کر کے اس محبت میں اضافہ کرنا چاہیے جنہیں ہم ساری دنیا سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں،
اللہ پاک ہم سب کا خاتمہ ایمان کے ساتھ فرمائے۔ (آمین)
پھر گلہائے رنگ و بو بھیرتی ریشمی دستک کی محفل میں داخل ہوئے۔ نعیم بھٹی کو ایوارڈ مبارک ہو۔ غضنفر بھائی کی
ناسازی طبع کا انہی کی زبانی علم ہوا، اللہ علی صحت عطا فرمائے آمین۔ تاکہ ان کی مسلسل حاضری لگتی رہے۔ وٹو بھائی، معاو
عزیز، مجید جانی، ڈاکٹر طارق محمود، ملک ساجد، مشر حسن، حسن نظامی سبھی نے اپنے اپنے خوبصورت انداز میں شرکت کی بہا
شاہ اور شائستہ ساجد بھی نمایاں رہیں، غیر حاضر رہنے والوں کو جرمانہ لگانے، پیچھے یاد رکھنے اور تحریر پسند کرنے کا سبب
شکریہ۔

ساگر نمبر کے حوالے سے خصوصی سروے مع تصاویر جاندار رہا۔ سوال بھی منفرد اور جواب بھی دلچسپ رہے، ریشمی
ستارے بشری باجی نے فردا فردا سب کا مختصر مگر بے انتہا محبت سے تعارف کرایا۔ یہ اچھی کاوش جی جان سے پسند آئی۔ یہ
سب وہ ستارے ہیں جن کی بدولت ریشم دک رہا ہے۔ اللہ سب ستارے روشن و جاوداں رکھے۔ (آمین)
تھارہ کی دنیا کی سیر کرتے ہوئے سب سے پہلے ”ایم اشفاق بٹ“ کا ساگر نمبر پڑھا۔ محبت میں جدائی قیام سے
سے بڑھ کر نہیں، متیق اور راشدہ نے اپنی جی محبت کو پالیا۔ یہ صرف دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا پھل ہے۔ اچھی تحریر
رہی۔ بارش کے بعد اپنی مخصوص مہک چھوڑ گیا۔ عرصہ دراز تک عرفان بھائی کی تحریر یاد رہے گی۔ ریشمی رائٹر کا احوال بہت
کم نکھاری شامل کیے گئے۔ باجی نگہت غفار کو اللہ صحت کا ملہ عطا فرمائے (آمین) سعدیہ رئیس کی باتونی اذبان کے انشاء کو
واضح کر گئی۔ ”خام خیالی“ بے وقوف لڑکی کو سمجھ و عقل تب آئی جب باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ صفیہ کا مہاب رہیں اپنا نقطہ نظر
واضح کرنے میں۔ کچھ بچے ریشم نظارت نصر نے خوب لکھا۔ پیشین گوئی بھی مزادے تھی۔ محترمہ انجم انصار صاحبہ کی آمد
بہار کے جمونے کی مانند رہی۔ ان کے خاکے بھی ہر ماہ شائع کئے جائیں۔ ایس امتیاز کی کامنی نے بہت افسردہ کیا بھرم محل
جانے تو بہت تکلیف دیتا ہے۔ بابو نے لاج رکھی۔ محبت کرنے والوں کے دل بہت وسیع ہوتے ہیں۔ گرفت، ساحل اور
پتوار، سہرے خواب، خلش، منفرد موضوعات کی اعلیٰ تحریر رہیں۔

مختصر کہانیاں بھی اپنی جانب راغب کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ربیم رفیق کو صحت والی لمبی عمر خفزی عطا فرمائے۔ (آمین)
آپ کے روبرو میں پیاری بہن فرح طاہرہ کا احوال انہی کی طرح سچا اور کھرا لگا۔ فرح نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی
ہے۔ اللہ اسے ترقی عطا فرمائے۔ خود کامی کے اشعار پسند آئے۔

بھائی راشد ترین کو رنگ خیال میں مع تصویر کے دیکھ کر اچھا لگا، وہ نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ بہت اچھے انسان بھی
ہیں۔ ان کی صحت کے لئے بے شمار دعائیں۔ سب بہن بھائیوں خاص طور پر سعدیہ بہا، تمثیلہ لطیف، فریدہ فری، نگینہ راشد،
اکبر نواز، ہما شاہ اور افضل عاجز کی شاعری نے دل موہ لیا۔ بچوں کے صفحات کشائش کو مبارکباد دینا دراصل اس کی حوصلہ
افزائی کرنا ہے۔ جس طرح وہ ترتیب دیتی ہیں ان کے اندر اچھا لکھاری اور ایڈیٹر بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود لگتی
ہے۔

اللہ پاک مزید عروج نصیب فرمائے۔ (آمین) عید قربان کی آمد آمد ہے۔ آپ سب کو مبارک ہو۔
(☆ خیر مبارک! اپنا خیال رکھا کرو، تمہاری صحت کے لیے بے شمار دعائیں)

☆☆☆

ملک عاشق حسین ساجد، ہیڈ بکائی ضلع مظفر گڑھ

محترمہ حاجی بشری مسرور صاحبہ!

محترمہ محمد عرفان اسے صاحب!

السلام علیکم! اس بار ستمبر کا سالگرہ نمبر ریشم کا اپنی مثال آپ تھا۔ سچی سلسلے لا جواب تھے۔ مگر افسانوں کے مصنفین کے
نام باریک اور ایڈریس سے صاف تھے۔ معلوم نہیں بورہا تھا کہ فلاں رائٹر کہاں سے تعلق رکھنے والا ہے اور تحریر کے حوالے
سے مفید مشورے اور آراء براہ راست کیسے دینے جائیں۔ مرضی ہے آپ کی۔

بہر حال اشفاق بٹ کی کاوش سالگرہ کے نام سے زبردست تھی۔ مبارکباد قبول کریں اشفاق بٹ صاحب اس طرح
معیاری تحریروں کے ساتھ آتے رہا کریں۔ اس بار ”رُوت بھرا ہے“ کو ناپا کر بہت اداس ہوا۔ کیونکہ مجھ جیسے بے شمار
پرستار محترمہ بشری مسرور صاحبہ کے ہلکے پھلکے شگفتہ انداز پر مبنی سفر نامہ پڑھنے سے محروم رہے۔ ایک کمی کا شدت سے
احساس ہوا۔

ریشم کے رائٹر اور قارئین کے تعارف کا سلسلہ بھی خوب رہا۔ بہت کچھ معلومات میں اضافہ ہوا۔ مگر بات وہی کہ کیا
ہی اچھا ہوتا کہ ان تعارف کے ساتھ پوئل اڈریس اور موبائل نمبر بھی شائع کئے جاتے۔

ریشم کی سالانہ تقریب کا حتمی اعلان نہ پا کر دل بچھ سا گیا۔ گرمیوں سے توجہ جھڑپا لیا مگر اب سخت سردیوں کا بہانہ
شاید آڑے آ جائے۔ میری ناقص رائے کے مطابق تو اکتوبر کا موسم خوب رہے گا۔ (☆ ریشم رائٹرز ملن تقریبات پہلے بھی
دو بار ہو چکی ہیں اس سلسلے میں بہانے کرنا ہماری عادت نہیں) طنز و مزاح پر مبنی شگفتہ تحریر مجھ سے نہیں لکھی جانی اور نہ ہی
میرے مزاج میں ہے۔ البتہ پڑھنے کی بات کچھ اور ہے۔

عورتوں کے حقوق اور معاشرے میں اس کے ساتھ کی جانے والی نا انصافیوں اور زیادتیوں کے ساتھ مختلف مظالم پر
لکھنا میری فطرت میں شامل ہے اور کمزوری بھی۔

معاشرے میں عورت کی اٹھنی مظالم اور زیادتیوں پر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جس کا اظہار میں اپنے قلم کے
ذریعے کرتا رہتا ہوں۔

کیونکہ عورت کے مختلف روپ اور رشتے ہیں اور ہر رشتہ مقدس ہوتا ہے۔ کاش کہ ہم سب اس کے حقوق صحیح معنوں
میں پورے کر سکیں اور اپنی زندگی میں اس مقدس روپ کو دل سے تسلیم بھی کر سکیں۔ ہر مرد کی کامیابی اور ناکامی میں انسان
کی ذات سے وابستہ عورت کا کردار ہوتا ہے۔ تو اس کی دل سے قدر کرنا سیکھیں میری کاوش ”نقص خزاں“ آپ کی توجہ کی
طلب گار آپ کے پاس پڑی ہے ہو سکے تو شائع کر دیں۔ تاکہ میں مذید کوئی اور تحریر لکھ کر وار سال کر سکوں۔ (شکریہ)

☆☆☆

محمد سدید اعوان، بنوں کینٹ

پاری باجی!

السلام علیکم: امید ہے کہ آپ کے مزاج اچھے ہوں گے اور آپ کی خیریت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں۔
میں نے سنواری لکھ دی ہے۔ اس میں غلطیاں بہت ہوں گی۔ باقی سنا ہے کہ آپ نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تو آپ کو میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔
پلیز اگر آپ کو میری بھجوائی گئی سنواری پسند آئی اور شائع ہوئی ہے تو مجھے ضرور بتا دینا۔ تاکہ میری حوصلہ افزائی ہو اور میں مزید اور کہانیاں لکھ سکوں۔

باقی یہ جو کہانی میں نے لکھی ہے۔ یہ ہمارے گاؤں کی ہے اور یہ سب واقع میری آنکھوں دیکھا ہے۔

اس میں میں نے جو نام اور جگہ لکھی ہے وہ سب فرضی ہیں اس لیے یہی نام رہنے دیں۔

میری شادی کو سا تو اس سال شروع ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

اس لیے آپ ہمارے لیے دعا کرنا۔

(☆ اچھے سدید اعوان! آپ کی کہانی شامل اشاعت ہے۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے آئندہ بھی لکھتے رہیے گا)

☆☆☆

انتظار حسین ساقی، تندلیا نوالہ فیصل آباد 0300-6012594

ڈیز آئی بشری مسرور صاحبہ!

سب سے پہلے نہایت ادب و احترام کے ساتھ اور عقیدت کے ساتھ، ڈیز آئی بشری مسرور صاحبہ دل کی باتال گہرائی سے اس ناچیز کا سلام قبول فرمائیں۔ میں ریشم کا نیا قاری اور راسخ ہوں۔ ریشم کی باتیں، ریشم کے چرچے اور ریشم کی شہرت تو اکثر کانوں میں رس گھولتی رہتی ہیں مگر ریشم بہت کوشش اور محنت کے بعد مجھے ملا۔ میرے شہر تاندلیا نوالہ سے تو ریشم ملتا ہی نہیں ہے۔ نجائے نئی بار پوک گھنٹہ گھر سے پتا کیا مگر مایوسی اور نہ امید کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ میرے بہت سارے دوست روز ریشم کی باتیں کرتے ہیں۔ تو میرا دل بہت بے چین سا ہو جاتا ہے۔ مجھے اس وقت اور بھی بہت شوق ہوتا جب میرے دوست مجھے فون پر بتاتے کہ اس بار ریشم میں میری غزل آئی ہے میرا شعر آیا ہے، میرا ریشم سندیسہ آیا ہے۔ میرا دل اس وقت بہت بے چین سا ہوتا۔ میں اپنے دل میں سوچتا کہ نجائے کب ریشم میرے پاس بھی ہوگا اور میری تحریں بھی ریشم کی زینت ہوں گی اور پھر اک دن سا بیوال شہر سے میرے بہت پیارے دوست ملازم حسین چمن اور عنبر وٹو نے مجھے ریشم گفت کے طور پر ارسال کیا۔ گفت بہت اچھا اور خوبصورت تھا۔ تانتیل اتنا خوبصورت اور دلکش تھا کہ دل میں اترتا چلا گیا۔ ریشم کا سالگرہ نمبر تھا۔ سالگرہ نمبر میں شامل تو نہ ہو۔ کا مگر میری طرف سے سالگرہ نمبر مبارک ہو۔ سالگرہ نمبر دیکھا جہاں یہ بہت خوشی ہوئی وہاں یہ سالگرہ ایک دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ دل میں یہ خواہش بھی جاگ اٹھی کہ کاش کبھی ہم بھی اس کیک کو اپنے ہاتھوں سے کاٹتے۔ مگر ہماری اتنی اچھی قسمت کہاں۔

آئی بشری مسرور صاحبہ! ویسے کتنا اچھا ہو اگر ریشم کی سالگرہ ہو اور تمام ریشمی ٹیم ہو۔ شاعر ہوں، راسخ ہوں، قاری ہوں اور پھر سب کی آنکھوں کے سامنے آپ ریشمی کیک کاٹیں اور ہم سب تالیاں بجا رہے ہوں، کتنا اچھا ہو۔ وہ یادگار لمحے زندگی بھر کے لیے امر ہو جائیں۔ یہاں پہ اک اور مزے کی بات کرنا چاہتا ہوں اگر ٹائٹل پہ کھڑی ماڈل سالگرہ کا کیک کاٹ رہی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ سچ ہی کہتے ہیں دیر آید درست آید مجھے ریشم دیر سے ملا مگر خوشی اس بات کی ہے کہ مجھے ایک خاص نمبر ملا۔ میڈم صاحبہ ریشم کے سارے سلسلے بہت اچھے ہیں۔ خاص کر آپ کا سفر نامہ کیا بات ہے، آپ کے سفر نامے کی۔ ریشمی دستک، لغت شریف، دین کی باتیں، افسانے، ناول، سنواریاں، رنگ خیال، ریشمی سندیسے اور خود کا نامی بہت اچھے سلسلے میں خود کا نامی کے صفحات اگر زیادہ کر دیں تو بہت اچھا ہوگا اور ہر دفعہ شمارے میں پہلے بتا دیا کریں کہ "اگلے شمارے میں، خود کلامی، میں کونسا لفظ ہوگا۔ جس پہ تمام قارئین اپنے اپنے اشعار ارسال کریں گے۔ راسخ کا تعارف بھی بہت اچھا سلسلہ ہے اور ساتھ میں تصویر یہ تو اور بھی اچھی بات ہے بس اک کی محسوس ہوتی ہے، افسانہ، سنواری

ناول کے ساتھ رائٹر کا نام تو ہوتا ہے مگر شہر کا نام نہیں ہوتا۔

اگر ایسا ہو جائے تو اک قاری اور رائٹرز کے درمیان ایسا رشتہ بہت جلدی بن جائے گا۔ جس کو ادبی دنیا میں حوصلہ افزائی کہتے ہیں۔ امید ہے آپ ضرور میری اس تجویز پر غور کریں گی، اب آتا ہوں کچھ جان سے پیارے دوستوں کی طرف جن کی وجہ سے آج میں ریشم کی محفل میں شرکت کر رہا ہوں۔ مگر مجھے ان دوستوں سے گلے شکوے بھی کرنے ہیں۔ کیونکہ شکوے شکایتیں اپنوں سے ہی کی جاتی ہیں غیروں سے نہیں۔ میرے تمام دوست میری سانس ہیں، اور انسان اپنے دوستوں سے اپنی سانسوں سے کب دور رہ سکتا ہے۔ سب سے پہلے مجید احمد جانی، بھائی جان آپ نے تو ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ آپ نے منزل کے قریب آ کر چھوڑ دیا ارے ریشم نے آپ کو ایوارڈ کیا دے دیا.....؟ آپ تو ہمارا نام بھی بھول گئے ہیں۔ میری طرف سے آپ کو بھی بہت مبارک ہو۔ ریشمی دستک پہ انعام ملنے پر۔

پیارے بھائی ملک عاشق حسین ساجد صاحب آپ سے مجھے کوئی گلہ نہیں ہے کیونکہ آپ اور ملازم حسین چمن اور غبروؤ کی محبت ہی مجھے ریشم کی دلیلیز پرانی ہے۔ ساجد بھائی آپ کی تحریریں دل کو اچھی لگتی ہیں۔ نظر آتے رہا کریں۔ اشفاق بٹ صاحب آپ کو ریشمی سالگرہ مبارک ہو، بہت خوش ہوئی آپ کا نام دیکھ کر اور اس سے زیادہ خوشی آپ کی سنواری پڑھ کر ہوئی۔ ایم ارشد وفا صاحب ارے جناب جی!! آپ تو میرے بغیر کا غنڈہم کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے۔ پھر آپ مجھے بتائے بغیر ریشم کی بزم میں آ گئے اور آتے ہی، انعام حاصل کر لیا۔ واہ جی واہ..... مبارک ہو آپ کو۔ اگر اسی طرح شکوے کرتا رہا تو یہ اک لمبی داستان کی شکل اختیار کر لیں گے، میں اپنے تمام دوستوں کو جن کو جانتا ہوں اور جن کے لیے میں نیا ہوں مجید احمد جانی، ملک عاشق ساجد، محمد اشفاق بٹ، ایم ارشد وفا، اللہ دتہ بے درد، ایم اے راحت، ملازم حسین چمن، غبروؤ اور قابل احترام دوست اور بھائی جناب راشد ترین کو سلام پیش کرتا ہوں۔ دوست محمد وٹو صاحب کی کتاب پڑھی ہے اس دور میں اک اچھی کتاب ہے مبارک ہو۔ وٹو صاحب آپ ریشم کی محفل میں چمکتے ستارے ہیں۔ آبی بشری مسرور صاحبہ آپ کا ریشم اک مکمل رسالہ ہے۔ اس میں ہر قاری کے ذوق کے لیے سب کچھ موجود ہے دعا کرتا ہوں کہ ریشم خوب تر ترقی کرے۔ (آمین) باقی راشد ترین، عرفان رام، علی شیر، نعیم رضا بھٹی اور باقی تمام دوستوں سے امید کرتا ہوں کہ مجھے اپنی اس بزم میں ضرور ویکلم کریں گے۔ آبی جی میرا سیل نمبر ضرور شائع کرنا نوازش ہوگی۔ آخر میں جاتے جاتے اک شعر آپ کی اور ریشمی ٹیم کی نظر کرتا ہوں۔

ایک ہی دستک پہ وہ دروازہ نہیں کھولے گا
اسے معلوم جو ہے میں نے کھڑے رہنا ہے
☆☆☆

یہ تو تھے آپ سب کے خطوط و تبصرے.....

اگلے ماہ بشرط زندگی انہی صفحات پر دوبارہ ملاقات ہوگی۔ انشاء اللہ

فی امان اللہ

بے شمار چاہتوں کے ساتھ آپ سب کی

بشری مسرور

خطوط اور اپنی تحریریں ہمیں اس پتے پر ارسال کریں

Suite#1, 4th Floor,

12-Mian Chambers, 3-Temple Road, Lahore

جاوید شیخ آج بھی مقبول ہے



کئے ہوئے ہیں۔

جاوید شیخ کو بچپن ہی میں اداکار بننے کا شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بچپن ہی سے فلمیں دیکھنے کے بھی بہت شوقین تھے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اس بات کا تذکرہ بھی کیا تھا کہ ان کا شمار ان طالب علموں میں ہوتا تھا جو سکول سے بھاگ کر فلمیں دیکھنے جایا کرتے تھے، اس زمانے میں ٹیلی ویژن بھی نہ تھا مگر وہ ریڈیو سنا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے بچپن ہی سے اداکار بننے کا بھوت سوار رہا۔ جاوید شیخ نے اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے آڈیشن کے سلسلے میں بھی بہت دھکے کھائے مگر ہمت نہیں ہاری۔

فاطمہ ثریا بھجیا نے ایک ڈرامہ سیریل ”شع“ ٹیلی ویژن کے لئے تحریر کیا جس میں شع کا مرکزی کردار غزالہ کیفی نے ادا کیا جن کا پہلا تجربہ تھا اور جاوید شیخ کو اس سیریل کے ہیرو کے طور پر منتخب کیا گیا۔ بس یہی وہ وقت تھا جب قسمت نے جاوید شیخ کے کھاتے سے تمام ناکامیاں اور محرومیاں ختم کر کے کامیابیاں اور کامرانیوں لکھ دیں۔ اس سیریل نے بے پناہ شہرت حاصل کی اور

پاکستان کی فلمی صنعت آج جس صورتحال سے دو جا رہے اس میں بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آرہی ہے لیکن فلمی صنعت سے وابستہ چند لوگ اب بھی اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح یہ فلمی صنعت اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ جو لوگ اس مسائل سے دو جا رہے ہیں انہی میں ایک نام فلم ساز و اداکار اور ہدایت کار جاوید شیخ کا بھی ہے جو کافی حد تک اس صورتحال سے ناامید ہونے کے بجائے مسائل سے نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جاوید شیخ پاکستانی فلمی صنعت کا ایک ایسا روشن ستارہ ہے جس نے ہر شعبہ میں اپنی کارکردگی سے نمایاں مقام حاصل کیا۔

شو بزنس کی دنیا میں جہد مسلسل کے حوالے سے اگر کسی کا نام لیا جاتا ہے تو وہ جاوید شیخ ہیں۔ جنہوں نے شو بزنس کی دنیا میں قدم رکھ کر جس محنت اور جدوجہد سے اپنا نام اور مقام بنایا ہے اس کی مثال بہت مشکل سے ملتی ہے۔ جاوید شیخ آج ان فنکاروں میں شامل ہے جو پاک بھارت فلمی صنعت میں یکساں مقبولیت حاصل



جاوید شیخ کو جو شہرت اور مقبولیت درکار تھی وہ اس سیریل نے انہیں فراہم کر دی۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن ہی سے حسینہ معین کی ایک اور سیریل ”ان کہنی“ بھی دکھائی گئی اس میں بھی جاوید شیخ نے شاندار پرفارمنس کے ذریعہ فلمی صنعت کے ناخداؤں کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کے اوپر لگی ہوئی فلاپ ہیرو کی چھاپ کو ختم کر کے اسے ایک موقع اور دیں یوں مرحوم بدایینکار شباب کیرانوی نے جاوید شیخ کو اپنی نئی فلم ”کبھی الوداع نہ کہنا“ کے لئے سلیکٹ کر ہی لیا۔ شباب کیرانوی نے

جاوید شیخ کو کاسٹ کر کے جو رسک لیا تھا جاوید شیخ نے اپنی عمدہ پرفارمنس کے ذریعہ اس فیصلے کو بھی درست ثابت کر دکھایا اور ہمیشہ کے لئے فلمی صنعت میں اپنی جگہ بھی مستحکم کر لی۔

فلمی صنعت میں جو سفر جاوید شیخ نے فلم ”کبھی الوداع نہ کہنا“ سے شروع کیا تھا وہ آج بھی عمدگی سے جاری ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہ الٹی وڈ میں کم اور بالی وڈ میں زیادہ مصروف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لولی وڈ میں فلمی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہر حال وہ لولی وڈ کی فلمی صنعت کو پھر سے متحرک کرنے کی بھرپور کوشش میں لگے ہوئے ہیں شاید وہ اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل کر لیں۔ جاوید شیخ نے اپنے فلمی کیریئر میں کم و بیش 150 فلموں میں کام کیا ہے۔ انہوں نے یکسانیت کا شکار ہونے کے بجائے مختلف نوعیت کے کردار ادا کئے ہیں۔ جنہیں تماشاخیوں کی بھرپور پذیرائی بھی ملی ہے۔ بہت سی فلمیں ایسی ہیں جن میں انہوں نے کمال کی اداکاری کی ہے جن میں فلم ”لازوال“ اور ”جیوا“ کے نام سرفہرست ہیں ان فلموں میں انہوں نے اپنے مد مقابل سپر اسٹار ندیم کے سامنے

اتنی جاندار اداکاری کی کہ خود ندیم بھی انہیں شاباش دینے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی دیگر فلموں میں ”ہانگ کانگ کے شعلے، بوبی، کبھی الوداع نہ کہنا، شادی مگر آدھی، غریبوں کا بادشاہ، ہم ایک ہیں“ وغیرہ نے بھی باکس آفس پر زبردست شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ جاوید شیخ نے فلمی صنعت کو نہ صرف ایک اچھا اداکار دیا بلکہ ان کی شکل میں فلمی صنعت کو ایک اچھا فلم ساز اور کامیاب ہدایت کار بھی ملا جب ”مشکل، چیف صاحب، ایس باس“ اور ”یہ دل آپ کا ہوا“ جیسی فلمیں انہوں نے فلمی صنعت کو بحیثیت ہدایت کار دیں۔ حال ہی میں ان کی فلم ”کھلے آسمان کے نیچے“ پیش کی گئی جو بلاشبہ ایک بہترین کاوش کہی جائے گی۔ جاوید شیخ نے ہر قسم کے کرداروں میں عمدہ پرفارمنس دی ہے وہ ہیرو بھی آئے، جذباتی اداکاری میں بھی دکھائی دیئے اور ایکشن اور کامیڈی میں بھی کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مضمینی کرداروں میں بھی جان ڈالی ہے جیسا کہ بھارتی فلم ”جنت“ میں وہ ایک خطرناک ولن کے روپ میں دکھائی دیئے۔ جاوید شیخ جیسے سینئر اور تجربہ کار اداکار سے پاکستانی فلمی صنعت کو بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

☆.....☆.....☆

شوہر مصلحہ

ریشم رپورٹر: محمد طلحہ

نے ہی لکھی تھی جو ایک سرب فوجی اور ایک بوسنیائی خاتون کے عشق کے بارے میں ہے۔ اس فلم کو گولڈن گلوب ایوارڈ کے لیے نامزد کیے جانے کے علاوہ پروڈیوسرز گلڈ ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

کیسا غرور

ایک وقت تھا جب کرینا کپور کی ساری فلمیں فلاپ ہوتی تھیں۔ لیکن اس کے پاس فلموں کی کمی نہیں تھی فلاپ فلموں کی ہٹ ہیروئن کہلانے والی بے بوکو پچھلے دنوں اچانک احساس ہوا کہ اس کی چار فلموں 3 ایڈمٹس، ہاڈی گارڈ، گول مال 3 اور راوان نے سو کروڑ روپے سے زائد بزنس کیا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی اس نے ”پرچار“ کے لیے اپنے بندے پھیلا دیئے۔ اب بھلا کوئی اس سے پوچھے گی اس سو کروڑ روپے کمانے میں تمہارا کیا رول ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان چاروں فلموں میں کرینا کپور کا رول محض شو پیش سے

انجلینا جولی کی اگلی منزل؟

ہالی وڈ کی شہرہ آفاق اداکارہ انجلینا جولی بوسنیا کی مائے جنگی کے حوالے سے فلم بنانے کے بعد اب افغانستان کے بارے میں فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہی



ہیں، تاہم ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ وہ افغانستان کے بارے میں فلم کے اسکرپٹ پر کام کر رہی ہیں، تاہم فی الحال اس بارے میں کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکتیں کہ یہ فلم بنا پائیں گی یا نہیں.....؟ یاد رہے کہ 36 سالہ انجلینا جولی نے بطور ہدایت کارہ اپنے کیریئر کا آغاز ہونیا کے حوالے سے بنائی جانے والی فلم In the land of blood & honey سے کیا ہے۔ اس فلم کی ہدایت دینے کے علاوہ کہانی بھی خود انجلینا جولی



زیادہ نہیں تھا۔ پھر اتر اہٹ کیسی؟ کرینا کپور کو چاہیے کہ بڑے اشارے کے ساتھ کام کرنے کا شوق چھوڑ کر ایسے کردار کرے کہ جن میں فلم بین اس کے کردار کی تعریف کریں تاکہ اس کے ہیروز کی۔

نظر نہ لگ جائے کہیں

بے شک اکھڑ مزاجی میں ایلکتا کپور اور پوجا بھٹ ایک جیسی مانی جاتی ہوں لیکن ایلکتا کپور کا نام کئی اداکاراؤں کی زندگی بنانے والی شخصیت کے طور پر بھی لیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ ایلکتا کپور نے اپنی سالگرہ بڑی سادگی سے منائی۔ اس روز پہلے وہ بنو مان مندر گئیں۔ پھر سدھی مندر۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ صرف سالگرہ والے دن ہی بنگلوان کو یاد کرتی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتی ہیں تو دروازے پر پہلے سے ہی نوکر ہاتھ میں تھال لیے ان کی آرتی اتارنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی مرچیں ان کے سر سے پیر تک گھمائی جاتی ہیں تاکہ کسی کی نظر نہ لگے اور بلا میں ان سے دور رہیں۔ اب یہ اور بات کہ ان کے دوست انہیں خود کسی بلا سے کم نہیں سمجھتے۔

افواہ یا سچائی

کنگ خان کے لیے پریانکا کی پسندیدگی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں..... وہ گا بے بگا بے شاہ رخ کی فین ہونے کا اقرار کرتی رہی ہیں۔ اسی طرح شاہ رخ کی ذات بھی ماضی میں ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر رہی ہے اور وہ ایک مثالی گھر بار والے شخص تصور کیے جاتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے سے ان کے اس تصور میں دراڑیں پڑنی شروع ہو گئی ہیں۔ اس کی وجہ پریانکا چوپڑا کے ساتھ ان کی بڑھتی ہوئی قربت بتائی جاتی ہے۔ جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ محض ”دون 2“ کی پرموشن کے لیے شاہ رخ کا ایک پبلیٹی اسٹنٹ ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہاں آگ ضرور ہوئی ہے، جہاں سے دھواں

اٹھتا ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب شاہ رخ نے اپنے گھر پر دوستوں کے لیے ایک پرائیویٹ پارٹی کا اہتمام کیا اور پریانکا کو بھی اس پارٹی میں مدعو کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ رخ کے ایک قریبی دوست اور ان کی بیوی نے اس موقع پر پریانکا کو وہاں بلانے پر باقاعدہ اعتراض کیا۔ اب حقیقت کیا ہے۔ یہ تو شاہ رخ اور پریانکا ہی بتا سکتے ہیں۔

”بگ بی“ پاکستانی بنیں گے!

بولی وڈ کے مگا اسٹار ایتنا بھ بچن کو ان کے پاکستانی مداح جلد ہی ایک فلم میں اپنے ہم وطن کے روپ میں دیکھ سکیں گے۔ اطلاعات کے مطابق آسکر ایوارڈ یافتہ



ساؤنڈ ڈیزائنر رسل پوگی نے بطور ہدایتکار اپنی پہلی فلم میں ایتنا بھ بچن کو ایک پاکستانی باشندے کے روپ میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس حوالے سے تفصیلات بتاتے ہوئے پوگی کا کہنا تھا ”جی ہاں! میں نے اپنی نئی فلم کے لیے ایتنا بھ بچن سے بات چیت کی ہے۔ اس فلم کا اسکرپٹ میرے سابق کلاس فیلو ایتنا بھ بھٹ نے لکھا ہے، جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس فلم میں ایتنا بھ کا کردار بمسایہ ملک (پاکستان) کے شہری کا ہو گا لیکن یہ کوئی سیاسی نوعیت کی فلم نہیں ہو گی، اس کی کہانی انسانی جذبات و احساسات پر مبنی ہے، جو سرحد کے دونوں جانب رہنے والوں کے دلوں کو چھو لے گی۔“

پیامِ محبت لائی ہے مجھے

والدین اپنی اولاد کے حق میں بہت قصدا کرتے ہیں
مگر فرسودہ روایات، غلط اوقات، بچوں کے
خوابوں کو یوں پکٹا چکا کہ یہ بچے کبھی میرے مسائل
کے جنم لینے سے وہاں کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔۔

اس لڑکی کی کہانی جس سے خوشیاں روٹتی چلی جا رہی تھیں



چاند نکلا ہے تیرے بعد تو یوں لگتا ہے
میسرے آنگن کا پتہ بھول گیا ہو جیسے

”منحوس کہیں کی میرے جوان بیٹے کو کھا گئی، اب نہ جانے کتنے اور لوگوں کی جانیں لے گئی۔“ سعیدہ بیگم نے کمرے میں بیٹھے بیٹھے زور دار آواز میں ماہم کو کوسنے دینے شروع کیے۔

”اماں! یہ ماہم تو شروع سے بد بخت ہے۔ پیدا ہونے والی تھی تو باپ مر گیا آپ ہی کی مت ماری تھی تھی جو آپ اسے بیاہ کر اس گھر میں لے آئیں۔ بھائی کو اس نے ایسا اپنے قابو میں کیا ہوا تھا کہ وہ اس کی محبت میں آپ سے اور ہم بہنوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ ہم بہنوں کی ساری بد دعائیں جو اس کو دیتے تھے بھائی کو لگ گئیں وہ خود تو اس دنیا سے چلا گیا، یہ منحوس رہ گئی۔“

سعیدہ بیگم کی بیٹی سدرہ نے تیز آواز میں ماہم کو ننانے کی کوشش کی ماہم صحن میں واشنگ مشین لگائے کپڑے دھونے میں مصروف تھی وہ مسلسل ایک گھنٹے سے سعیدہ بیگم اور ان کی بیٹی کی باتیں برداشت کر رہی تھی۔ ہر روز اسے بد دعائیں اور کوسنے دینا سعیدہ بیگم کے معمولات میں شامل تھا۔ جب ان کی بیٹیوں میں سے سدرہ اور طوبی آ جاتیں تو ان کے ساتھ مل کر وہ بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتیں۔ کپڑے دھل چکے تھے وہ انہیں نچوڑ کر سی پر پھیلانے لگی بظاہر وہ اپنے کام میں مگن تھی لیکن کان اندر سے آنے والی آوازوں کو سننے کی جستجو میں تھے۔

”امی! میں تو آپ سے کہتی ہوں کہ ماہم کو خالہ کے گھر میں چلتا کریں اب تو اس کی عدت بھی گزر چکی ہے۔“

”تم کیا سمجھ رہی ہو کہ میں اسے خوشی سے رکھے ہوئے ہوں میں تو خود اس سے عاجز ہوں سلیمہ کو کہا تھا کہ اس کو لے جاؤ تو صاف کہنے لگی کہ اپنی پوتی کا کچھ خیال کرو تمہارے گھر پر اس کا بھی حق ہے۔“ سعیدہ بیگم نے پاندان گھسیٹا اور اپنے لیے پان بنانے لگیں ان کی عادت تھی جب وہ ٹینشن میں ہوتی تھیں تو کئی کئی پان کھا جاتی تھیں۔

”امی میں تو سلیمہ خالہ کے منہ پر کہہ دوں وہ اول نمبر کی لالچی عورت ہیں جب آپ کا بیٹا ہی نہ رہا تو بہو کا کیا حق؟ آپ نے عدت تک رکھ لیا یہی بہت ہے ان سے کہیں کہ وہ اپنی لاڈلی کو لے جائیں۔ بہانہ بنا دیں کہ اشعر کی شادی ہونے والی ہے ماہم والا کمرہ میں اشعر کی بیوی کو دودن گی آپ ایک سال سے اشعر کے سرسرا والوں کو ٹال رہی ہیں کہ اوپر دو کمرے بنوا لوں تو شادی کی تاریخ لینے آؤں گی۔ اشعر بیچارہ اتنے پیسے اکٹھے نہیں کر پارہا کہ اوپر کمرہ بنوا سکے۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو سلیمہ کو تو خود چاہیے تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے جاتی بھلا گھر میں جوان دیور کے ہوتے ہوئے کوئی اپنی بیوہ بیٹی چھوڑتا ہے۔ اب میں خود سے بولوں گی کہ بھئی اپنی بیٹی کو لے جاؤ میں اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتی تو فضول میں بری بنوں گی۔“ سعیدہ بیگم نے پان منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو حقیقت ہے کہ یہاں کوئی کسی کا احسان نہیں مانتا۔ خالو کے بعد آپ اور ابو نے ہر ممکن طریقے سے خالہ کی مدد کی تھی ورنہ ان کی سلائی کی آمدنی سے ان کے بچے کبھی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر پاتے ابو نے ہمدردی میں بھائی کے لیے اسے کیا مانگ لیا اس کی دلی حسرت پوری ہو گئی۔ شادی کے بعد دیکھا تھا کیسے یہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اتنے مہنگے مہنگے بوتیک کے سوٹ اس نے خریدے تھے۔ آپ نے کہا تھا کہ ابھی بری اور جہیز کے سوٹ بھرے پڑے ہیں اور تم ہو کہ مزید کپڑے خرید رہی ہو تو کتنی معصومیت سے بولی تھی میں تو اوہیں کو منع کر رہی تھی یہ جب بھی مارکیٹ جاتے ہیں زبردستی مجھے سوٹ دلا دیتے ہیں۔“ سدرہ کے لہجے میں سفاکی اور نفرت بھری ہوئی تھی۔

”ہائے ہائے اس کم بخت کے پیچھے میرا بچہ جان سے گیا اور یہ ایسی عورت ہے جس نے میرے بیٹے کو اولاد بھی ترسا کر دی۔ وہ بھی بیٹی کی شکل میں اگر بیٹا ہوتا تو میرے اولیس کا نام لیوا ہوتا۔“ سعیدہ بیگم پچھاڑنے لگیں۔

بناؤ۔“

”امی ایک تو جب بھی آپ کے گھر آؤں دال چاول اور سبزی کھانے کو ملتی ہے۔“ ماہم کے کمرے سے نکلتے ہی سدرہ بڑبڑائی۔

ماہم کھانا بنا کر فارغ ہوئی تو ایمان سکول سے آگئی وہ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں کو نمٹانے لگی۔ سدرہ دوپہر کا کھانا کھاتے ہی گھر روانہ ہوگئی۔ ماہم ایمان کو سلاتے سلاتے خود بھی سو گئی۔ عصر کی اذان سے پہلے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے بستر پر لیٹے لیٹے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب مزید خالہ پر بوجھ نہیں بنے گی۔ خالہ کی باتیں بے شک کڑی سہی مگر یہ حقیقت ہے۔ جب اوئیں ہی نہیں رہے تو میرا اس گھر پر کیا حق؟ کل کو اشعر کی بیوی آئے گی تو اسے سب سے پہلے میرے وجود پر اعتراض ہوگا۔ میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں امی کے پاس چلی جاؤں اور جاب کر کے اپنا بوجھ اٹھاؤں۔ اس نے مطمئن ہو کر سوچا۔

☆.....☆.....☆

”یہ لو یہ میں تمہارے اور ایمان کے لیے لایا ہوں“ بھیا! اس میں کیا ہے؟“

ماہم نے شاپر ہاتھ میں لیتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ ”میں آج آفل سے مارکیٹ گیا تھا مجھے تمہاری بھائی کے لیے سوٹ لینا تھا سوچا کہ تمہارے لیے بھی لے لوں۔ تمہارے اور ایمان کے پاس آنے جانے کے لیے سوٹوں کی کمی ہے۔“

”شکریہ بھیا۔“

”اس میں شکریہ کی کیا بات ہے؟ بھائی ہوں، میرا بھی تو تم پر حق ہے۔ تم میرے لیے جلدی سے چائے بناؤ میں جب تک فریج کے پاس سے ہو کر آتا ہوں۔“

”فریج! دیکھو میں تمہارے لیے کتنا زبردست سوٹ خریدا ہے۔“

”مجھے نہیں چاہیے یہ سوٹ۔“ اس نے غصے سے شاپر اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ سوٹ تو تم نے دیکھا نہیں

”اف خدا کیا ساری آزمائش میرے لیے ہے۔“ اوئیں آپ کے جانے کے بعد میں تو بالکل تنہا ہو گئی ہوں مجھ سے تو میرا سناہن بھی چھینا جا رہا ہے۔ میں کہاں اپنا ٹھکانہ تلاش کروں؟“ اداس دل سے ماہم نے سوچا۔ کپڑے دھل چکے تھے۔ اس نے ٹب ایک طرف رکھا اور بچن میں گھس کر برتن سمیٹنے لگی۔ کپڑوں کی دھلائی میں مصروف ہو کر آج اس نے بچن کی صفائی بھی نہیں کی تھی۔ سبک برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے برتن دھونے شروع کیے تھے کہ سعادہ بیگم کی گرج دار آواز اس کے کانوں سے مکرائی۔

”سارا دن کیا ایک ہی کام میں لگی رہو گی؟ نند آئی ہوئی ہے کچھ پکانے کی فکر ہے؟“

ماہم نے برتن چھوڑے اور سعیدہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”خالہ کیا پکانا ہے؟ آپ بتادیں۔“

”تم تو تھکی پچی ہو تمہیں تو کچھ عقل نہیں ہے کتنے سالوں سے اس گھر میں ہو پھر بھی یہی پوچھتی ہو کہ آج کیا پکاؤں؟“ سعیدہ بیگم نے طنز یہ لہجے میں کہتے ہوئے اسے گھورا۔ ماہم کے دل میں آیا کہ کہہ دے اس گھر میں آج تک میری مرضی اور پسند کا کھانا بنا رہے روز آپ ہی تو بتاتی ہیں کہ کیا پکانا ہے وہ اپنے لبوں پر مہر لگائے چپ کھڑی تھی کہ سعیدہ بیگم نے خاموشی کو توڑا۔

”ایسا کرو لو کی گوشت بنا لو دونوں ٹائم کا کھانا ہو جائے گا۔“

”خالہ! گوشت تو نہیں ہے۔، پرسوں جو آخری پیکٹ فریج میں رکھا ہوا تھا میں نے پکا لیا تھا آپ گوشت لادیں تو میں سائلن بنا دیتی ہوں۔“

”جب سے ماہم اس گھر میں آئی ہے ساری برکت اٹھ گئی ہے تین کلو گوشت لا کر رکھتی ہوں پتہ نہیں کیسے مہینہ پورا ہونے سے پہلے ختم ہو جاتا ہے اور تو اور آنا، دال چاول سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ عجیب بے برکتی پھیلا رہی ہے۔ تم اور طوبی بھی تو بچن سنبھالتی رہی بوتب تو راشن ایسے ختم نہیں ہوتا تھا جاؤ جا کر دال چاول

”آج کچھ خاص کام نہیں تھا سو میں نے سوچا کیوں نہ گھر چلا جائے۔“

”آرام سے اے سی میں بیٹھو باہر سے آئے ہو گرمی لگ رہی ہوگی۔“

”اپنے ملک کی گرمی کا ایک الگ مزہ ہے باہر رہ کر تو ہم دھوپ کو ترس جاتے ہیں۔ آپ کا بلڈ پریشر بہتر ہوا، صبح تو خاصا بڑھا ہوا تھا۔“

”ہاں اب کنٹرول میں ہے۔ تبھی تو چل پھر رہی ہوں بس خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ چلتے پھرتے بلا لے۔“

”امی اب کی دفعہ میں کینیڈا جاؤں گا تو آپ بھی میرے ساتھ چلنے کا آپ کا وہاں پر دل کیوں نہیں لگتا۔“

”میرا دل ضرور گنگے گا اگر تم دوسری شادی کر لو اور وہ بھی کسی پاکستانی سے۔ یہاں اظفر کا گھر ہے مگر میں صرف کبھی بھاری اس کے پاس ملنے کے لیے جاتی ہوں۔ تمہاری بھابی کو میں برداشت نہیں ہوں اظفر مبینے میں ایک دفعہ ملنے کے لیے آتا ہے اور خرچہ دے کر جھٹتا ہے کہ اس نے تمام حقوق کو پورا کر دیا ہے۔ اب تو مجھے تنہا رہنے کی عادت ہو گئی ہے ویسے سلیبہ بہن میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔“ مہر النساء مطمئن لہجے میں بولیں۔

”امی مجھے ماہم ابھی نظر آئی تھی شاید کسی سکول میں پڑھانے لگی ہے۔“

”ہاں بیٹا ماہم تو دو مہینے سے ادھر ہی ہے۔ بیجاری کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے نہیں بتایا تو تھا۔ تمہاری لاڈلی بیگم کے مزاج کیسے ہیں؟ راحم ویک اینڈ پر ہی تم سے ملتا ہو گا۔ میرا پوتا“ میں تو اس کی صورت دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔“ مہر النساء نے آہ بھری۔

”سوزین تو مجھ سے علیحدہ ہو کر بہت خوش ہے میں اس کی آزادی کی راہ میں حائل جو تھا راحم سے ملاقات ہوتی رہتی ہے میں اسے پاکستان لانا چاہتا تھا کہ آپ اس سے مل لیں مگر سوزین نے اجازت نہ دی۔“

”سوزین جیسی آزاد خیال مغربی لڑکی تمہاری

ہے اور اٹھا کر ایسے بھینک رہی ہو جیسے تمہیں پسند ہی نہ آیا ہو۔“

”یہ سوٹ بھی آپ اپنی چیتھی بہن کو دے دیں۔“

”اچھا تو تم اس بات پر ناراض ہو کہ میں نے کچھ کپڑے ایمان اور ماہم کے لیے خرید لیے۔ ماہم جاب کے لیے نکلتی ہے کیا امپریشن پڑے گا وہ کس قدر پرانے کپڑے پہن کر جا رہی ہوتی ہے۔“

”ہاں تو کیا ہوا؟ یہ وہ عورت ہے۔ یہ وہ عورتیں تیار ہوتی اچھی لگتی ہیں کیا۔ آپ امی سے کہہ دیں اس کی جلد سے جلد شادی کر کے اسے چلتا کریں ایمان کی نظریں ہر وقت میرے بچوں کی چیزوں اور کھلونوں پر ہوتی ہیں میرے بچے شیز کرنے کے عادی نہیں ہیں۔“

”فریحہ! اتنی کھور مت بنو۔ ماہم دکھی ہے پلیز جب تک اس کی شادی نہیں اور نہیں ہو جاتی تم اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔“

”اس کی مسکین صورت دیکھ کر بجائے ترس آنے کے مجھے تو الٹا غصہ ہی آتا ہے۔“ فریحہ غصے سے چلائی۔

ماہم چائے لے کر کمرے میں آ رہی تھی کہ بھابی کی گفتگو سن کر واپس لوٹ گئی اس قسم کی گفتگو سننے کی تو وہ اب عادی ہو گئی تھی زخمی دل سے وہ اپنے مقدر پر آنسو بہانے لگی۔“

☆.....☆.....☆

شایان احمد نے کار لاک کرتے ہوئے ایک نظر سامنے بنے ہوئے بنگلے پر ڈالی ڈور نیل بجاتی ہوئی ماہم اسے پہلی کی طرح لگی نفیس اور پاکیزہ لگتا ہے کہ محترمہ کسی سکول میں پڑھانے لگی ہیں۔ اس نے ماہم کے ہاتھ میں موجود کاپیوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔ اتنے میں گیٹ کھلا تو وہ تیزی سے اندر کی طرف چلی گئی۔ شایان احمد نے جیب سے چابی نکالی اور لاک کھولنے لگا۔

”السلام علیکم امی!“

”وعلیکم السلام! آج تم دوپہر میں کیسے آ گئے۔“ مہر النساء کی نظر جو نبی اس پر پڑی بے اختیار انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے کو چوم لیا۔

پابندیاں کہاں برداشت کر سکتی تھی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم دونوں کی علیحدگی سے نقصان سراسر تمہارے بیٹے کو ہوا ہے۔“

”امی آپ کی بات ٹھیک ہے مگر اسے کوئی میری یا راحم کی پروا تھی۔ ورنہ اپنے بچے کی خاطر مجھ سے کمپر و ماثر کرتی وہ کونسا صلح چاہتی تھی۔“ شایان کے لہجے میں افسردگی در آئی۔

”تم سے باتیں کرنے میں مجھے ہوش ہی نہ رہا کھانے کا وقت ہو رہا ہے میں نے آج تمہاری پسندیدہ فرائی جھنڈیاں بنائی ہیں ساتھ میں شامی کباب۔“

”پھر تو آپ فوراً کھانا لے آئیں۔“ کھانے سے فارغ ہو کر مہر النساء چائے بنا کر لے آئیں۔

شایان! اب کی دفعہ تم ادھر آئے ہو تو شادی کر کے جانا میں نے کئی لڑکیوں کو نظر میں رکھا ہوا ہے۔ آخر کب تک تم اس طرح سے رہو گے میں نے لڑکیوں کی تصویریں منگوا کر رکھی ہوئی ہیں۔ تم دیکھ لینا تصویر میں اگر تمہیں کوئی پسند آگئی تو ہم گھر چل کر دیکھ لیں گے۔“

”امی! ابھی تو مجھے یہاں پر آئے ہوئے تین روز ہوئے ہیں، آرام سے چل کر دیکھ لیں گے۔“

”دیکھو شایان اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا تم لڑکی فائل کر دو تا کہ تمہارا نکاح ہو جائے آخر کینڈا جا کر تمہیں پیپر بھی تو تیار کروانے ہوں گے!“ مہر النساء اسے ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش میں تھیں۔

”جیسے آپ کی مرضی“ اس نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ”تم آرام کرو میں نماز پڑھ کر آتی ہوں۔“ مہر النساء نماز پڑھنے چلی گئیں۔

شایان احمد آنکھیں موندے ماہم کے تصور میں گم تھا۔ آج اسے ایک عرصے کے بعد دیکھ کر اس کی پرانی بادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ اس کو بچپن سے ہی ماہم میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب ماہم اور اس کے بھائیوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ

اسے یہ سوہن لڑکی بے حد اچھی لگنے لگی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے وہ باہر کھایا کرتی تھی۔ اب جب وہ اس کے بھائیوں سے ملنے جاتا تو وہ صرف ضروری گفتگو کرتی تھی۔ شایان اس وقت اسٹوڈنٹ تھا۔ اس کی ایجوکیشن مکمل ہونے میں ایک سال باقی تھا اس نے سوچ لیا تھا جو بی ایجوکیشن مکمل کر کے اسے جاب ملے گی وہ امی کو ماہم کے گھر رشتے کے لیے بھیجے گا۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی ماہم کے رشتے کی بات اولیں سے ملے ہوگی۔

اسے اپنی محبت کے کھونے کا بہت افسوس ہوا۔ اس نے ماہم کے گھر جانا ترک کر دیا۔ اس دوران اس نے کینڈا کے لیے اپنا بی کیا۔ اس کی لک نے کام کیا اور وہ کینڈا جا کر کیمٹل ہو گیا وہیں پر اس نے سوزین سے شادی کی جو نا کام ہو گئی۔

”یہ تم کن سوچوں میں گم ہو؟“ مہر النساء نے اسے صوفے سے ٹیک لگائے سوچوں میں گم دیکھ کر پوچھا۔

”امی یہ سوچیں کبھی انسان کا پیچھا چھوڑ سکتی ہیں۔“

”اسی لیے تو کہہ ہی ہوں کہ تم لڑکی پسند کر لو تا کہ اسے اپنے ساتھ لے جا سکو فارغ رہو گے تو ایسے ہی پریشان رہو گے اب انظر کو دیکھ لو وہ اپنے بیوی بچوں میں خوش ہے۔ میں اس کی خوشی میں خوش ہوں۔“

”امی! ایک بات کہوں آپ سلیمہ آنٹی سے بات کریں میرے اور ماہم کے رشتے کی۔“

”شایان! تم ماہم سے شادی کرو گے، میرا نہیں خیال کہ ماہم شادی کرنا چاہے گی وہ تو نوکری اس لیے کر رہی ہے تا کہ کسی پر بوجھ نہ بنے۔“ مہر النساء نے فوراً بہانہ بنایا۔

مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ماہم ہر لحاظ سے میرے لیے بہتر ہے۔ پھر آپ اور میں اس کی فیملی کو کافی عرصے سے جانتے ہیں۔ ماہم دوبارہ شادی نہ بھی کرنا چاہے۔ اس کے گھر والے تو ضرور چاہیں گے۔ مجھے ماہم پسند ہے۔ آپ اس کے گھر رشتے لے کر جائیں باقی خدا کی جو مرضی۔“

”اس سے پہلے تو تم نے ماہم سے کبھی اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔“ مہر النساء سرد لہجے میں بولیں۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے مجھے اظہار کا موقع ہی کب ملا ہے۔“

”شایان! میں رشتہ لے کر ضرور جاؤں گی مگر ایک بات کلیئر کر دوں میں اس کی بیٹی کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ بیٹی کو اس کی نانی یا ماموں رکھ لیں تو مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ بہتر سمجھیں وہ جب بھی پاکستان آئے گی تو اپنی بیٹی سے مل سکتی ہے۔ مجھے اس کی بیٹی کو ساتھ رکھنے یا نہ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”میں جلد ہی جا کر بات کروں گی تم بے فکر ہو جاؤ۔“ مہر النساء نے کہا۔

☆.....☆.....☆

”لوگوں کی لڑکیاں ماں کے گھر پڑی عیش کر رہی ہیں ایک ہم ری وہ گئے ہیں۔ سسرال والوں کی خدمتیں کرنے کے لیے۔“ فریحہ کچن میں برتن بیٹھتے ہوئے بڑبڑاتی۔

”ایمان یہ ہوم ورک جلدی سے کرو۔ مجھے اور بھی کام کرنے ہیں۔“ ماہم نے کہا سکول سے آنے کے بعد اس کے سر میں شدید درد تھا وہ آتے ہی لیٹ گئی تھی آج بھائی کو شام کی چائے بنانی پڑ گئی جس کا غصہ وہ نکال رہی تھیں۔ ایمان نے ہوم ورک کر لیا تو ماہم رات کے لیے سائلن بنانے لگی۔

”ماہم! خالد کا فون ہے بلا رہی ہیں، تم سے اور ایمان سے بات کرنی ہے۔“

”السلام علیکم! خالہ“
”ولیکم السلام! جب سے تم گئی ہو گھر کا چکر نہیں لگایا۔ خیریت تو ہے۔“

”ہاں بالکل خیریت ہے دراصل میں اتنا مصروف ہوتی ہوں کہ آپ کی طرف آنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

”اب بھلا تم نہیں آؤ گی تو ایمان تو ہمیں بھول جائے گی۔ ایمان کو بلاؤ میرا اپنی بچی سے بات کرنے کا جی چاہ رہا ہے۔“

”ایمان دادی سے بات کرو!“

”ایمان کافی دیر تک باتیں کرتی رہی وہ اس کی بات کرا کے فون رکھ رہی تھی کہ امی کمرے میں آ گئیں۔“

”مما! مجھے دادی کے گھر جانا ہے۔ چاچو مجھے کئی چیزیں دلاتے تھے یہاں پر تو کوئی بھی مجھے گھمانے نہیں لے جاتا۔“

”اچھا ہم دادی کے گھر چلیں گے پھر تم چاچو کے ساتھ گھومنے جانا۔“ ماہم نے اسے بہلایا۔

”اب تم جاؤ اپنے کھلونوں سے کھیلو۔“

”امی یہ جب بھی فون پر بات کرتی ہے اسی طرح سے بچل جاتی ہے۔“

”چھوٹی بچی ہے۔ بچوں کو تو محبت سے ہی اپنا بنایا جاسکتا ہے۔“ سلیمہ بیگم بولیں۔

”چولہے پر سائلن رکھا ہے میں جا کر دیکھتی ہوں روٹیاں بھی بنا لیتی ہوں تاکہ کام ختم ہو جائے۔“ ماہم بیڈ پر سے اٹھی۔

”چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں تمہاری کچھ ہیلپ کر دوں گی۔“

”امی! آپ آرام کریں میں خود کام کر لوں گی۔“

ماہم کی طبیعت دوپہر سے بو جھل تھی روٹیاں پکا کر وہ فارغ ہوئی تو سامنے والی مہر النساء آنٹی آ گئیں اس نے چائے تیار کی اور لے جا کر آنٹی کے سامنے رکھی۔

”آنٹی! آج کیسے راستہ بھول گئیں! اتنے دنوں کے بعد آئی ہیں۔“

”تم نے ناحق تکلیف کی، میں چائے پی کر آئی تھی۔ تم سے یہ نہ ہوا کہ آنٹی سے کبھی ملنے آ جاتیں۔“

شایان آیا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے فرصت نکال کر آئی ہوں۔“

”آنٹی! آپ جانتی تو ہیں میں سکول میں مصروف

چاہت

قاری، لکھاری اور افسانے!
کہانیاں، غزلیں اور لطیفے
شاعر، خط اور تراشے
عید کے اس موقع پر
سب کے سب اچھے لگے
”ریشم“ میں پڑھتے ہوئے
(محمد حسن نظامی، قبولہ شریف)

لہجے کا کیونکہ ایمان کو آپ لوگوں نے رکھنا ہوگا۔ بچی کو
شایان کس طرح اپنے پاس بلا سکتا ہے۔“ مہر النساء
اپنے موقف پر آگئیں۔
”آپ فکر نہ کریں ہم لوگ ہیں ناں ماہم کو اتنا اچھا
رشتہ مل رہا ہے۔ اس کا گھر دوبارہ بس جائے اس سے
بڑی بات کیا ہوگی میں ایک دو روز بعد آپ کو جواب
دوں گی۔“ سلیمہ بیگم کے لہجے میں خوشی کا تاثر تھا۔ ٹھیک
ہے آپ اچھی طرح سے سوچ کر فیصلہ کیجئے گا۔ اب
میں چلتی ہوں۔

☆.....☆.....☆

”امی! آپ کو کیا ہو گیا ہے میں ایمان کو کس طرح
چھوڑ سکتی ہوں کچھ بھی ہے آخر کو وہ میری بیٹی ہے۔“
”ماہم تم اس طرح سے اگر سوچو گی تو کبھی بھی
دوسری شادی نہیں کر پاؤ گی شایان کو بہت سی کنواری
لڑکیاں مل سکتی ہیں وہ تو تمہاری خوش نصیبی ہے کہ اس
نے تمہارا انتخاب کیا۔ دیکھو ماہم میں ہرگز نہیں چاہتی
ہوں کہ تم یہاں پر رہ کر ساری زندگی فریجہ کے طعنے سنتی
رہو۔ اس کی باتیں بھی سنو گی اور تمہیں نوکرانی بنا کر کام
کروانی رہے گی وہ۔“

ماہم میں ہرگز تمہیں زندگی بھر بیوہ کے روپ میں
نہیں دیکھنا چاہتی خدا کے لیے تم میری بات مان لو اسی
میں تمہاری بھلائی ہے۔“
”امی اعتراض مجھے رشتے پر نہیں اس شرط پر ہے

ہوتی ہوں گھر آ کر اسنے کام ہوتے ہیں کہ کہیں آنے
جانے کا نام نہیں ملتا۔“
”ماہم! تمہاری بیٹی تو تم پر بالکل نہیں گئی۔ ہو بہو
اولیس کی کا پی ہے تم تو خاصی خوبصورت ہو۔“ مہر النساء
نے بغور ایمان کا جائزہ لیا۔
”تمہاری خالہ اپنی پوتی سے ملنے نہیں آتیں۔“
”انہیں فرصت نہیں فون پر بات کر لیتی ہیں اشعر
کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔“
”مما! آپ نے مجھے سبق تو پڑھایا نہیں۔“ ایمان
نے یاد دلایا۔

”اوکے میری جان میں ابھی پڑھا دیتی ہوں آنٹی
آپ امی سے باتیں کریں میں آتی ہوں۔“
”ہائے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ اتنی حسین لڑکی اور
بھری جوانی میں بیوہ۔“
”مہر النساء بہن یہ تو خدا کی مرضی ہے۔“
”کچھ سوچا ہے آپ نے ماہم کے بارے۔“ مہر
النساء نے کر دیا۔

”ہم لوگ تو چاہ رہے ہیں کہ جلد سے جلد ماہم کی
دوسری شادی کر دیں، ماہم تو شادی کے لیے تیار ہی
نہیں تھی میں نے اسے سمجھایا کہ میرے بعد تو اس کا کوئی
پرساں حال نہ ہو گا۔ ماہم کے لیے رشتے تو بہت
آرے ہیں۔“

”سلیمہ بہن! میں ماہم کو اپنے بیٹے شایان کے
لیے مانگنے آئی ہوں۔ آپ کو تو پتہ ہے شایان نے کینڈا
میں جو شادی کی تھی وہ ناکام رہی تھی۔ شایان کی میں کسی
پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ ماہم سمجھ دار
ہے۔ شایان اور اس کی شادی ہو جائے تو ہر لحاظ سے
بہتر ہے۔“

”باجی آپ یقین کریں مجھے اس رشتے کا سن کر
بہت خوش ہوئی ہے میں اپنے بیٹوں سے مشورہ کر لوں۔
پھر جواب دوں گی بھلا انہیں بھی کیا اعتراض ہو گا وہ تو
شایان کو بچپن سے جانتے ہیں!“
”سلیمہ بہن! آپ ماہم کی مرضی بھی ضرور معلوم کر

۱۔ میں ایمان لو آپ لوگوں کے پاس چھوڑ دوں۔ مجھے مہر النساء آنٹی کی یہ شرط قبول نہیں آپ میری طرف سے انکار کر دیں۔“ ماہم اٹھ لیجے میں بولی۔
 ”ماہم! سوچ لو ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہو۔“ سلیمہ بیگم کے لہجے میں آس تھی۔
 ”میں نے سوچ لیا ہے۔“

☆.....☆.....☆

”دیکھ لیا ماہم نے صاف منع کر دیا۔ تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے۔ میں اب دوسرے گھروں میں تمہارے رشتے کی بات چلاؤں گی۔“
 ”انکار کی وجہ آپ کو کبھی پتہ ہے۔ اسے اپنی بیٹی کی جدائی گوارہ نہیں ہے۔“

”کسی اور کے خون کو کون اپنے گھر میں برداشت کر سکتا ہے۔“ مہر النساء نے تیز لہجے میں کہا۔
 ”امی! سوزین نے اگر راحم کو میرے پاس بھیج دیا تو کیا ہوگا؟ اس کے ہونے کا چاس تو کم ہے پھر بھی میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“
 ”اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے کہ راحم تمہارے پاس آ جائے۔“

”میری دوسری بیوی نے اسے قبول نہ کیا تو۔“
 ”کیسے وہ قبول نہیں کرے گی تم مرد ہو تمہاری بات ماننا اس کے لیے ضروری ہے۔“

”صرف مرد ہونے کی وجہ سے میں اپنی مرضی اس پر مسلط کر سکتا ہوں یہ میری مردانگی ہے کہ میں ایک بچی کو اس کی ماں سے جدا کرنے کی شرط رکھ رہا ہوں وہ بچی جو پہلے ہی اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہے۔ میں اس سے اس کی ماں کی محبت بھی چھین لوں مجھے تو پہلے بھی آپ کی شرط پر اعتراض تھا اور اب بھی ہے۔“
 ”میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں تمہارے بھلے کے لیے کر رہی ہوں۔ کسی بچے کی ذمہ داری لینا آسان کام نہیں ہے۔ آگے چل کر تمہیں احساس ہوگا کہ امی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ ہو جائے گی اس کی بھی کہیں پر شادی۔ تھوڑے دن اپنی ماں کے گھر بیٹھے گی تو اپنے

فیصلے پر پچھتائے گی۔“ مہر النساء نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔
 ”امی! ماہم مجھے پسند ہے اور مجھے اس کی شرط قبول ہے۔ میں اس کی بیٹی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میری اتنی حیثیت ہے کہ میں ایک یتیم بچی کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں۔ اگر میری شادی ماہم سے نہیں ہوئی تو میں کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔“

”یہ تمہاری ضد ہی ہے جس کا خمیازہ تم ایک دفعہ پہلے بھی بھگت چکے ہو۔ میں تو تمہارا بھلا چاہتی ہوں مگر تم ہو کہ اپنی بات منوار ہے ہو۔ ماں کی مرضی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“

”امی! میں آپ کو کوئی دکھ تھوڑی دینا چاہتا ہوں آپ نے شادی کے لیے میری پسند کا پوچھا تو میں نے اپنی پسند آپ کے سامنے رکھ دی پسند کا اختیار تو مجھے میرے مذہب نے بھی دیا ہے۔ امی آپ میری خاطر اپنے فیصلے میں لچک پیدا کر لیجئے پلیز امی۔“ شایان نے التجائی لہجے میں کہا تو مہر النساء پلکل گئیں۔

”میں تو تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ تمہاری خاطر میں سلیمہ بہن سے بات کروں گی۔“
 ”تھینکس امی مجھے آپ سے یہی امید تھی۔“

☆.....☆.....☆

”ہو ایمان یہ تمہارا بکر انہیں ہے، یہ دونوں بکرے میرے پایا لائے ہیں۔ طلال نے اپنے بکرے کی رسی کو کھینٹا۔“

ایک تو یہ ایمان ہماری ہر چیز میں شیر کرنے کے لیے آ جاتی ہے پایا یہ بکرے ہمارے لیے لائے ہیں ناں۔“ میرب چلائی

نانو تو کہہ رہی تھیں کہ یہ میرے بھی بکرے ہیں تمہارے پایا میرے ماموں ہیں وہ میرے لیے نہیں لا سکتے!“

”بالکل نہیں تمہیں کوئی چیز چاہیے ہو تو تم اپنے پایا سے ماگودہ تمہیں دلائیں گے۔“ میرب نے کہا۔

”اس کے پاس ہوتے تو یہ ہمارے گھر رہتی۔ اس کے تو پایا ہی نہیں میں تب ہی تو یہ ہمارے پایا سے ہر

چیز مانگتی ہے۔“ طلال بولا۔
”سن لو ایمان یہ دونوں بکرے ہمارے ہیں۔ ایک

آپ کو امی سے گس چیز کی اجازت درکار ہے۔

”تمہیں اپنے ساتھ لے کر شاپنگ پر جانے کی۔

بقرہ عید کے تیسرے دن ہماری شادی ہے۔ میں چاہ رہا

تھا کہ نکاح کا سوٹ تم اپنی پسند سے لو۔“

”آئی جو سوٹ اپنی پسند سے لے آئیں گی وہ

مجھے اچھا لگے گا۔“

ہاں مگر وہ چاہتی ہیں کہ سوٹ ماہم کی پسند کا ہو سو تم

میرے ساتھ چلو میرے خیال میں تمہیں اب تو کوئی

اعتراض نہ ہو گا۔“ شایان نے اس کی آنکھوں میں

جھانکا تو اس کی نظریں جھک گئیں۔

”مما! مجھے بکرا چاہیے۔“ ایمان نے اس کو کندھے

سے بلایا۔

”یہ دونوں بکرے جو گھر میں ہیں یہ آپ کے بھی تو

ہیں۔“

”نہیں ممما! مجھے اپنا بکرا چاہیے یہ تو طلال اور

میرب کے ہیں۔“ ایمان اپنی ضد پراڑی ہوئی تھی۔

”ایمان آپ کو میں بکرا لا کر دوں گا بولو ایمان

آپ کو کس کلر کا بکرا چاہیے۔“

”مجھے سفید کلر کا بکرا چاہیے وہ بھی آج۔“

”میں اپنی بیٹی کی فرمائش ضرور پوری کروں گا۔“

”تھینک یو! انکل۔“

”ویلم مگر تم مجھے انکل کے بجائے بابا کہو!“

”اوکے بابا!“ ایمان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلا

دیا۔

اب جب کہ ایمان مجھے بابا کہہ چکی ہے تو تمہیں

بھی میرے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو گا کیوں

بیگم؟

ماہم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی دل بی دل

میں وہ رب کی شکر گزار تھی۔ ایک طویل مسافت کے

بعد اس نے اپنی منزل پالی تھی۔ یہ عید الاضحیٰ ماہم کی

زندگی میں محبت کا پیام لے کر آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”سن لو ایمان یہ دونوں بکرے ہمارے ہیں۔ ایک

میرا اور ایک میرے بھائی کا ہم دونوں انہیں گھمائیں

گے اور اپنے دوستوں کو دکھائیں گے تم انہیں ہاتھ مت

لگاؤ۔“

”ماما! ممما! میرب مجھے اپنے بکروں کو ہاتھ لگانے

نہیں دے رہی مجھے بھی بکرا چاہیے۔ بقرہ عید پر سب

بچوں کے گھر بکرے آتے ہیں میرا بکرا کہاں ہے؟“

ایمان رو ہانسی ہو گئی۔

ایمان! ماموں جو بکرے لائے ہیں وہ آپ کے

بھی ہیں ابھی طلال اور میرب کھیل لیں پھر تم بکروں کو

پیار کر لینا۔“

☆.....☆.....☆

”کیا ہو رہا ہے؟ خیریت تو ہے۔“

ماہم مزی تو شایان کھڑا تھا۔

”شہیر بھائی تو گھر پر نہیں ہیں۔ وہ بھائی کو لے کر

عید کی شاپنگ کرنے گئے ہیں۔“

”ڈونٹ وری مجھے شہیر سے نہیں تم سے ملنا ہے۔“

”آپ کو ایسی کون سی بات مجھ سے کرنی ہے جس

کے لیے آپ خود تشریف لے آئے۔“

”میں تو تمہارے سامنے صرف ایک بات کلیئر کرنا

چاہ رہا تھا کہ امی نے جو شرط رکھی تھی وہ ان کی اپنی مرضی

سے تھی مجھے ماہم کے وجود پر اعتراض ہرگز نہ تھا اس

لیے نئی زندگی کی شروعات سے پہلے مجھ سے بدگمان

مت ہو جانا۔“

”آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میری خاطر اپنی امی

کو قائل کیا ہے۔“

”تمہاری خاطر نہیں اپنی گم شدہ محبت کو پانے کی

خطر۔ ماہم! ایمان میرے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے

جتنی تمہارے لیے میں اسے کبھی باپ کی کمی محسوس

ہوئے نہیں دوں گا۔“

”میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

”سلیمہ آئی کہاں ہیں؟ مجھے ان کی اجازت درکار تھی۔“

روٹ ہمراہ ہے



یشی سرور

بے شک ہم پاکستانی ہیں مگر میں تو انڈیا کے پڑوسی
ناں۔ اور پڑوسیوں کا خیال رکھنا بھی ہماری ذمہ داری
ہے۔ تو اگر پرویس میں آپ کو کوئی پرالہم ہے تو بلا جھجک
ہم سے کہہ ڈالیے۔ ممکن ہے کہ ہم آپ کی کچھ مدد کر
سکیں۔ وہ دراصل آپ ہمیں کچھ پریشان سے
لگے.....!“
ہم نے جھجکتے جھجکتے کہا تو وہ رک کر کسی سوچ میں پڑ
گئے۔

یوں لگا کہ جیسے وہ الجھن میں ہیں کہ ہم سے کہہ دیں
کہ نہیں۔“
کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ٹھوڑی کھجاتے ہوئے
بولے۔

”نہیں کچھ نہیں..... وہ تو ہم نے آپ کو دیکھا تو
سمجھے آپ انڈین ہو۔ کیوں کہ آپ کے خدو خال بالکل
انڈین عورتوں جیسے ہیں تو بس اس لیے آپ کی جانب
لپکے چلے آئے۔“

ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کہیں اتنی دیر میں
ہمارے صاحب شاپنگ سے فراغت پا کر ادھر ہی آتے

”نستے بہن جی۔“ انہوں نے اپنی بیٹی کی نمائش
کرتے ہوئے ہمارے نزدیک آ کر دونوں ہاتھ جوڑتے
ہوئے کہا۔
ہم شیشا گئے کہ اب بھلا نستے کے جواب میں کیا کہیں
آخر؟ تو بس صرف کھنکھار کر رہ گئے۔

”آپ انڈیا سے آئے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔
”نہیں..... ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان سے آئے
ہیں۔“

ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو گویا ان پر یک
لخت بجلی گر پڑی۔
چہرہ گہرے سانولے سے جامنی رنگ بدل گیا۔
ناک چڑھ گئی اور ہونٹ سکڑ گئے۔

”اوہ..... میں سمجھا آپ انڈین ہو۔“ وہ قدرے
مایوس سے ہو کر واپس جانے کے لیے مڑے۔
”سینے بھائی صاحب!“ ہم نے بے ساختہ انہیں
پکارا۔

وہ ناگواری سے پلٹے اور استفہامیہ نظروں سے
ہماری جانب دیکھنے لگے۔

دکھائی دیئے۔

وہ ہمیں اک اجنبی کے ہمراہ گپ شپ کرتے دیکھ کر یقیناً حیران ہوئے تھے۔ سبھی تیزی سے قدم بڑھاتے چلے آئے۔ اور مصافحے کے لیے ہاتھ بھارتی بھائی کی جانب بڑھا کر ہماری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ یہ صاحب انڈیا کے رہنے والے ہیں اور ہمیں بھی انڈین سمجھ کر علیک سلیک کرنے چلے آئے تھے۔ ہم نے وضاحت کی۔

صاحب نے ان حضرت کا نام پوچھا تو کوئی رام پرشاد نام بتایا انہوں نے۔

ابھی صاحب شاید ان سے کوئی بات چیت آگے بڑھاتے کہ اسی اثناء میں تین چار سکھ ادھر آ نکلے اور رام پرشاد کا نام لے کر انہیں پکارنے لگے پھر جب انہیں ہمارے ہمراہ دیکھا تو خود بھی ادھر ہی چلے آئے۔

وہ بھی شاید لمبی چوڑی شاپنگ کر کے لوٹے تھے سبھی ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے تھیلے اور شاپنگ بیگز تھے۔

ہاتھ جوڑ کر ہمیں پرنام کرنے کے بعد وہ ہمارے صاحب سے ملے اور انداز ایسا تھا کہ جیسے کوئی پرانے واقف کار ہوں۔ جبکہ رام پرشاد صاحب اپنی جگہ کھڑے نا جانے کیوں بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے اور اپنے ہونٹ چبارہے تھے۔ پیشانی پر ہزار ہا سلونیں تھیں۔ ان کے انداز سے ناگواریت صاف ظاہر تھی۔ مگر اس دم انہیں کوئی لفٹ ہی نہیں کرار ہاتھا۔ صاحب اور سکھ صاحبان گپ شپ میں مصروف تھے۔

تعارف کے مراحل سے گزر کر معلوم ہوا کہ وہ اور رام پرشاد صاحب آنکھوں میں سنہرے خواب سجا کر روزی کمانے جرنی آئے تھے مگر ابھی تک بے روزگار تھے۔ حکومت جرنی کی جانب سے بے روزگار الاؤنس سے گزارہ کر رہے تھے اور ایک تنگ سے فلیٹ میں سب دوست مل کر رہتے تھے اور کھانا وغیرہ بھی خود بناتے تھے۔

بقول ان کے جرمن مالک مکان بے حد سخت تھا اور



اکثر گھر کی صفائی ستھرائی کا جائزہ لینے چکر لگاتا تھا۔
ان سکھوں نے وہیں کھڑے کھڑے ہمیں اپنے گھر

بھجوانا پڑتا تھا انہیں۔
ہم حیران رہ گئے۔ بے روزگار الاؤنس کی رقم میں

سے پیسے بچا کر گھر والوں کو بھیجنا بے حد مشکل کام تھا۔
شاید ان کے گھر والے سمجھتے ہوں گے کہ انہیں جانتے

ہی اچھی سی نوکری مل گئی ہے یا جرمنی میں شاید درختوں پر
ڈالرز لگے ہوں گے جو وہ جاتے ہی گھر پیسے بھجوانے لگے

ہیں۔ اور ان کے رشتے دار سمجھتے ہوں گے کہ وہ جرمنی میں
ایک کمفرٹبل زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر ہم دیکھ رہے تھے

کہ ان کے جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ
رہی تھیں اور وہ شدید سردی میں باریک سی جرسی پہنے،

آدھے چہرے پر پرانا سا مظفر لپیٹے، بغلوں میں ہاتھ
دبے، سکرے سے کھڑے ٹھنڈے سے کپکپا رہے تھے۔

”مارکیٹ میں آپ یقیناً شاپنگ کے لیے آئے
ہوں گے۔“

انہیں فرصت سے کھڑے ہو کر گپ شپ لگانے کے
موڈ میں دیکھ کر صاحب نے یاد دلایا۔

”اونہیں جی..... شاپنگ کیا کرنی تھی بس ایویں ای
باہر نکلتے تھے۔ چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ بیٹھ کر جی گھبرا

گیا ہے۔“
”بہن جی بھی اکیلی گھبرا جاتی ہوں گی (انہوں نے

ہماری جانب اشارہ کیا) تو یہاں پر تو کئی پاکستانی فیملیاں
رہتی ہیں۔ جن سے میری ہیلو بوائے ہے تو میں آپ کو فون

نمبر دے دوں گا۔“
”جی بہت بہتر۔“ صاحب نے کہا اور ان کی فرمائش

پر اپنے گھر کا فون نمبر بھی انہیں دے دیا۔
ہاتھ ملا کر رخصت ہونے سے قبل ہمارے صاحب کو

کچھ یاد آیا۔
”یار..... یہ بتائیں کہ یہاں پر کوئی رسالوں،

کتابوں کی دکان ہے۔ جہاں سے پاکستانی میگزین یا
ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے مل سکیں۔ جب سے جرمنی آئے

میں عرصہ ہی ہو گیا اردو پڑھتے ہوئے۔“
ہاں جی..... دکان ہے ناں..... وہ صاحب خوش دلی

ہم نے دیکھا کہ اس بات پر رام پرشاد نے بے چینی
سے پہلو بدلا اور منمناتے ہوئے اپنی مصروفیت کا بہانہ کر

کے معذرت کی کوشش کی تو صاحب اس کا گریز سمجھ گئے۔
آپ بے فکر رہیے گا آپ کے لیے گوشت کی بجائے

سبزی چاول بنالیں گے۔
سکھ صاحبان بھی رام پرشاد کو کہنے لگے کہ یہ لوگ اتنی

محبت سے کھانے کی آفر کر رہے ہیں تو منع مت کرو۔
اس بات پر وہ چپ کر گئے اور ہم نے خاموشی نیم

رضا مندی سمجھی۔ ٹیلی فون نمبروں کے تبادلے کے بعد
ویک اینڈ پر ملاقات کا وعدہ کر کے سب اپنی اپنی راہ

لگے۔
ہم یہاں سے فراغت کے بعد ذرا آگے بڑھے تو

ایک صاحب ہمارے صاحب بہادر کی جانب لپکے۔
”سینے صاحب! کیا آپ پاکستانی ہیں؟ انہوں نے

مصافحے کے لیے ہاتھ ہمارے صاحب کی جانب
بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں.....!“ ہمارے صاحب نے قدرے
حیران ہوتے ہوئے جواب دیا۔ میں بھی پاکستانی

ہوں..... فیصل آباد کا رہنے والا ہوں..... اتنا کہہ کر
انہوں نے وہی کہانی سنائی کہ جو ہر بیرون ملک جانے والا

سناتا ہے کہ گھر میں ڈالرز کے انبار لگانے کے چکروں میں
وہ روزگار کی تلاش میں جرمنی چلے آئے تھے مگر ایک سال

کا عرصہ گزرنے کے باوجود بے روزگار تھے۔ اور بے
روزگاری الاؤنس سے نا صرف خود کسمپرسی کی حالت میں

گزارہ کر رہے تھے بلکہ کچھ نہ کچھ بچا کے گھر والوں کو بھی
نومبر.....

دراصل جرمنی میں پارکنگ کا منظم طریقہ ہے۔ پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کرنے والی جگہ کے ساتھ چھوٹا سا کھمبالا ہوتا ہے جس پر ایک میٹر نصب ہوتا ہے۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد آپ اپنا پارکنگ ٹائم اس میٹر میں سیٹ کرتے ہیں اور پھر نہیں جاتے ہیں اور اپنا پارکنگ ٹائم اور ہونے سے قبل لوٹ آتے ہیں۔ مگر ہمیں چوں کہ اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ سو ہم اپنے پارکنگ ٹائم سے لیٹ ہو چکے تھے۔ نتیجتاً جرمانہ ہو گیا تھا۔

خیر یہاں سے باہر نکلتے ہی ہم ایک بار پھر بٹ صاحب کے گھر کی تلاش میں رواں دواں تھے۔ کئی سڑکیں پھرنے اور کئی گلیوں میں رلنے کے بعد بالآخر بٹ صاحب کا گھر ملا۔ ہم نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔

کچھ دیر توقف کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بے حد موٹی سی خاتون نے سر نکال کر باہر جھانکا۔ اس کے نوزلہ جیسے بال آپس میں الجھے ہوئے تھے جنہیں اس نے مزید ہتھم کٹھا کر کے اور ایک گرہ دے کر کلیپ میں جکڑ لیا تھا۔

قدرتی طور پر اس کی رنگت سرخ و سفید ہونے کے باوجود منہ دھلا ہوا انیس لگ رہا تھا اور چہرے پر اذلی سستی چھائی ہوئی تھی۔

پہلے تو اس نے اپنا بھاڑ سامنے پھاڑ کر اک زوردار جھانکی لی اور پھر ہم سے وہاں قدم رنجہ فرمانے کا مقصد پوچھا۔

صاحب نے اپنی تشریف آوری کا مقصد بیان فرمایا۔

”بوٹ صاحب تو گھر پہنچے ہیں۔“ اس نے بے زاری سے اطلاع دی۔ بٹ صاحب کے لیے ”بوٹ صاحب“ کا لفظ سن کر تو ہماری بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ مگر ہم نے فوراً ہنسی کو بریک لگائے اور چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔

سے بولے اور کسی ”بٹ صاحب“ کی دکان کا رستہ سمجھانے لگے جہاں ناصر ف پاکستانی مریج مصالحو ملتے تھے بلکہ رسائل و کتب بھی موجود تھیں۔

ان صاحب سے رخصت ہونے کے بعد ہمارے قدم تیزی سے بٹ صاحب کی دکان کی تلاش میں آگے بڑھنے لگے۔ آخر کافی دور چلنے کے بعد بٹ صاحب کی دکان ملی بھی تو ہند پڑی تھی۔

صاحب نے ساتھ والی دکان سے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت بٹ صاحب اپنے گھر پائے جاتے ہیں۔ عرصہ دراز سے بٹ صاحب نے کسی جرمن عورت سے شادی کر رکھی تھی اور پھر اپنا بزنس سٹیل کرنے کے بعد یہیں کے ہو رہے تھے۔

ساتھ والے دکان دار نے بتایا کہ بٹ صاحب ڈائجسٹ اور رسالے وغیرہ گھر پر ہی رکھتے ہیں اور جسے خریدنے ہوں ان کے گھر سے لے لیتا ہے۔

یہ جاننے کے بعد صاحب نے ساتھ والے دکاندار سے بٹ صاحب کے گھر کا ایڈریس لیا اور ہم دوبارہ پارکنگ ایریا کی جانب چل دیے جہاں ہماری گاڑی کھڑی تھی۔

کافی دور دوبارہ پیدل چلنے کے بعد پارکنگ ایریا تک آئے تو سامنے ہی وینڈسکرین کے ساتھ ہمارے لیے جرمانے کی چٹ رکھی تھی۔

”یہ کیا ہو گیا؟“

صاحب ابھی چٹ اٹھا کر پڑھنے ہی لگے تھے کہ سامنے سے وردی میں انسپکٹر ایس آئی دکھائی دی۔

”آپ لوگ میٹر پر پارکنگ ٹائم دو گھنٹے لگا کر گئے تھے جبکہ آپ کو تین گھنٹے سے زائد ٹائم لزر چکا ہے۔ لہذا یہ جرمانہ جمع کروا دیجئے گا۔“

اس نے ہمیں حیران و پریشان دیکھ کر وضاحت کی۔ ”اوکے“ صاحب نے ضروری کارروائی کے بعد گاڑی پارکنگ ایریا سے باہر نکالی۔

اگر گھر پر رسائل و کتب موجود ہیں تو کیا ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں؟ صاحب نے پوچھا۔

وہ خاتون کچھ دیر خاموش کھڑی سوچتی رہی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ ہمیں اندر آنے دے یا نہیں۔ پھر اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی اور سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔

یہ گویا گھر میں داخل ہونے کا اجازت نامہ تھا۔ جیسے ہی گوشت کا پھاڑ دروازے سے سرکا تو ہم اندر داخل ہوئے اور حیران رہ گئے۔

اب تک تو ہم جرمن لوگوں کی صفائی و ستھرائی اور نظم و ضبط و سلیقہ سے بے حد امپریس تھے مگر یہاں آکر شپٹا کر رہ گئے۔

یہ گھر کسی طور پر بھی نفیس طبع جرمن خاتون کا گھر نہیں لگ رہا تھا بلکہ ایک لمبے کوٹو ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہم غلطی سے فیصل آباد، گوجرانوالہ یا لاہور کے کسی گنجان آباد محلے کے ایسے گھر میں داخل ہو گئے ہیں جہاں چاروں طرف بدسلیقہ و بدانتظام خاتون خانہ کے پھوہڑ پن کے اشتہار لگے ہوئے ہیں۔

لاؤنج کے صوفوں پر سوکھتے بچوں کے نہالے اور کپڑے۔

سینئر ٹیبل پر بکھری رنگین، پنسلین، پینسل تراش سے نکلنے والا کوڑا اور کاغذوں کے پھنے ہوئے ٹکڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ سامنے ہی ڈائننگ ٹیبل پر سنے ہوئے برتن پڑے تھے۔

اور کمرے کے دروازے کے ساتھ گھر بھر میں استعمال ہونے والی چپلوں اور جوتوں کا جمعہ بازار لگا ہوا تھا۔

بیدروم کے ادھ کھلے دروازے سے بلند آواز میں چلتی ٹی وی اور بچوں کے شور و غل کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔

ہمارے اندازے کے مطابق اس وقت گھر میں تین سے چار بچے موجود تھے۔ جو اندرا دھم بچار ہے تھے۔

ہمیں اس طرح حیران و پریشان کھڑے دیکھ کر اس خاتون نے ایک سٹور نما چھوٹے سے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ اور ہم یہ سمجھ کر کہ ”رسالے وہیں ہیں“ آگے بڑھ گئے تھے۔

پرانے رسالوں اور کتابوں کے اس بے ترتیب انبار میں سے اپنا مطلوبہ ڈائجسٹ یا رسائل ڈھونڈنا ایسے ہی تھا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کرنا۔

پھر بھی ہم نے ہمت کر کے دو چار انڈین و پاکستانی ڈائجسٹ ڈھونڈ ہی لیے اور انہیں ہاتھ میں لیے باہر آئے۔

تب بوٹ صاحب کی بیگم امیران باندھے کچن میں جانے کی تیاریوں میں تھیں شاید۔ ازراہ کرم ان رسائل کی قیمت بتا دیجئے۔ صاحب نے خاتون کو مخاطب کیا۔ جواباً اس نے حسب عادت اپنی ٹھوڑی کھجائی، کچھ دیر سوچا۔ اور اپنی مولیٰ سی ستون نما گردن نفی میں ہلا دی۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔ یہ سب تو بوٹ صاحب ہی بتا سکتا ہے۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔

”تو بوٹ صاحب سے کب ملاقات ہو سکے گی؟“ صاحب نے پوچھا۔

”پتہ نہیں..... وہ تو کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”مگر ہم تو بہت دور سے ڈائجسٹ خریدنے آئے تھے..... اب ہم کیا کریں؟“ صاحب بڑبڑائے۔

”میں تو اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“ وہ مسکرائی۔

”تو پھر ہمیں ڈائجسٹ دیکھنے اندر کیوں بلایا تھا۔ ہمارا اتنا وقت برباد کر دیا اس مولیٰ نے۔“ صاحب زیر لب

اردو میں بڑبڑائے اور پھر خاتون کی معذرت قبول کرتے ہوئے خود بھی مسکرا دیئے۔ ہاتھ میں پکڑے رسائل لیڈی کو تھمائے اور اجازت چاہی۔

”بوٹ صاحب کے لیے کوئی پیغام؟“ خاتون نے پوچھا۔

ہم پھر چکر لگالیں گے۔ بس ہمارا سلام دے دینا۔
صاحب نے کہا اور ہم باہر نکل آئے۔

☆☆☆

یوں تو ہماری جرمن لینڈ لیڈی بے حد اچھی خاتون تھی۔

جب بھی کوئی خاص ڈش بناتی تو بڑی سی پلیٹ میں لیے دوڑی چلی آتی۔ اور اکثر ہم سے پوچھتی رہتی تھی کہ تمہیں ہم سے کوئی شکایت تو نہیں..... یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ اگر کوئی مشکل درپیش آئے تو ہم سے کہنا۔ اور ہم اسے مسکرا کے ”سب ٹھیک ہے بے حد شکریہ“ کہہ کر ٹال جاتے تھے۔

اب بھلا ہم اسے کیسے کہتے کہ سب سے بڑی تکلیف تو ہمیں اس کی شوخ و چہلچل جو ان بنی سے تھی۔ جو اپنے قاتلانہ حسن اور کافرانہ اداسوں سے کسی بھی مرد کو گھٹا کر کرنے اور وفا شعار بیویوں کے کلیجے میں خنجر گھونسنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔

اگرچہ ہمارے ”صاحب“ ایسے گرے پڑے نہیں تھے کہ بدیسی میموں کی سنہری زلفوں کے جال میں گرفتار ہو جاتے۔ اور ہمیں ان پر پورا بھروسہ تھا۔ مگر اس کے باوجود جب وہ ہر ماہ ایک مخصوص طے شدہ تاریخ پر مکان کا کرایہ دینے نیچے لینڈ لیڈی کی طرف جایا کرتے تھے تو ناجانے کیوں ہم پر بلاوجہ ہی گھبراہٹ طاری ہونے لگتی تھی۔ اگرچہ ہم ان سے کچھ کہتے نہیں تھے مگر ہمارا دل چاہتا تھا کہ ہمارے صاحب بہادر لینڈ لیڈی کے ہاتھ میں کرایہ تھماتے ہی اگلے قدموں واپس پلٹ آئیں۔ مگر ہماری لینڈ لیڈی اتنی خوش اخلاق تھی کہ چائے کافی سے تواضع کیے بغیر انہیں واپس آنے ہی نہیں دیتی تھی اور نا، ناں کرتے بھی گھنٹہ دو گھنٹہ بٹھا کر ان سے پاکستان کے بارے میں سوالات کرتی رہتی اور پاکستان کے رسم و رواج کے بارے میں معلومات لیتی رہتی تھی۔ یا پھر اپنے پرالہمز ڈسکس کرتی رہتی تھی۔

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ صاحب ہمیں بھی ہر

بار اپنے ساتھ لینڈ لیڈی کی طرف چلنے کے لیے کہتے تھے۔ مگر ہمیں جرمن زبان تو آتی نہیں تھی سوان کے ساتھ جا کر ٹکر ٹکر سب کا منہ دیکھنے کے بجائے ہمیں مناسب لگتا تھا کہ گھر پر رہ کے کام کاج نمٹالیں۔ اور ہم خوش دلی سے صاحب کو اجازت دے دیا کرتے تھے کہ وہ جا کر کرایہ دے آئیں۔

مگر جب وہ لینڈ لیڈی کی طرف جاتے تو ہمیں اک عجیب سی بے چینی آگھیرتی تھی۔ جسے ہم کوئی نام نہیں دے سکتے تھے۔ اور پھر ایک دن ہماری یہ بے چینی بھی ختم ہو گئی۔

ہوا کچھ یوں کہ میں اور صاحب اپنے بیٹے کے ہمراہ ایک روز باہر سے آئے تو لینڈ لیڈی کی خوبصورت بیٹی اپنے ایک دیو جیسے بوائے فرینڈ کے ساتھ کہیں باہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ”کھڑی“ کا لفظ شاید ہم نے غلط استعمال کیا ہے جبکہ کہنا چاہیے تھا کہ ”لپٹی“ کھڑی تھی۔

اور اس سے دو ہاتھ اونچے، بے حموٹے تازے، بوائے فرینڈ نے اسے اپنی بغل میں بری طرح دبوچا ہوا تھا اور اپنی براؤن لمبی سی داڑھی لڑکی کے گلابی رخساروں پر پھیر رہا تھا۔

لڑکی کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کی اس حرکت کو بے حد انجوائے کر رہی ہے۔ سچی بات بے بات کھلکھلاتی اس کی بغل میں بے بس چڑیا کی طرح دبی، اس کے تنور نما پیٹ پر ہاتھ پھیرتی، ہنسی مسکراتی چلی آ رہی تھی۔

اس کے بوائے فرینڈ نے اسی ”کیفیت“ میں ہمارے صاحب سے ہاتھ ملایا اور نہایت خوش اخلاقی سے خیر خیریت معلوم کی، اور پھر وہ اور ہم اپنی اپنی راہ لگے۔

ہماری جانب ایک اخلاقی مسکراہٹ اچھالی۔ لینڈ لیڈی کی نازک اندام پھول سی بچی کو اس داڑھی والے مسنڈے پر بوجھ کی طرح لدے دیکھ کر یکبخت ہمارے ذہن کا سارا بوجھ اتر گیا اور ہم خواہ مخواہ ہی مسکرا دیئے تھے۔

بعد میں ہمارے پوچھنے پر صاحب نے تفصیل سے بتایا کہ اس لڑکے کو تو وہ اکثر لینڈ لیزڈی کے گھر میں اس کی بیٹی کے ساتھ چہلمیں کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ اکثر ادھر ہی آیا رہتا تھا۔

بطور خاص ویک اینڈ کی دوراتیں لینڈ لیزڈی کے گھر اس کی بیٹی کے بیڈ روم میں ساتھ گزارتا تھا۔ صاحب نے بتایا کہ میں جب بھی کرایہ دینے جاتا ہوں۔ ان کے گھر میں اسی قسم کے سین چل رہے ہوتے ہیں۔

اور اگر لڑکی کا بوائے فرینڈ نہ آیا ہو تو وہ لڑکی اس سے ملنے لگتی ہوتی ہے۔ اور اس کی ماں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ندادی منہ باتی ہے۔

”حیرت ہے۔“ ہم نے کہا۔
”حیرت کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں اس لڑکی کی ماں اور دادی نے بھی یہی کچھ کیا ہوگا۔ یہ تو ان کے کچھ کا حصہ ہے بیگنی۔“ صاحب نے ہمیں رسان سے سمجھایا۔
”بس کبھی کبھی مجھے ایک بات پر حیرت ہوتی ہے۔“ صاحب نے کہا۔

”وہ کیا.....؟“ ہم نے پوچھا۔

”یہ لڑکی اتنی خوبصورت ہے، اس کی رفاقت کے لیے تو کئی خورہ اور بیڈسٹم لڑکے ترستے ہوں گے تو اس نے اس دیونا بھالو جیسے بد صورت لڑکے کو اپنے لیے بطور بوائے فرینڈ کیوں پسند کیا۔“

ہم صاحب کی بات سن کر ہنس پڑے۔

”بات صرف اتنی ہے کہ یہ لڑکی حسین ہی نہیں بلکہ ذہین بھی ہے۔ اور عام اہالی لڑکیوں کی طرح کسی مرد کے صرف ظاہری حسن پر نہیں مرتی۔ اس دیونا لڑکے نے اس لڑکی کا دل ہی نہیں بلکہ انتہائی جیتا ہوگا بھی تو وہ اس پر دیوانہ وار غارتہور رہی تھی۔ بعض اوقات انسان کو کسی کی باطنی خوبصورتی بھی متاثر کر دیتی ہے اور پھر بد صورت ہونے کے باعث فوری طور پر کسی اور لڑکی کے متوجہ ہونے کا ذریعہ بھی تو نہیں ہے۔“ ہم نے کہا تو صاحب مسکرا دیئے۔

یقیناً انہیں ہمارا جواب پسند آیا تھا۔

”ہو سکتا ہے کہ اس جواب کی بدولت اس وقت وہ دل ہی دل میں ہمارا شمار بھی ذہین خواتین میں کر رہے ہوں۔“ یہ سوچ کر ہم بھی مسکرا دیئے تھے۔

☆☆☆

ہمارے صاحب کے ساتھ ان کے باس ایک جرمن کرنل کلاؤز وولف تھے۔ ایک بار انہوں نے ہمیں اور صاحب کے ایک اسٹنٹ، جو نیوز افسر کیپٹن پاؤلی کو فیملی سمیت اپنے گھر ذریعہ انوائٹ کیا۔

ایک تو دعوت اور پھر وہ بھی صاحب کے باس کی جانب سے۔ سوانکار کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس لیے مقررہ وقت پر تیار ہو کے چلے گئے۔ کیپٹن پاؤلی ہم سے پہلے اپنی فیملی سمیت ہمارے استقبال کے لیے وہاں موجود تھا۔

کرنل وولف کی بیوی ہمیں سنجیدہ مزاج، بااخلاق اور گریس فل لگی جبکہ کیپٹن پاؤلی کی ڈبل روٹی کی مانند پھولی پھولی سی بیگم ہمیں قدرے شوخ اور نٹ کھٹ سی لگی۔

ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ جہاں پہلے سے جام و جم کا دور چل رہا تھا۔

ہمارے لیے بھی فوراً ڈوگلاس لائے گئے اور شیمپن کی نئی بوتل کھل گئی۔ ”سوری ہم تو شراب نہیں پیتے۔“ ہم میاں بیوی کی معذرت پر یکدم وہاں سناٹا چھا گیا۔
”دوستوں کی محفل میں ان کی خوشی کے لیے بھی نہیں پی سکتے؟“ کرنل وولف نے سوال کیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میرا جواب اب بھی ”نہیں“ میں ہوگا۔“ صاحب نے شرمندگی سے معذرت چاہی۔
تب کرنل کی بیوی ہمارے لیے پیپسی لے آئی۔

کرنل..... کا ایک بیٹا تھا۔ بمشکل تمام آٹھ برس کا ہو گا اور کیپٹن پاؤلی کی ایک سات سالہ بیٹی تھی۔ دونوں کھیلنے لگے تو ہمارے بیٹے کو بھی ساتھ ملا لیا۔ حالانکہ وہ ابھی بمشکل سوا سال یا ڈیڑھ سال کا تھا۔

ایک عرصے تک وہاں حکمرانی کی۔ ہم وہاں جا کر عہد رفتہ کی یادوں کے دریچوں سے قریب کی اذانوں کی بازگشت سننا چاہتے تھے۔

مسلمانوں کی عظمت کے نقوش تلاشنا چاہتے تھے۔

حالانکہ اہل مغرب سیاہ چمکدار بالوں پر جان چھڑکتے ہیں اور اپنے سنہری بالوں کو سیاہ رنگت کا شید دے کر خوشی محسوس کرتے ہیں مگر ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ چین کے باشندوں کو اپنے سیاہ چمکیلے بالوں سے کیوں نفرت ہے۔ مگر اس کے باوجود چین جانا چاہتے ہیں اور مسلم عہد رفتہ کے نقوش پاتااش کرنے کے علاوہ وہاں کی بل فائننگ دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہم بل فائننگ رنگ کے نزدیک سب سے قریبی کرسی پر بیٹھ کر یہ مقابلہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بدن میں وہ سنسنی محسوس کرنا چاہتے ہیں جو پہلی بار بل فائننگ کے میدان میں اترتے وقت نوجوان بل فائنر کے جسم میں دوڑتی ہوگی۔

ہم جیتنے والے بل فائنر کو اپنے ہاتھ سے تھپکی دینا چاہتے ہیں اور ریشموں سے چور چور، بہادر نیل کا گوشت کھانا چاہتے ہیں جس نے آخری دم تک جم کے مقابلہ کیا تھا اور ہار نہیں مانی تھی۔

ہم چین کے اس تہوار میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ جس میں لوگ گلی کوچوں میں پھرے ہوئے بیلوں کے آگے پوری قوت سے دوڑتے ہیں اور موت کو تیزی سے تعاقب میں آتے دیکھ کر زندگی بچانے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں اور جو گر جاتے ہیں وہ کچلے جاتے ہیں یا روندے جاتے ہیں۔

ہمیں چونکہ کچلے اور روندے جانا پسند نہیں ہے۔ اس لیے یہ چین جا کر دیکھا جائے گا کہ ہم اس خونخواری کھیل کا حصہ بنیں گے یا نہیں۔ فی الحال تو ہم اس کھیل کے بارے میں مسز پاؤلی سے معلومات لے رہے تھے۔

”اچھا ویز..... تم اتنی دیر یہ میگزین دیکھو، میں مسز وولف کے ساتھ ذرا بچن میں مدد کر دوں۔ میرا خیال ہے

کرنل کی بیگم نے اپنے بچے کو اشارہ کیا تو وہ ایک بڑا سا لکڑی کا ٹھیلہ، جس کے نیچے پہلے لگے ہوئے تھے دھکیلتا ہوا لے آیا۔ اس ٹھیلے میں بے شمار کھلونے بھرے ہوئے تھے۔

ماں کے اشارے پر بچے نے ٹھیلے کے سارے کھلونے قالین پر اتار دیئے۔

یہاں سے وہاں تک قالین پر رنگ برنگے ربڑ، پلاسٹک و لکڑی کے طرح طرح کے کھلونے بکھر گئے۔

”بس اب اپنے بیٹے کو آرام سے کھیلنے دو۔ یہ تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔“

کرنل کی بیوی نے شستہ انگریزی میں کہا۔ اور وقتی ہمارے بیٹے نے ہمیں دو تین گھنٹے تک بالکل بھی تنگ نہیں کیا اور آرام سے کارپٹ پر بیٹھا کھلونوں سے کھیلتا رہا۔

کیپٹن پاؤلی کی بیٹی اور کرنل کا بیٹا بھی وہیں بیٹھ کر بلاکس سے بلڈنگ بنانے لگے۔

بچوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا اور آغاز تعارف سے کیا گیا۔

جب معلوم ہوا کہ کیپٹن پاؤلی خود تو جرنل ہیں مگر ان کی مسز سٹینش یعنی سپین سے تعلق رکھتی ہیں تو ہماری دلچسپی بڑھ گئی۔

مگر وہ ہمارے بارے میں یہ جان کر کہ ہم مسلمان ہیں ہم سے ذرا کھینچ سی گئی تھی۔

اس کے رویے کا یہ فوری بدلاؤ ہمارا وہم ہرگز بھی نہیں تھا۔

تاہم ہم اپنے تجسس سے مجبور ہو کر اس سے سپین کے بارے میں معلومات لینے لگے۔ بطور خاص بل فائننگ کے بارے میں۔

کیوں کہ اس کھیل میں ہماری خصوصی دلچسپی تھی اور ہماری خواہش سے کہ زندگی میں ایک بار سپین ضرور جائیں۔ اور وہ جگہ دیکھیں جسے مسلمانوں نے فتح کر کے

دفعاً ایک خیال ہمارے ذہن میں آیا اور ہم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”میں ذرا کھانے کے برتن میز پر لگانے میں مسز وولف کی مدد کر دوں۔“

ہم نے صاحب سے کہا اور کچن کی جانب چل دیئے۔

”تمہاری بیوی بے حد حسین اور دلکش خاتون ہے۔“
 ہمیں اپنے پیچھے سے کرنل وولف کی آواز سنائی دی۔
 ”کیوں نہ ہو..... آخر میرا انتخاب ہے۔“

صاحب نے کھلے دل سے اعتراف کیا اور تفصیل بتانے لگے کہ کس طرح ہم دونوں نے بطور جیون ساتھی ایک دوسرے کا انتخاب کیا اور ایک دوسرے کے خاندانوں کی شدید مخالفتوں کے باوجود شادی کی۔

”مجھے بتائیے کیا کام کرنا ہے، میں بھی کچن میں آپ کا ہاتھ بٹانے آئی ہوں۔“ ہم نے مسز وولف سے کہا تو وہ حیران رہ گئی۔

”ارے نہیں رہنے دو، ویسے بھی تم تو مہمان ہو۔“
 اس نے گرم کری ڈش میں اندیلیتے ہوئے جواب دیا۔
 ”یہ بھی تو مہمان ہے مگر تمہاری مدد کر رہی ہے۔“

ہم نے مسز پاؤلی کی جانب اشارہ کیا۔
 ”اس کی بات اور ہے..... یہ تو اکثر آتی جاتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ مہمانوں والا کوئی تکلف نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو میری گہری دوست ہے۔ مسز وولف نے کہا۔

اگر تم میرے ساتھ مہمانوں والا تکلف نہیں رکھو گی تو میں بھی آئندہ آتی جاتی رہوں گی اور کوشش کرو گی کہ تم مجھے بھی اپنی دوستوں میں شمار کر سکو..... اس کی طرح۔“
 ہم نے ایک بار پھر مسز پاؤلی کی طرف اشارہ کیا۔
 جواباً مسز وولف ہنس پڑی اور ہمارے گلے آ گئی۔

تمہارا اچانکیت بھرا انداز یہ محسوس نہیں ہونے دے رہا کہ تم پہلی بار میرے گھر آئی ہو۔ میں ابھی سے تمہیں اپنی گہری سہیلی محسوس کرنے لگی ہوں۔“ اس نے محبت سے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیا۔

کہ وہ میز پر کھانے کے برتن لگانے کے لیے اٹھی ہے۔“
 مسز پاؤلی نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ بجا کر ایک میگزین ہماری جانب بڑھایا اور خود مسز وولف کی مدد کے لیے کچن میں چلی گئی۔

ہم نے دیکھا کہ مسز پاؤلی کے بال بھی پنکدار سیاہ تھے اور اس کی سرخ و سپید رنگت پر بہت سوٹ کر رہے تھے۔ مگر اس کی آنکھوں میں مسلمانوں کے لیے نفرت کی جو چنگاری سلگ رہی تھی۔ وہ ہمیں بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

لیکن اس نفرت کا کافی الحال ہمارے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ اس لیے چپ چاپ میگزین کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔ میگزین جرمن زبان میں تھا سو صرف تصاویر دیکھنے پر اکتفا کر رہے تھے۔

اچانک ہمیں اک عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہم نے نظریں اوپر اٹھائیں تو کرنل وولف کو دیوانوں کی طرح اپنی جانب تکتے ہوئے پایا۔ کسی کو دیکھنا کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں مگر اس کی آنکھوں میں جو حریصانہ چمک تھی۔ وہ ہمیں بہت ناگوار گزری۔

مگر کیا کر سکتے تھے۔ سو دوبارہ میگزین کی جانب متوجہ ہو گئے۔ لیکن تھوڑی سی دیر میں پھر بہت عجیب سا احساس ہوا اور جو نہی نظریں اوپر اٹھائیں تو کرنل وولف کو اسی وارفتگی سے اپنی جانب تکتے پایا۔

جیسے ہی نظریں چار ہوئیں۔ اس کے لبوں پر لوفرانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جسے چھپانے کے لیے اس نے شراب بھرا جام اپنے ہونٹوں سے لگایا۔

ہمارے صاحب اور مسٹر پاؤلی نہایت گرم جوشی سے کسی مسئلے کے حل کی تلاش میں مصروف گفتگو تھے۔

لیکن مسٹر وولف ان کی باتوں سے بے نیاز بے دلی سے ہوں ہاں کرتے پوری طرح ہماری جانب متوجہ تھے۔ پہلے سوچا چہرے کے آگے میگزین تان لیں کہ جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں مگر یہ بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔

”تو پھر مجھے بتاؤ..... میز پر کون سے برتن لگانے ہیں۔“ ہم نے کہا تو اس نے ایک شیلٹ میں موجود برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور ہم برتن نکالنے لگے۔

کھانے میں چکن کری (پھینکی اور بد مزہ) تھی۔ موٹے چاولوں اور فش کے ساتھ طرح طرح کے سلاؤ، بند گو بھی، انڈے اور بیسن تھے۔

ہم نے فش، سلاؤ اور بیسن (beans) برزور رکھا۔ البتہ ہمارے بیٹے کو چاول اور چکن کری اچھی لگی تھی شاید۔ اور وہ رغبت سے ہمارے ساتھ بے پی چیز پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ سویٹ ڈش میں بیکڈ پڈنگ تھی۔

پڈنگ ہمیں ویسے ہی پسند نہیں ہے۔ ذرا سی پیچ پر لے کر بیٹے کو کچھائی تو اس نے بھی فوراً اپنے بپ پر اگل دی۔

”اس کا شاید پیٹ بھر گیا ہے۔ اسی لیے پڈنگ نہیں کھانا چاہ رہا۔“ یہ کہہ کر ہم نے اپنی خفت مٹائی اور بیٹے کا بپ تبدیل کر دیا۔

کھانے کے بعد ہم نے مسز وولف اینڈ مسز پاؤلی کے ہمراہ مل کر کھانے کے سارے برتن سمیٹے۔ نیبل صاف کرائی۔

جبکہ مسز پاؤلی نے برتن دھونے کے لیے آستینیں چڑھائی تھیں۔ مسز وولف برتنوں کو لیکوڈ جیل لگا رہی تھی اور مسز پاؤلی ٹل کے پانی سے کھنگال کر انہیں ایک طرف رکھتی جا رہی تھی۔ ہم نے ایک صاف کپڑا لیا اور دھلے ہوئے برتن پونچھ پونچھ کر واپس ان کی جگہ پر لگانے لگے۔

ساتھ میں گپ شپ بھی جاری تھی۔ جب ہمیں معلوم ہوا کہ مسز وولف تو صبح کسی دوسرے شہر اسکیٹنگ کے لیے جا رہی ہے تو ہم حیران رہ گئے۔

”صبح تم لوگ جا رہے ہو تو اب آرام کرتے ناں..... یہ کھانے کا تکلف کیوں کر لیا تھا؟“

”ہم لوگ“ نہیں صرف میں جا رہی ہوں..... میرا خاندان نہیں رہے گا۔“ دراصل بہت عرصے سے گھر پر رہ کر بور ہو گئی تھی تو دوستوں کے ساتھ اسکیٹنگ پر جانے کا پروگرام بن گیا۔

برف پر پھسلنے میں مجھے بے حد مزا آتا ہے اور میں اپنے آٹھ سالہ بیٹے کو بھی سکھانا چاہتی ہوں کہ برف پر سے پھسلنے وقت بورڈ پر توازن کس طرح قائم رکھنا ہے اور خود کو کیسے سنبھالنا ہے۔

تم پریشان مت ہو..... مجھے صبح سات بجے گھر سے ایئر پورٹ کے لیے نکلنا ہے۔ اور میں نے اپنی اور بیٹے کی ساری تیاری مکمل کر رکھی ہے۔ اگر آج تمہیں کھانے پر نہ بلاتی تو پھر بہت لیٹ ہو جاتی۔ مسز وولف نے کہا۔

”سنو..... بہت ہو گیا کام..... اور کچن میں ہماری ہیلپ۔ اب تم اندر چل کے بیٹھو..... ہم کچھ دیر تک کافی بنا کر لاتے ہیں۔“ مسز پاؤلی نے کہا اور زبردستی ہمیں کچن سے باہر تھکیل دیا۔

ناچار ہم دوبارہ مردانہ محفل میں آن بیٹھے۔ اب پھر مسٹر وولف کی بے باک نظریں ہمیں اور ہم۔ اس کا شاید بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمیں گھول کے پی جاتا۔

”منحوس..... دیدے پھوٹیں اللہ کرے۔“ ہم زرب لب بڑبڑائے۔

ہماری اس بڑبڑاہٹ کا مسٹر وولف پر الٹا اثر ہوا اور اس نے ایک زوردار ”ہوائی بوسہ“ ہماری جانب اچھالا۔

”الو کا پٹھا۔“ صاحب نے تپ کر فوراً اسے با آواز بلند گالی دی۔

بھلا اردو میں دی گئی گالی کا اس پر کیا اثر ہونا تھا۔ وہ تو بس مسکرائے گیا۔

اتنی دیریں میوزک آن کر دیا گیا۔

مسٹر وولف کا بیٹا اور مسٹر پاؤلی کی بیٹی ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالنے ”پبل ڈانس“ کرنے لگے۔

ان کے برسٹیپ پر مسٹر پاؤلی اور مسٹر وولف تالیاں

بجا کر انہیں داد دیتے اور بچوں کے رقص میں گرم جوشی اور شدت بھر جاتی۔

”کیا میں تمہاری بیوی کے ہمراہ رقص کرنے کا شرف حاصل کر سکتا ہوں؟“

”جانے مسٹر وولف کو اچانک کیا سوچھی تھی کہ اس نے گلاس کے پینڈے میں بچے ہوئے شراب کے آخری چند گھونٹ اپنے حلق میں انڈیل کر خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے بے ساختہ ہمارے صاحب سے پوچھ لیا تھا۔

”بالکل بھی نہیں..... ہمارے ہاں ایسی باتوں کو بے حد مائنڈ کیا جاتا ہے مسٹر وولف۔ دوبارہ ایسا سوچنا بھی مت۔“ صاحب نے مکمل سنجیدگی سے جواب دیا۔ ان کے لہجے کی غراہٹ اور پیشانی پر پڑے ہل کر نل وولف کو فوراً پسپائی پر مجبور کر گئے۔

”آئی ایم سوری..... مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“ اس نے فوراً معذرت کر لی۔

”کوئی بات نہیں..... بس آئندہ متاثر رہنا۔ پاکستانی اپنی خواتین کے معاملات میں بے حد حساس ہوتے ہیں۔“

صاحب نے دھیرے سے کہا۔

ماحول خاص تلخ ہو چلا تھا، جسے تلخ کافی حلق سے اتارنے کے دوران ہلکی پھلکی گپ شپ سے خوشگوار بنانے کی کوشش کی گئی۔ مگر بات پھر بھی بن نہیں پائی۔

تب کافی پیتے ہی ہم نے اپنے میز بانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت چاہی۔

”ارے ابھی ہے؟“ مسٹر اینڈ مسز وولف حیران رہ گئے۔

سارے کاموں سے فرصت پانے کے بعد اب تو مل بیٹھ کے گپ شپ کا مزا آتا تھا۔ مسز وولف نے کہا۔

”درست..... مگر ہمارا بچہ نیند سے بے چین ہے اور اسے اپنے بستر کے سوا کسی جگہ سکون سے نیند نہیں آتی۔“

ہم نے غدار تر شاہ۔ ہمارا بیٹا واقعی اس وقت گھر جانے کے لیے بے تاب تھا اور اپنی خفگی کا اظہار ہماری گود میں دائیں

بائیں لٹک کر اور چوں چوں کرتے ہوئے کر رہا تھا۔ ہمارے لیے اسے سنبھالنا دو بھر ہو رہا تھا۔

”اچھا..... اگر اتنی مجبوری ہے تو جاسکتے ہو۔“ مسٹر وولف نے گویا دل پر پتھر رکھ کے ہمیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

ہمیں اس بات کا علم تھا کہ دعوت کے بعد اگر جرمن میزبان سے جلد رخصت ہونے کی اجازت طلب کی جائے تو اسے انتہائی بد اخلاقی اور ناشائستگی کے زمرے میں لیا جاتا ہے۔

جبکہ جرمن معاشرے کی اخلاقی روایات کے مطابق مہمان کھانے کے بعد گھنٹوں اپنے جرمن میزبان کے ہمراہ موجود رہتا ہے، شراب کا دور چلتا رہتا ہے اور گپ شپ جاری رہتی ہے۔ ذہن کے بعد اسی طرح اکثر رات گزر جاتی ہے۔

مگر ہم اتنی دیر بیٹھ کے بھلا کیا گپ شپ کرتے! جبکہ کھانا پیٹ میں اترتے ہی ہمیں تو حسب عادت نیند کے جھونکے تھپکیاں دے دے کرسلانے لگتے تھے۔

اس وقت بھی ہماری آنکھوں کے پونے نیند سے بوجھل تھے اور ہم سوچ رہے تھے کہ اگر کچھ دیر مزید وہاں ٹھہرنا پڑتا تو شاید ہم وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے او گھنے لگتے۔ گھر آتے ہی ہم نے بیٹے کے کپڑے بدلوائے۔ اس کا میسر چیخ کیا اور اسے بستر پر لانا کرسلانے لگے۔ جبکہ ہمارے صاحب اپنے جرمن میزبان مسٹر اینڈ مسز وولف کی میزبانی کو سراہنے اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ”تھینک یو“ کا کارڈ لکھنے میں مگن تھے۔

☆☆☆

اس دعوت کے اگلے روز دو پہر کو ہمارے گھر خود ان مسکھوں کی دعوت تھی جو اس روز ہمیں ششٹ گارڈ کے بازار میں رام پرشاد نامی ہندو کے ساتھ سر راہ ملے تھے۔

ہم نے کئی پاکستانی ڈشز بنائیں۔ جن میں روایتی پیاز، مٹن کا قورمہ، کو فٹے، چکن روست اور بیٹھے میں کھیر تھی۔

نومبر 68 2012

اتار رہے تھے اور مصوم بچوں کو نیزے کی انی میں پرو رہے تھے۔

”چلیے جانے دیجئے۔ جو وقت گزر گیا، اسے کیا یاد کرنا؟ آپ تسلی سے کھانا کھائیے۔“

ہم نے کہا اور بیٹے کے لیے کھانا نکال کر کچن میں چلے آئے۔

جہاں کھانے کی میز کرسیاں موجود تھیں۔ اور ہمارا بیٹا اپنی بے بی چیئر پر بیٹھا ہمارا منتظر تھا۔

اگر ہم یہ واقعہ اپنے سفر نامے میں آپ سے شیئر نہ کرتے تب بھی کچھ مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ رام پرشاد کا رویہ ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہوگا جو انڈین چینلزدیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔

سٹار پلس کے ڈرامے جن کی جان ہیں اور جو انڈین فلمی ہیروز اور ہیروز کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ انڈین پہنناوے کو پسند کرتے ہیں اور ہندوؤں کے ساتھ ان کے تہوار مناتے ہیں اور ہندو..... ذرا ان کا حال ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ایک مسلمان کے گھر کا کھانا تک کھانا پسند نہیں کرتے۔

”بھن جی..... آپ کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ ہے۔ واہ گورو دی سوں..... ایسا مزیدار کھانا جرنی آنے سے پہلے آخری بار اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا کھایا تھا یا آج کھایا ہے۔ کیسے بتاؤں کتنا سواوا یا۔“

کھانے کے بعد فوراً ہی ہمارے سکھ مہمانوں نے اجازت لی۔ مگر جانے سے قبل ہماری میز بانی کا شکر یہ ادا کرنا نہیں بھولے تھے۔

اور ایک دن وہ فیصل آبادی بھائی بھی آئے تھے جو ہمیں ششٹ گارڈ میں سردی سے کپکپاتے ہوئے فٹ پاتھنا پتے ملے تھے۔

انہوں نے ایک بھاری لفافہ صاحب کو تھماتے ہوئے التجا کی تھی کہ یہ خط پاکستان جاتے ہی پیرڈاک کر دیجئے گا تا کہ میرے گھر والوں کو جلدی مل جائے۔

”میری ماں میرے لیے بے حد پریشان ہے۔ وہ

اپنے بھارتی ہندو مہمان کے لیے بڑی احتیاط سے مٹر چاول، پالک پنیر اور کڑھی بناتی تھی۔

مگر یہ دیکھ کر ہمیں بے حد حیرت ہوئی کہ وہ مہمانوں میں شامل ہی نہیں تھے۔

”رام پرشاد کیوں نہیں آئے؟“ صاحب نے سکھ مہمانوں سے پوچھا۔

”اوچھڑو جی۔ اسی جے آگئے آں۔“ انہوں نے نالنے کی کوشش کی۔

اگر رام پرشاد گھر میں موجود ہیں تو میں خود جا کر انہیں لے آتا ہوں۔ صاحب نے کہا تو مجبوراً ہمارے سکھ مہمانوں کو بتانا پڑا کہ ان کے لاکھ کہنے پر بھی رام پرشاد اس لیے ان کے ہمراہ ہمارے گھر کھانے پر نہیں آیا کہ ایک مسلمان کے گھر کا کھانا کھانے سے اس کا دھرم بھر شٹ ہو جائے گا۔

وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتا ہے۔ بہتر ہے کہ اسے آپ رہنے ہی دیں۔ انہوں نے کہا تو ہمیں بے حد افسوس ہوا رام پرشاد کی سوچ پر۔

”بھن جی۔ بہت ادھی ہون دی لوڑنی۔ ایناں ہندوؤں داسلوک ہن سکھاں نال وی چنگا نئی ریا دوسی طراں نفرت کردینیں جس طراں 1947ء وچ مسلماناں دے ناں کردے سن۔“ ایک سکھ نے ہمیں تسلی دی۔

ماں مگر اس وقت تو مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے میں سکھ بھی کسی سے کم نہیں تھے بلکہ ہندوؤں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

ہمیں اعتراف ہے کہ اس موقع پر ہمیں اپنے سکھ مہمانوں سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ مگر ہم اپنی جذباتیت پر قابو نہیں پاسکے تھے اور بے ساختہ یہ بات منہ سے نکل گئی تھی۔

ہماری بات پر ہمارے سکھ مہمان بہت شرمندہ ہوئے اور بتایا کہ وہ آج تک اپنے پرکھوں کی اس غلطی پر نادم ہیں اس وقت وہ ہندوؤں کو اپنا دوست سمجھتے تھے اور ان کے سکھائے میں آکر مسلمانوں کے سینوں میں کرپائیں

روزانہ مجھے خواب میں دیکھتی ہے اور یاد کر کے بہت روتی ہے۔“

یہ بتاتے ہوئے خود بھی ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔

صاحب نے لغافہ لے کر ان سے خط پہنچانے کا وعدہ کر لیا تھا۔

انہی صاحب نے کئی پاکستانیوں کو ہمارا فون نمبر دے کر رابطہ کرنے کو بھی کہا تھا تاکہ ہم تنہائی محسوس نہ کریں۔ اور ہمارے پاس پاکستان کمیونٹی سے کچھ پاکستانی فیملیز کے ٹیلی فون بھی آئے جو ہم سے ملاقات کی خواہشمند تھیں مگر ہماری مصروفیات نے اس ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ ویسے بھی ان میں زیادہ تر وہ فیملیز تھیں جو جرمن حکومت سے پناہ حاصل کر کے خود ساختہ جلا وطنی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ ان میں اکثریت مرنیوں اور احمدیوں کی تھی۔ جو غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد مختلف ممالک میں جا کر آباد ہو گئے۔ اور ان ممالک میں باقاعدہ پناہ حاصل کر رکھی تھی۔

☆☆☆

جرمنی میں گزارا ہوا رمضان المبارک اور عید الفطر کا تہوار ہمیں کبھی نہیں بھولے گا۔

ہم سحری کے وقت کا الارم لگاتے۔ پھر اٹھ کر سحری بناتے۔ صاحب کو جگاتے۔ دونوں مل کے سحری کرتے۔ فجر کے وقت کا اندازہ کر کے نماز پڑھتے۔

پھر شام کو تھوڑا بہت افطاری کا اہتمام کرتے، کھانا کھاتے۔ مغرب کی نماز ادا کر کے چھوٹے مونے کام بناتے اور پھر گھر پر ہی باری باری نماز تراویح ادا کرتے۔ پہلے صاحب تراویح ادا کرتے اور ہم بیٹے کا دھیان رکھتے تھے پھر وہ بچے کو سنبھالتے تھے اور ہم نماز عشاء ادا کر کے نوافل وغیرہ پڑھ لیتے۔

کچی بات ہے کہ دور پردیس میں نہ رمضان گزارنے کا مزہ ہے اور نہ ہی عید منانے کا۔

پاکستان میں رمضان المبارک کا چاند نظر آنے سے قبل ہی اہتمام شروع ہو جایا کرتا تھا۔

کہیں بچے کی دال کا تین سوایا جا رہا ہے تو کہیں اہلی اور انار دانے کو صاف کر کے رکھا جا رہا ہے۔ تاکہ پکڑوں کا مزہ دہا لایا جاسکے اور مزیدار چٹنیاں بنائی جاسکیں۔

کبھی دہی بڑوں کے لیے ماش کی دال کا آٹا پیسا جا رہا ہے تو کہیں سرخ سرخ کوٹی جا رہی ہے۔

پھر سحری و افطاری پر خاصا اہتمام کیا جاتا تھا۔ سحری میں قیتے کا سالن، گرم گرم پراٹھے، دہی، لسی، چائے، پھنیاں اور دودھ سویاں عام چلتا تھا۔

اسی طرح افطاری کے لیے ظہر کی نماز کے ساتھ ہی تیاری شروع ہو جاتی تھی۔ ماش کی دال کے دہی بھلے، فروٹ چاٹ اور پکڑے تو لازمی بنائے جاتے تھے۔ پھر اس کے بعد اگر کسی کا دل کیا تو بازاری سمو سے بھی آ جایا کرتے۔

انواع و اقسام کی چٹنیاں اور شربت بھی افطاری کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔

مگر یہاں پردیس میں اکیلے سحری کا مزہ تھا نہ افطاری کا لطف، اگر کبھی زیادہ اہتمام کر بھی لیتے تھے تو کھایا نہیں جاتا تھا۔

اس لیے بس افطاری سے زیادہ ڈنر پر زور تھا۔ رمضان المبارک گزر گیا اور عید کی آمد ہوئی۔

ہم نے بیٹے کے لیے خوب شاپنگ کی۔

مگر اپنا وہی مسئلہ کہ پاکستان ڈریسز ملتے نہیں تھے اور جینز سکرٹ ہم نے پہنی نہیں۔ اس لیے پاکستان سے ساتھ لائے ہوئے کپڑوں میں ہی گزارہ کیا۔

صاحب نے ادھر ادھر بہت چیک کرنے کی کوشش کی مگر نماز عید کا وہاں کہیں کوئی اہتمام نہ تھا۔

ہم نے شیر خر بانالیا اور روایتی کھانے کا بندوبست کر کے ان فیصل آبادی بھائی کو بلا لیا۔ جو ہمیں ششٹ گاؤ کی سڑکوں پر پھرتے ملے تھے۔ تاکہ انہیں ہمارے ہوتے

ہوئے عید پر گھر والوں کی کمی محسوس نہ ہو۔

کھانے سے فراغت اور ان بھائی صاحب کے جانے کے بعد ہم نے گاڑی نکالی اور سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگے۔

سب کچھ ویسے ہی تھا۔ جیسا روز ہوتا تھا۔ عید والی کہیں کوئی بات نہیں تھی۔

ہوتی بھی کیسے؟ ہم کسی مسلم کنٹری میں تو نہیں رہ رہے تھے۔

خیر یونہی ادھر ادھر گھر گھر کے ہم واپس آ گئے۔

جیسے ہی گاڑی شیڈ تلے پارک کر کے ہم گھر میں داخل ہوئے تو ہماری لینڈ لیڈی ہماری منتظر تھی۔

دراصل صبح ہم نے شیر خر ماڈنگ بھر کے اس کے ہاں بھجوایا تھا تو وہ ناصر ف ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی بلکہ شیر خر سے ترکیب بھی جاننا چاہتی تھی۔ ہمیں تو جرمن لینکوئج آتی نہیں تھی۔ ہم نے صاحب

کو ترکیب سمجھادی اور انہوں نے لیڈی کو بتادی۔

مگر پھر بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ بھاگ کر کمرے سے ڈائری اور بال چین اٹھالائی کہ اس پر ریپسی لکھ دو۔ تو صاحب نے لکھ کر اسے دے دی۔

اس نے زبردستی ہمیں لاؤنج میں بٹھالیا تھا۔ اور پھر وہ پلاؤ کی ترکیب پوچھنے لگی۔

صاحب نے وہ بھی لکھ کر دے دی۔

تو اس نے زردے کے متعلق پوچھا۔

اس کی ترکیب بھی لکھ کر دے دی گئی۔

تب وہ ہماری بے حد ممنون ہوئی۔

ہم نے اجازت چاہی تو وہ مصنوعی دھنگی دکھانے لگی۔

”عید والے دن بھی ایسے ہی بغیر کچھ کھائے پیے چلے جاؤ گے؟“

یہ کہہ کر وہ کچن میں گئی اور بیک کی ہوئی ایک نمکین اور ایک میٹھی ڈش ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔

اس کے اصرار پر ہم نے پلیٹ میں ڈال کر تھوڑا تھوڑا کچھا۔

نمکین ڈش مزے کی تھی۔ مگر میٹھا بس سوسوتا۔

پھر بھی ہم نے اس کا دل رکھنے کی خاطر براہ چڑھ کے اس کی دونوں ڈشز کی تعریف کی اور اصرار کر کے نمکین ڈش کی ریپسی۔ جس پر لینڈ لیڈی بے حد خوش ہوئی اور جرمن کھانوں کی ایک چھوٹی سی کتاب ہی کچن سے لا کر ہمیں گفٹ کر دی۔

”میں اکثر اسی بک میں سے دیکھ کر کھانا بناتی ہوں۔ جو ڈش تمہیں پسند آتی وہ بھی اسی سے دیکھ کر بناتی ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں تمہیں جرمن کھانے بنانے میں مدد دے گی۔“ ہم نے اس کے اس قدر خلوص کا شکریہ ادا کیا۔ اور وعدہ کیا کہ جلد ہی اس سے دیکھ کے کوئی ڈش بنا کر اسے کھلائیں گے۔

وہ خوش ہو گئی۔

اور ہم اس کی خوشی میں راضی ہو گئے۔

☆☆☆

جس طرح عید الفطر بے قدموں گزر گئی تھی۔ ویسے ہی بقر عید بھی آئی اور چلی گئی۔

فرق صرف یہ تھا کہ عید الفطر پر ہمارے مسلمان ترک پڑوی عید منانے ترکی گئے ہوئے تھے اس لیے بالکل بے روتی تھی جبکہ اس بار ان کی فیملی موجود تھی۔

قربانی کا یہاں کوئی سین نہیں بن رہا تھا۔

صاحب نے اندازاً قربانی کے جانور کی قیمت کی رقم کے سات حصے کر کے مستحق لوگوں یعنی وہ پاکستانی و بنگلہ دیشی بھائی جو یہاں انتہائی بے بسی اور محسوس کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے، میں برابر تقسیم کر دی۔

ہمیں علم نہیں تھا کہ اس بات کی کوئی شرعی حیثیت ہے یا نہیں۔ مگر یہ کام ہم نے صرف اپنے دل کی تسلی کی خاطر کر لیا تھا۔ بقر عید کے فوراً بعد ہماری پوسٹنگ فرینکفرٹ آ گئی۔

شاید ایک یا دو مہینے کا کوئی کورس تھا۔ جس کے بعد ہمیں پاکستان واپس چلے جانا تھا۔

ہمارے جانے کی خبر سن کر ہماری جرمن لینڈ لیڈی اور ترک پڑوسن مسز رمضان بہت اداس تھی۔

ہم نے صاحب سے جرمن کھانوں کی ریسپی بک سے ایک کھانے کی ترکیب کا ترجمہ کرایا اور اسے بنا ڈالا۔ اور پھر حسب وعدہ جرمن لینڈ لیڈی کو کچھانے کے لیے لے گئے۔

وہ تو خوشی سے تقریباً ناچ ہی اٹھی۔

چپٹ پٹ ہماری بلائیں لے ڈالیں اور اپنی بوڑھی ساس کو یا شاید ماں کو ہمارا ”کچن کارنامہ“ بتانے لگی۔

اس نے بھی ڈونگے میں سے چچ میں لے کر ذرا سی کچھی اور ہماری ”کاوش“ کو سراہا۔

ترک لینکو تاج کے بہت سارے الفاظ اردو زبان کا حصہ ہیں اور وہ الفاظ ہمیں اپنی ترک پڑوسن سے سن کر بے حد اچھا لگتا تھا۔ اسی لیے جب ہماری ترک پڑوسن نے ہم سے کہا کہ وہ ہمیں ”چائے“ پر بلانا چاہتی ہے تو ہم انکار نہیں کر سکے۔ اور چائے پینے چلے گئے۔

اسے انگلش نہیں آتی تھی اور ہمیں ترکی۔ بس اشاروں اور مسکراہٹوں کی زبان میں گفتگو ہوتی رہی۔

اس کا بھی ایک اپنا مزاج ہے، اس بات کا اندازہ ہمیں اس روز ہوا۔

ہم نے دیکھا سوئزر لینڈ:

شسٹ گارڈ سے ہم سوئزر لینڈ بھی گئے تھے۔ سوئزر لینڈ کا دارالحکومت برن ہے۔ اور ہم برن تک پہنچے اور وہاں خاصا نام گزرا۔

برن میں پرانی بلڈنگز یا عمارات کو بے حد خوبصورتی کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے۔

اس شہر میں بے شمار پھول، نوارے، تنگ گلیاں اور تاریخی مینار یا گنبد خوبصورتی میں ایک الگ مقام عطا کرتے ہیں۔

سوئزر لینڈ کو اگر سیاحوں کی جنت کہا جاتا ہے تو اس میں کچھ غلط بھی نہیں ہے اور نہ کسی مبالغہ آرائی سے کام لیا

گیا ہے۔

بانی یورپین ممالک کی طرح یہاں بھی صفائی ستھرائی کا خاص اہتمام ہے اور خوبصورتی کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے۔

حتیٰ کہ بعض جگہوں پر جن دیواروں کے نیچے بے شمار رنگ برنگ پھول اگائے گئے ہیں تو وہیں ان دیواروں پر بھی خوبصورت پینٹ کیا گیا ہے اور رنگین پھولوں کے پس منظر میں پینٹ شدہ دیوار بے حد خوبصورت منظر پیش کرتی ہے۔

سوئزر لینڈ کو ہم نے جس تفصیل سے دیکھا تو اس کے لیے ہم ایک سفرنامہ سوئزر لینڈ سے متعلق الگ سے تحریر کریں گے۔ فی الحال طوالت کی وجہ سے سوئزر لینڈ کی سیر کو ہمیں پر ختم کرتے ہیں اور واپس جرمنی کی طرف آتے ہیں۔

تو ہم بتا رہے تھے کہ ہماری پوسٹنگ فرینکفرٹ آگئی اور ہم نے ایک بار پھر رخت سفر باندھا اور فرینکفرٹ کا رخ کیا۔

جب صاحب نے ہمیں بتایا کہ اس کورس میں جاوید بھائی اور اسلم بھائی بھی شامل ہیں تو یہ جان کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ اس طرح ہم ایک بار پھر انیٹا، اور روبینہ سے مل سکیں گے۔

فرینکفرٹ میں اس بار صاحب نے کرائے پر ایک بہت بڑا گھر لیا۔ جس میں چار بیڈ رومز تھے۔ ڈرائنگ، ڈائننگ، ٹی وی لاونج اور کسی ہال کمرے جتنا بڑا کچن تھا۔ اور اس کچن میں بھی الگ سے چھ افراد کے کھانے کے لیے میز کرسیاں لگی تھیں۔

یہ گھر بھی مکمل فرشتہ تھا۔ اور اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے آگے پیچھے بے حد وسیع لان تھا۔

لان میں طرح طرح کے پھول کھلتے تھے اور درخت لگے ہوئے تھے۔

گھر تو واقعی بے حد خوبصورت تھا۔ مگر اس کی صفائی

ستھرائی بطور خاص لان کو مین ٹین رکھنا ہمیں بے حد مشکل نظر آ رہا تھا۔

کیوں کہ ہر روز لان میں بے شمار سوکھے پتے اور پھولوں کی پتیاں بکھر جاتی تھیں اور اسے باقاعدگی سے صاف کرنا ہوتا تھا۔

پھر پودوں کی کٹائی چھٹائی اور گھاس کاٹنے کا فریضہ بھی خود ہی سرانجام دینا ہوتا تھا۔

اگرچہ لان میں گھاس کاٹنے کی مشین موجود تھی۔ مگر ہمیں اس سے قبل گھاس کاٹنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ نہ زندگی میں کبھی ایسے کام کیے تھے۔ سو ہم لان کی صفائی کے لیے خاصہ پریشان تھے۔

گھر کی صفائی، کپڑوں کی دھلائی، استری، کھانا پکانا جیسے کاموں سے فراغت پا کر لان میں نکلتے تو اس کی صفائی میں ہی آدھا دن گزر جاتا تھا۔ اور ہم تھک کے چور ہو جایا کرتے۔ اس کے علاوہ اتنے بڑے گھر میں سارا دن ہم اکیلے چکراتے پھرتے تھے اور ہمارا احساس تنہائی دو چند ہو جایا کرتا تھا۔ کیوں کہ صاحب تو صبح ناشتے کے بعد جاتے تو شام کو واپس آیا کرتے تھے۔

سارا دن ہم ہوتے اور ہمارا تنہا سا بچہ۔ وہ سو جاتا تو ہم بوکھلا اٹھتے کہ اب کیا کریں۔ چند ہی روز میں صفائی ستھرائی کے اور گھر کے کاموں میں ہم اتنے طاق ہو چکے تھے کہ ذرا سی دیر میں تمام کام پٹنالا کرتے۔ اور جیسے تیسے لان بھی صاف کر آتے مگر اس کے باوجود وقت گزرنے میں نہیں آتا تھا۔

نہ پڑھنے کے لیے کچھ تھا اور نہ کرنے کے لیے۔ آخر کار تنگ آ کر ہم نے صاحب سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی چھوٹا گھر کرائے پر دیں جہاں مالک مکان بے شک ساتھ ہو۔ کم از کم انسانوں کی جبل پہل تو ہوگی وہاں۔ اگر ہم زیادہ عرصہ اس گھر میں رہے تو تنہائی سے پاگل ہو جائیں گے۔ تو تم وہ گانا گایا کرو ناں کہ:

دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے۔
صاحب نے شرارت سے کہا۔

وہ تو ہم گاتے رہتے ہیں۔ اکیلے میں گلوکاری کا تمام شوق پورا کر لیتے ہیں۔ مگر اب بہت ہو چکا۔ آپ کوئی اور گھر تلاش کریں۔“

”کس لیے؟“ انہوں نے شرارت سے بھنویں چڑھا کر پوچھا۔

اور ہم ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان کا ”کس لیے“ والا مطلب سمجھ گئے اور پاس پڑا اسکے انہیں کھینچ مارا اور اس کے بعد تو باقاعدہ پلو فائٹ ہوئی جس میں ہمارے بیٹے نے بھی حصہ لیا۔ اور بڑا مڑا آیا۔

چند روز کے اندر ہی صاحب نے ایک دوسرا کرائے کا گھر تلاش کر لیا تھا۔ جس میں نیچے مالک مکان کی فیملی آباد تھی اور اوپر والے پورشن میں ایک کمرہ تمام جدید سہولتوں سے آراستہ اور فل فرنشڈ ہمارے پاس تھا۔

اس کمرے کے ساتھ باہر والے حصے میں واش روم تھا۔

ہمیں یہ کمرہ بے حد بھایا۔
مالک مکان ایڈی بھی اچھی خاتون تھی اور بس اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔

اس فیملی میں میاں بیوی، گریڈ ما اور ایک نو عمر لڑکی تھی۔ جس کا دوست اکثر اسے ملنے آیا کرتا تھا۔

اور ان کے گھر کبھی کبھار ایک ایسی فیملی بھی آتی تھی جن کے تین چار چھوٹے بچے تھے۔

تو جب وہ آتے تو گھر میں ایک ہنگامہ ہوتا۔
بچے پکڑن پکڑائی کھیلتے اور خوب شور مچاتے۔

ہمیں ان کا شور بے حد اچھا لگتا تھا۔
اور ہم ان کے جانے کے بعد اشعوری طور پر ان کا

انتظار دوبارہ شروع کر دیتے ایک بار بچے کھیلتے کھیلتے اوپر

جلے آئے تو ہم نے انہیں پاس بلا لیا اور فریج میں پڑی چاکلیٹس انہیں دیں اور دوسری کا آغاز کیا۔

پھر اس کے بعد وہ بچے جب بھی لینڈ لیڈی کے گھر چکر لگاتے تو ہمیں ملنے ضرور آ کر تے تھے۔

اور ہم بھی ان کے لیے چاکلیٹس اور سوئیٹس لا کر رکھا کرتے تھے۔

ہماری انیلا اور روبینہ سے دوبارہ ملاقات کے بعد جیسے زندگی کے کھوئے ہوئے رنگ دوبارہ لوٹ آئے تھے۔

ایک بار پھر سیر و تفریح کا پروگرام بنا اور ہم ویک اینڈ پر چیکو سلواکیہ سدھارے۔

حسب عادت ہم سب نے چیکو سلواکیہ کے دارالحکومت ”پراگ“ (Prague) میں قیام و طعام کا فیصلہ کیا تھا۔

پراگ پہنچے تو ہلکی دھوپ اور معتدل موسم بے حد اچھا لگا۔

پہلے تو ہم نے اپنی گاڑیوں پر شہر کا ایک چکر لگایا۔ وہی یورپین سٹائل کے گھر..... ذھلوان سٹریٹ

چھتیں ہٹکونے انداز اور وہی باہر کی جانب کھلتی کھڑکیاں اور ان کھڑکیوں پر سفید جالی دار پردوں کے منفرد سٹائل۔

اور ہر کھڑکی میں سجا ہوا اک پھولدان۔

جب بھی ہم کھڑکیوں میں سجے ہوئے گلدان دیکھتے تو نا جانے کیوں ہمیں یورپین شاکر کا یہ شعر یاد آ جاتا۔

عجیب شخص تھا بارش کا رنگ دیکھ کے بھی کھلے درتچے میں اک پھولدان چھوڑ گیا

یورپ میں بارش زیادہ ہوتی ہے مگر ہر درتچے میں سجا ہوا گلدان پھر بھی ملتا ہے۔

چیکو سلواکیہ میں بنے ہوئے گھروں کا سائز دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔

بے حد چھوٹے چھوٹے گھر زمین پر یوں کھڑے

تھے جیسے کسی نے بجا بجا گڑیوں کے گھر سجاد دیئے ہوں۔
چپتے نہیں کتنے مرلے میں بنائے گئے تھے۔ ہمیں اندازہ نہیں ہو سکا۔

شہر کا چکر لگانے کے بعد ہم مارکیٹ میں آ گئے اور گاڑیاں پارک کر کے پیدل گھومنے لگے۔

کبھی ایک دکان میں جاتے، کبھی دوسری میں گھٹتے..... مگر ہر شے پر مہنگا ہونے کا شبہ ہوتا اور ہم۔

Es ist Zehr toure

”ایس اسٹ زیئر ٹورے“، یعنی بہت مہنگا ہے، بہت مہنگا ہے کا اعلان کرتے باہر نکل آتے۔

آخر نہ کرتے بھی ہم نے کافی کچھ لے ہی لیا تھا کہ پاکستان واپس جانے کے دن قریب آ رہے تھے اور گھر والوں، عزیز رشتے داروں کے لیے تحائف بھی تو

لینے تھے۔

اتنا پیدل چلنے کے بعد مانگوں نے ”پٹرول“ اور پیٹ نے ”ایئدھن“ ختم ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

وہ تو شکر ہے کہ اس وقت ہم تینوں لیڈز نے جاگرز پہنے ہوئے تھے۔ ورنہ تو ہیل والے جوتوں کے ساتھ آج پیروں کی خیر نہیں تھی۔

آنتیں بھوک سے قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں تبھی پاپی پیٹ کا دوزخ بھرنے کی خاطر ہم ایک ریسٹورنٹ میں

آ بیٹھے۔ جو ہاٹ ڈاگ (ایک قسم کے برگرز) بنانے کے لیے مشہور تھا۔

ہمارے صاحب اور اسلم بیانی کاؤنٹر پر فوڈ کا آرڈر دینے گئے۔ اور کافی کرید کرید کے پوچھا کہ ”ہاٹ ڈاگز“

میں وہ کہیں سوڑ کا گوشت تو استعمال نہیں کرتے۔

ریسٹورنٹ والے کو انگریزی آتی تھی نہ جرمن۔

ساری بات چیت اشاروں میں ہو رہی تھی۔

ہمارے شوہر حضرات اثبات میں سر ہلا کے کچھ پوچھتے تو ریسٹورنٹ والا انکار میں سر ہلا دیتا۔

کبھی وہ اثبات میں گردن ہلاتا تو یہ لوگ سر کے

اشارے سے انکار کر دیتے۔

سے باہر نکل آئے۔

”سور کے گوشت“ کا سن کر سب کا دل کچا ہو رہا تھا۔

کیا خبر سچی کے برگرز میں سور کا گوشت ڈال دیا ہو منخوس نے، یقیناً جان بوجھ کے ایسا کیا ہو گا۔ آخر شرارتی لوگ تو دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہو سکتے ہیں۔

کیا خبر سچی کا آرڈر تبدیل ہو گیا ہو..... مگر اس نے بتایا صرف ایک کا؟ دل میں طرح طرح کے واہے سر اٹھا رہے تھے مگر سب اسلم بھائی کی وجہ سے نارل نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور انہیں تسلی دے رہے تھے کہ اس میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ چنانچہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے۔ وہ جانے ان جانے میں کی گئی ہر خطا مغاف کر دینے پر قادر ہے۔

وہاں سے نکل کر سیر و تفریح کا پروگرام بنا۔ اگرچہ چیکوسلواکیہ میں دیکھنے کی بہت سی جگہیں ہیں مثلاً پراگ کیسل، چارلس برج، اولڈ ٹاؤن سیکٹر، دی لینن وال اور دی جیوش کوارٹر.....

ہم نے پراگ کیسل دیکھا، اولڈ ٹاؤن سیکٹر، دی لینن وال وغیرہ کی سیر کی مگر ان کا تفصیلی ذکر ہم پھر کسی اور سفر نامے میں کریں گے فی الحال مختصراً یہ کہ ہم نے رات پراگ کے ایک ”سرائے خانے“ میں گزاری کیوں کہ ہوٹل بے حد مہنگے تھے اور سرائے خانے یا مہمان خانے کا کرایہ اس کی نسبت بے حد سستا تھا اور یہاں سہولیات کسی فائیو سٹار ہوٹل سے کم نہیں تھیں۔

اس سرائے کو ایک عورت چلا رہی تھی۔

رات گئے اس کے مہمان بننے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں اپنا سامان رکھتے کے ساتھ ہی ہم نے اس سے پوچھا کہ یہ بتاؤ اس وقت تم ہمارے لیے کھانے میں کیا بنا سکتی ہو؟

آخر کافی دیر بعد یہ لوگ ریسٹورنٹ والے کو کچھ سمجھا کے اپنے آرڈر نوٹ کرانے کے قابل ہو پائے تھے۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں گرم گرم پاٹ ڈاگنز اور کولڈ ڈرنکس آگئی تھیں۔ بھوک اس قدر شدید تھی کہ سب فوراً ہی بے صبری سے کھانے پر نوٹ پڑے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے آدھے سے زیادہ برگرز ہمارے پیٹوں میں اتر چکے تھے جب ریسٹورنٹ کا ایک ویٹر ہمارے پاس بوکھلایا ہوا آیا اور آکر اسلم بھائی کے پاس رک گیا اور کچھ کہنے لگا۔

اس کی بات سمجھنا دشوار تھا۔

بالآخر اس نے اسلم بھائی کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی اور اشاروں سے سمجھانے کی کوشش کی کہ جو برگر وہ اس وقت کھا رہے ہیں وہ غلطی سے ایک دوسرے کا ہلک کے آرڈر سے تبدیل ہو گیا ہے اور آپ کا برگر اس کے پاس چلا گیا اور اس کا سور کے گوشت والا برگر آپ کے پاس آ گیا ہے۔ صرف اسی آرڈر میں غلطی ہوئی ہے باقی لوگ اپنا کھانا جاری رکھ سکتے ہیں۔ لڑکے نے بے حد ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور جرمن کس کر کہا۔

”اتنی بڑی غلطی؟؟؟“ ہمارے صاحب اور طارق بھائی فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور ریسٹورنٹ کے مالک کی گوشمالی کو چلے۔

جبکہ سور کے گوشت کا سن کر تو اسلم بھائی فوراً ہی ابا بیاں لینے لگے تھے۔

اور پھر وہ اپنے حلق میں انگلی ڈالتے ہوئے اٹھے اور تیزی سے واش روم کی جانب لپکے۔

اب بھلا کھانا کھانے کی کسے بھوک رہ گئی تھی۔

سب نے ہاتھ میں پکڑے برگرز واپس پلیٹ میں رکھے کولڈ ڈرنکس اٹھائیں اور ٹیبل سے اٹھ گئے.....

ہمارے شوہر حضرات نے ریسٹورنٹ کے مالک کے پیچھے خاصے لٹے لیے، کاؤنٹر پہلے پے کیا اور ریسٹورنٹ

سب کو بہت جھوک لگی تھی۔ دو پہر کے واقعے کے بعد پھر کہیں کچھ کھانے کا رسک نہیں لیا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

اس وقت تو میں انڈے یا پھر آلو بی کھلا سکتی ہوں۔

”زبردست“

بس تم ہمارے لیے انڈوں کا آلیٹ اور ڈبل روٹی کا بندوبست کر دو۔ اور وہ فوراً ہی ایمرن باندھے کچن میں کھس گئی۔

کھانے کے بعد گرم گرم کافی نے لطف دو بالا کر دیا تھا۔

اگلی صبح کے ناشتے کا مینو دے کر اور آٹھ بجے اٹھانے کا کہہ کر سب ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے آئے۔

اگلی صبح ہمارا پروگرام ناشتے کے بعد چیکو سلواکیہ کا کرسل خریدنے کا تھا۔

چیکو سلواکیہ کا کرسل دنیا بھر میں مشہور ہے اور ہم بطور سوویئٹ ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

کرسل شاپ پر اتنی ورائٹی تھی کہ ہم بوکھلا گئے کہ کیا چھوڑیں اور کیا خریدیں۔

نہ نہ کرتے بھی کئی کرسل پیسز لے لیے۔

ان میں سے ہمیں وہ بلیاں بے حد پسند آئی تھیں جن کے کرسل سے روشنیاں منعکس ہو کر انہیں مختلف زاویوں سے مختلف شیدز دیتی تھیں۔

یہ بلیاں عرصہ دراز تک ہمارے ڈرائنگ روم کی زیونت بنی رہیں ان میں سے ایک کی آنکھ کا چھوٹی سی سیاہ پتلی جھاڑ پونچھ کے کے دوران کہیں گر گئی تو ہم نے اس کی جگہ گرم مصالحوں سے موٹی سی کالی مرچ ڈھونڈ کر اس کی آنکھ کی جگہ چکا دی تھی۔

جس کا غلیم نہ کبھی ڈرائنگ روم میں آنے والے مہمانوں کو بوانہ ہمارے صاحب بہادر کو۔

عرصہ دراز تک یہ کرسل کی خوبصورت بلیاں دیکھنے

والوں کی داد سیمینٹی رہیں اور پھر ایک روز ہمارے چھوٹے بچے کے ہاتھوں اپنے منطقی انجام کو پہنچیں، یعنی گر کر ٹوٹ گئیں۔ ”ان اللہ مع الصابرين“

☆☆☆

پاکستان جانے کے دن بڑی تیزی سے قریب آرہے تھے اور اسی تیزی سے ہماری شاپنگ بڑھتی جا رہی تھی اور سامان میں اضافہ ہو رہا تھا۔

پھر وہ دن بھی آیا کہ ہماری ٹکٹس مصر کے لیے کنفرم ہو گئیں اور روانگی میں دو چار روزہ رہ گئے ہم نے آخری بار ایک چکر ”آلڈی شاپ“ کا لگایا۔ آلڈی شاپس کا بھی بتاتے چلیں کہ جرمن میں آلڈی شاپس کی پوری ایک چین ہے۔

آپ آلڈی شاپ کو پاکستان کا یوٹیٹی سٹور سمجھ سکتے ہیں۔ مگر یوٹیٹی سٹورز پر صرف راشن ملتا ہے جبکہ آلڈی شاپس کو بہت بڑا شاپنگ مال کہہ سکتے ہیں۔

اس کے مختلف پورشن ہیں اور ہر پورشن یا حصے میں الگ الگ اشیاء دستیاب ہیں۔ مثلاً کاسٹیکس، کھلونے، جیولری، کپڑے اور برتن وغیرہ۔

آخر جرمنی کو خیر باد کہنے کا وقت آ گیا۔ اور ہم لفٹھا زرا ایئر (جرمنی کی ایئر لائن) سے شام کے وقت مصر کے دارالحکومت قاہرہ جا پہنچے۔

قاہرہ میں طاہرہ

مصر کے دارالحکومت کے قاہرہ ایئر پورٹ کسٹم سے فراغت پانے کے ساتھ جیسے ہی ہم باہر آئے تو گندگی کا عالم دیکھ کر حیران رہ گئے۔

فیرش پر شاید کئی دن سے جھاڑ نہیں دی گئی تھی۔ تبھی جا بجا گندریوں کے پھلکے اور چوسا ہوا پھوک پڑا نظر آیا تو دل بے حد خراب ہوا۔

حالانکہ صفائی مسلمانوں کے ”ایمان کا نصف جزو“ ہے مگر ہم سے زیادہ صفائی ستھرائی مغربی ممالک میں پائی جاتی ہے۔

تھے۔ تاکہ دریائے نیل اپنی ”دلہن“ پا کر خوش ہو جائے اور تباہی و بربادی نہ پھیلے۔

مگر حضرت عمر فاروق کو جب دریائے نیل کی تباہ کاریوں کا پتہ چلا تو آپ خود دریا پر تشریف لے گئے اور اپنے ہاتھ سے ایک رقعہ دریائے نیل کے نام لکھا جو کچھ اس طرح سے تھا کہ

”اے نیل اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو بے شک تباہی پھیلا، لیکن اگر تو خدا کی مرضی سے بہتا ہے تو اپنی حد میں رہ کے بہہ۔“

اور اس کے بعد سے اہل مصر دریائے نیل کی سیلابی تباہ کاریوں سے محفوظ ہو گئے۔

کبھی ہم چشم تصور سے خدا کی اس قدرت کا نظارہ کرتے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پانی پر ٹوکری میں بستے ہوئے آئے تھے اور حضرت آسیہ نے انہیں ٹوکری سے اٹھا کے پالا تھا۔ تو کبھی تصور کی آنکھ سے دیکھتے کہ دریا کے پانی نے کس طرح دو حصوں میں تقسیم ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے لیے راستہ بنا دیا تھا۔ مگر ان کے تعاقب میں آنے والے فرعون اور اس کے لشکر کو آنا فانا لہروں نے غرق کر دیا تھا۔

ہمارے کانوں میں گویا فرعون اور اس کے ساتھیوں کی چیخ و پکار گونج رہی تھی۔

یکدم ہمیں جبر جبری سی آ گئی۔

ویسے بھی پانی کے قریب ہونے کی وجہ سے ہوا ٹھنڈی تھی۔

شاید ہمیں ٹھنڈ لگ رہی تھی۔

”واپس چلیں“ کسی نے کہا۔

اور ہم سب واپس لوٹ آئے۔

ہوٹل پہنچ کر گاڑی کو فارغ کیا اور سب نے جاگرز پہن لیے اور پیدل ہی قریبی مارکیٹ کا رخ کیا۔

ایک دو گلیاں مڑنے کے بعد ایک مارکیٹ کے آثار

خیر ایئر پورٹ سے باہر آ کر ہم نے ایک عدد گاڑی کرائے پر لی جس کے ہمراہ ایک ٹورسٹ گائیڈ بھی تھا۔

اس سے دو روز کا کرایہ ملے کیا اور گاڑی میں سامان رکھوا کر اسے کسی ایسے ہوٹل میں چلنے کے لیے کہا جو مارکیٹ کے نزدیک ہو اور جہاں پیدل رات کو گھومنے پھرنے کا جاسکتا ہو۔

گاڑی والا ہماری بات سمجھ گیا اور ہمیں ایک بڑے سے بازار کے کونے سے منسلک گلی کے ہوٹل میں لے آیا۔

باہر سے ہوٹل چھوٹا سا لگ رہا تھا مگر اندر سے بے حد شاندار تھا طارق و اسلم بھائی کو برابر برابر نیچے کے دو کمرے ملے تھے جبکہ ہمارا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا۔

اگرچہ ہم سب بہت تھکے ہوئے تھے مگر مصر دیکھنے کا شوق تھکن پر غالب آ گیا تھا۔

ہم نے ڈرائیور کو کال کر کے بلایا اور دریائے نیل پر چلنے کے لیے کہا۔ اس نے کچھ دیر سوچا۔ پھر ہمیں دریائے نیل کی سست لے چلا۔ خاصی دیر کے بعد (ہمیں تو دیر ہی لگی) وہ دریا کے پل پر پہنچ گیا جو دریا پر گاڑیاں وغیرہ گزارنے کے لیے بطور سڑک بنایا گیا تھا اور وہاں جا کر گاڑی روک دی۔

سڑک کے دونوں اطراف لگے کھجوروں پر چلتی لائنس کی روشنی میں دریا کا پانی مکمل سیاہ دکھائی دے رہا تھا۔

ماحول پر مکمل سکوت طاری تھا۔ اور نیل بھی خاموش کی چادر اوڑھے، گویا دبے قدموں بہہ رہا تھا۔

ہم دیر تک دریا کے پل کی ریلنگ پر جھکے، اس کی بہتی موجوں میں مصر کا ماضی کھنگالتے رہے۔

یہ وہی نیل تھا جو ہر سال اپنی سیلابی لہروں سے مصر میں تباہی و بربادی پھیلاتا تھا۔

اور اہل مصر دریائے نیل کو راضی کرنے کے لیے ہر سال اپنی ایک جوان و خوبصورت لڑکی کو تاج سنوار کے، دلہن کے روپ میں دریائے نیل میں دھکیل دیا کرتے

دکھائی دیئے۔ صاحب نے فون اٹھایا تو دوسری جانب ہمارے

گاؤ کا فون تھا۔ جو بتا رہا تھا کہ گیارہ بجے کے قریب ہم

تیار رہیں۔ وہ گاڑی لے کر آجائے گا اور آج کا دن ہم

مارکیٹ جائیں گے اور پھر ابرام مصر چلیں گے پھر میوزیم

وہاں سے فراغت پا کر لنچ کر دیئے نیل کے کنارے بنے

ہوٹل میں کریں گے۔ اور پھر واپسی ہوگی مگر اسی میں سارا دن گزر جائے

گا۔ پھر اس کے بعد ذکر کر کے پرائڈ لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو

(Pyramid light and sound show) دیکھنے چلیں گے۔

ابرام مصر دیکھنے کے جوش میں ہم نے فوراً بستر چھوڑ

دیا۔ اور لپک جھپک خود بھی تیار ہو کر اپنے بیٹے کو بھی تیار

کیا۔ صاحب بھی تیار تھے۔ ہمارے باقی ساتھی بھی جاگ کر تیار ہو چکے تھے۔

سب نے مل کر ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ایک

ساتھ ناشتہ کیا اور پھر ہمارا گاؤں ہمیں ساتھ لے کر چلا تو ہم

سیدھے خان اٹھلی بازار چاہنچے۔ جو مصر کا مشہور بازار اور

سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ یہ بازار تنگ گلیوں کے اندر ہے اور یہاں قدیم و

جدید اشیاء کا خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس بازار میں سچی کچھ دستیاب ہے۔ مگر بات وہی

ہے کہ سودے بازی یعنی بارگین چلتی ہے۔ یعنی دکاندار

جو قیمت بتائے آپ اسے نصف سے بھی کم کہیں۔ امید

ہے تھوڑی بہت بحث و تمحیص کے بعد سودا بن جائے گا۔

یہاں کئی مینڈ میڈ اشیاء بھی دستیاب ہیں۔

ہم تینوں خواتین نے ایک ایک مینڈ میڈ، مینڈ بیگ

لیا اور ہلکی پھلکی آرٹیفیشل جیولری خریدی۔

اس بازار میں مصری مشروبات مثلاً بنی کس

(Hibicus) کرکارے (Karakare) اور ہلبا

(Helba) بھی ملتا ہے۔ جنہیں پینا سیاحوں کے لیے

اکثر دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔

جو کھلی تھیں وہ بھی بند ہو جا رہی تھیں۔

البتہ فٹ پاتھ مارکیٹ ابھی بھی بارون تھی۔

ہم نے چند کھلی ہوئی دکانوں میں چیزوں کا جائزہ لیا

اور قیمتیں وغیرہ معلوم کیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ یہاں بھلاؤ

تاؤ بھی چلتا ہے اور پاکستان والا ہی حال ہے کہ چیز کی

قیمت اصل سے دوگنی بتائی جاتی ہے اور پھر گاہک کو خوش

کرنے کے لیے خاصی کم کر دی جاتی ہے مگر اس کم کرنے

میں بھی دکاندار اچھا خاصا کم لیتا ہے اور قیمت اچھی

خاصی کم کرانے کے باوجود گاہک یہی سمجھتا ہے کہ وہ

دکاندار کے ہاتھوں لٹ کر آ گیا ہے۔

خریدا تو ہم نے کچھ بھی نہیں بس ویسے ہی گھوم پھر

کے خالی ہاتھ واپس چلے آئے۔

اس وقت ویسے بھی مقصد شاپنگ کرنا نہیں تھا بلکہ

مارکیٹ کا اندازہ کرنا تھا۔

ہم چیزوں کی ورائٹی، کوالٹی اور قیمتوں کے اتار

چڑھاؤ کا اندازہ لگانے گئے تھے۔

انتاپیدل چلنے کے بعد سب کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

لہذا کھانے کا آرڈر دیا گیا۔

کھانے میں مونے چاول، نان، نمناپ لمبی سی

شے، (جسے ہم نے روٹی سمجھ لیا تھا) مچھلی اور ایک قسم کے

عجیب مونے مونے سے کباب تھے۔

(اب ہمیں ان کبابوں کا نام وغیرہ یاد نہیں)

لیکن یہ کھانا اس کھانے سے بہر حال بہتر تھا جو ہمیں

یورپ کے ہوٹلوں میں میسر تھا۔ اس میں کم سے کم مرچ

مصافحوں والی اپنائیت تو تھی۔

کھانا کھانے کے بعد آپس میں گپ شپ کا کسی

میں یارانہ تھا سو سب نے سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں

کی راہ لی۔

صبح ہماری آنکھ ملی فون کی گھنٹی کی آواز سے کھلی۔

ایک نیا خوشگوار تجربہ ہو سکتا ہے۔ ویسے ہم نے تو نہیں کیا۔ کیوں کہ ہمیں کھانے پینے کے معاملات میں کچھ زیادہ تجربات کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ سموکرز یعنی سگریٹ نوشی کے شائق حضرات کے لیے اس بازار میں شیشہ (ایک قسم کا حقہ) بھی دستیاب ہے۔

اس بازار کی ایک سو وینر شاپ سے ہم نے مصری فائن پورسلین پلیٹ اور مصری پینٹنگ والا لگ خرید۔ چند پوسٹ کارڈز لیے، ایک سینری خریدی اور جیولری باکس لیا۔ مصر کے اس قدیم بازار میں پھرتے ہوئے ناجانے کیوں ہمیں صدیوں پرانے اس مصروف بازار کا خیال آ رہا تھا، جہاں غلاموں کی خرید و فروخت کی جاتی تھی اور جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی لاکر بیچا گیا تھا۔

اگرچہ ہم پہلی بار مصر آئے تھے مگر اس کی اسلامی تاریخ و عبرت انگیز واقعات کا پراسرار فوں ہماری رگ رگ میں اتر اہوا تھا۔

تجھی ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا شاید..... اور ہم مصر کی گلیوں میں ایک سحر زدہ معمول کی طرح پھر رہے تھے۔ خان الخلیل بازار کے بعد اب ہم مصری میوزیم جا رہے تھے۔ یہ میوزیم دو فلورز پر مشتمل یعنی دو منزلہ ہے۔ پہلے حصے میں قدیم مصری سکے اور کرنسی وغیرہ رکھی گئی ہے۔ اور دوسرے حصے میں مصری ماکاؤں، بادشاہوں اور شہزادوں کے سٹیجوز وغیرہ ہیں۔ اور شیشے کے تابوتوں میں حنوط شدہ میاں بھی رکھی گئی ہیں۔

ہمیں فرعون کی مومی دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ مگر میوزیم انتظامیہ کے مطابق اسے نئے سرے سے ”مسالے“ لگانے کے لیے لے جایا گیا تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت میوزیم میں موجود نہیں تھی۔

اسی میوزیم میں کنگ ٹوٹن خامن (King totan)

(khamun) کے مجسمے پر چہرے سے لے کر سینے تک گیارہ کلو سونے کا ماسک چڑھایا گیا ہے۔ میوزیم میں ہم گھومنے کے بعد ہم گاڑی میں اپنے گائیڈ کے ہمراہ اہرام مصر Pyramid of giza دیکھنے چلے۔

اہرام مصر کو دیکھنے کے بعد پرانے زمانے کے مصری آرکیکچر ز اور ماہرین تعمیرات کی ذہانت اور ان کے طرز تعمیر اور ڈیزائننگ پر رشک آتا ہے۔

یہاں دور دور تک ریت ہی ریت ہے اور اونٹوں پر سواری کے شوقین لوگوں کے لیے مصری شتر سوار اونٹ لیے گھوم رہے ہوتے ہیں۔

ہم نے اکثر انگریز سیاحوں کو شوق سے اونٹ پر سواری کرتے ہوئے دیکھا۔ ہماری تو ایسے کسی ایڈونچر کی ہمت نہیں ہوتی اس لیے بازار ہے۔

ان Pyramids کے تہہ خانوں میں جانے اور واپسی کے لیے سرنگیں بنی ہوئی تھیں۔ جن کی اونچائی اتنی کم تھی کہ انسان کو حالت رکوع میں جا کر Slope نما سرنگ میں اتر کے نیچے جانا پڑتا تھا۔

نیچے جانے کے قیمتی خواتین و حضرات کو گائیڈ ز خبردار کر رہے تھے کہ نیچے آئیں آکسیجن کی شدید کمی کھٹن گرمی، پسینے اور سانس کا پرالیم لاق ہو سکتا ہے۔ اس لیے سوچ سمجھ کر نیچے جائیں۔

ہمارے صاحب کو بھی نیچے جانے کا اشتیاق تھا۔ سو بیٹے کو ہماری گود سے اپنی گود میں لیا، ہمارا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور حالت رکوع میں نیچے اترنے لگے۔ جہاں گہری تاریکی تھی۔

اوگ ماچس کی تیلیاں اور الٹرز جلا جلا کے روشنی کر رہے تھے۔ ہمیں یہاں سخت کھٹن اور عجیب سی بو کا احساس ہوا۔

ہمارے صاحب سگریٹ نہیں پیتے تھے اس لیے ہمارے پاس ماچس تھی اور نہ الٹرز۔

انہ نالی لہ۔ ہما میں بھائیں کر رہے تھے۔
 الاولوالاقوة ہم تو صرف طرز تعمیر دیکھنے اس گھٹن اور
 تار بلی میں آئے تھے۔
 ہمیں اپنی نہیں بلکہ اپنے بیٹے کی فکر تھی۔ کہ کہیں اس
 کا دم نہ گھٹنے لگے۔ اس لیے صاحب سے واپس آنے کو
 کہا۔

اوپر آئے تو جیسے جان میں جان آئی۔
کافی وقت گزر چکا تھا یوں ہی سیاحت میں اور اب
سب کو دوپہر کے کھانے کی فکر ہوئی۔

تب ہمارا گائیڈ ہمیں دریائے نیل کے کنارے ایک
ریسٹورنٹ لے گیا۔ ریسٹورنٹ کی عمارت تو چھوٹی سی تھی
مگر اس کا ان بہت بڑا تھا۔ اور اس ان میں جا بجا
پتھریوں کے نیچے میز کرسیاں لگا کر بیٹھنے کا انتظام کیا گیا
تھا۔

ہم نے بھی ایک بڑی سی میز کے گرد لگی کرسیاں
سنبھال لیں۔

اور چکن روٹ کا آرڈر دیا۔ اس کے ساتھ سیون
پ کے ٹن کھول لیے۔

ہمارا بیٹا یہاں آ کر بے حد خوش تھا۔ اس نے نیا نیا چلنا شروع کیا تھا اور ادھر ادھر دھڑکتا دھڑکتا گم گاتا پھر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا تو وہ لان کی ہری بھری گھاس پر کسی ننھی سی بچی کے ہمراہ کھیل رہا تھا۔ صاحب نے فوراً اس کی کئی فوٹوز بنالیں۔

کھانے کے بعد بھی ہم کافی دیر تک صرف اپنے
میٹے کی وجہ سے وہاں بیٹھے رہے تاکہ وہ اور کھیل سکے۔

آج پہلی بار ہم اسے اتنا خوش اور کھلکھلاتا ہوا دیکھ سکتے تھے۔ یونہی کافی وقت گزر گیا تو ہمارے کائیڈ نے ہم سب کو یہاں سے روانگی کا کاشن دیا۔

کیوں کہ ہم لیٹ ہو رہے تھے اور پروگرام کے

مطابق ابھی ہمیں اپنے گائیڈ کے ہمراہ ایک پرفیم شاپ پر بھی جانا تھا۔ جہاں پھولوں سے عرق کو کشید کر کے بوتلوں میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔

تو جاب گائیڈ صاحب ہمیں وہاں ساتھ لے گئے۔ ہم تو چلے گئے دکان کے اندر اور وہ باہر کھڑے دکان والے کے ملازم لڑکے کے ہمراہ خوش گپیوں میں مصروف رہے۔

دکان والے نے ہمیں کئی شیشوں میں بند پھولوں کے کشیدہ عرق چیک کرائے اور ان کی خوشبو بیاٹ سوگنہنے کا موقع دیا۔

دکاندار نے ہمیں ان خوشبو پات کی خریداری کی طرف مائل کیا مگر ہم میں سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد ہمارا گائیڈ اندر آیا اور بتایا کہ ہر بوتل میں مختلف پھولوں کا جو عرق محفوظ ہے تو یہ تمام مال فرانس جاتا ہے جہاں ان عرق کے محض چند قطروں کو استعمال کر کے پرفیومز کی بوتلیں بھری جاتی ہیں اور یہ پرفیوم دنیا بھر میں منجے داموں فروخت ہوتے ہیں۔ مصر میں صرف خوشبوئیں کشید کی جاتی ہیں اور باقی سارا پر اسس فرانس میں ہوتا ہے۔

تو ہم جو آج تک سنتے آئے تھے کہ روشنیوں اور خوشبوؤں کا شہر فرانس کو کہا جاتا ہے تو اس کی خوشبوؤں کا اصل منبع مصر ہے۔

اس بات کے ساتھ ہی ہمیں مصر کی علامہ قلوبطرہ یاد آگئی جو اپنے حسن کے نکھار کے لیے طرح طرح کے نسخے اور ٹونکے آزمایا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کا گھدی کے دودھ سے غسل کرنا بھی مشہور ہے۔

ہماری دلچسپی پر ویڈیوز کے عرق میں نہ دیکھ کر گائیڈ
نے دکان سے نکلنے کا اشارہ کیا۔

کیوں کہ ابھی ہمیں رات کو لائٹس اینڈ ساؤنڈ شو دیکھنے بھی جانا تھا۔

اس لیے ہم ہوٹل چلے آئے۔ تاکہ کچھ دیر آرام

ہمارے صاحب چیک آؤٹ کے لیے ہوٹل کے
کاؤنٹر پر گئے تو ان کے نیچے جاتے ہی ہوٹل کی سوپریس
(صفائی کرنے والی) دیکھویم ٹیبلز لیے ہمارے کمرے میں
آگئی۔

میڈم! میں روزانہ آپ کے کمرے سے جانے کے
بعد آپ کے کمرے کی صفائی کرتی تھی، آپ کو کوئی
شکایت تو نہیں تھی نا؟
”نہیں تو.....!“ ہم نے چونک کر اس کی طرف
دیکھا۔

”تو اس کا مطلب یہ کہ آپ میرے کام سے مطمئن
رہیں؟“
اس نے امید بھرے انداز میں پوچھا۔
”ہاں بالکل“ ہم نے جواب دیا۔
”تو پھر نکالے میرا انعام!“ اس نے اپنی ہتھیلی آگے
پھیلائی۔

”اوہ..... کبھی..... یہاں بھی ملازمین کے بخشش
مانگنے کا انداز پاکستان والا ہی ہے۔“
ہم نے اپنے پرس سے بچی ہوئی مصری کرنسی نکالی
اور ساری اس کے ہاتھ میں تھما دی۔
اس نے یہ کرنسی فوراً اپنے گریبان کی گہرائی میں منتقل
کرنے کے بعد دوبارہ ہمارے سامنے اپنی ہتھیلی پھیلا
دی۔
”اولی ڈالرز پلیز۔“ اس کی آنکھیں لالچ سے
چمک رہی تھیں۔

”ڈالرز تو میرے پاس نہیں ہیں۔“ ہم نے بتایا۔
”اوکے..... پھر.....؟“ اس کی چھوٹی چھوٹی
آنکھیں ہمارے سر آپے پر پھسلنے لگیں اور پھر ہماری کانچ
کی چوڑیوں سے بھری ہوئی کانیاؤں پر آکر رک گئیں۔
”یہ کیا ہے؟“ اس نے انگلی سے چوڑیوں کو چھوتے
ہوئے پوچھا۔
”بینگلز ہیں۔“ ہم نے بتایا۔

کرنے کے بعد دوبارہ تیار ہو گئیں۔
8 بجے لائنس اینڈ ساؤنڈ شو شروع ہو جائے گا اس
لیے ہم تقریباً سو اسات بجے یہاں سے نکلیں گے۔ آدھا
گھنٹہ وہاں تک جانے میں بھی لگے گا۔

ہم سے رخصت ہونے سے قبل ہمارے گائیڈ نے
ہم سب کو ہدایت کی اور ہم ٹھیک سات بج کر دس منٹ پر
تیار تھے اور ہوٹل کی لابی میں اپنے گائیڈ کا انتظار کر رہے
تھے۔
وہ بھی وقت مقررہ پر پہنچ گیا اور ہم روانہ ہوئے۔

ہماری طرح کئی اور سیاح بھی شو دیکھنے کے لیے
وہاں موجود تھے اور نشستوں پر براجمان تھے۔
نشستوں سے ہماری مراد پلاسٹک کی وہ کرسیاں
ہیں جو Pyramids کے سامنے، کھلے آسمان تلے لگائی
گئی تھیں۔
ساؤنڈ اینڈ لائٹ شو شروع ہوا۔

لیزر اور ریڈ لائٹس کا فوکس Pyramids تھے۔
ساتھ انگریزی زبان میں کنسٹری..... لائنس اور
کنسٹری دونوں مل کے ایسا سماں پیدا کر رہے تھے کہ جیسے
آپ خود تاریخ مصر کا حصہ ہوں۔ ہر منظر گویا آپ کی
آنکھوں کے سامنے تھا۔
یوں لگتا تھا کہ جیسے سامنے کوئی مصری تاریخی مادی
چل رہی ہے۔ تمام ناظرین جیسے سانس روکے لائن و
ساؤنڈ شو کے سحر میں گرفتار بیٹھے تھے۔
شو ختم ہونے پر لائنس آن کی گئیں اور ہم اپنی گاڑی
کی جانب چلے۔

اگلے روز صبح ہماری فلائٹ براستہ سعودی عرب
پاکستان کے لیے تھی۔
ہم نے راستے سے بن کباب اور کوئلڈ ڈرنکس مانپ
کھانا لیا اور ہوٹل آگئے۔ جہاں صبح رواگئی کے لیے پیکنگ
بھی کرنی تھی۔
سب نے اپنی صبح رواگئی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

”یہ تم مجھے دے سکتی ہو میڈم؟“ اس کی آنکھیں بدلتور چمک رہی تھیں۔

”مگر یہ تمہاری کلائیوں میں نہیں آئیں گی۔ تمہارے بازو مونے ہیں۔“

ہم نے نظروں ہی نظروں میں اس کی کلائیوں کی مونائی جانچ کر اسے مطلع کیا۔

”کوئی بات نہیں..... میں یہ چوڑیاں اپنی بیٹی کو دے دوں گی۔ وہ پہن لے گی۔ اس کی کلائیاں تمہاری کلائیوں کی طرح سڈول ہیں۔“

اس کی اس قدر بدینتی دیکھتے ہوئے ہم نے اپنی کلائی سے چوڑیاں اتار کر اسے تھما دیں۔ جنہیں اس نے فوراً احتیاط سے نشو ویز میں لپیٹ لیا اور خواہ مخواہ اپنی بیٹی کی نمائش کرنے لگی۔

”تمہاری بیٹی پڑھتی ہے؟“ ہم نے پوچھا۔
”نہیں وہ ایک ہوٹل میں کبیرے ڈانسر ہے۔“ اس نے فخر سے اطلاع دی۔

”اگر کوئی کام ہے تو اڈ میں کر دیتی ہوں..... کیوں کہ صفائی کو اب تمہارے جانے کے بعد ہی کروں گی۔“

ہمیں پیکنگ کو آخری ٹچ دیتے ہوئے دیکھ کر اس نے مخلصانہ پیشکش کی۔

نہیں شکریہ۔ اب تم جاسکتی ہو ہم نے کہا۔
تم پاکستانی ہونا؟ وہ ہمارے کہنے کے باوجود

لگی نہیں بلکہ ہمارے سر پر کھڑی رہی۔ پاکستانی میڈمز بہت اچھی ہوتی ہیں شاید۔ کیونکہ تم بہت اچھی ہو۔

اس نے خوشامدانہ لہجے میں ہماری تعریف کی۔
”شکریہ“ اور اب تم جاسکتی ہو۔ ہم نے رکھائی سے

کہا۔
ایسے کیسے چلی جاؤں؟ تم نے تو اب تک میرا نام ہی نہیں پوچھا۔

”اچھا اب جلدی سے نام بتا دو اپنا۔“ ہم نے بے

زارى سے کہا۔

”طاہرہ“ میرا نام طاہرہ ہے۔

”تمہیں مصر اچھا لگا ہو گا ناں؟“ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی اور بار بار جانے کا سن کر بھی ہمارے سر پر سوار تھی۔

”ہاں پھر..... ہم نے ڈنڈا مارنے والے انداز میں

کہا۔
تو پھر یہ ممکن نہیں کہ تمہیں مصر کی طاہرہ اچھی نہ لگی ہو۔ تو جب تم اپنے ملک جاؤ اور مصر کی تعریف کرو تو وہاں

کے لوگوں کے سامنے جب مصر کا ذکر آئے تو طاہرہ کا ذکر کرنا مت بھول جانا۔

اس نے اتنی لجاجت سے کہا کہ ہم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”تمہیں اس کا کیا فائدہ ہو گا؟“ ہم نے پوچھا۔
”کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے اپنی تعریف کرانے کا بہت شوق ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔“ اسے اچانک کوئی کام یاد آ گیا تھا۔

تو جناب آج ہم نے مصر کی طاہرہ سے کیا گیا وعدہ وفا کرتے ہوئے مصر کے ساتھ ساتھ طاہرہ کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

اب پتہ نہیں بے چاری طاہرہ کہاں ہو گی۔ ہماری دعا ہے کہ وہ جہاں ہو آرام و سکون کی حالت میں ہو اور اسے اپنی تعریف سننے کو ملتی رہے۔ (آمین)

پنی آئی اسے کی فلائٹ پر ہم پہلے سعودی عرب آئے۔ جہاں چار گھنٹے ٹرانزٹ پیئرڈ کے

گزارے۔ اور پھر پی آئی اسے کی ہی پرواز کے ذریعے بلا خرہم

بخیر و عافیت واپس اپنے وطن پہنچ گئے۔

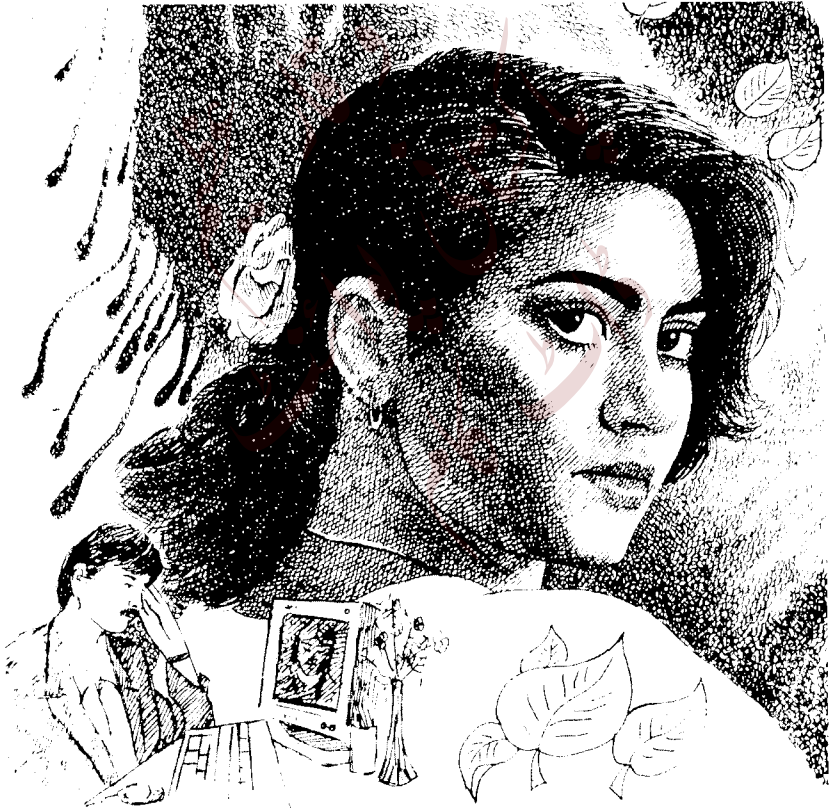
(ختم شد)

ایک تیرے وعدے کی قیمت

شائستہ زریں

ایک ہی منظر نے اس کی آنکھوں کے سب
 خواب چھین لیے، کیونکہ زندگی نے اس کے
 ساتھ عجب تماشا کیا تھا۔ لیکن وہ بے بس تھی
 کیونکہ وقت اپنی چال چل چکا تھا۔

سالگرہ ریشم کے حوالے سے ایک نہایت دلچسپ تحریر



تمام عمر کی نامعتبر رفاقت سے!
 کہیں بھلا ہو کہ میں بھر ملیں، یقین سے ملیں

نومبر ریشم 2012

تھی جس کی سالگرہ کے لیے شیریں نے یہ اہتمام کیا تھا۔ کیک کا ٹکڑا شیریں کے منہ میں ڈالتے ہوئے سلی نے کہا:

”ڈارلنگ! تمہارا تحفہ زبردست ہے یہ بتاؤ تم کیا لوگی اپنی سالگرہ پر؟“

”کیا؟ یہ تو نہیں بتا سکتی۔ کیسا؟ یہ بعد میں بتاؤں گی۔“ شیریں نے شرارت سے کہا۔

”بعد میں کیوں؟ آپ تو جھٹ پٹ کی عادی ہیں۔“ لیلیٰ نے برجستہ کہا:

”وہ تو میں ہوں دیکھ لینا شادی بھی اُس سے کروں گی جو میری طرح پھٹیلی پر سرسوں جمانے پر کمال رکھتا ہو، نام بے شک اُس کا کمال نہ ہو۔“

”پھر کیا نام ہو بھلا؟“ لیلیٰ نے تجسس سے پوچھا

”میں شیریں وہ فرہاد“ شیریں کھلکھلا کر ہنس دی۔ ہاں بات ہو رہی تھی سالگرہ کے تحفے کی تو واقعی نیک کام میں دیکھیں؟ پہلی فرصت میں میرا تحفہ لے آؤ، جو میری طرح سب سے اچھا سب سے جُدا اور سب سے انوکھا ہو۔“

”یہ تحفہ کیا رہے گا؟“ آواز کے تعاقب میں شیریں نے پلٹ کر دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔

”فرہاد حسن جو عمر میں شیریں سے بیس سال بڑے تھے شانِ قافرا سے کہہ رہے تھے۔“

”آپ کی طرح سب سے اچھا بھی ہوں، سب سے جُدا بھی اور سب سے بڑھ کر آپ شیریں اور میں فرہاد“ کہیے تحفہ قبول ہے؟ سالگرہ کب ہے؟ بتا دیجئے جیتا جاگتا تحفہ مل جائے گا“

شیریں دم بخود کھڑی تھی ایسا تحفہ اُس نے کب چاہا تھا؟ ادھر فرہاد جو پہلی نظر کی محبت کے قائل اور کسی ایک لڑکی پر قناعت کرنے والے ہی نہیں تھے جانے کیسے شیریں پر دل ہار بیٹھے اور یہ اُن کے جذبے کی سچائی ہی تو تھی جو اُن کے ساتھ ساتھ اُن کی امی اور بہنوں کو بھی شیریں ایسی بھائی کہ شیریں کی سالگرہ کے روز شوہر کے روپ میں شیریں کو فرہاد حسن کا انوکھا تحفہ مل گیا۔“

”سالگرہ کا تحفہ مجھے سب سے اچھا، سب سے الگ اور انوکھا چاہیے۔ یاد ہے نا آپ سب کو۔“

یہ وہ مطالبہ تھا جو شیریں کے شیریں ذہن سے آزاد ہوتے ہی اُس کے والدین اور دونوں بھائیوں کی سماعت میں قید ہو جاتا۔ برسہا برس سے یہ شیریں کا معمول تھا مارچ کے اوائل ہی سے وہ اپنے گھر والوں، قریبی عزیزوں اور سہیلیوں کے ذہن و دل پر دستک دینا شروع کر دیتی۔ وقت گزرتا گیا سال بدلتے گئے لیکن شیریں کے۔

ذوقِ طلب میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ بات در اصل یہ تھی کہ شیریں غیر معمولی حسن کی مالک تھی جو اُسے دیکھتا اس کا احساس بھی دلاتا سواپنے طور شیریں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ سالگرہ کے تحائف ایسے آنے چاہئیں جن میں کوئی تو بات اُن جیسی ہو، غیر معمولی حسین نہ سہی انوکھے اور منفرد ہی سہی۔ اکلوتی بیٹی اور اکلوتی بہن ہونے کا بھی شیریں نے خوب خوب فائدہ اُٹھایا تھا۔

خود نمائی اور خود ستائی شیریں کا شیوہ تھا، عمر میں اضافے کے ساتھ اُن کی شیوہ گری بھی بڑھتی جاتی تھی۔ شیریں کی طبیعت میں جلد بازی بہت تھی۔ پھٹیلی پر سرسوں جمانے کی عادت بھی نئی نہیں تھی۔ اکثر تو بات منہ سے نکلنے بھی نہیں پاتی کہ شیریں اُس کی تکمیل کے لیے چل جاتی۔ اب اتنی بچی بھی نہیں رہی تھی میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی مگر گھر والوں کے لاڈ پیار نے بچہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔ چونکہ شیریں کے لیے پیام آنا شروع ہو گئے تھے اس لیے تمام تر بچپن کے باوجود اب اس حوالے سے بھی شیریں خود کو اہم سمجھنے لگی تھی۔

شیریں کے حسن کے ساتھ اُن کے احباب میں شیریں اور لیلیٰ کی دوستی کا بھی بہت چرچا تھا، لیلیٰ کی سالگرہ پر شیریں خاص اہتمام کرتی تھی۔ اُس روز شیریں کا معصوم حسن دو آتشہ ہو رہا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ پارلر سے تیار ہوئی تھی، اپنی تمغیٹیں سن کر شیریں خوشی سے سرشار ہو رہی تھی اور اُس سے بڑھ کر خوشی لیلیٰ کو ہو رہی

کم عمر اور حسین بیوی پاکر فرہاد بہت خوش تھے۔ جب شیریں محبت آمیز لہجے میں انھیں بتی کہ کرپکارتی تو وہ اُس برسوجان سے غار ہو جاتے۔ شادی کے بعد شیریں نے تعلیم جاری رکھی۔ ذہین تو تھی ہی ساری تعلیم پرائیویٹ حاصل کی بالآخر ایک دن شیریں نے ایم اے انگریزی ادب کا امتحان دے کر اول پوزیشن حاصل کر لی۔ شیریں کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا لیکن بہت کم مدت میں جس طرح شیریں نے خود کو فرہاد حسن کے ماحول میں ڈھالا تھا فرہاد اُس سے بے حد متاثر تھے، شادی کے ابتدائی برسوں میں شیریں کی ضدیں بھی دلفریب لگا کرتی تھیں اور فرہاد حسن اپنی لاڈلی بیگم کی کوئی بھی فرمائش رد نہیں کرتے تھے۔ شیریں کے جنم دن اور شادی کی سالگرہ کے تحفے بھی اس کے حسب منشاء دیتے۔ حسن اتفاق کہ شیریں کے دونوں بیٹے فرہاد حسن کی سالگرہ کے روز دنیا میں آئے اور ان دونوں سالگرہوں پر شیریں خوشی سے بھولے نہ ماری تھیں کہ انھوں نے حسن صاحب کی سالگرہ پر ان کے وارثوں کا تحفہ انہیں دیا ہے۔ دوسرے بیٹوں کی پیدائش پر شیریں ترگم میں آکر کہہ بیٹھیں۔

”ہنی! سالگرہ پر آپ بھی مجھے ایسا نوکھا تحفہ دیجیے گا جو حیرت انگیز نا قابل یقین مجھ سے بڑھ کر حسین اور سر پرانز گفٹ بھی ہو“

اور فرہاد حسن جو دوسرے بیٹے کی ولادت پر بہت مسرور تھے شیریں سے وعدہ بھی کر بیٹھے کہ ”فرہاد نے اپنی شیریں کے لیے نہر کھودی تھی میں اپنی شیریں کے لیے سوپ سے موتی تلاش کروں گا“ بات آتی گئی ہوئی وقت برق رفتاری سے آگے بڑھتا گیا۔ ہر سال شیریں آس لگاتیں شاید اس سال وہ نایاب تحفہ فرہاد اپنی شیریں کو دیں گے جس کا انھوں نے وعدہ کیا ہے مگر ہر بار فرہاد وعدہ فردا پر مال دیتے یہاں تک کہ ان کی شادی کی بیچیسویں سالگرہ نزدیک آ گئی۔

بتی! شیریں نے انتہاک سے اخبار پڑھتے ہوئے

فرہاد حسن کو پکارا اُن کی آواز ہی نہیں لہجے میں بھی مٹھاس گھلی ہوئی تھی اور فرہاد حسن جو گزشتہ کئی برسوں سے اپنی لاڈلی بیگم شیریں کی مدد بھری آواز اور سر انگیز لہجے کے گن گارہے تھے، وہ جو شیریں کی پہلی صدا پر لبیک کہتے تھے خلاف معمول مطالعے میں مصروف رہے پل بھر کو ٹھٹھک کر شیریں نے فرہاد کو دیکھا اور اگلے ہی پل اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے فرہاد کے کاندھے پر ہاتھ رکھے۔

”آپ نے سنا نہیں بتی! ادھر دیکھنے نا پلیر میری طرف۔“

شیریں کے لہجے میں ناز بھری فطرتی اور التجا بھی۔

”جی فرمائیے خاتون اول میں ہم تن گوش ہوں“

فرہاد حسن نے اخبار میز پر رکھ دیا۔

خاتون اول سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اُلجھتے ہوئے شیریں نے استفسار کیا۔

کیا آپ ہماری خاتون اول نہیں ہیں؟ فرہاد نے والہانہ محبت سے شیریں کو دیکھتے ہوئے کہا تو پل کی پل میں شیریں کی ساری کلفت دُور ہو گئی اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

”ممنی! ہماری شادی کی بیچیسویں سالگرہ آ رہی ہے“

”اچھا! مگر کیب اور کون سی فلائیٹ سے؟“ فرہاد حسن نے حیرت اور ہنس سے کہا:

”بہت شیریں ہیں بتی آپ۔“

”یہ تو بہت پرانی بات ہے بالکل ایسی جیسی تم

old woman

”کیا؟ بتی تم مجھے old woman کہہ رہے ہو؟ مارے صدے کے شیریں کی آواز بھر آ گئی۔“

”کون کا فرکہ رہا ہے میں نے تو gold woman کہا تھا“

فرہاد حسن نے محبت پاش نظروں سے شیریں کو دیکھتے ہوئے کہا

”sorry بتی! میں سمجھی آپ مجھے old

woman کہہ رہے ہیں“

”تصور سر اسر آپ کی سمجھ کا ہے حالانکہ آپ جب چاہیں کہہ سکتی ہیں، اعلان کر سکتی ہیں، گا سکتی ہیں۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔“

فرہاد حسن نے تان لگائی تو شیریں جھینپ گئی، خوشی اُن کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔
”مجھے یقین ہے بنی! آپ مذاق کر رہے ہیں ہاں اگر آپ ”خاتون ثانی“ کے آرزو مند ہیں تو میری جانب سے اجازت ہے آپ جب چاہیں اپنے ارمان پورے کر لیں اور ”ثانی“ کو لے لی آئیں، اللہ کرے لے لی آئیں“ شیریں نے شوخی سے کہا:

”دوبارہ کہو ڈارنگ میں تو کھل اُٹھا۔ فرہاد کی فرمائش پر شیریں نے اُسے آنکھیں دکھائیں۔
”بنی! اب مذاق ختم آپ کو یاد ہے نا اگلے ماہ ہماری شادی کی پچیسویں سالگرہ ہے ہم اپنی شادی کا سلور جوبلی فنشن اس شان و شوکت سے منائیں گے کہ لوگ دیکھتے رہ جائیں گے۔ لوگ کتنا رشک کرتے ہیں ہم پر اور وہ مسز اخلاق! وہ تو حسد سے جل پھن جاتی ہیں جب آپ مجھے کوئی گفٹ دیتے ہیں۔ ہاں بنی اب وقت آ گیا ہے آپ کو اپنا برسوں پُرانا وعدہ پورا کرنا ہے“ شیریں نے فرہاد کو وعدہ یاد دلایا۔
”واہ ہماری بیگم تو صاحب کشف ہو گئیں آپ کو کیسے پتہ چلا کہ اب وقت آ گیا ہے۔“ فرہاد نے شرارت سے کہا؟

”جناب آپ ہمارے دل میں رہتے ہیں ہمیں آپ کے دل کی خبریں اپنے دل سے مل جاتی ہیں اور اب میں نہیں لوں گی کہ یہ ہمارا سلور جوبلی جشن ہے آپ سے ایسا تحفہ لوں گی کہ لوگ برسوں یاد رکھیں اور مسز اخلاق! جب اخلاق صاحب سے ایسے ہی تحفے کی فرمائش کریں تو وہ بے بسی سے انھیں دیکھتے رہ جائیں کہ ایسا انوکھا تحفہ اور وہ بھی امیر جنسی میں؟ ناممکن! تب گنتی بیٹی ہوگی اُن کی کتنا مزہ آئے گا ناں! ہے ناں بنی؟“

مسز اخلاق کی متوقع بے وقعتی اور اخلاق صاحب

کی بے بسی کے تصور سے خط اُٹھاتے ہوئے شیریں نے فرہاد پر تانید نظر ڈالی تو فرہاد حسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں شیرینی من اس بار میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا ایسا انوکھا تحفہ دوں گا کہ شادی کی سلور جوبلی کے جشن میں شرکت کرنے والوں کے لیے تو کیا خود تمہارے لیے بھی حیرت انگیز اور ناقابل یقین ہوگا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شاید ہی کسی شوہر نے اپنی شادی کی سلور جوبلی کے موقع پر اپنی محبوب بیوی کو ایسا تحفہ دیا ہو۔“

تجتنی! thanks my love
فرہاد حسن کی والہانہ محبت پر شیریں خوشی سے نہال ہو گئیں۔

جشن کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ فرہاد حسن کی فرمائش اور خود اپنی آرزو کی تکمیل کے لیے شیریں نے پورے بنگلے کو از سر نو ڈیکوریٹ کیا۔ اپنے لیے 50 ہزار کی مالیت کا بے حد نفیس لباس تیار کروایا، دولا کر کاسو نے کاسیٹ بنوایا۔ فرہاد حسن کو یہ اشیاء دکھا کر شیریں نے بعد نماز کہا

”مہنی! دیکھیے میری پسند کنی زبردست ہے“
”اور میری اس سے بھی زیادہ زبردست بلکہ آفت“ چشم تصور سے فرہاد نے جانے کسے دیکھا تھا کہ مسرت اُن کے انگ انگ سے عیاں تھی
جشن میں صرف ایک روز رہ گیا تھا جب شیریں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”مہنی! پلیز اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، جب بھی آپ کے تحفے کا خیال آتا ہے آپ کی لازوال محبت، بے مثال چاہت اور طوفانی شوق مجھے بے پایاں مسرت سے ہمکنار کر دیتا ہے، تب خوشی سے سرشار میں سوچتی ہوں جتنا میرے بنی نے مجھے چاہا ہے اتنا تو کسی شوہر نے اپنی بیوی کو نہ چاہا ہوگا بیوی سے یوں دیوانہ وار محبت کرنے والا شوہر اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ پر اُسے کون سا یادگار اور بے نظیر تحفہ دے سکتا ہے؟“

شیریں کی بیٹابی قابل دید تھی اور فرہاد حسن کہہ رہے تھے۔

”ڈارلنگ! اب تو 24 گھنٹے بھی نہیں رہے صبر کرو سر پر انزگفت ہے، ادھر کیک کئے گا ادھر تحفہ مادام شیریں فرہاد کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔ تحفہ حسب وعدہ دوں گا یعنی نایاب، یادگار، حیرت انگیز، منفرد، ناقابل یقین اور تم سے بڑھ کر حسین۔“

فرہاد کے لہجے میں پُر اسراریت ہی نہیں عجب قسم کی سرمستی تھی جسے محسوس کر کے شیریں مدہوش ہو رہی تھی اپنے خاص دوستوں کو شیریں نے متوقع انوکھے تحفے کی نوید سنا دی تھی جو ان کے توسط سے بڑی تیزی سے شیریں کے حلقہ احباب میں گردش کر رہی تھی یوں شیریں ہی نہیں اور بھی کئی لوگ اس جشن کے شدت سے منتظر تھے۔

کچھ دنوں سے شیریں کو شدت سے احساں ہو رہا تھا کہ فرہاد حسن کے رویے میں وہ پہلی سی وارفتگی نہیں رہی۔ فرہاد حسن کے کہے بعض فقرے شیریں کو چونکا دیتے شادی کی سالگرہ کا اہتمام ہمیشہ دونوں مل کر کرتے تھے لیکن اس مرتبہ فرہاد اپنی مصروفیت کے باعث وقت ہی نہیں دے پا رہے تھے، ہاں تحفے کے ذکر پر وہ مثل گلاب کھل اٹھتے۔ تب شیریں یہ سوچ کر دل کو سمجھاتی۔

”ہنی! اس لیے اتنے بے نیاز نظر آ رہے ہیں کہ کہیں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر راز فاش نہ کر دیں چاہتے بھی تو بہت ہیں مجھے۔“

شیریں کی خوش گمانی انھیں فرہاد سے بدگمان ہونے ہی نہیں دے رہی تھی۔

جشن کی صبح مسز اخلاق کا چمکتا ہوا فون آ گیا۔

”ہائے شیریں تم ابھی سے بوڑھی ہو گئیں، شادی کی گولڈن جوبلی کیا سلور جوبلی منائے بنا ہی۔“

مسز اخلاق کا یہ تیر شیریں کے دل پر تازہ ہو گیا۔

”میں سمجھی نہیں“ قد آور آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے شیریں نے کہا۔

پھر عید کی گہما گہمی ہے

عید آئی ہے لوٹ آؤ تم کچھ باتیں یاد دلانی ہیں کچھ قصے تمہیں سنانے ہیں کچھ باتیں پھر دہرائی ہیں

وہ بگھٹ آج بھی ویسا ہے اور پنچھی روز اترتے ہیں جو آنکھیں ہنستی رہتی تھیں ان آنکھوں میں اب پانی ہیں

پھر چاند ندی میں اترتا ہے اور یاد تمہاری آئی ہے پھر عید کی گہما گہمی ہے ہر سمت مگر دیرانی ہے

ہر سمت ہیں نظریں رستے پر میں چاند کو نکلتی رہتی ہوں تم آؤ تو میں بھی عید کروں مجھ کو بھی عید منانی ہے

پھر آج کلانی مہک اٹھے مرا چہرہ آج سنور جائے تو کاش کہیں سے آجائے میرا چہرہ اور نکھر جائے

پھر آج مجھے اس کمرے میں کچھ یاد کے دیپ جلانے ہیں میرے ہاتھ میں نکلن دینے ہیں بالوں میں پھول جانے ہیں (نزدہت جبین ضیاء، کراچی)

”آئینہ شیریں کی شادابی اور بے مثال حسن کی گواہی دے رہا تھا۔“

”میں سمجھا دیتی ہوں ابھی۔ آپ کے جاں نثار

شوہر ایک قتالہ کے ہمراہ دیکھے جا رہے ہیں شیریں ڈیر اپنے میاں کی باگیں کس لو جوانی میں تو وہ دیوانے تھے

ہی اب کیوں ساون کے اندھے بنے جا رہے ہیں“

یہ کہہ کر مسز اخلاق نے فون بند کر دیا اور ریسپور

تھاے شیریں ساکت کھڑی تھیں، اس سوال کا جواب تو

خود ان کو بھی معلوم نہ تھا، مسز اخلاق کو کیا جواب دیتیں۔

ایک ایک شیریں کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں

ایسا لگ رہا تھا کوئی گھنٹی پر انگلی رکھ کر بنانا بھول گیا ہے

شیریں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ جوانی میں فرہاد حسن خاصے رنگین مزاج تھے مگر پندرہ سالہ شیریں کے حسن جہاں سوز کے ایسے اسیر ہوئے کہ اُن ہی کے ہور ہے۔ ان بچپن برسوں میں فرہاد حسن نے شیریں کو چاہا ہی نہیں بقول مسز وقار پوہ جابھی تھا اور فرہاد حسن کی پریشانی کے اس انداز پر جانے کتنے دل راکھ ہو جاتے۔ فرہاد حسن کہتے بھی تو بڑے لاڈ سے تھے:

”مجھے ہر منظر میں شیریں کا نظارہ دکھائی دیتا ہے اپنی شیریں کا نظارہ۔“

فرہاد حسن تو واقعی فرہاد بن گئے تھے۔ عہد جدید کے شیریں فرہاد ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ شیریں کو اپنے فرہاد کی چاہت پر نازی نہیں گھمنڈ بھی تھا۔

”مسز اخلاق تو ہمیشہ مجھ سے حسد کرتی ہیں جانتی ہیں نا پریشان ہوں گی تو فشار خون بلند ہو جائے گا۔ میری خوشی خاک میں ملانے کے لیے ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں اُن کی بکواس پر کان دھروں گی تو.....“

ابھی شیریں کی سوچ کی پرواز بلند بھی نہ ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فرہاد حسن محبت سے پُور لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

”آج کے یادگار فنکشن کی ساری تیاری مکمل ہے ناں خاتونِ اول“ اور جواب سنے بغیر ہی فرہاد نے فون رکھ دیا۔

”یہ اپنی مجھے خاتونِ اول کیوں کہنے لگے؟ شیریں نے اُلجھتے ہوئے خود سے سوال کیا لیکن اگلے ہی پل مسز اخلاق کو کوٹنے لگی۔ جنھوں نے اُن کے دل میں شک کا بیج بو دیا تھا، مسز اخلاق کی بکواس پر کان نہ دھرنے کا عہد کرنے کے باوجود لا شعوری طور پر خود کو زیادہ حسین اور کم عمر ثابت کرنے کی آرزو شیریں کے اندر شدت سے بیدار ہو گئی تھی فوراً ہی انھوں نے اپنی بیویشن کو خصوصی ہدایت نامہ جاری کر دیا۔“ آج کے سنگھار میں اُسے اپنا تمام ہنر آزمانا ہے۔ جس کا اُسے منہ مانگے معاوضے کے علاوہ بھی قیمتی انعام دیا جائے گا۔“

شیریں نے اپنے ہنگے کے وسیع و عریض لان میں

جشن کا اہتمام کیا تھا۔ جہاں اس وقت رنگ و نور کا سیلاب اُٹا ہوا تھا شیریں مہمانوں سے اپنے حسن ہی کی نہیں حسن انتظام کی بھی دواسیت رہی تھی۔ بلاشبہ لان کی سجاوٹ اور جشن کا دیگر انتظام شیریں کی صلاحیتوں اور خوش ذوقی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ حسب آرزو شیریں نہایت حسین اور اپنی عمر سے کم نظر آ رہی تھیں تو فرہاد حسن بھی نوجوان نسل کے مقبول ہیرا سائیکل میں اپنی عمر سے کم دکھائی دے رہے تھے۔ جاندار مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائے فرہاد نے شیریں کے نزدیک آکر کہا

”شیریں! اجازت ہے جاؤں؟“ فرہاد حسن کے انداز دلربائی نے شیریں کا دل موہ لیا۔

”نیکلی اور پوچھ پوچھ، چائے بنی بلکہ دوڑ لگائیے“ شیریں کی بے چینی قابل دیدھی۔

فرہاد حسن کو گئے نصف گھنٹہ بیت گیا تھا شیریں کو ایک ایک پل ایک صدی کے مانند لگ رہا تھا۔ بالآخر طویل صبر آزما انتظار کے بعد فرہاد حسن آئے بھی تو خالی ہاتھ، شیریں نے تجسس سے انھیں دیکھا دل میں سو طرح کے خدشات سر اُٹھا رہے تھے۔

”بس شیریں انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں“ فرہاد کی نظروں نے پیام دیا تو شیریں طمانیت سے مسکرا دی۔

فرہاد حسن نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور نہایت محبت سے شیریں کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھے، میز پر قریب سے سچی بچپن موم بتیاں گل کر کے دونوں نے تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا۔ یہ منظر کچھ کر مسز اخلاق واقعی انگاروں پر لوٹ گئیں۔ اپنے تھے حصول کی بیتابی کے باوجود کن اکیھوں سے مسز اخلاق کے تاثرات دیکھ کر شیریں تکبیر سے مسکرا دی مگر کیونکہ اس وقت اولیت تھے کو حاصل تھی اس لیے اپنی متکبرانہ مسرت کو شیریں نے بعد کے لیے اٹھا رکھا اور لاڈ سے فرہاد کے آگے ہاتھ پھیلا دیے۔ ”ہنی میرا گفٹ۔“

شیریں کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی منتظر دُستس نظریں بھی فرہاد کی سمت اُٹھیں جو لان کے آخری سرے

پر منتظر نظر ڈال کر خود کو انتظار تھے مہبانوں کا منتہس اور شیریں کے دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ شیریں بغاوت پر آمادہ اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے فرہاد حسن سے مخاطب تھیں۔

”بہنی! پلین اب سسپنس ختم کریں“ اس سے پہلے کہ فرہاد لب لٹھائی کرتے ایک بے حد حسین لڑکی فرہاد کے برابر آن کھڑی ہوئی، اس کا سادہ اور معصوم حسن غضب ڈھا رہا تھا۔ فرہاد نے نہایت محبت سے اُس کا ہاتھ تھام کر شیریں کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے بنی؟“ حواس باختہ شیریں نے کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں فرہاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آگ آگ میں بھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو ڈار لنگ تمہارا تھخہ ہے اور تمہاری آرزو کے عین مطابق، انوکھا، حیرت انگیز، ناقابل یقین، تم سے بڑھ کر حسین اور سر پرانز گفٹ بھی یہ مزہ ثانی حسن ہیں۔ آج ہماری شادی اور ثانی کی پیدائش کی بچیویں ساگرہ ہے اس پر مسرت موقع پر خاتون اول کے حضور خاتون آخر کا نذرانہ حاضر ہے۔ پھر فرہاد نے شیریں کی جانب دیکھا۔“ تم نے کہا تھا ناں کہ آپ ثانی لے آئیں میں اجازت دے رہی ہوں، اب تم یہ بھی نہیں کہہ سکتیں کہ تم سے اجازت نہیں لی اور اجازت کی کیا بات ہے تم نے تو ہمیں دُعا بھی دی تھی ثانی کی۔ یاد ہے ناں؟

دم بخود کھڑی شیریں بھی فرہاد حسن اور کبھی ثانی حسن کو دیکھ رہی تھی اُس کے سارے ارمان آنسو بن کر بہ گئے تھے ایسے انوکھے تھے کہ شیریں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا محفل پر شکوت طاری تھا جسے مزہ اخلاق کی پُر جوش مبارکباد نے توڑا تھا۔ فرہاد حسن کے الفاظ شیریں کے کانوں میں سیسہ بگھلا رہے تھے۔

”خواتین و حضرات! آج ایک مکٹ میں دو مزے کریں گے یعنی میری پہلی شادی کا سلور جوبلی جشن اور دوسری اور آخری شادی کا ولیمہ فٹاشن“

برطرف سے مبارک سلامت کا شور مچ رہا تھا اور شیم بیبوشی کی کیفیت میں شیریں اعتراف کر رہی تھی

کہ:

”واقعی شیریں کے فرہاد کا تھخہ یادگار، نایاب، حیرت انگیز، منفرد، ناقابل یقین اور سب سے بڑھ کر شیریں سے زیادہ حسین ہے۔ ہوگا کوئی فرہاد حسن جیسا تھی دار اور صاحب دل؟“ جوانی عزیز از جان شریک حیات کو اُس کی شادی کی سلور جوبلی کے موقع پر پچیس سالہ سوکھ کا تھخہ دے کر اُسے رہنمائی دے دینے کا احساس دلانے“

ثانی حسن کے حسن جہاں سوز نے فرہاد حسن ہی کو نہیں شیریں کے ارمانوں کو بھی راگ کر دیا تھا۔ چالیس سالہ شیریں خود کو بہت بوڑھی محسوس کر رہی تھی۔ شیریں کی آنکھوں میں اشکوں کی جھڑی لگی تھی اور ماضی کی سست سفر کرتے ہوئے ڈوبتے دل سے وہ سوچ رہی تھی۔

”فرہاد حسن کی وہ والہانہ محبت، طوفانی عشق اور ستائشی کلمات محض دکھاوا تھے؟ مزہ اخلاق کی اطلاع صرف اُن کا حسد نہیں تھا، بھیا نک اور اُمَل حقیقت تھی“

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر دہن کیا ہے
تعریف و ثناء، اول، جہڑ کی و عتاب آخر

مسٹر دہلوی کے شعر نے شیریں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا یہ وہی شعر تھا جس نے شیریں کے دل سے مان سے کہا تھا ”بہنی واقعی میرے فرہاد ہیں اور روز اول کی طرح آج بھی اپنی شیریں کی مدح سراہی کرتے ہیں۔ بنی نے تو کبھی مجھے پھولوں کی چھڑی تک نہیں ماری“ اور اب۔۔۔ اب اس ستم پیشہ نے مجھے جیتے جی مار دیا۔“

شیریں تھکی تھکی اور اٹھکا نظر دوں سے فرہاد حسن کو دیکھ رہی تھیں جو اپنی نئی ٹولی دہن کے ہمراہ مبارکباد وصول کر رہے تھے آج کے دونوں فنانشن فرہاد حسن کے نام رہے کہ وہ مرد ہیں اور مرد عورت کا اسیر ہو کر بھی با اختیار ہوتا ہے جب چاہے اپنے اختیارات استعمال کر کے اپنے دل کی ملکہ کو معزولی کا پروانہ تھا سکتا ہے اور اب شیریں کی حیثیت بھی معزول ملکہ کی سی تھی وہ تائیف سے اپنے آراستہ گھر کو دیکھ رہی تھیں جس پر اب ثانی حسن کا بھی حق تھا حسن و جمال کا پیکر کھلتے گلاب کی

ماند ثانی اس وقت شیریں کو کسی ناگن سے کم نہیں لگ رہی تھی جس نے اُن کی خوشیوں کو ڈس لیا تھا اور خود تلی بنی اُڑ رہی تھی۔

”ہماری ازدواجی زندگی کی دیوار پر پہلی دراڑ کب اور کیسے پڑی؟“

شیریں کی سوچ اس نلٹے پر آ کر ٹھہر گئی تو وہ بھی ماضی کے درکھکھانے لگیں۔

فرہاد جس شیریں کی ہر ادھر پر شمار تھے، شیریں کی ہر جائز اور ناجائز بات مانتے تھے۔ اُن کے چھوٹے سے کاروبار کے فروغ میں شیریں نے اپنے حُسن و ذہانت سے اہم کردار ادا کیا۔ فرہاد کا کاروبار کئی ممالک میں پھیل گیا تھا، اور شیریں کو اپنے بھڑکا بخوبی احساس بھی تھا۔ جس پر وہ بہت نازاں بھی تھیں اور گاہے گاہے اپنے اس عظیم الشان کارنامے کا تذکرہ کر کے فرہاد حسن سے داد بھی وصول کرتیں۔ چند ماہ قبل ترنگ میں آ کر کھد بیٹھیں۔

”دیکھ لیں ہنی! ہماری شادی کو 25 سال ہونے والے ہیں اور میں آج بھی روزِ اوّل کی طرح جوان اور حسین ہوں اور آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔ آپ مجھے حسین پری کہتے ہیں ناں، میں نے بھی بڑی مہارت سے آپ کو اپنے پروں میں قید کر رکھا ہے، کبھی آزاد نہ کرنے کے لیے، آپ کے کاروبار کو میں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یوں بھی میں دو بیٹیوں کی ماں ہوں بڑا بھرم ہے میرا۔ ہار مان لیں ہنی! آپ اپنی پسند سے مجھے شادی کی سالگرہ کا مجھ سے اچھا، جبرت انگیز، ناقابل یقین، انوکھا اور سر پرانز ڈگفت دے ہی نہیں سکتے“

”ہاں یہ تو ہے؟ آپ ہیں تو لا ثانی ذرا آئینہ تو ایسے ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے“ فرہاد حسن نے شرارت سے کہا

”لا تو دوں فرہاد حسن! پر آپ آئینہ دیکھ اپنا سامنہ لے کر رہ جائیں گے۔ آپ کے برابر میں میں جو کھڑی ہوں گی بڑے میاں“

شیریں نے شوخی اور تکبر سے گردن اٹھا کر کہا تو

فرہاد حسن انھیں دیکھتے ہی رہ گئے۔

شاید یہی وہ پہلا موقع تھا جب فرہاد حسن کے دل کے شیشے پر بال آ گیا تھا۔

شیریں خود احتسابی کے عمل سے گزرتے ہوئے دم سادھے فرہاد اور ثانی کو دیکھ رہی تھیں جو سب کی توجہ کا مرکز تھے۔

شیریں کی سوچ غلط نہ تھی کیونکہ سچ یہی تھا کہ اُن ہی دنوں کاروباری دور سے پر فرہاد حسن کا آسٹریلیا جانا ہوا وہاں اُن کی ملاقات ثانی آغا سے ہوئی تو وہ جو شیریں کے کہنے پر بھی بار نہ مان سکے تھے ثانی کے حُسن و ذہانت کے آگے ہار گئے ثانی کی بڑی خوبی اس کے مزاج کی سادگی، انکساری طبیعت کی شیریں تھی، اُس کے چہرے کی نرمی اور معصومیت دیکھنے والے کو مسخر کر لیتی تھی پھر بھلا فرہاد حسن کیسے بچ سکتے تھے؟

”ایک دو دن نہیں تقریباً 25 برس تک میں نے شیریں کی فتح سے اکڑی گردن دیکھی ہے اب یہ اعزاز میرے حصے میں آنا چاہیے“

شیریں کی شکست سے جھکی گردن دیکھنے کی خواہش شدت سے فرہاد حسن کے دل میں سر اٹھانے لگی تھی۔ فرہاد کی کایا پلٹ گئی تھی ہر لحاظ سے ثانی کو شیریں پر سبقت حاصل تھی۔ صرف فرہاد ہی نہیں ثانی آغا بھی فرہاد حسن سے اتنی متاثر ہوئیں کہ عمر کا فرق تک بھلا بیٹھیں ثانی نے فرہاد حسن پر کچھ اس طرح اپنی گرفت مضبوط کی کہ شیریں اُن کے دل و دماغ کی دسترس سے آزاد ہوتی چلی گئی۔ انجانے میں فرہاد دونوں کا موازنہ کر رہے تھے۔ شیریں اور ثانی کی عمروں میں پندرہ سال کا فرق تھا۔ ثانی کا شباب اور شادابی دونوں ہی مسور کن تھے جبکہ غیر معمولی حُسن کے باوجود شیریں کا شباب اب اتنا شاداب نہ رہا تھا کہیں نہ کہیں اُن کی عمر چغلی کھا ہی جاتی۔ یہ تمام انکشافات ثانی پر نظر پڑتے ہی آپوں آپ فرہاد حسن پر ہونے لگے تھے شیریں کی قسمت کی خرابی دیکھنے کہ فرہاد کے آسٹریلیا جانے سے ایک روز قبل ہی فرہاد حسن کو شیریں نے بتایا کہ

میڈیکل رپورٹ کے مطابق شیریں کی شوگر بارڈر لائن پر ہے بلڈ پریشر بھی ہائی رہنے لگا تھا اس پل تو فرہاد نے کتنی محبت سے اپنی لادلی شیریں کو پیشہار دیا ت دی تھیں اور اس کی جانب سے متفکر ہو گئے تھے مگر اب ثانی کے جلووں نے فرہاد کو ہر فکر سے آزاد کرادیا شیریں انھیں فرہاد حسن لادلی میں دلشیں کہا کرتے تھے یک یک اُن کے دل سے اتر گئیں اور فرہاد حسن ثانی آغا کی جانب ملتفت ہو گئے یہ القات اتنا بڑھا کہ آج وہ ثانی آغا کا تعارف ثانی حسن کی حیثیت سے کروارے تھے اور شیریں خود کو ملامت کرتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ فرہاد کو بڑھا کہ کر شاید اُنھوں نے فرہاد کی حمیت پر ضرب لگا لی تھی جب ہی تو اُنھوں نے شیریں سے پندرہ سال کم عمر کی لڑکی سے شادی کر کے انھیں اُن کی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس دلایا تھا۔ یہ ہنسی مذاق یوں رنگ لائے گا اس کا تو شیریں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

جس ’’جشن سیمیں‘‘ کی تیاریوں میں شیریں نے دن کا چین اور راتوں کی نیند گنوائی تھی وہ شخص اُن کی پچیس سالہ کامیاب ازدواجی زندگی کا نہیں پچیس سالہ ثانی حسن کے ویسے کا جشن بھی بن گیا تھا۔ میز پر رکھے تحائف پر تائفت بھری اور فرہاد حسن کے دیے ہوئے منفرد تختے پر حسد اور حقارت بھری نظر ڈال کر شیریں صوفے پر ڈھیر ہو گئیں، وہ خود کو ریٹائرڈ محسوس کر رہی تھیں شیریں جوانی جانب میں فاتح حکمران کی طرح فرہاد حسن کے دل پر حکمرانی کر رہی تھیں اپنی ممبر تاناک اور ناقابل یقین شکست پر ریزہ ریزہ بکھر گئیں۔ شیریں کی سمت اُنھنے والی لوگوں کی نظروں میں ہمدردی بھی تھی اور مسخر بھی حتیٰ کہ ہر پل شیریں کی محبت کا دم بھرنے والی اُن کی رازدار اور ’’وفادار‘‘ سہیلیاں بھی اُنھیں ترس کھاتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ نگنی احباب ایسے تھے جو فرہاد اور ثانی کو گرجموٹی اور خوشدلی سے مبارکباد دے رہے تھے تو نہایت محبت سے شیریں کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش بھی کر رہے تھے اور لوگوں کے اس

دوغلے اور بے رحم رویے کو دیکھتے ہوئے شیریں کو یہ خیال ستارہا تھا کہ

یہ تو سچ ہے سب نے مل کر دلجوئی بھی کی تھی اپنی رسوائی کے مزے بھی سب یاروں نے لوئے اس دم شیریں کو کسی مخلص دوست کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی کبھی بھی عرصہ دراز سے لندن میں مقیم تھی۔ بیٹے بھی دونوں تحصیل علم کے لیے نیویارک گئے ہوئے تھے، سارے اپنے پرائے ہو گئے تھے۔ شیریں کی توقع کے عین مطابق اخلاق صاحب بے بسی سے اپنی بیگم سے کہہ رہے تھے۔

میڈم فوری طور پر نوا اتنا حسین تھہ میرے اختیار میں نہیں، آپ انتظار فرمائیے، چند روز بعد۔ ہاں اگر آپ کو بہت جلدی ہے تو اس نجوم مہ رخاں ہی میں سے کسی کا انتخاب کر لیتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہاں بھی ثانی حسن کا کوئی غالی نہیں کہنے کو تو شیریں فرہاد کی پہلی بیگم ہیں لیکن ثانی کے مقابلے میں دوسرے نمبر پر ہیں اور ثانی ثانی ہونے کے باوجود اول درجے پر فائز ہیں۔ شاید ثانی کی کوئی بہن؟ فرہاد سے معلوم.....؟‘‘ اخلاق صاحب کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتی اُن کی بیگم نے اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انھیں مزید لب کشائی سے باز رکھا۔ شیریں جیسے یا اُس سے بڑھ کر حسین بیش قیمت اور انوکھے تحفے کی خواہش میں اُنھوں نے اخلاق صاحب کا جینا حرام کر رکھا تھا لیکن اب وہ شیریں کی حرص سے ہاتھ بھیچ چکی تھیں۔ مسز اخلاق نے مضبوطی سے اخلاق صاحب کے ہاتھ تھام لیے۔

’’نہیں اخلاق نہیں۔۔ میرا سب سے قیمتی اور انمول تحفہ آپ ہیں مجھے آپ اور آپ کی محبت سے بڑھ کر عزیز کچھ بھی نہیں، آپ میرا سراسر مایہ زیست ہیں ڈیر‘‘ مسز اخلاق نے شیریں پر فاتحانہ اور پھر ممبر تاناک نظر ڈال کر کہا تو بڑے دھیان سے اُن کی باتیں سنتی شیریں کا غرور سے اٹھا رہنے والا سراسر احساس ندامت اور ذلت سے جھک گیا۔ شیریں کا فشار خون تیزی سے بڑھ

رہا تھا وہ دل پر دباؤ محسوس کر رہی تھیں۔ یہ حادثہ نہیں
 سانحہ تھا جسے شیریں نے جانے کس حوصلے سے
 برداشت کیا تھا۔ ضبط کر کے اس کی آنکھیں سرخ ہو
 رہی تھیں۔ دل میں اُٹھتی ٹیٹوں کو دبائے بظاہر بہادری
 سے وہ اپنی جگہ استاد تھیں لیکن دراصل فرہاد حسن کے
 غیر متوقع تحفے نے انھیں اندر سے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔
 شیریں اپنے ہی گھر میں خود کو اجنبی محسوس کر رہی تھیں۔
 چونکہ وہ خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہ رہی تھیں اس لیے
 نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اس ماحول کا حصہ اور میزبان
 اول بننے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھیں۔ شیریں
 کے اندر سخت رن پڑا ہوا تھا۔ بالآخر اس محاذ پر جیتی
 ڈٹے رہنے اور ”قصر شیریں“ میں مضبوطی سے اپنے
 قدم جمانے کے لیے شیریں نے خود کو تیار کر ہی لیا
 کیونکہ شیریں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُن کے دل پر خواہ
 کیسی ہی قیامت کیوں نہ ٹوٹ جائے۔ ثانی اُن کے
 لیے کتنی ہی قابلِ نفرت کیوں نہ ہو وہ فرہاد حسن پر تو کیا
 دنیا والوں پر بھی ظاہر نہ ہونے دیں گی۔

کچھ دیر پہلے تک ہواؤں میں اڑنے والی شیریں
 حسن اب پستیوں میں گرتی چلی جا رہی تھیں۔ مسز
 اخلاق نے بڑی لگاؤ سے ثانی کے سونے کے
 کنگنوں کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا کہ کہاں سے
 خریدے تب ثانی نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ حسن
 صاحب کا پہلا تحفہ ہے اور مجھے بے حد عزیز تب خود بخود
 شیریں کی نظریں اپنے ہیرے کے کنگنوں
 پر آکر ٹہر گئیں جو نیو ایر کے جشن کے موقع پر فرہاد نے
 انھیں دیے تھے اور اب شیریں! فرہاد حسن کو یوں دیکھ
 رہی تھیں جیسے کہ رہی ہوں

توڑے میں تُو نے جیسے یہ دھاگے خلوص کے
 لے اب میری کلائی کے ٹکٹن بھی توڑ دے
 آج کے خاص دن کے لیے شیریں نے بھی تو
 فرہاد کے لیے خاص الخاص تحفہ لیا تھا۔ لیا کیا تھا؟ خود
 شیریں بہت اچھی مضمون تھیں، سو انھوں نے بڑی محبت
 سے ایک پینٹنگ بنائی تھی جس میں دکھایا تھا کہ فرہاد

کے ہاتھوں میں تیشہ تھا ہاتھ زخمی اور خون آلود، لباس
 خستہ اور پسینے میں تر تر فرہاد شیریں کی دیوانہ وار محبت
 میں سرشار نہر کھود رہا ہے اور شیریں شانِ تفاخر سے
 کھڑی فرہاد کو دیکھ رہی ہے۔“

شیریں نے سوچا تھا اگر فرہاد انھیں انوکھا تحفہ
 دیں گے تو وہ بھی انھیں لاٹانی تحفہ دیں گی۔ مگر حالات
 نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ سب کچھ ٹپٹ ہو گیا اور فرہاد
 نے شیریں کو لاٹانی تحفہ تو نہیں ہاں ثانی کا تحفہ ضرور
 دے دیا۔ جب دلی جذبے میں سچائی نہ دلی تعلق میں
 مضبوطی نہ رہی تب فرہاد حسن کی نظر میں اس تحفے کی کیا
 اہمیت ہوگی؟ جو بہت مان اور محبت سے شیریں نے
 اپنے فرہاد کے لیے تخلیق کیا تھا اپنے محبوب شوہر فرہاد کے
 لیے جو اپنا ہونے کے باوجود پرایا ہو گیا تھا۔ اور اب
 شیریں سوچ رہی تھی کہ اچھا ہی ہوا جو سب کے سامنے
 یہ تحفہ فرہاد کو نہیں دیا، کہ پینٹنگ میں شیریں کے لیے
 فرہاد کے جذبے عیاں تھے لیکن شیریں کے دلی
 احساسات کا ایک رنگ بھی اس میں نہ تھا۔ جبکہ فرہاد کے
 لیے شیریں کا جذبہ محبت بہت خالص تھا بس خود پسندی
 کی عادت انھیں لے ڈوبی۔ اور یہ یا اور کوئی بھی تحفہ
 فرہاد کو دینے کا فائدہ بھی کیا تھا کہ اب فرہاد حسن کو
 شیریں کے لاٹانی تحفے کی نہیں ثانی کی ضرورت تھی جو
 انہیں مل گئی تھی۔ اور اس وقت فرہاد حسن کا ہاتھ تھامے
 سب سے تعارف حاصل کر رہی تھیں۔

”میرے اور ثانی کے کُسن میں کیا فرق ہے؟“
 بغور ثانی کا جائزہ لیتے، اپنا اور ثانی کا موازنہ کرتے
 ہوئے ایک نکتہ خود بخود شیریں کے ہاتھ آ گیا کہ

”شوہر کتنا ہی جان نثار کیوں نہ ہو بہر حال وہ مرد
 ہوتا ہے اگر بیوی شوہر پر اپنی برتری ثابت کرنے کی
 کوشش کرتی ہے تو وہ بھی محبوب شوہر سے حاکم بن جاتا
 ہے اپنی انا بھوج ہوتے دیکھتا ہے تو مرد اپنے مقابل کو
 مضروب کیے بنا نہیں رہتا کتنا ہی لبرل کیوں نہ ہو بیوی
 اُسے تابعدار ہی اچھی لگتی ہے اور شیریں کے مقابلے میں
 ثانی کی طبیعت میں انکساری اور لہجے میں فرہاد حسن کے

تب ثانی نے کیسی مدلل تقریر کی تھی اور اب تجربے سے گزر کر وہ محسوس کر رہی تھی کہ

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

ادھر شیریں نے بھی یہ زہر امرت سمجھ کر پی لیا تھا۔ فرہاد نے تو حسب وعدہ اپنی شیریں کو سپ سے موتی تلاش کر کے دے دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وعدے کی قیمت شیریں کو درد دل کی صورت چکانی پڑی شیریں کے دل میں فرہاد حسن دھڑکن بن کر دھڑکتے تھے اب اسی دل میں درد نے بسیرا کر لیا تھا اور شیریں کا حال یہ تھا

دل دھڑکتا نہیں ٹپکتا ہے

اُس کی خواہش بھی آبلہ ہے مجھے

اور آبلہ پانی ہی شیریں کا مقدر ٹھہری تھی، یہ بجا کہ نادانی میں وہ چند باتیں غلط کہہ گئی تھیں لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ اُس نے اپنے ہنسی سے والہانہ محبت کی تھی جس میں کہیں کھوٹ نہ تھا ذرا سی خطا کی اتنی بڑی سزا؟ یہ کیسی محبت تھی جس میں درگزر کی نہیں سزا کی گنجائش تھی اور شیریں کو بہت دکھ تھا کہ اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود وہ کھوٹے کو کھرا سمجھتی رہی۔ فرہاد حسن اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد تھا اور شیریں جو پہلی بھی نہ تھی اور آخری بھی نہیں۔ فرہاد عہد جدید کا کولمبس اسے جانے اور کتنے جہاں دریافت کرنے تھے، شیریں کو اس خیال کے ساتھ ہی اپنا اور ثانی کا درد ایک سماحوس ہوا۔

شیریں اور ثانی کا دردی مشترک نہ تھا اُن کی سوچ کا محور بھی ایک ہی شخص تھا اور دنیا کے سامنے تماشا بن کر اپنی جگہ ہنسائی دونوں میں سے کسی کو منظور نہ تھی سو اپنی اپنی انا کا پرچم سر بلند رکھنے کے لیے دونوں خواتین نے ایک دوسرے سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ اُن کے جیون کی ذور مرد سے بندھ تھی وہ ایک ہی تھا اور زندگی بہر طور انھیں اسی کی رفاقت ہی میں بسر کرنی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

لیے احترام بہت واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا، ثانی کے باطن کے کسب کا عکس اُس کے چہرے پر لہرا رہا تھا۔ اگر میں دو بیٹوں کی ماں ہوں تو کیا ہوا؟ وارث تو ثانی بھی فرہاد حسن کو دے سکتی ہے۔ وقت واقعی بہت بڑا استاد ہوتا ہے اور وقت کے کاری وار نے ہی تو شیریں کو سمجھایا تھا کہ

”ہنسی مذاق میں بھی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جس کی پکڑ ہو جائے۔۔ شوہر شوہر ہوتا ہے اور بیوی بیوی“

شیریں آپنی آئیے میری سالگرہ کا کیک نہیں کھوائیں گی“

سوچوں میں گم شیریں کی سماعت سے بے حد نرم اور مٹھی آواز گلڑائی تو انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا تب ثانی نے بڑی محبت سے اُن کے ہاتھ تھام لیے شیریں نے ایک شکوہ بھری نظر ثانی کے برابر کھڑے فرہاد حسن پر ڈالی اور خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس سے پہلے کہ شیریں ثانی کی ہمراہی میں آگے قدم بڑھائیں فرہاد حسن ثانی سے مخاطب ہوئے۔

”ثانی! شیریں کو سوکھ نہیں بڑی بہن اور دوست سمجھنا، یہ مجھے بہت عزیز ہے“

یہ کہہ کر فرہاد حسن آگے بڑھ گئے۔ اپنے مجازی خدا کے حکم پر ثانی نے آگے بڑھ کر شیریں کو گلے لگایا تو عجب سے احساس نے شیریں کو آلیا، ثانی نے اپنی سالگرہ کا کیک کاٹا تو شیریں نے اپنے ہاتھ سے نگلن اُتار کر اُسے دے دیے۔ حالانکہ نگلن شیریں نے دیے تھے لیکن جانے کیوں اُس پل شراکت کا جو شدید احساس ثانی حسن کو بُوا تھا اس سے قبل نہ بُوا تھا۔ اس کی تو اُسے خود بھی توقع نہ تھی کہ کبھی وہ اس نہج پر بھی سوچ سکتی ہے وہ جو عرب معاشرے کی مثالیں دے گرم دیکر ایک سے زائد شادی کے حق میں دلائل دیا کرتی تھی آج اُسے احساس ہو رہا تھا کہ ”کہنا آسان“ اور ”سمجھنا بہت مشکل“ ہوتا ہے۔ جب گھر والوں نے فرہاد حسن کے رشتے پر اعتراض کیا تھا کہ اس کی پہلی بیوی موجود ہے

ایک تھا بکرا

محمد عرفان رائے

اپنا گھر جنت ہے تو اپنے مسائل بھی اثاثہ ہیں۔
اور انہیں مل بیٹھ کر حل کرنے میں ہی عافیت ہے
کیوں کہ محبت نام ہے ہر حال میں ساتھ بھانے کا۔

ایک نوجوان کا قصہ جو عجیب و غریب مصیبت میں پھنس گیا تھا



اس کے آنگن میں مری پر چھانیاں دیکھی گئیں
کس حوالے سے میری رسوائیاں دیکھی گئیں

دی

”ہلو بیٹا! دیکھو! اکثر اکل آئے ہیں تم سے ملنے۔
ذرا انہیں اپنا گلا تو چپک کر اوٹاؤ ناسلڑ ٹھیک ہوئے یا
نہیں۔“

خلیفہ صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ چھ فٹ کے ہلو شیر
نے بھر پور انگڑائی لیتے ہوئے اپنے قد کو آٹھ فٹ تک
طول دیا اور پھر اپنی جگہ چھوڑ کر کیٹ واک کرتا ہوا میری
جان بڑھا۔ میری رنگت سرسوں کی مانند پہلی بڑبکی تھی۔
میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دنیا کے کسی سسرال
میں سمجھانے اور دھمکانے کا یہ طریقہ بھی رائج ہو سکتا
ہے۔ پھر اس سے قبل کہ میں اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کر
پاتا شیر نے قریب پہنچ کر اپنی لمبی سی زبان نکال کر میرا
نمک مرچ چپک کیا اور پھر بد مزگی کا اظہار کرنے کے
لئے اپنا غارنا منہ کھول کر پوری قوت سے دھاڑا۔۔۔
”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔“

آصف نے شیر کی طرح دھاڑ کر اپنی کہانی میں
حقیقت کا رنگ بھرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔
”ہائے میرے اللہ۔۔۔“ کالے شاہ بے اختیار اچھل
پڑا۔

”بالکل یہی۔۔۔ میں نے بھی یہی الفاظ کہتے
ہوئے شیر کے حلق میں جھانکا تو مجھے اپنا سانس رکتا ہوا
محسوس ہوا۔ کیوں کہ ایک سالم دنبہ چھ مرغیوں کے ساتھ
اس کے پیٹ میں بیٹھا لڈو کھیل رہا تھا۔۔۔ مجھے دیکھتے
ہی وہ سب ویلکم ویلکم کے نعرے لگانے لگے تھے۔ بس
پھر کیا تھا میں نے اسی وقت خلیفہ صاحب کے
قدموں میں گر کر ان کے شکاری بوٹ پکڑ لیے۔ اور توہ
کر لی کہ آئندہ کبھی ان کی دختر نیک اختر کو کچھ نہیں کہوں
گا۔۔۔ اب تم ہی بتاؤ ان حالات میں میں تانیہ کو منانے
اپنے سسرال کیسے جاسکتا ہوں۔ ویسے بھی میں نے سنا
ہے کہ خلیفہ صاحب نے ایک نئی بندوق خرید لی ہے اور
اس کی بسم اللہ کے لئے کسی مناسب شکار کی تلاش میں
ہیں۔“

”بات تو قابل غور ہے تمہاری۔۔۔ کیس بھی کافی

”بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔۔۔ کھانے میں نمک
کچھ زیادہ تھا۔ میں نے ڈانٹ دیا تو روٹھ کر میکے چلی گئی
۔۔۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ عید سر پر ہے، کیا کروں گا میں
اکیلا اس کے بغیر۔“

آصف نے پر غم پلکیں صاف کرتے ہوئے
جھگڑے کی وجہ بتائی تو پیر کالے شاہ نے غور سے اس کی
جانب دیکھا اور پھر دائرہ کھجاتے ہوئے اپروائی سے
بولتا:

”یوں تسوئے بہانے سے بہتر ہے کہ جا کر اسے
منا لو۔ پہلے تم لوگ بیویوں کو انسان نہیں سمجھتے اور پھر ان
کے جاتے ہی منہ لٹکا کر بیٹھ جاتے ہو۔“
”دل تو یہی چاہتا ہے کہ اڑ کر اس کے پاس جاؤں
اور بھگا کر گھر لے آؤں۔۔۔ مگر ڈر لگتا ہے۔“
”بیوی سے؟“
”نہیں سر سے۔“

”کیوں وہ آدم خور ہے کیا۔“ کالے شاہ نے دم
توڑتے سگریٹ کا آخری طویل کش لیا۔

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔۔۔ میرے سسر خلیفہ
عبدالقدوس اپنے دور کے جانے مانے شکاری رہ چکے
ہیں۔ اس کے علاوہ سرکس کے شیروں کو بلیاں بنانے کا
فن بھی انہیں ورثے میں ملا ہے۔۔۔ معلوم ہے جب
بچپنی مرتبہ میں نے تانیہ کو ڈانٹا تھا تو اس نے چپکے سے
اپنے ابا کو فون کر کے میری شکایت لگادی تھی اور پھر۔۔۔“
آصف جملہ ادھورا چھوڑ کر ماتھے پر نمودار ہونے
والی پسینے کی بوندیں صاف کرنے لگا جو اس کے اندر کے
خوف کی گواہی دے رہی تھیں۔

”پھر کیا ہوا؟“ کالے شاہ نے پرتشسس نظروں
سے اس کی جانب دیکھا۔

”ہونا کیا تھا خلیفہ صاحب مجھے بہانے سے سرکس
دکھانے گھر سے لے گئے اور بجائے کوئی وی آئی پی
سیٹ پیش کرنے کے سیدھا شیر کے پنجرے میں جا بیٹھے
۔ اس سے قبل کہ میں مزید کوئی سوال کرتا انہیوں نے
پنجرے کے کونے میں بیٹھے شیر کو پچکار تے ہوئے آواز

نازک ہے۔۔۔ مگر یہ بتاؤ مجھ سے کیا مدد چاہتے ہو۔
لیکن پہلے ہی بتا دوں کہ یہ سب کچھ جاننے کے بعد مجھ
میں تو اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ تمہارے سر کے پاس جا کر
تمہارا معافی نامہ پیش کروں۔“ کالے شاہ نے تفصیل
سن کر ہاتھ کھڑے کر دیے۔

”یارت تم بھی تو بڑے پیچھے ہوئے عامل بنے پھرتے
ہو۔ سارے محلے کے لڑکے تمہارے مرید ہو کر رہ گئے
میں جب سے تم نے ”محبوبہ آپ کے قدموں میں“ والا
پیچ متعارف کروایا ہے۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ مگر اس پیچ کا نام ”محبوبہ آپ کے
قدموں میں“ ہے۔۔۔“ بیوی آپ کے قدموں میں“
والا عمل کسی عامل کے پاس نہیں ہے۔“
”لیکن تم نے خود ہی تو مجھے بتایا تھا کہ تمہارے
لبے میں ایک بہت طاقتور جن ہے۔۔۔ اپنے اس غلام
جن سے کہہ کر میرا مسئلہ بھی حل کرادو ناں۔ آصف کرسی
سے اٹھ کر کالے شاہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”یارت تم تو شرمندہ کر رہے ہو مجھے۔ زمین سے اٹھ
کر واپس کرسی پر بیٹھو۔۔۔ دیکھو میں تم سے جھوٹ نہیں
بولوں گا۔ میں تمہیں اس سلسلے میں صرف تعویذ دے سکتا
ہوں بھابی کو واپس بلانے کے لئے۔۔۔ لیکن معافی
ماہتا ہوں، جن کی خدمات حاصل نہیں کر سکتا۔“
”افسوس ہے مجھے۔۔۔ کیا تم اپنے دوست کی اتنی
مدد بھی نہیں کر سکتے؟“

”تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے جگر۔۔۔ مگر
اب میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میرا یہ تمام رعب و بد بہ محض
ایک ڈھونگ اور پیسے کمانے کا ذریعہ ہے۔ اپنا غلام جن
میں کب کا آزاد کر چکا ہوں۔“

”مگر کیوں۔۔۔؟“ آصف اس انکشاف پر چونکا۔
”وہ کبخت ایک جہی سے لومیرج کر بیٹھا تھا۔ کام
مند کوئی کرتا نہیں تھا۔ سارا دن کھانے پر زور دیتا تھا
وہاں کا۔ پھر انہوں نے دو بچے بھی پیدا کر لیے۔ بچے
اپا تھے آفت کے پرکالے تھے۔ کچھوں کو شاید سوما یہ

سے برآمد کیا گیا تھا۔ ہر وقت بھوکے رہتے تھے۔ انہوں
نے تو میری جیب سے نسوار تک نکال کر کھانی شروع کر
دی تھی۔ چنانچہ میری برداشت جواب دینے لگی اور ایک
دن غصے میں آکر میں نے اپنے جن کو آزاد کر دیا۔۔۔
بہت رویا چلایا کہ بیوی بچوں والا ہوں کہاں جاؤں گا
چلو تم ہم سے کرایہ ہی لو اوپر والے کمرے کا۔ مگر میں
عاجز آچکا تھا ان کی حرکتوں سے اس لئے اپنا فیصلہ نہ
بدلا اور انہیں گھر سے نکال کر بی دم لیا۔“

”اب کہاں ہے وہ جن خاندان؟“

”دریا پار برگد کے ایک پیڑ پر رہتا ہے۔۔۔ اگر
مجھے کبھی کبھار کوئی ضروری کام آن پڑے تو اس بھوکے
خاندان کو کھانے کا لالچ دے کر اپنا کام نکلوا لیتا ہوں۔
ویسے انہیں منہ نہیں لگاتا۔۔۔ تمہارے لئے بھی میں یہی
کر سکتا ہوں کہ تمہیں اس کے پاس بھجوا دوں۔ امید ہے
تمہارا مسئلہ حل کر دے گا۔“

”اللہ تمہارا بھلا کرے۔۔۔ جلدی بتاؤ مجھے کرنا کیا
ہو گا۔“

”اس کی مدد حاصل کرنے کے لئے تمہیں دس کلو
گوشت بطور نذرانہ لے کر جانا پڑے گا اس کے پاس
۔۔۔ اگر بکرے کے گوشت کی سکت نہیں تو بے شک
گائے کا گوشت ہی لے جانا۔۔۔ مگر یاد رہے خالی ہاتھ
ہرگز مت جانا۔ یہ نہ ہو وہ بھوکا خاندان تم پر ہی ٹوٹ
پڑے اور میری بھابی اپنے میکے میں بیٹھی بی بوڑھی ہو
جائے۔“

اس کے بعد کالے شاہ نے اسے جن سے ملاقات
کا وقت اور طریقہ سمجھایا اور احتیاطی تدبیر بتانے کے بعد
گھر رخصت کر دیا۔

- ☆ -

دوسرے روز آصف نے کالے شاہ کی ہدایت کے
مطابق گوشت خریدا اور اس کے سمجھائے ہوئے راستے
پر سفر کرتا دریا کے کنارے جا پہنچا۔ کالے شاہ کی بتائی
ہوئی نشانی کے مطابق برگد کا درخت تلاش کرنے میں
اسے زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ یہ علاقہ چونکہ ویسے ہی

ایران اور بھوت پریت کی وجہ سے بدنام تھا اس لئے آصف نے بلا خوف و خطر درخت کے نیچے زمین پر کھڑا بچا کر گوشت رکھا اور خود ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر کالے شاہ کا بتایا ہوا عمل پڑھنے لگا۔

اسے عمل پڑھتے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک کسی نے اس کی گردن پر زور دار پھیرر سید کیا۔ اس نے لڑکھڑا کر گرتے ہی چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر کسی کو ناپا کر اٹھتے ہوئے ہکلیا:

”سک۔۔۔ کون ہے؟“

”کیوں آئے ہو یہاں۔۔۔ اچھا بھلا آرام کر رہا تھا۔ کچی میند سے جگا کر موڈ خراب کر دیا میرا۔“
آصف اب سنبھل چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی بڑا حرام جن ہے جو سوائے کھانے اور سونے کے کچھ نہیں کرتا۔

”مجھے کالے شاہ نے بھیجا ہے۔“

”کیا مسئلہ ہے۔۔۔“

”میری بیوی روٹھ کر چلی گئی ہے۔“

”تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔“ جن کی آواز دوبارہ

سنائی دی۔

”مگر میں اپنی بیوی کے بغیر بہت اداس ہوں۔“

”تو کیا پھر میں اپنی بیوی دے دوں؟“ جن غرایا۔

”نہیں نہیں مجھے اپنے والی ہی چاہیے۔“

”تو مثالاؤ اسے جا کر۔“

”وہ ناراض ہے۔۔۔ میں چاہتا ہوں وہ خود ہی گھر

واپس آ جائے۔۔۔ اگر میں اسے لینے گیا تو اس کے ابا

میری تنکا بوٹی کر دیں گے۔“

”شادی کیوں کی تھی اس قصائی خاندان میں اگر اتنا

بی ڈر لگتا ہے تو۔“

بس لومیرج کر بیٹھا ہوں غلطی سے۔۔۔ دیکھو پلیز

میری مدد کرو۔ میں بہت امید لے کر تمہارے پاس آیا

ہوں۔۔۔“ آصف منت ترلے پر اتر آیا تھا۔ وہ اس

جن کو دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر آواز صاف سنائی دے رہی

تھی۔

”ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ یہ بتاؤ نذرانہ لائے
ہو۔“ چند لمحے توقف کے بعد جن کی آواز سنائی دی۔

”ہاں دس کلو گوشت۔“

”کونسا۔۔۔؟“

”گائے کا۔۔۔“

جیسے ہی آصف کی زبان سے گائے کا لفظ نکلا
نادیدہ ہاتھ ایک بار پھر اس کے گال پر آ پڑا۔

”اب کیوں مارا ہے۔“ آصف کے کان سامیں
سامیں کرنے لگے تھے۔

”میں نے کالے شاہ کو بار بار کہا ہے کہ میرے بچے
بڑا گوشت نہیں کھاتے۔۔۔ ان کے لئے بکرے کا

گوشت بھیجا کرو۔“

”مگر جن بادشاہ بکرے کا گوشت تو مدت ہو گئی
ہم نے خود نہیں کھایا تمہیں کہاں سے کھلائیں۔۔۔

کالے شاہ سچ کہتا تھا تم بڑا حرام اور چنورے جن ہو۔ اگر

تمہیں محنت کر کے کمانا پڑے تو لگ پتا جائے۔“ تھپڑ

کھاتے ہی غصے میں آصف یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ

یہاں جن سے مدد حاصل کرنے کیلئے آیا ہے ناکہ اس کی

اصلاح کرنے۔

”بہت زبان چل رہی ہے تمہاری۔۔۔ لگتا ہے

بیوی سے پہلے تمہارا علاج کرنا پڑے گا۔“

”سک کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔“ آصف کو اپنی

غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

”بے عزتی کرتے ہو میری۔ دیکھنا اب میں تمہارا

کیا حشر کرتا ہوں۔۔۔“ یہ کہتے ہی تالی بجنے کی آواز

سنائی دی اور آصف کو ادھکی محسوس ہوئی۔ اسے اپنا سر

بھاری محسوس ہونے لگا تھا۔ چنانچہ اس نے جھرجھری

لیتے ہوئے اپنے جسم پر نظر دوڑائی تو بے اختیار منہ سے

چیخ نکل گئی۔۔۔ کیوں کہ اب وہ انسان نہیں رہا تھا بلکہ

ایک صحت مند بکرا بن چکا تھا۔

”نہیں۔۔۔ یہ کیا کیا تم نے۔۔۔؟“

آصف بے اختیار چیخا تو اسے احساس ہوا کہ اس

کے وجود میں گونجنے والی اپنی آواز کی بازگشت تو انسانی

ہے مگر منہ سے نکلنے والی آواز بکرے کی ہے۔ اس کی بے بسی کے جواب میں جن کا وہ فیملی تہقہہ سنا کی دیا۔ وہ سب اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسی سے نڈھال ہوئے چلے جا رہے تھے۔“

”اب تمہیں احساس ہو گا کہ ایک جن سے مذاق کرنا کس قدر مہنگا پڑا سکتا ہے۔“

”دیکھو پلیز۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تو پہلے ہی بہت دھبی ہوں۔ شاید اسی لئے پریشانی کے عالم میں اول فول بک گیا۔۔۔ پلیز مجھے پھر سے انسان بنادو۔ وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔“ آصف کی ٹانگیں ہی نہیں آواز بھی کانپ رہی تھی۔

”دوبارہ انسان بننے کے لئے تمہیں اپنی سزا کے ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے رفو چلے ہو جاؤ۔ ورنہ میرے بچے تمہاری جی بنانے کی ضد کرنے لگیں گے۔ انہیں بکرے کی جی بہت پسند ہے۔“

جن کے عزائم معلوم ہوئے تو آصف نے بے اختیار جھرجھری لی اور جان بچانے کے لئے بنا سوچے سمجھے قریبی کھیتوں کی جانب دوڑ لگا دی۔ جنات کے قہقہوں نے کچھ دیر تک اس کا تعاقب کیا اور پھر خاموش چھا گئی۔

وہ جانے کتنی دیر تک بے تکان بھاگتا رہا اور پھر تھک ہار کر ایک پیڈنڈی پر گرتے ہی زور زور سے ہانپنے لگا۔ اسے اپنی ایک کچھلی ٹانگ میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی تیز دھار چیز نے گوشت کو اندر تک چیر کر رکھ دیا ہو۔ کافی دیر تک وہ ویران راستے پر بیٹھا اپنی قسمت کو کوستا رہا۔ پھر دور سے ایک شخص کو اپنی جانب آتا دیکھ کر اسے کچھ حوصلہ سا محسوس ہوا۔ راہگیر شخص نے ایک تھیلا اپنی پشت پر لٹکا رکھا تھا۔ آصف اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ کوئی مزدور ہے اور شہر سے روزی روٹی کما کر واپس لوٹ رہا ہے۔۔۔ کچھ ہی دیر میں وہ خستہ حال شخص اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غم پاس سے گزر کر آگے

بڑھنے ہی والا تھا کہ آصف نے تیز آواز میں اسے مدد کے لئے پکارنا چاہا۔ مگر منہ آنے والی آواز بدستور بکرے کی ہی تھی۔

ویران راستے میں بکرے کی آواز سنتے ہی اس شخص کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر آواز کی سمت نظریں گھمائیں۔ جیسے ہی اس کی نظر ایک صحت مند پلے ہوئے بکرے پر پڑی وہ چند لمحوں کے لئے حیران رہ گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے اس کی حیرت پر سکون مگر اہٹ میں بدل گئی۔ وہ تیزی سے آصف کی جانب بڑھا اور قریب بیٹھ کر اس کے سر پر دست شفقت رکھا تو نا چاہتے ہوئے بھی دل بھر آیا۔ مگر وہ ہمدرد شخص ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ اس نے جلدی سے پشت سے اپنا تھیلا اتارا اور ایک مضبوط رسی نکال کر آصف کے گلے میں ڈال دی اور پھر اسے کھینچتا ہوا اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ وہ کافی دیر ناہموار راستوں پر چلتے رہے اور چند گھروں پر مشتمل چھوٹی سی آبادی میں پہنچ کر ایک خستہ حال مکان کے سامنے جا کر جس کی بیرونی دیوار زمین بوس ہونے کے قریب تھی۔۔۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ چنانچہ وہ شخص آصف کو کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ کچے گھن میں پہنچ کر اس نے آصف کو ایک کونے میں موجود کھونٹے سے باندھا اور واپس پلٹا ہی تھا کہ ایک عورت جو یقیناً اس کی بیوی تھی بے چینی کے عالم میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس نے ایک چھوٹا سا بچہ اٹھا رکھا تھا اور پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی:

”بہت دیر لگا دی تم رجیم بخش۔۔۔ کا کے کی طبیعت آج پھر بہت خراب ہے۔۔۔ حکیم جی نے کہا ہے کہ اسے ہسپتال لے جاؤ۔ بخار پل بھر کے لئے کم نہیں ہوا۔ گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ میں شام سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔۔۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم آج بھی کہیں خالی ہاتھ تو نہیں لوٹ آئے؟“ وہ ایک ہی نشست میں بہت سی باتیں کہہ چکی تھی۔

”نہیں سکیں! آج دن بھر کوئی مزدوری نہیں ملی۔

بلکہ میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ دوپہر کا کھانا کھا سکتا۔“

مرد جس کا نام رحیم بخش تھا رندھے ہوئے لہجے میں بولا تو سیکندہ نڈھال سی بو کر حن میں بچھی چارپائی پر جا بیٹھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو بچے کے چہرے پر گرنے لگے تو وہ بھی گسما یا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا ہو۔

”مگر تو فکر مت کر سیکندہ۔۔۔ کل ہم ہر صورت کا کے کو ہسپتال لے جائیں گے۔۔۔“ اس نے آگے بڑھ کر سیکندہ کی گود میں موجود بچے کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخاری شدت کا اندازہ لگایا۔

”کل کا سورج بھی بے رحم ہو گا رحیم بخش۔۔۔ کل بھی بے بسی کے سوا کچھ نہیں ہو گا اس گھر میں۔“ اس کے لہجے میں دنیا بھر کا کرب سمٹ آیا تھا۔

”تو پریشان مت ہو رب سوچنا بہت بے نیاز ہے۔ اس نے ہماری مشکل آسان کر دی ہے۔ اب ہمارے کا کے کو کچھ نہیں ہو گا۔“ رحیم بخش نے حن کے کون میں بندھے بکرے کی جانب اشارہ کیا۔

”بکرا۔۔۔ یہ کس کا ہے؟“ اس کی نظر پہلی مرتبہ بکرے پر پڑی تھی۔

”اپنا ہی ہے اللہ کی بندی۔“

”کہیں۔۔۔ کہیں تم نے کوئی چوری تو نہیں کی۔“ سیکندہ کے لہجے میں تشویش نے جہم لیا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہے تو سیکندہ۔ تیرا رحیم بخش اگر چوری چکاری کرنے والوں میں سے ہوتا تو اس کا اکلوتا بیٹا گھر میں دوکانی کے لئے نہ تڑپ رہا ہوتا۔“ رحیم بخش نے اس کی بات کاٹی اور بکرا ملنے کی پوری روداد سنا ڈالی۔ حقیقت جاننے کے بعد سیکندہ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی جیسے رحیم بخش نے چوری نہ کر کے اس کا مان بڑھا دیا ہو۔

اگلے دن صبح سویرے رحیم بخش، آصف کو لے کر گھر سے نکلا تو مارے بھوک کے اس کے لئے چلنا محال

تھا۔ رحیم بخش نے روانگی سے قبل اس کے سامنے چار توڑا لٹا مگر گھاس کھانا آصف کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ بھوکے پیٹ ہی اپنے وجود کو گھسیٹا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ رحیم بخش نے پل کے قریب پہنچ کر آصف کو اپنے ساتھ تانگے پر بٹھایا اور بکرا منڈی جا پہنچا۔

انہیں وہاں پہنچے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک لحیم شمیم ادھیڑ عمر آدمی نے رحیم بخش سے بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد اسے پندرہ ہزار میں خرید لیا۔“

”اب میری قیمت صرف پندرہ ہزار روپے ہے۔“ آصف نے اس قیمت پر احتجاج کرنا چاہا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ رحیم بخش ہزار ہزار کے کڑکتے ٹوٹ مٹھی میں دبائے نہایت پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج وہ اپنے بیٹے کا علاج ضرور کرا لے گا اور اگر کچھ پیسے بچ گئے تو اپنے گھر کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے میں بھی کامیاب ہو جائے گا۔

آصف کا نیا مالک جسے ساتھ موجود تیز طرار ملازم ملک صاحب کہہ رہا تھا مسلسل موبائل پر کسی سے باتیں کرنے میں مگن تھا۔ لیکن اس نے ملازم کو اشارے سے بکرا رکشے میں گھر لے جانے کی ہدایت دے دی اور خود سفید کار میں بیٹھ کر وہاں سے رنو چکر ہو گیا۔

نوکر نے ملک صاحب کے جاتے ہی ایک رکشہ روکا اور آصف کو دھکیل کر اندر داخل کرنے کی کوشش کی تو وہ تیزی سے دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

”پکڑو پکڑو۔۔۔ میرا بکرا بھاگ گیا۔۔۔“ نوکر نے شور مچایا تو دو تین لڑکوں نے مل کر بھاگتے ہوئے آصف کو قابو کیا اور اٹھا کر واپس رکشے میں ٹھونس دیا۔ اب کے بار نوکر نے آصف کی رسی مضبوطی سے تھام لی اور رکشہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

دیر تک سڑکوں پر گشت کرنے کے بعد وہ لوگ ایک نو تعمیر شدہ کالونی میں جا پہنچے۔ نوکر کے بتائے ہوئے راستے پر سفر کرنے کے بعد وہ ایک خوبصورت کوٹھی کے سامنے موجود تھے۔ رکشے والے کو کرایہ دے کر رخصت

عرفان راے کے قلم سے.....

101 عظیم مسلمان



ان نامور مسلمانوں کا تذکرہ جنہوں نے اپنے علم، کردار اور بہادری سے رہتی دنیا تک کیلئے مثالیں قائم کیں۔

نشان عبرت

اللہ کی واحدیت کو لاکارنے والی ان شیطان صفت قوموں اور افراد کی داستانیں جنہیں روز قیامت تک کیلئے نشان



عبرت قرار دیا گیا۔

قیمت
فی کتاب
200 روپے

☆ اندرون ملک کسی بھی شہر میں کتاب منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیج کر بالکل مفت منگوائیں ☆ بیرون ملک کتاب منگوانے کے لئے رقم بذریعہ ڈرافٹ روانہ کریں۔

خطوط اور منی آرڈر
ارسال کرنے کا پتہ

رابعہ بک ہاؤس

الکریم مارکیٹ ○ اردو بازار ○ لاہور ○ پاکستان

Ph: 042-37123555

Email: info@rabiabooks.com

Website: www.rabiabooks.com

کرنے کے بعد نوکر اسے کوٹھی کے اندر لے گیا اور چھوٹے سے سرسبز لان میں درخت کے تنے سے باندھ دیا۔ پورچ میں کھڑی سفید کار دیکھ کر آصف سمجھ گیا تھا کہ ملک صاحب ان سے پہلے ہی واپس پہنچ چکے ہیں۔ گھر میں بکرے کی آمد کی خبر پھیلنے ہی ملک صاحب بھی اپنی نوجوان بیوی کے ہمراہ لان میں آ گئے۔ ملک صاحب کا چھوٹا سا بیٹا چھڑی سنبھال کر آصف کی خبر گیری کرنے لگا۔ اس نے مار مار کر آصف کی ہڈی پیلی ایک کر دی تھی مگر باقی لوگ روکنے کی بجائے اس کی حرکتوں پر خوشی سے پھولے نہیں سارے تھے۔

نئے گھر کی مالکن جسے ملک صاحب ارشاد بی بی کہتے تھے اپنے شوہر سے عمر میں کافی چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بھڑکیلا قسم کا لباس پہن رکھا تھا اور بات بے بات قہقہے لگا کر ملک صاحب کی دلجوئی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسری جانب ملک صاحب کے چہرے پر دنیا جہان کی بے زاری اور اکتاہٹ نے ڈیرہ بہا رکھا تھا۔ اور وہ بیمار مرغ کی طرح مسلسل آنکھیں موندے اُلگھ رہے تھے۔ جب ارشاد بی بی نے محسوس کیا کہ وہ ملک صاحب کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس کی برداشت جواب دینے لگی:

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ملک جی۔“
”ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ بس تھوڑی تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے۔“

انہوں نے بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے دائیں ہاتھ سے بائیاں بازو دبانا شروع کر دیا۔ یہ منظر دیکھ کر ارشاد بی بی کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا۔

”ویسے ایک بات تو بتائیں ملک جی۔“
”ہاں بولو۔“ وہ اسی حالت میں بڑبڑائے۔
”یہ وہی مکانی آپ کو اتنا تھکا کر کیوں بھیجتی ہے ویلی سے کہ آپ مجھ سے بات کرنے کے قابل بھی نہیں رہتے۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بول رہی تھی۔
”کیسی باتیں کرتی رہتی ہو تم ارشاد بی بی۔۔۔ میں

بھلا وہاں کبڑی کھیلنے جاتا ہوں جو تم آئے دن مجھے طعنہ دیتی رہتی ہو۔“

”ایک نمبر کی خرافات ہے وڈی ملاکائی۔۔۔ وہ نہیں جانتی کہ آپ میرے ساتھ نہیں بولیں، میرے ساتھ گھومنے پھرنے جائیں۔۔۔ معلوم نہیں کیا تعویذ گھول کر پلا دیے ہیں اس نے آپ کو۔ اب تو آپ میری جانب نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔“

”فضول میں بک بک مت شروع کر دیا کرو وارثاد لی بی۔۔۔ کبھی کسی بات کو مثبت انداز میں بھی سوچ لیا کرو۔ وڈی ملاکائی بہت بیمار ہے آج کل۔ میرے سمیت سب لوگ رات بھر بہت متشکر رہے ہیں اس کی صحت کے بارے۔ اس لئے اب آنکھیں نہیں کھل پارہیں تھکاوٹ کے باعث۔“ ملک صاحب نے اسے سمجھانا چاہا۔

”اتنی ہی بیمار رہنے لگی ہے تو پھر مریکیوں نہیں جانتی وہ میری خوشیوں کی دشمن۔ کیوں آپ کا پیچھا نہیں چھوڑ دیتی۔۔۔“

ملک صاحب اس کی بات سن کر غصے سے کھول اٹھے اور پھر اٹھ کر اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے بولے:

”تم شکر کرو کہ وہ ابھی زندہ ہے۔۔۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو تجھ پر ایک اور سوتن لے آؤں گا میں۔۔۔ کیوں کہ ہمارے خاندان میں ایک بیوی رکھنا مرد کی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اب سچی ہو تم۔۔۔“

یہ کہہ کر ملک صاحب آگے بڑھے اور کوٹھی کے اندرونی حصے میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ارشاد لی بی نے اپنے اسی ملازم کو بلا کر ملک صاحب کی حویلی میں مصروفیات کے بارے تازہ رپورٹ طلب کی اور پھر چھوٹے ملک کو لے کر اندر چلی گئی۔

آصف بدستور لان میں موجود درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا اور شکر کر رہا تھا کہ اس نے جوش میں آ کر دوسری شادی نہیں کر لی۔ کیوں کہ بیوی کے روٹھ کر چلے جانے کے بعد بعض دوستوں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ پہلی بیوی کو سبق سکھانے کا بہترین طریقہ یہی ہے

کہ دوسری شادی کر لی جائے بلکہ وہ کافی حد تک ذہنی طور پر تیار بھی ہو گیا تھا مگر تانیہ کی محبت نے اسے کسی اور کا نہیں ہونے دیا تھا۔

رات دھیرے دھیرے بیتی چلی جا رہی تھی۔ آدھی رات کے وقت دو چور دیوار پھلانگ کر کوٹھی میں داخل ہوئے تو ان کا رخ آصف کی طرف تھا۔ گیٹ کو اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے لان میں پہنچ کر آصف کی رسی کھولی اور کھینچتے ہوئے تیزی سے دیوار کے پاس لے گئے۔ کوٹھی کی دیوار زیادہ بلند نہیں تھی۔ انہوں نے جیسے تیسے ہمت کر کے اسے کوٹھی سے باہر پہنچایا اور پھر کچھ دور کھڑے رکشے میں ٹھونس کر وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد آصف کے ساتھ بیٹھے چور نے پیرے سے کپڑا ہٹایا تو اسے حیرت کا جھکا سا لگا۔ کیوں کہ یہ ملک صاحب کا وہی ملازم تھا جو اسے گھر میں لے کر آیا تھا اور ارشاد لی بی کو ان کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔

-☆-

اگلی صبح آصف ایک بار پھر بکرا منڈی میں موجود تھا۔ جب کہ چوری کرنے والے دونوں افراد کمائی کر کے غائب ہو چکے تھے۔

بھانت بھانت کے بکروں پر مشتمل اس ریوڑ میں وہ اپنی دودھ جیسی سفید رنگت اور بھرپور جسامت کے باعث ہر آنے جانے والے گا بک کے لئے باعث کشش بنا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں موجود دوسرے بکروں میں حسد کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ اور وہ آتے جاتے اسے سینگ دکھا رہے تھے۔

عید میں صرف دو روز باقی تھے اس لئے دن چڑھتے ہی گا بکوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔

”ہاں بھی کیا قیمت ہے اس بکرے کی۔۔۔“ ایک جانی پیچانی آواز سماعت سے ٹکراتے ہی آصف کے جسم میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔

”صرف بائیس ہزار۔۔۔“ قریب بیٹھے مانک نے

”اکیس نہیں دس ہزار۔۔۔ گیارہ ہزار تو تم خود ہی سیدھا سیدھا اڑا دو۔“

خلیفہ عبدالقدوس نے آصف کی قیمت لگائی تو وہ مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ یعنی سر کی نظر میں میری قیمت صرف دس ہزار ہے۔“

اب ان دونوں کے درمیان ایک بحث چل نکلی تھی۔ خلیفہ صاحب بکرے کی خامیاں گنوا کر قیمت کم کرانا چاہ رہے تھے جب کہ بیچنے والا خوبیاں بیان کر کے دام کمانا چاہ رہا تھا۔

”مجھے تو لگتا ہے بکرا سگریٹ بھی پیتا ہے۔۔۔ دیکھو اس کے ہونٹ کیسے کالے ہو رہے ہیں۔“

”آپ کو بکرا بوس و کنار کے لئے چاہیے یا قربانی کیلئے؟“ مالک خلیفہ صاحب کی بات سن کر آگ بگولا ہو گیا تھا۔

سودے بازی کے دوران کئی بار ایسا ہوا کہ خلیفہ صاحب نے بکرا خریدنے کا ارادہ بدل دیا۔ جس پر آصف اپنی جگہ پر سرپا احتجاج بن گیا۔ وہ چاروں پاؤں جوڑ کر اللہ کے حضور دعا گو تھا کہ کسی طرح خلیفہ صاحب اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔

آخر کار خدا نے اس کی سن بی ٹی اور ایک تیسرے شخص نے معاملہ بارہ ہزار میں طے کر دیا۔

بکرے بن کر پہلی مرتبہ سسرال پہنچا تو اس کا یوں پر تیاگ استقبال کیا گیا جیسے وہ کوئی وی آئی پی شخصیت ہو۔ کئی کمروں پر مشتمل اس آبائی حویلی میں خلیفہ صاحب اپنے پانچ بچوں کے ہمراہ ٹھانڈے سے زندگی گزار رہے تھے۔ خلیفہ صاحب نے آدھی سے زیادہ زندگی جنگلوں میں گزاری تھی مگر وہ کسی شیر چیتے سے نہیں صرف اپنی بیوی سکیہ تیکم سے ہی ڈرتے تھے۔

سب نے بکرے کا والہانہ استقبال کیا اور اسے صحن میں دائیں دیوار کے پاس پانی کے نل سے باندھ دیا گیا۔

اب تمام گھر والے کرسیاں بچھا کر بکرے کے سر ہانے بیٹھ گئے تھے۔ اور اس کے وزن کا اندازہ لگا کر

نقے کا کش لے کر تسلی سے جواب دیا تو آصف نے جلدی سے گردن گھما کر پیچھے دیکھا جہاں اس کے سر خلیفہ عبدالقدوس قصاب کی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

”ابا حضور۔۔۔“

آصف نے چیخ کر ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانا چاہی مگر یہ چیخ محض بکرے کی میں میں ثابت ہوئی۔

ادھر خلیفہ صاحب جارحانہ انداز میں آگے بڑھے اور آصف کا منہ کھول کر اس کے دانت چبک کرنے کی کوشش کی۔ جس پر گھبرا کر آصف نے منہ کھولنے سے انکار کر دیا۔

”بڑا ڈھیٹ بکرا ہے، منہ نہیں کھول رہا۔“ وہ آصف کے سر پر ایک چپت رسید کرتے ہوئے بولے۔

”ابا ٹھہریں ہم اسے گدگدی کرتے ہیں۔“ یہ کہتے ہی آصف کے دونوں چھوٹے سالے فیضان اور سلطان جنہیں وہ ناران اور کاغان کہا کرتا تھا گدگدی کرنے کے لئے اس کے پیٹ کو ٹٹولنے لگے۔

گدگدی کیا تھا نشتر چھوڑے تھے وہ دونوں شیطان پہنچے آصف نے جلدی سے منہ کھول دیا۔

”ہوں دانت تو ٹھیک ہیں۔۔۔“

پھر خلیفہ صاحب نے آصف کا جسم ٹٹول کر صافی گوشت کا اندازہ لگانا شروع کر دیا۔

”ابا حضور! میرا اتنا تفصیلی چیک اپ تو آپ نے اس روز بھی نہیں کیا تھا جب اپنی بیٹی کا رشتہ طے کرنا تھا۔ آصف کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”ہاں بھی اب بتاؤ۔۔۔ کیا لوگ اس بکرے کا۔“ میڈیکل مکمل کرتے ہی وہ ربوڑ کے مالک سے مخاطب ہوئے۔ ”مگر یاد رہے ٹھیک ٹھیک بتانا میں نے ساری عمر جنگلوں میں شکار کیا ہے۔ جانور کو ایک میل دور سے دیکھ کر گوشت اور ہڈیوں کا وزن الگ الگ بتا سکتا ہوں۔“

”آپ کے لئے ایک ہزار کم کر دیتا ہوں۔۔۔ اب صرف اکیس ہزار روپے۔“

کو اُت لی بندر بانٹ کے بارے پلاننگ شروع کر دی
کئی تھی۔

”اتفاق سے بکرا تو اچھا مل گیا ہے۔۔۔ امید ہے
گوشت بھی کافی ہوگا۔ ایسا کریں دو رائیں ثابت رکھوا
لیں۔ ایک ناصر بھائی کے ہاں بھجوا دیں گے اور دوسری
رشیدہ آپا کے ہاں۔“ سکینہ بیگم نے سب سے پہلے اپنے
میکے کے حقوق کا تحفظ چاہا۔

”تمہارا خاندان تو ہمیشہ بھوکا ہی رہتا ہے۔۔۔ مجھے
تو لگتا ہے وہ لوگ پیدا ہی قربانی کا گوشت کھانے کے
لئے ہوئے ہیں۔ پچھلی مرتبہ میں محرم پران کے ہاں گیا
تو انہوں نے اتنے دنوں بعد بھی قربانی کے گوشت کی
حلیم بنا رکھی تھی اندازہ کرو۔ گوشت خور کہیں کے“ خلیفہ
صاحب بھڑک اٹھے تو سکینہ بیگم نے بھی تلوار نکال لی:
”دیکھیں خلیفہ صاحب میرے خاندان کے بارے
کچھ بھی کہنے سے قبل ہزار بار سوچ لیا کریں کیوں کہ اگر
میں نے اپنے سسرال کے بارے زبان کھولی تو بات
بہت دور تک جائے گی۔“

”اماں چپ بھی کرو۔۔۔ یہ بھی کوئی وقت ہے
جھگڑنے کا۔“ بیٹی آسیہ نے انہیں ٹوکا۔

”بیٹا ایک جھگڑا ہی تو ایسا مشغلہ ہے جسے کے لئے
کسی ناظم کیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔۔ آدھی رات کو
بھی لڑائی کا موڈ بن جائے تو انسان کوئی نہ کوئی بہانہ
ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ ویسے بھی تمہاری اماں تو شبہ سوار ہیں
اس میدان کی۔۔۔ اچھا خیر چھوڑو اس بحث۔۔۔
رائیں تو تقسیم ہونیں۔ ایسا کرنا اس ظالم کی چٹنی اور
دل الگ کر کے پہلے ہی دن بھون لینا۔“

خلیفہ صاحب نے رال ٹپکاتے ہوئے کاشف کی
جانب دیکھا تو وہ یکدم سہم سا گیا۔۔۔ اب وہ گردن گھما
کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔۔۔ لیکن تانیہ کہیں دکھائی نہیں
دے رہی تھی۔

پھر اچانک سکینہ بیگم نے تانیہ کو آواز دی تو وہ
بیڑھیاں اترتی صحن میں آن پہنچی۔ تانیہ پر نظر پڑتے ہی
آصف کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ وہ کافی دنوں بعد

اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا پھول سا چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا
اور آنکھوں تلے نمودار ہونے والے ہلکے گواہی دے
رہے تھے کہ وہ کئی راتوں سے سو نہیں سکی۔

”بیٹا دیکھو تمہارے ابا بکرا لائے ہیں۔۔۔ کیسا ہے
۔“ نفیہ بیگم نے آصف کا تعارف کرایا۔

”اچھا ہے۔۔۔“ تانیہ نے مختصر جواب دیا۔

”اچھا نہیں بہت اچھا۔۔۔ مجھے تو اس کی آنکھیں
بالکل آصف بھائی جیسی لگ رہی ہیں۔“

آسیہ نے اسے چھٹرا تو وہ بے دلی سے مسکرا دی۔
مگر آصف دیکھ چکا تھا کہ اس کا نام سنتے ہی تانیہ کی
آنکھوں میں نمی عود آئی تھی۔

”نام مت لو اس منحوس کا اس خوشی کے موقع
پر۔۔۔ اگر اسے ذرا بھی بیوی کا خیال ہوتا تو کب کا
لے گیا ہوتا معافی مانگ کر۔“ آسیہ بیگم چمک اٹھیں۔

”مم۔۔۔ میں۔۔۔“

آصف نے وہیں سے اپنی موجودگی کا احساس
دلانا چاہا۔ تو خلیفہ صاحب بولے:

”بکرا بہت مناسب ریٹ پر مل گیا ہے۔ مجھے
یقین ہے اتنا گوشت نلکے کا کہ پورے محلے میں تقسیم ہو
جائے گا۔۔۔“

”خلیفہ صاحب تو بہ کیا کریں۔ اتنی مبالغہ آرائی بھی
اچھی نہیں ہوتی۔۔۔ یہ بکرا ہے اونٹ نہیں کہ سارا محلہ
اسی سے پیٹ بھر لے گا۔“

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ پہلے تم لوگ بکرے کو
پانی وغیرہ پلاؤ۔ اس دوران میں بازار سے چارالے
آؤں۔ جانے کب سے بھوکا پیاسا ہے بے چارا۔“
خلیفہ صاحب کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے اور گھر سے
باہر نکل گئے۔

”اچھا بیٹا تم لوگ گھر آئے مہمان کی خاطر مدارت
کرو۔۔۔ میں ذرا چابی بٹیراں کے ہاں جا رہی ہوں
سنا ہے انہوں نے نے بھی ایک بلی نما بکرا خریدا ہے
۔ ذرا موزا فے تو کروں تمہارے اکبا تیر مار کر آئے ہیں“
سکینہ بیگم چادر سنبھال کر دروازے کی جانب

مگر وہ نادان بے خبر تھی کہ جس دلبر کی وہ منتظر ہے وہ تو اسی کے سامنے رسی سے بندھا بیٹھا ہے۔۔۔ اسی دوران تانیہ نے اپنی ماں سے پھر آصف کے بارے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ سخت لہجے میں بولیں: ”بہی اگر اس کے دل میں تمہارے لئے رتی بھر محبت بھی ہوتی تو وہ کبھی عید کے موقع پر تمہیں گھر سے نہ نکالتا۔“

”مگر امی قصور صرف ان کا نہیں میرا بھی تو ہے۔ مجھے بھی تو ان باتوں سے احتیاط برتنی چاہیے جو انہیں نا پسند ہیں۔۔۔ لڑکی کو شادی کے بعد سسرال ہی کو اپنا اصل گھر سمجھنا چاہیے۔۔۔ بات بات پر روٹھ جانے کی دھمکیاں اور منیکے چلے جانے کے ڈراوے اس کا اچھا تاثر قائم نہیں کرتے۔ شوہر شادی کس لئے کرتا ہے۔۔۔ کہ اسے اچھا بیون ساسھی ملے۔ گھر میں سکون کی فضا قائم ہو۔ کوئی اس کی ضرورتوں کا خیال رکھے، گھر جانے پر کوئی مسکرا کر اس کا استقبال کرے۔۔۔ لیکن اگر بیوی یہ بنیادی فرائض ہی پورے نہ کرے تو پھر ایک چھت تلتے دونوں کا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔“

تانیہ کی باتیں سن کر سیکڑے نیگم خاموش ہو گئیں اور آصف محبت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ اب وہ انسان نہیں رہا تھا بلکہ ایک بکرا بن چکا تھا۔ ایسا بکرا جسے اگلے دن قصاب کی چھری کا سامنا کرنا تھا اور پھر اس کے بعد تانیہ نے باقی زندگی ماں باپ کی چوکھٹ پر ہی گزار دینی تھی۔ اس نے خیال نے اسے مزید افسردہ کر دیا تھا۔

اس دن اسے خوب مہندی لگائی گئی۔ بچے اس کے گردن میں رسی ڈال کر سارے محلے میں گھما کر لائے اور شام کو واپس کھونٹے سے باندھ دیا گیا۔ رات کو جب سب لوگ سو گئے تو آصف اپنے رب کے حضور دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ پھر سے انسان بن جائے۔ دن بھر بول بول کر وہ بہت تھک گیا تھا مگر کسی نے اس کی فریاد نہیں سنی تھی۔ اسی پریشانی میں اٹھ کر اس نے چہل قدمی شروع کر دی لیکن جیسے ہی اس

برعین کیوں کہ یہی تو وقت تھا خود نمائی کا۔ ان کے ہانے کے بعد تانیہ نے ایک بار پھر بکرے کی جانب غور سے دیکھا۔ جو مسلسل اس پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ تانیہ محسن میں موجود دل سے پانی کا ٹب بھر کر اس کے پاس لے آئی۔

”کیسی ہو جان۔۔۔“ جیسے ہی تانیہ ٹب رکھنے کے لئے اس کے قریب پہلی آصف آگے بڑھ کر اس کے بالکل قریب آ گیا۔ لیکن تانیہ اس کی بات سننے سے قاصر رہی۔

”یہ تو مجھے کوئی اوباش قسم کا بکرا لگ رہا ہے۔۔۔ دیکھو کیسے گھر میں داخل ہوتے ہی جوان لڑکیوں سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کرنے لگا ہے۔“ آسہ لی بات سننے ہی تانیہ بے اختیار مسکرا دی۔ مگر جانے یوں اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بکرے کی آواز بہت مصنوعی قسم کی ہے اور اس کی آنکھوں میں سمجھ نہ آنے والا لرب ہے جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔

لیکن یہ سب یقیناً اس کا وہم تھا۔ بھلا ایک بکرا کیا لہنا چاہے گا اس سے۔ محسن سے اٹھ کر وہ بچن میں جا مٹی لیکن وہ نوٹ کر رہی تھی کہ بکرے کی نظریں مسلسل ان پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ جدھر جا رہی تھی بکرے کی گردن ادھر ہی ٹھوم رہی تھی۔

اسی دوران خلیفہ صاحب نے چارالہ کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”ہائے رے میری قسمت۔۔۔ سسرال میں مجھ پر یہ دن بھی آتا تھا کہ میں بڑے سے برتن میں چارالہاؤں۔“ آصف بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔

وہ رات بھی اسی حالت میں گزر گئی۔

اب عید میں صرف ایک دن باقی تھا۔ آصف صاف محسوس کر رہا تھا کہ تانیہ کی بے چینی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی جیسے انتظار ہو کہ ابھی اٹک کی آواز سنائی دے گی اور آصف مسکراتا ہوا اسے لینے آجائے گا۔

میں نے اس کے سانسوں کی سرسراہٹ اپنے چہرے پر محسوس کی ہے۔۔۔ وہ یقیناً کوئی بھوت تھا۔“

سب لوگ اس کی بات سن کر پریشان تھے اور مختلف اندازے لگا رہے تھے کہ اچانک فیضان کی نظر بکرے کی رسی پر پڑی تو وہ پھرتی سے اسے کھینچتے ہوئے بولا۔

”پڑ لیا وہ بھوت میں نے۔۔۔“

اس نے رسی کو زور سے کھینچا تو آصف کی آنکھیں اور زبان باہر آ گئی۔ دو لوگوں نے اسے کھینچ کر بیڈ کے نیچے سے باہر نکالا اور کان مروڑ کر خوب برا بھلا کہا۔ پھر اسے دوبارہ سے صحن میں لے جا کر مغبوطی سے باندھ دیا گیا۔

☆

وہ رات آنکھوں میں گزری۔ آصف کو لمحہ بھر کیلئے نیند نہیں آئی تھی۔ اس کے اپنے ہی اس کی گردن پر چھری چلانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب وہ کالے شاہ کے کہنے پر جن کے پاس گیا تھا۔

اگلے روز عید تھی۔ خلیفہ صاحب عید کی نماز پڑھ کر لوٹے تو کچھ ہی دیر میں قصائی بھی آن دھمکا:

”میں نے سوچا پہلے خلیفہ صاحب کا بکرا کاٹ دوں۔۔۔ پچھلے سال بھی ناراض ہو گئے تھے کہ تاخیر سے آیا ہوں۔“

اس نے آتے ہی خوشامد بھرے لہجے میں کہا تو گھر میں قربانی کی تیاری شروع ہو گئی۔

ایک رسی بھی لاؤ۔۔۔ قصائی نے منہ میں پان کی گلوڑی رکھتے ہوئے کہا۔“

وہ کیوں۔۔۔

”بھئی بکرے کی کھال بھی تو اتارنی ہے ناں لٹکا کر

۔ آصف کے کانوں میں یہ فقرہ گونجا تو اسے دل کی

دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی جگہ پر بھرپور

زور آزمائی میں مصروف تھا کہ کسی طرح رسی ٹوٹ جائے

اور وہ یہاں سے بھاگ نکلے مگر یہ ممکن نہیں رہا تھا۔

”ٹیفے بھائی! چھری ذرا چھپا کر رکھو۔۔۔ جانور ڈر

کی رسی میں تناؤ پیدا ہوا گرہ خود بخود کھل گئی۔ شام کو بچے شاید اسے صحیح طرح باندھ نہیں سکے تھے۔

آزاد ہونے کے بعد کچھ دیر تک وہ یہی سوچتا رہا

کہ اب کہاں جائے۔ پھر اسے تانیہ کا خیال آیا کہ

کیوں نا اس کے پاس جا کر اپنی جانب متوجہ کرنے کی

کوشش کی جائے۔ ٹانگ پر زخم جو بکرا بننے کے بعد روز

اول سے تھا ابھی تک بدستو اسے تکلیف کا احساس دلا

رہا تھا۔ لیکن وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور اس کمرے کی

جانب چل پڑا جہاں تانیہ سو رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ اس کے

سر ہانے جا کھڑا ہوا۔ اور منہ اس کے کان کے بالکل

قریب کر کے سرگوشی کرنے کی کوشش کی:

”تانیہ اٹھو یہ میں ہو۔۔۔ تمہارا آصف“

لیکن تانیہ جو کہ گہری نیند سو رہی تھی کسی کو اپنے اتنا

قریب پا کر ہڑا کر اٹھ نہ سکی۔

”لک۔۔۔ کون ہے۔۔۔ چور چور۔۔۔ بھوت

بھوت۔۔۔“ تانیہ نے بدحواسی کے عالم میں شور مچا دیا تو

آصف مزید گھبرا گیا اور کچھ نہ سوچنے پر جلدی سے اس

کے بیڈ کے نیچے گھس گیا۔

اتنی دیر میں باقی سب لوگ بھی اس کے کمرے

میں جمع ہو گئے۔ خلیفہ صاحب کے ہاتھ میں بندوق تھی

اور وہ بنا عینک اپنے شکار کا نشانہ لینے کے چکر میں سیکنہ

بیگم پر بندوق تانے کھڑے تھے۔

”خلیفہ صاحب مت ماری گئی ہے آپ کی۔

میرے ہی سر میں سوراخ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“

بیگم نے غصے سے بندوق کو جھٹکے دے کر دوسری جانب

کیا اور پھر تانیہ سے مخاطب ہوئیں:

”کیا ہوا میری بچی۔۔۔ کیوں اتنی پریشان ہے۔“

”ابھی یہاں کوئی تھا اماں۔۔۔“ تانیہ خوف سے

کانپ رہی تھی۔

”نہیں میری جان یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔۔۔

میرا خیال ہے تم خواب میں ڈر گئی ہو۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں اماں یہاں واقعی کوئی تھا۔

کس کر باندھنے کے بعد میدان میں اتر آیا اور کارپٹ پر پان کی پیک تھوکتے ہوئے بولا:

”یہ بکرا مجھے کسی شریف گھرانے کا چشم و چراغ نہیں لگتا خلیفہ جی۔۔۔ میں تو کہتا ہوں اسے بیس کاٹ دیتا ہوں۔ اسے تو بہن بیٹیوں کی عزت کا خیال ہی نہیں ہے۔“

یہ جدو جہد ابھی جاری تھی کہ اچانک فیضان کی نظر بکرے کی دائیں ٹانگ میں بیوست ایک تیز دھار کیل پر پڑی:

”ارے یہ کیا؟“

اس نے سب کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو قضائی نے آگے بڑھ کر کیل باہر کھینچ لی۔

کیل کھینچتے ہی کمرے میں روشنی کا ایک جھمکسا ہوا اور بکرا روپ بدل کر صفیں گیا۔ وہ بھی اس انداز میں کہ اس نے دونوں بازوؤں کے حصار میں تانیہ کو جکڑ رکھا تھا اور باقی لوگ مانگوں سے پکڑ کر اسے پیچھے کھینچ رہے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر سب نے ہڑ بڑا کر اسے وہیں چھوڑ دیا تو وہ دھڑم سے زمین پر آن گرا۔

اسے یوں روپ بدلتا دیکھ کر قضائی سمیت سب لوگ ڈر کے مارے بھوت بھوت کا شور مچاتے باہر کی جانب بھاگ گئے تو تنہائی ملتے ہی آصف اس کے مزید قریب آ گیا اور اپنی کمر کی چوٹ سہلاتے ہوئے بولا:

”بہت تنہا اور اداس ہوں میں تمہارے بغیر۔۔۔ چلو اپنے گھر چلتے ہیں۔۔۔ کہ میں صرف تمہارے لئے لوٹ کر آیا ہوں۔۔۔“

تانیہ جو کہ ابھی تک حیرت سے منہ کھولے نکر نکر آصف کی جانب دیکھے چلی جا رہی تھی خود پر قابو نہ رکھ سکی اور بے اختیار اس کے کاندھے پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگی۔۔۔ جب کہ آصف کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ یہ آنسو غم کے نہیں خوشی اور شکر کے ہیں۔۔۔“

-☆-☆-

رہا ہے شاید۔“

خلیفہ صاحب کے دل میں بھی آصف کا احساس جاگا۔ جولباٹھنے نے آصف کو دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اسے فوراً مقتل میں پیش کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

سب لوگ اسے کھینچ کر قصابی کے پاس لے آئے۔ قضائی نے آصف کو جارجانہ انداز میں زمین پر گرایا اور اس کے کاندھے پر پاؤں رکھ کر چھری اٹھانے کے لئے دوسری جانب متوجہ ہوا۔ لمحہ بھر کے لئے اسے خود سے غافل پاتے ہی آصف اپنی جگہ پر زور سے اچھلا اور گرفت سے آزاد ہو کر صحن میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔

سب لوگ اس کے تعاقب میں تھے۔ کافی دیر تک صحن میں اوہم چانے کے بعد وہ اس کمرے میں جا گھسا جہاں تانیہ اس پریشان گہری سوچ میں گم بیٹھی تھی۔

بکرے نے اسے دیکھتے دور سے دھچک لگائی اور سیدھا اس کی گود میں جا گھسا۔ اس اچانک نازل ہونے والی مصیبت پر تانیہ بری طرح بوکھلا گئی تھی سب لوگ بکرے کو پکڑ کر واپس کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

”مجھے تو یہ بکرا کوئی بھوت پریت لگ رہا ہے۔۔۔ کبخت جب سے اس گھر میں آیا ہے میری بیٹی کے سر ہے۔“

”بیگم بیگم نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے دھانی دی۔

”بیگم کم از کم عید کے دن تو منہ سے کوئی اچھی بات نکال لیا کرو۔۔۔ یہ جن بھوت نہیں اللہ کا جانور ہے۔ بس ذرا بدگ گیا ہے اس لئے قابو نہیں آ رہا۔“

خلیفہ صاحب نے بیگم کو سمجھایا اور پھر اس لشکر کی نمائندگی کرنے لگے جو بکرے کو تانیہ کی گود سے نکالنے کے لئے کوشاں تھا۔

سب لوگ بکرے کو پکڑ کر کھینچنے لگے اس نے تانیہ کی قمیص کو منہ میں دبایا تھا۔ اب سیکنہ بیگم اور آسیہ بکرے کے منہ سے قمیص نکالنے کی جدو جہد میں مصروف ہو گئیں جب کہ مرد حضرات اسے پچھلی مانگوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ رہے تھے۔۔۔ اتنی دیر میں طیفہ قضائی بھی اپنی لہنگا نمائندہ نو سکرٹ کی طرح

آدم، حوا اور شیطان

عطیہ عمر / سبرینا خان



یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتا تھا۔ البتہ جمعہ کی نماز اور پھر رمضان کی تمام نمازیں پابندی سے پڑھتا تھا اماں نے بچپن سے ہی روزے اور نماز کی عادت ڈالنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر میں جی نکم ثابت ہوا تھا۔
”عابد بیٹا! نماز تو پورا سال فرض ہے زندگی کے آخری سانس تک، جب تک ہوش و حواس سلامت ہیں نماز کی معافی نہیں۔ بیٹھ کر، لیٹ کر، اشاروں سے، ہر

رات بستر پر جاتے ہوئے میں بہت خوش تھا۔ بہت عرصے بعد میں نے اپنے دل میں ایک تازگی، خوشی اور امنگ محسوس کی تھی۔ صبح خلاف معمول میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ کہیں دور سے اذان کی مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر تو یونہی کسل مندی سے لیٹا رہا پھر سوچا کیوں نہ فجر کی نماز پڑھ لوں۔ شاید کل سے تو رمضان المبارک شروع ہو جائے۔ میں عام طور پر



صورت نماز کی ادائیگی کا حکم آیا ہے۔ کاش اللہ تعالیٰ تجھے بھی توفیق دے اور تو ہمیشہ کے لیے نماز کا پابند بن جائے۔“

بلڈنگ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے ایک ملراتی نگاہ تیسری منزل کے اس فلیٹ پر ڈالی جہاں صبا رنق تھی۔ صبا! جس پہ پہلی نگاہ ڈالتے ہی خنک اور سکون آمیز چاندنی کا خیال آتا یا پھر پھولوں کی پگھڑیوں پہ دھکتے پتھنم کے قطاروں کا یا پھر وہ باد صبا جو پھولوں، خوش بوؤں کے دھیمے مدھر پیام اپنی سانسون میں سنبھالے پھرتی تھی۔ اس کا نام معلوم ہوا تو میں ہنس دیا تھا۔ صبا جس کے بارے میں رات ہی میں نے اماں سے کہا تھا۔

”اماں! اس بار عید پر آپ یہاں آجائیں، میرے پاس، ہم صبا کے گھر جائیں گے۔“

”کس کے گھر.....؟“ نیلی فون کے تاروں پر اماں کی حیران کن آواز ابھری تھی۔

”وہ اماں صبا کے گھر..... میں نے سوچا ہے آپ کی بات مان ہی لوں اور جب آپ کی بہو آجائے گی تب تو آپ میرے پاس آکر رہیں گی نا۔“ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کی یورش سے اماں کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔

”سچ..... سچ کہہ رہے ہو عابد! تیرا شکر ہے میرے موالا۔“ اپنے جوان اکلوتے بیٹے کے کبھی شادی نہ کرنے کے فیصلے پر روتی، منتیں کرتی مایوس اماں کے لیے یہ بہت خوش کن لمحہ تھا۔ جب بیٹے نے اپنی ضد چھوڑ دی تھی۔ اماں بے چاری کی کوئی شرط نہ تھی وہ تو بار بار کہہ چکی تھیں۔

”تو جہاں کہے گا بیٹا، جس لڑکی کا نام لے گا وہ جو بھی ہوگی میری بہو اور تیری خوشی بن کر تیرا گھر آباد کرے گی۔ مجھے کچھ نہیں سوچنا، کچھ نہیں دیکھنا، بس تو شادی کے لیے راضی ہو جا۔“ مگر ہر بار میرے سختی سے انکار پر وہ مرجھا جاتیں۔

اور وہ صبا! بڑی سی سفید چادر میں صبح کے دھندلے

میں لپٹی اپنے فلیٹ کے دروازے کے پٹ تھاٹے کھڑی تھی۔ اور ادھر سے ”انو“ نکل رہا تھا۔ ساتھ کی بلڈنگ میں رہنے والا شرابی، جواری غنڈہ جس سے پورا علاقہ پریشان اور خائف رہتا تھا جس کے لیے حوالات اور جیل تفریحی مقامات تھے۔ سنا تھا کہ وہ کسی منشیات کے بڑے سمگلر کا ملازم تھا۔ جس کے تعلقات اور اثر و رسوخ کے باعث علاقے کی پولیس انوکھو تحفظ فراہم کرتی تھی۔ وہ جس سے محلے کی کوئی عورت بات کرنا تو درکنار پاس سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ وہی انو منہ اندھیرے صبا کے فلیٹ سے نکل رہا تھا۔ آسمان پر چھائے بادلوں کے باعث معمول سے زیادہ اندھیرا تھا مگر سیڑھیوں پہ چلنے والے کم طاقت کے بلب اور خود صبا کے فلیٹ کی روشنی میں وہ بہ خوبی پہچانا جا رہا تھا۔ مجھے لگا میری ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا ہے، آنکھوں میں مریچوں کی جلن اور چھین تھی۔ میں نے ایک نفرت اور حقارت کی نگاہ صبا کے فلیٹ کے بند دروازے پہ ڈالی اور سوچا۔

’پانچوں انگلیاں برابر ہوں یا نہ ہوں مگر عورتیں سب ایک سی ہوتی ہیں۔ دھوکہ باز، فریبی، معصوم صورتوں کے پیچھے عیاری اور مکاری مجسم ہوتی ہے۔“

اماں کا کئی بار فون آچکا تھا۔ انہوں نے اپنے آنے کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں، ماموں افضل نے کہا تھا وہ اماں کو لاہور اسٹیشن سے ٹرین پر بٹھا دیں گے اور کراچی اسٹیشن سے انہیں میں لے لوں گا۔ سفر بھی طویل تھا اور پھر اماں نے کبھی سفر تنہا کیا ہی نہ تھا۔ میں خود پچھلے ماہ کافی بیمار رہا، پھر اماں کا دائمی جوزوں کا درد اور دمہ کچھ اس طرح حملہ آور ہوا کہ افضل ماموں نے گھبرا کر مجھے گاؤں بلوا بھیجا۔ پندرہ بیس دن اماں کی طبیعت سنبھلنے میں لگ گئے۔ میں نے بہت ضد کی کہ اماں میرے ساتھ کراچی آجائیں مگر اماں بھی میری ہی اماں تھیں۔ بولیں۔ ”ضرور آؤں گی، مگر تب جب تم میری بات مان لو گے۔“

اور میں کراچی لوٹ آیا تھا۔ اب فی الحال تو آفس

دیا۔ اماں کے لیے الگ باورچی خانہ بنایا گیا اور ہم وہاں رہنے لگے۔ ماموں کے تین بچے تھے۔ طارق بھائی سب سے بڑے تھے۔ پھر شارق اور سب سے چھوٹی شرمہ۔ میری سب سے دوستی ہو گئی تھی مگر خاص طور پر شرمہ تو مجھے بہت پیاری لگتی تھی۔ اس کے گول منہ گلابی چہرے پہ کالی سیاہ آنکھیں اور ان پہ گھنی پلکیں ہر ایک کو بے اختیار اسے پیار کرنے پہ مجبور کر دیتیں۔ مجھے وہ دکان پہ بھی سونے جانے والی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ مامی رضیہ کا رویہ بھی ہم سے اچھا تھا۔ وہ اماں کو کافی اہمیت دیتی تھیں، میٹرک میں میرے بہت اچھے نمبر آئے تو ماموں نے اماں کے کہنے پر مجھے لاہور کے ایک بہت اچھے کالج میں داخل کروا دیا۔ اب میں ہوسٹل میں رہتا تھا اور غنتے بعد گاؤں آتا تھا۔ طارق بھائی پہلے ہی لاہور میں تھے۔

وقت گزر رہا تھا یہاں تک کہ طارق بھائی کی تعلیم مکمل ہو گئی اور انہیں ملازمت بھی مل گئی۔ مامی نے ان کی شادی کی تیاری شروع کر دی۔ وہ اپنی خالہ زاد نرہت سے منسوب تھے۔ شادی میں شرکت کے لیے میں بھی گاؤں آ گیا تھا۔ میں ڈاکٹر تو نہ بن سکا کہ میڈیکل کی تعلیم سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی ویسے پڑھائی میں اچھا تھا اور پنجاب یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ شرمہ ان دنوں شاید تھرڈ ایئر میں تھی۔

سب لڑکیاں صحن میں بیٹھی ڈھولک پیٹ پیٹ کر بے حال ہو رہی تھیں آوازیں تقریباً سب کی ہی بھدی اور بے سری تھیں۔ میں طارق بھائی کے دوستوں کے لیے جانے کا کہنے آیا تھا، سامنے برآمدے میں اماں کھڑی مسکرا رہی تھیں میں ان کے قریب آیا تو میری طرف جھک کر دھیرے سے بولیں۔

”عابد! دیکھ تو، شرمہ کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ پرسوں طارق کا ولیمہ ہے، میں آج ہی افضل بھائی سے بات کروں گی مجھے یقین ہے رضیہ بھائی اور وہ انکار نہیں کریں گے اور طارق کے ویسے پر ہم تنہا ہی اور شرمہ کی منگنی کر دیں گے۔ شادی سچے نوکری ملنے کے بعد۔“

سے چھٹی ملنا نامکن ہی تھا۔ ماموں بھی کسی مصروفیت کے باعث نہ آ سکتے تھے چنانچہ اماں کو تنہا سفر کرنا تھا۔ مگر اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک بار آس دلا کر پھر اماں کی امید کیسے توڑ دوں؟ وہ تو پہلے ہی بیماری کے باعث بہت کم زور ہو گئیں ہیں دوبارہ بیمار نہ ہو جائیں۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ مجھے دو غلے پن سے شدید نفرت تھی پھر کیوں میرے ساتھ ایسا ہوتا تھا۔ میرے مالک ایک ہی خواہش تو کی تھی۔ ایسے جیون ساتھی کی جس کے نام کی دل میں پہلی بار گونج سنائی دے، جس کی آنکھوں میں میرے نام پر ستارے دیکھیں، پلکیں جھپکیں اور جس کے چہرے پہ میری نگاہ کی گرمی شفق بن کر اترے مگر اس آرزو کے بدلے میرے دل نے ہر بار ایک نیاز ختم کھایا تھا۔

میں بہت چھوٹا سا تھا۔ شاید پانچ یا چھ برس کا جب ابا کا انتقال ہوا ابا کی لاہور میں چھوٹی سی کپڑے کی دکان تھی۔ ابا کے بعد چچا نے اماں سے دکان کی چابیاں مانگیں تو اماں کہنے لگیں۔

”بھیا چابیاں کسی اتم خرید لو یہ دکان، پیسہ میں عابد کے نام بینک میں جمع کروادوں گی، فی الحال وہ ابھی چھوٹا ہے مگر اس کے ابا کی خواہش تھی کہ یہ اچھے بڑے کالج میں پڑھے، ڈاکٹر بنے۔“

”بھائی! دکان بھائی کے نام ہی رہے گی، بس شوکت ان کا بڑا بیٹا وہاں بیٹھتا رہے گا۔۔۔ ہر ماہ حساب کر کے منافع کی رقم تمہیں دیتا رہے گا۔“

”نہیں بھائی! پھر شوکت کو کیا فائدہ ہوا، اتنی زیادہ تو آمدنی ہوتی نہیں کہ منافع میں سے اسے بھی حصہ دیتے رہیں۔ بہتر یہی ہے کہ مال بیچ دوں اور دکان کرایہ پر اٹھا دوں۔“

اماں بچا کے جال میں نہ آئیں۔ وہ اپنے منصوبے کی ناکامی پر بہت جھنجھلائے، تلملائے، لڑائی جھگڑا بھی کیا مگر ماموں افضل قد کاٹھ اور دولت و مرتے میں بھی ان سے بڑھ کر تھے۔ وہ اماں کو اپنے گھر گاؤں لے آئے اور گھر کا ایک حصہ بالکل ان کے لیے الگ کر

کے ساتھ اماں کھڑی تھیں، میں انہیں سہارا دے کر نیچے لے آیا، کمرہ بند کر کے اماں ہلک کر روتی رہیں اور میں..... میں تو رو بھی نہ سکا تھا۔ بچپن سے دل کے ایوانوں میں تجی تصویر اکھاڑ پھینکنا آسان نہ تھا۔ پھر اماں کہنے لگیں۔

”عابد! افضل بھائی مجھ سے بڑے ہیں مگر ساری عمر انہوں نے میری عزت و احترام میں کمی نہیں آنے دی۔ پھر تمہارے ابا کے بعد جس طرح انہوں نے ہمیں سہارا دیا وہ تو تمہیں معلوم ہی ہے اب میں بھائی کو اپنے سامنے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی اور نہ ہی شمرہ کی مرضی کے خلاف کچھ کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ آپ فی الحال ماموں سے کہہ دیں کہ جب تک شمرہ اور عابد کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی، تب تک ہم کوئی فیصلہ نہیں کریں گے اور بعد میں بھی بچوں کی مرضی سے فیصلہ کریں گے۔“

اس کے بعد جو میں لاہور آیا تو پھر کتنا عرصہ تو چھٹیوں میں بھی گھر واپس نہ گیا۔ ایک بار اماں نے بتایا کہ شمرہ کا رشتہ آیا ہے اگرچہ خاندان برادری سے نہیں ہے مگر لڑکا بہت پڑھا لکھا ہے، خوب صورت بھی ہے اور خاندان بھی اچھا ہے مگر تمہارے ماموں کا خیال ابھی بھی تیری طرف ہے۔ رضیہ بہت پریشان تھی کہ کیا کرے، میں نے اسے چپکے سے کہا۔

”دیکھ بہن! افضل بھائی تو شمرہ کا باپ ہے، بیٹیوں کی مائیں ان کے دل کے بھید جانتی ہیں، بغیر بتائے سمجھ لیتی ہیں، میں شمرہ کی پھوپھی ہوں تو اسی لیے کہتی ہوں زور زبردستی کا فائدہ نہیں۔ اس کی مرضی پوچھو اور میں بھائی افضل سے کہتی ہوں کہ ہاں کر دے۔ وہ بے چاری تو روئے لگیں، مگر میں نے انہیں سمجھا بھجا کر راضی کر لیا۔“

پھر سنا کہ شمرہ کی شادی ہو گئی۔ میں نے بہانہ بنا دیا کہ مجھے چھٹی نہیں ملی۔ میں نے اماں کے اصرار کے باوجود شادی سے انکار کر دیا۔ شمرہ کا انکار، اپنی ہتھک

ٹھیک ہے نا۔“ میں نے سامنے تالیاں بجاتی پہلے جوڑے میں لمبوس گاٹی کا بلی شمرہ کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

”ٹھیک ہے اماں۔“ اماں نے ہنس کر میرا ہاتھ چوم لیا تھا۔ تبھی مامی قریب آتے ہوئے بولیں۔

”کیا بات ہے، بڑے لاڈ بور ہے ہیں ماں، بیٹے میں۔“ اماں مسکراتے ہوئے مامی کو بہ غور دیکھتے ہوئے بولیں۔

”تو کیا عابد صرف میرا لاڈلا ہے؟ سچ تو یہ ہے آپا کہ میں نے کبھی طارق، شارق یا عابد میں فرق نہیں کیا۔“

”ہاں تمہارا عابد بچہ زیادہ حق اس لیے ہے کہ تم اس کی ماں بھی ہو اور باپ بھی۔“

”مامی! طارق بھائی نے چائے منگوائی ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا تھا۔

دوسرے روز جب سارے گھر میں خوب رونق اور ہنگامہ برپا تھا۔ طارق بھائی کی بارات لے جانے کی تیاریاں آخری مراحل میں تھیں میں ماموں افضل کے کہنے پر مامی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں تھیں کسی نے بتایا وہ تھوڑی دیر پہلے چھت پر گئی تھیں۔ میں وہاں گیا تو کوئے والے چھوٹے کمرے میں سے مامی اور شمرہ کی آوازیں آرہی تھیں، مامی کی آواز میں شدید غصہ اور جھجھلاہٹ تھی۔

”شرم کر شمرہ! کیا تیری تعلیم نے تجھے یہی سکھایا ہے، کیوں اپنے باپ کو اس کی بہن کے سامنے شرمندہ کرتی ہے۔“

”اماں! آپ ابا کو سمجھائیں، اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے، میں کوئی بھیڑ بکری تو نہیں۔“

”شمرہ..... شمرہ! تو سمجھتی کیوں نہیں؟ ہم تیری پھوپھی کو انکار نہیں کر سکتے اور پھر عابد میں خرابی کیا ہے؟“

”کوئی خرابی نہیں..... مگر میں بتا رہی ہوں اگر آپ لوگوں نے زبردستی کی تو میں..... میں زہر کھا لوں گی۔“

میں لڑکھڑا کر واپس مڑا تو دیکھا پیچھے فق چہرے

مجھے بھولتی ہی نہ تھی۔ میں لاہور سے کراچی آ گیا دنیا اور اس کی رنگینیاں مجھے متوجہ ہی نہ کرتی تھیں حالانکہ آج کل میں اچھی پوسٹ پڑھتا مگر پھر بھی متوسط درجے کے رہائشی علاقے میں قیام پذیر تھا اور اس کی ایک مہم تیور تھا۔ میرا واحد دوست جو میری تمام تر بے اعتنائیوں کے باوجود ہر موقع پر میرے ساتھ رہتا تھا۔ یہاں تک کہ میں بھی اسے اہمیت دینے لگا تھا اس کا گھر اسی علاقے میں تھا۔

صبا کی کہانی تو اور بھی مختصر تھی۔ شروع ہو رہی تھی کہ ختم ہو گئی اور میں پھر تیار رہ گیا۔ بھی آگئی تھیں۔ ان کے آنے سے مجھے نادر کے نادر کھانوں سے نجات مل گئی تھی مگر اب اماں ہر وقت ایک ہی ذکر کرتیں۔

”بہنا! اب چلو نا اس صبا کے گھر۔ اس کے ماں باپ سے بات کر کے شادی کی تاریخ طے کر لوں، اب کس بات کی دیر ہے؟“ میں بہانے بنا بنا کر تھک گیا تھا کہ اس روز اماں ناراض ہو گئیں۔

”عابد! بات کیا ہے؟ کیا پھر تو نے اپنا ارادہ بدل دیا آخر کب تک ماں کو اذیت دے گا پھر آہستہ سے بولیں۔“

”شرہ کو ہم غلط سمجھے تھے۔ میں نے اسے بہو بنانے کا خواب دیکھا اور یہی خواب تمہاری آنکھوں میں بھی بس گیا۔ آج تک ہم اسے بھول نہ سکے مگر یہ بھول گئے کہ وہ بے جان گڑیا نہیں تھی زندہ انسان تھی۔ وہ پچھلے دنوں مینے آئی تو میرے پاس بیٹھ کر روتی رہی۔ کہنے لگی پھولی اماں کیا آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں؟ لیکن میں کیا کرتی، عابد بھائی اور طارق بھائی میں بھی مجھے کوئی فرق ہی نہیں لگا۔ میرا دل ہی نہ مانتا تھا کہ میں کچھ اور سوچ سکوں۔“

میں چونک اٹھا۔ تو کیا میں شرہ کو غلط سمجھا تھا؟

”اس کا شوہر باہر ذرا تیز مزاج کا لگتا ہے۔ پہلے تو ٹی سال ملک سے باہر رہا مگر اب جب سے پاکستان آیا ہے، تب سے شرہ کو مینے کم ہی لاتا ہے۔“ اماں کہہ رہی تھیں۔

سارا دن شرہ کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومتا رہا معصوم سا گلابی چہرہ، سال بھر پہلے شارق کے بیٹے کے عقیقے کی تقریب میں اسے دیکھا تھا، گزرتے وقت نے اس پر زیادہ اثر نہ ڈالا تھا۔ متناسب جسم، گلابی چہرے پہ البتہ تنجید کی آگئی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور پھر ادھر ادھر مصروف ہو گئی۔

آخری عشرہ شروع ہونے والا تھا۔ اماں کا ارادہ اعتکاف میں بیٹھنے کا تھا مجھے ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ وہ تیاریاں کر رہی تھیں یعنی کچی کھانے بنا کر فریج میں محفوظ کر رہی تھیں۔ ساتھ نادر کو بھی لگا رکھا تھا۔ کہ اس روز تیمور آ گیا ساتھ اس کی بیوی بھی تھی وہ اماں کو افطاری کی دعوت دینے آئے تھے، باتوں باتوں میں اماں اپنے پسندیدہ موضوع پر آ گئیں۔

”اسے بہنا تیمور! تم ہی کچھ سمجھاؤ اپنے دوست کو..... خدا خدا کر کے شادی کی حامی بھری، مجھے یہاں بلایا اور اب.....“

”افو اماں! آپ بھی کمال کرتی ہیں ذرا صبر تو کریں، کہا تو ہے۔“ میں نے جلدی سے اماں کی بات کاٹ کر موضوع بدلنا چاہا۔ میں نہیں چاہتا تھا اماں تیمور اور انبیا بھائی کے سامنے صبا کا نام لیں۔ مگر تیمور ”حامی“ کا لفظ سنتے ہی میری طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا باہر سے کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ہمارے پڑوسی تسلیم رضا کھڑے تھے۔

”ارے بھئی کمال ہے، ہماری بلڈنگ میں فوت گئی ہو گئی ایدھی والوں کی ایسولینس میت لے جانے آ گئی اور ہم لوگوں کو معلوم ہی نہیں..... آخر پڑوس کا معاملہ ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔“

”کون فوت ہو گیا۔“ میں نے پوچھا۔

”ارے میاں! تیسری منزل پر وہ جو لڑکی رتی ہے، گوری سی، کیا نام ہے اس کا وہی جس کے ساتھ اس کی بوڑھی ماں رتی تھی اس کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”صبا کی بات کر رہے ہیں۔“ تیمور نے سوال کیا۔

ہو گیا تھا۔“ مجھے اپنی سمجھ اور لوگوں کی پرکھ پر شرمندگی تھی۔ انو جیسے بدنام غنڈے نے ایک شریف لڑکی کو بے پیمان لیا تھا مگر میں جسے صبا سے محبت کا دعویٰ تھا اسے نہ سمجھ سکا۔

رات کو اماں صبا کی بی باتیں کرتی رہیں۔

”توبہ..... توبہ کیسی دکھی لڑکی ہے بے چاری! بھری دنیا میں تنہا، ایک ماں کا سہارا تھا وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی، بے چاری بچی اکیلی کیسے رہے گی۔ آج تو اس کے سکول کی کچھ استانیاں اس کے پاس رہ گئی ہیں مگر کب تک؟ ویسے وہ سب اس کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں، بہت شریف اور محنتی لڑکی ہے۔“

”ماں کی بہت خدمت کی..... صبح سکول، پھر نیوٹن ماں کا علاج کروایا مگر اللہ کو یہی منظور تھا ویسے بھی کس کے ماں باپ سدا رہتے ہیں، بچی کا گھر بس جائے..... مگر کون لائے رشتہ؟“

”ارے عابد بیٹا..... کیا یہ وہی صبا ہے؟“ اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں، میرا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔ ”اے بیٹے..... تو پھر کیوں اتنی دیر کی؟ ناحق وقت ضائع کیا، اس کی دکھیا ماں بچی کا ہستا گھر ہی دیکھ لیتی۔ میں کل ہی اس کے گھر جاؤں گی، بات کروں گی تیری۔ اگر اس کا کوئی والی وارث ہے تو اس کا پتا لوں گی ورنہ ابھی تیرے نکاح کی تاریخ رکھتی ہوں۔“

اماں کی بے پایاں خوشی دیکھ کر میں بھی مسکرا دیا۔ میری بے کیف زندگی کے افق پر عید کا چاند طلوع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میرا نام شرہ ہے۔ شروع سے ہر کسی کو اپنے لاڈ اٹھاتے دیکھا اکلوتی بہن تھی دو بھائیوں کی اور عابد بھائی! میں تو ان کو بھی ویسا ہی بھائی سمجھتی تھی۔ مگر ذرا ہوش سنبھالا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ میرے ویسے بھائی نہیں ہیں جیسے طارق اور شارق بھائی ہیں۔ لیکن وہ مجھ سے بہت پیار کرتے، بہت زیادہ خیال رکھتے۔ کالج میں جانے تک مجھے اپنی خوبصورتی اور کشش کا احساس

”ہاں ہاں، وہی صبا! کسی سکول میں ملازمت کرتی تھی۔ خدا جانے کون سا سکول ہے جہاں صبح آٹھ بجے۔ پڑھائی شروع ہوتی ہے اور شام کو چھ، سات بجے تک جاری رہتی ہے۔“ تسلیم رضا کے قدرے معنی خیز انداز میں کہنے پر تیور نہ ناگواری سے انہیں دیکھا پھر وہ پیچھے مڑ کر انیلا بھائی اور اماں سے مخاطب ہوا۔

”انیلا! تم خالہ جان کو لے کر صبا کے پاس جاؤ ہم جنازے کے ساتھ جاتے ہیں۔“ میں یونہی خاموش رہا تیور خود ہی کہنے لگا۔

”یار لوگ باتیں بنانے میں تو بہت مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر کسی کی مدد بغیر کسی فائدے کے نہیں کرتے اب اسی صبا کا دیکھ لو۔ شروع میں جب اس بلڈنگ میں آئی تو یہ جان کر کہ بوڑھی بیمار ماں کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں، پھر جوان اور خوبصورت لڑکی ہونے کے ناطے اکثر لوگوں نے اس سے میل جول بڑھانا چاہا۔ مگر وہ محتاط طبیعت کی شریف لڑکی ہے۔ کچھ لوگوں سے وہ خود ہی دور رہی، بعض فیملیز سے آنا جانا رکھا تو وہاں بھی کسی کو اپنے شوہر، بیٹے یا بھائی کے لیے خطرہ نظر آیا اور کسی کو یہ محسوس ہوا کہ تنہا لڑکی ہے۔ وقت بے وقت کسی کام کے لیے مدد طلب نہ کرتی رہے چنانچہ رفتہ رفتہ سب سے اس کا میل جول ختم ہو گیا۔

خود ہمارے اپنے گھر وہ اسی لیے نہیں آتی تھی کہ انیلا کی تیوری چڑھ جاتی تھی حالانکہ چند دن پہلے انو نے مجھے بتایا تھا اس کی امی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اسے انہیں ہسپتال لے کر جانا تھا۔ مگر دیر تک سڑک پر کھڑے رہنے کے باوجود ٹیکسی نہ ملی، بڑی مشکل سے ایک رکشا رکا اور اپنی امی کو ہیڑھیوں سے سہارا دے کر اتار دی تھی کہ وہ وہیں گر گئیں۔ انو وہاں سے گزر رہا تھا اس نے انہیں سنبھالا اور ان کے ساتھ ہسپتال گیا پھر واپس گھر چھوڑ کر گیا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں تو بدنام آدمی ہوں، میرا اس شریف لڑکی کے گھر جانا ٹھیک نہیں مگر آپ محلے کے خاندانی لوگ اس لڑکی کا خیال رکھا کریں۔ میں نے انیلا سے کہا تھا مگر اس کا موہ خراب

تمہیں ان کی دلہن بنانے کے منصوبے بنارس ہیں، میں نے خود سنا تھا ماں بیٹے کو باتیں کرتے۔ عابد بھائی بھی بہت خوش تھے۔“

”نہیں..... نہیں! یہ نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں منع کر دوں گی، میں تو..... مجھے تو“ کہتے کہتے میں نے جلدی سے اپنی زبان دانتوں تلے دبالی۔ میں یہ کیا کہنے لگی تھی کہ مجھے تو سوائے ہاشم کے اور کسی کا ساتھ منظور نہیں۔“

”کیا تم؟ کیا تم کسی اور سے.....“ شازیہ نے مجھے کریدنا چاہا۔ بے شک وہ میری سہیلی تھی مگر میں یہ راز فی الحال اسے نہیں بتا سکتی تھی، سب سے پہلے تو یہ راز اصل حق دار کو ہی سننا چاہیے تھا اور اس سے کہنے کی فی الحال ہمت نہ تھی۔

پھر اماں نے مجھے کہا۔

”تمہاری پھوپھی اماں اشاروں اشاروں میں کئی بار تمہیں یہو بنانے کا ارادہ کر چکی ہیں اور تمہارے ابا کہہ رہے تھے کہ جب بھی آپا نے بات کی وہ فوراً ہاں کر دیں گے۔ دیکھا بھالا لڑکا ہے۔“ یہ سن کر میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی میں نے فوراً صاف انکار کر دیا مگر اماں ہنس دیں تھیں گویا میں بچی تھی جو سوچے سمجھے بغیر کسی کام سے منع کر رہی تھی اور جس کے اقرار انکار کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ اور پھر وہاں سے اٹھ کر چل دیں میں ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ میں نے ایک بار پھر اماں کو قائل کرنا چاہا۔

وہ بستروں والے بڑے کس میں سے کوئی چیز نکال رہی تھیں میں وہیں پہنچ گئی۔ یہ اچھا موقع تھا ورنہ تو پورے گھر میں مہمان بھرے تھے اور بات کرنے کے لیے کوئی موقع ہی نہ ملتا تھا۔ میں اماں کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔

”اماں! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں، میں کسی کی بے عزتی نہیں کر رہی، پھوپھی اماں سے مجھے بہت پیار ہے، میں ان کی عزت کرتی ہوں ان کا ہر حکم مان سکتی ہوں، مگر جو کچھ آپ لوگ چاہتے ہیں، یہ ممکن

ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ عابد بھائی کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر چمک بڑھ جاتی ہے، لیکن میرے دل میں انہیں دیکھ کر کوئی غیر معمولی احساس بے دار نہیں ہوتا تھا۔ میرے دل نے تو اس روز ایک غیر معمولی لے پھڑکنا شروع کیا جب میں نے ہاشم کو دیکھا۔ حالانکہ ہاشم غیر نہ تھے، میرے ماموں زاد تھے غیر معمولی مردانہ وجاہت اور وقار کے پیکر۔ زراعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آج کل اپنی آبائی زمینیں سنبھال رہے تھے۔ وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے ہر سمت ان کی تعریفیں ہی سنی تھیں۔ ایک عید پر ہم زہت بھائی کی عیدی لے کر گئے تھے۔ تب وہاں ہاشم بھی آئے ہوئے تھے اگرچہ میں ان سے پہلے بھی کئی ایک بار مل چکی تھی مگر اس روز جانے کیا ہوا۔ میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ سامنے ہی بیٹھے تھے۔ سفید لٹھے کے کلف لگے شلوار کرتے اور کالی واسٹک میں ملبوس۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ کالی سیاہ آنکھیں اور گھنی خم دار پلکیں! مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں گھنے بادلوں میں اڑ رہی ہوں، باقی دنیا سے مجھے کچھ مطلب نہ رہا۔ مجھے خود پہ اختیار نہ رہا میرا جی چاہ رہا تھا میں ان کے قریب جا کر اپنا سر جھکا دوں اور کہوں.....

”بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیے سوائے آپ کے ساتھ کے.....“ نہ جانے کیسے میں ضبط کیے خاموش بیٹھی رہی میں نے محسوس کیا تھا کہ ان کی نگاہیں بھی بار بار میری جانب اٹھی تھیں۔ مجھے آج اپنی صورت پہ فخر محسوس ہوا تھا۔

طارق بھائی کی شادی تھی گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا ہاشم اور ان کے گھر والے ہماری طرف سے شرکت کر رہے تھے۔ جب بارات والے روز میری سہیلی شازیہ نے چپکے سے سرگوشی کی۔

”شرہ! تجھے عابد بھائی کیسے لگتے ہیں؟“

”کیا مطلب! کیسے لگتے ہیں؟ بجھی جیسے ہیں

ویسے ہی لگتے ہیں۔“

”اول..... ہوں..... سمجھا کرو نا۔ تمہاری پھوپھی

نہیں۔“

”کیوں، کیوں ممکن نہیں۔ آخر کیا کمی ہے عابد میں؟“

”بات کمی یا خرابی کی نہیں..... بات سوچ کی ہے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”یہ باتیں بچوں کے سوچنے کی ہوتی بھی نہیں، یہ بزرگوں کا کام ہے کہ ان کی بہتری کے لیے مناسب فیصلے کریں۔“

”اماں! خدا کے لیے یہ حق اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے عورت کو دیا ہے کہ وہ اپنی شادی کے معاملے میں اپنی پسند، ناپسند ظاہر کر سکتی ہے، یہ کوئی گناہ یا عیب کی بات نہیں۔ آپ اللہ کے واسطے یہ ضد نہ کریں۔“

”میں ضد کر رہی ہوں اور تم تو بڑی فرماں برداری کا مظاہرہ کر رہی ہو۔“

”میں یقیناً فرماں بردار ہوں مگر اپنی زندگی کے ایسے فیصلے نہیں مان سکتی جن کی وجہ سے ساری زندگی پچھتا نا پڑے۔“

”شرم کر شرہ..... کیا تعلیم نے تجھے یہی سکھا یا ہے کیوں اپنے باپ کو اس کی بہن کے سامنے شرمندہ کرتی ہے۔“

”اماں! آپ ابابو سمجھائیں، اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے؟ میں کوئی بھیڑ بکری تو نہیں.....“

”شرہ۔ شرہ! تو سمجھتی کیوں نہیں، ہم تیری پھوپھی کو انکار نہیں کر سکتے اور پھر عابد میں کیا خرابی ہے؟“

”کوئی خرابی نہیں..... مگر میں بتا رہی ہوں، اگر آپ لوگوں نے زبردستی کی تو میں..... میں زہر کھالوں گی۔“ اماں کے ہاتھ میں پکڑا بیٹی پکڑا نیچے گر گیا اور وہ رونے لگیں۔

”شرہ..... تو ایسی باتیں کرے گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اور تیرا باپ اور بھائی جو تجھے اعلیٰ تعلیم دلا رہے ہیں، تیری ہر فرمائش پوری کرتے ہیں تو نے ان کی محبت اور مان کا یہ صلہ دیا؟“

”اماں..... اماں! خدا کے لیے میرا یقین کریں،

میں کوئی غلط کام نہیں کر رہی، میں نے آج تک عابد بھائی طارق اور طارق بھائی میں کبھی فرق نہیں سمجھا۔ میں کچھ اور سمجھنا بھی نہیں چاہتی..... بس آپ کی منت کرتی ہوں کہ آپ یہ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“

اماں زار و قطار رو رہی تھیں۔ پھر شاید یہ خیال آنے پر کہ مہمانوں سے بھرا گھر ہے کسی نے دیکھ کر رونے کا سبب پوچھا تو کیا عذر پیش کریں گی آنسو پونچھ لیے، مگر پھر سارا دن انہوں نے مجھ سے بات نہیں کی۔

اس روز ماموں کمال ہمارے گھر آئے۔ اماں اور خالہ دو بہنیں تھیں مگر بھائی اکلوتے تھے۔ چنانچہ دونوں ہی بہنیں اپنے بھائی سے بہت محبت کرتیں اور خود ماموں بھی دونوں بہنوں کا بہت خیال کرتے تھے مگر ہماری مامی سعیدہ کو بہن بھائی کا لاڈ کچھ زیادہ پسند نہ آتا تھا۔ مذاق مذاق میں کئی دفعہ کبھی بچی تھیں کہ میرے میاں اور ننندیں ابھی تک بچپن کے چو نچلے کرتے رہتے ہیں حالانکہ اب بوڑھے ہو گئے، بچے جوان ہو گئے، مگر نہ جی! آپا رضیہ یا صفیہ کو پچھنک آتی تو ان کے بھائی کو فکر لگ جاتی کہ میری بہنیں بیمار ہیں۔ ادھر بھائی کے سر میں درد ہوا تو بہنیں مزاج پرسی کے لیے بھائی کے گھر آ پچھنیں۔

”تو اس میں کیا برائی ہے سعیدہ..... یہ تو اچھی بات ہے ناکہ ہم بہن بھائیوں میں ایسی محبت ہے۔“ ماموں کمال کے کہنے پر وہ برا سامنہ بنا لیتیں۔

”ہاں خیر..... برائی تو کچھ نہیں! بس آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ بیوی کو ڈاکٹر کی طرف لے جانا ہے اس لیے کہ آپ تو صفیہ آپا کے گھر پہنچ چکے ہوتے ہیں کیوں کہ ان کے نوکر نے آپ کو یہ خبر دے دی تھی کہ ان کی بہنیں کچھ سست لگ رہی ہے۔“ مامی کی اس بات پر ماموں کچھ شرمندہ سے ہو جاتے، کیوں کہ واقعی ایک آدھ بار اس طرح کے واقعات ہو چکے تھے اگرچہ مامی کو بھی خاندان خواستہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا مگر پھر بھی انہیں ایک موقع تو مل ہی گیا تھا۔ ایسے میں اگر اماں ہوتیں تو وہ تو ہنس کر خاموش ہو جاتیں لیکن اگر اس طرح کی بات

صفیہ خالہ کے سامنے کہی جاتی تو وہ تپ جاتیں اور جواب ضرور دیتیں جس سے مامی کا موڈ اگلے کئی روز تک ہم سے خراب رہتا۔

بہر حال میں بات کر رہی تھی، اس روز کی جب ماموں کمال آئے۔ وہ اکثر آتے رہتے تھے مگر اس روز بہت دنوں کے بعد آئے ان کے ساتھ ہاشم بھی تھے۔ وہ چلائی گرمیوں کی شام تھی ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اور شادو نے مل کر کچے تھکن میں چھڑکاؤ کیا تھا۔ برآمدے کے سامنے سرخ اینٹوں سے ایک کھلا سا چبوترہ بھی بنا ہوا تھا مجھے اور طارق بھائی کو پھول پودوں کا بہت شوق تھا اس لیے ہمارا تھکن اور چبوترہ پھل دار اور پھول دار پودوں سے ہمیشہ سرسبز رہتا تھا۔ اب بھی چبوترے کے اطراف بنی کیاریوں اور گملوں میں اگے موتیا، گلاب، چنبیلی اور دوسرے پودوں نے اس جھلنے دن کی شام کی پیش کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ شادو چار پائیاں اور کرسیاں چبوترے پر رکھ رہی تھی میں نے اسے پیڈسٹل فین باہر نکالنے کو کہا اور خود نہانے چلی گئی، غسل کے بعد عصر کی نماز پڑھی، بال ابھی گیلے تھے میرے بال تھے بھی بہت گھنے اور لمبے اس لیے جلدی سوکتے نہ تھے۔ اس گرمی میں ویسے ہی ہلکے گیلے بال اچھے لگ رہے تھے۔ انیس یونہی دو تین بل دے کر چھوڑ دیا۔ میری سہیلیاں میری تعریفیں کرتی رہتی تھیں انہیں میرے بال بھی بہت پسند تھے۔ گھنے، لمبے اور سیاہ بال جو شمع کے بقول ”ایسا مضبوط جال ہیں کہ ایک بار ان کی گرفت میں آنے والا پھر کبھی رہا نہ ہو سکے گا۔“ اور رومی تو اکثر کہتی۔

”شرہ! تم اس قدر خوب صورت ہو، اگر ڈرائے کی طریف آ جاؤ تو یہ جتنی بیرونز خود کو خوب صورت کہتے نہیں تھیں انہیں معلوم ہو گا کہ اصل خوب صورتی کیا ہوتی ہے۔“ اور رومی کی اس بات پر ہم سب اسے خوب جھجھکتے۔

”تمہاری تو مت ماری گئی سے رومی..... اسی لیے کہتے ہیں کہ یہی وہی فلمیں کم دیکھا کرو۔“ شمع کہتی۔

”ہاں! اگر میرے ابا یا بھائیوں کو بھٹک بھی پڑ گئی کہ میری سہیلیاں مجھے کیسے کیسے سنہرے مشورے دیتی ہیں تو میرے پڑھنے پر فوراً پابندی لگ جائے گی..... اور تم لوگوں سے تو بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہو گی۔“ میں بھی انہیں ڈراوا دیتی۔ اس وقت آئینے کے سامنے کھڑے یہی سب سوچتے ہوئے یونہی غیر ارادی طور پر میرے ذہن میں ہاشم آ گیا۔

”بارہا ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا..... میرا حسن جس کی ایک دنیا تعریف کرتی ہے کیا ہاشم کو میں کبھی نظر نہ آئی؟“ میں نے خود پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ سفید شلوار دوپٹے اور سبز، گلابی، نیلے اور سفید کھلتے رنگوں والی ان کی قمیص میں، میں بھی یقیناً ایک کھلا ہوا تروتازہ پھول لگ رہی تھی۔ میں نے کانوں میں پہنے گولڈ کے ننھے سے ٹاپس اتار کر چاندی کی بالیاں پہن لیں اور اپنے لیے چائے بنانے باورچی خانے میں آ گئی۔ ابا، اماں اور پھوپھی اماں میں سے کوئی بھی گرمیوں میں شام کو چائے نہیں پیتا تھا۔ طارق اور شارق بھائی موجود ہوتے تو کبھی کبھار میرے ساتھ مل کر چائے پی لیتے تھے ورنہ بقول اماں ”اس گرمی میں یہ اہلتا گرم پانی صرف خرما ہی پی سکتی ہے۔“

ابھی میں باورچی خانے میں آ کر اپنے لیے چائے بنانے لگی تھی کہ شادو آ کر کھنکھائی۔

”آپ کی اماں کہہ رہی ہیں، ایک پیالی چائے زیادہ بنالیں۔“

”کس کے لیے، کون پیے گا؟“ میں نے پوچھا مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ تو باورچی خانے کے باہر سے پیغام دے کر چلی گئی میں نے تھکن میں کھٹنے والی کھڑکی سے دیکھا، چبوترے پر پچھی چار پائیاں پر ابا، اماں، پھوپھی اماں اور کمال ماموں بیٹھے تھے۔ اور کوئی اور بھی تھا اگرچہ میری جانب اس کی پشت تھی مگر میرا دل زور سے دھڑکا۔

”ہاشم!“ میں کمرے سے نکل کر کچن میں آتے اپنے خیالوں میں اتنی مگن تھی کہ میں نے تھکن کی جانب

نمکین غزل

دو اشک ان کے در پر آیا تھا میں گرا کر
نکلے ہیں آج گھر سے وہ پانیچھ اٹھا کر
سترہ سنائیں اس نے، ہر بار یہ جتا کر
چاہوں گا میں اجازت بس یہ غزل سنا کر
بوتیں کہ لیٹ جانا چادر کہیں بچھا کر
پہلے مگر سلا دو بچوں کو تھپ تھپا کر
کتنبوں کو عقد اول ہوتا نہیں میسر
اور شیخ جی نے رکھی ہیں گھر میں تہ لگا کر
رستہ جو پوچھ بیٹھا میں سنتری سے اک دن
پھر جان میری چھوٹی کچھ اس کو دے دلا کر
کھانا پکانا بیگم مجھ کو سکھا رہی ہیں
کہتی ہیں، میں کھاؤں کیا عبر بھر پکا کر؟
کس سے یہ دل لگاؤں، استاد نے کہا تھا
تم کام جو بھی کرنا، کرنا وہ دل لگا کر
(انجم قاضی، لاہور)

میری طرف دیکھ رہے تھے اور نہ جانے کیوں مجھے محسوس
ہوا کہ آج ہاشم کی آنکھوں میں میرا عکس لرز رہا ہے۔

مغرب کی اذان ہوئی تو ماموں جانے کے لیے اٹھ
کھڑے ہوئے حالانکہ اماں اور ابا نے انہیں روکا کہ
کھانا کھا کر جائیں، آج اماں نے کریلے گوشت پکایا تھا
جو ماموں کا پسندیدہ کھانا تھا۔

”نہیں آ پا..... تمہاری بھرائی نے آج کڑھی پکائی
ہوئی ہے اگر میں ادھر کھانا کھا کر چلا گیا نا، تو خیر
نہیں.....“ وہ ہنسنے لگے جب کہ ہاشم کہنے لگے۔

”چھو پو! ابھی تو بھوک نہیں ہے اور ویسے بھی میں
نے تو اپنی پسند کی چائے پی لی ہے۔“ اس شب میں نے
تاروں بھرے آسمان کو تکتے خود کو نجی ان بی تاروں کے
ہم رکاب پایا تھا۔

دیکھا ہی نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو میں نے ہاشم
کے بارے میں سوچا تھا۔ دعا کی تھی کہ میں اسے نظر
آ جاؤں اس نظر سے جو میں جانتی تھی۔ میں نے بہت
احتیاط سے چائے بنائی اور سلیقے سے ایک ٹرے میں دو
پالیاں رکھیں۔ ایک پلیٹ میں اماں کے ہاتھ کی بنائی
سوچی کی مٹھائی رکھی اور باہر آ گئی۔ چار پانیوں کے بیچ
میں رکھی میز پر جگ اور گاس رکھے تھے گویا سب نے
تجربہ کیا ہی تھی۔ میرے سلام کے جواب میں ماموں
کمال میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر بولے۔
”ولیکم السلام، دھپے تو بھی ہاشم کی طرح اس گرمی
میں چائے ہی پیتی ہے۔“

”ہاشم کی طرح.....“ اس کے ساتھ معمولی سی
مماثلت نجی دل کو بھاری تھی۔

”صبح سویرے تو ہم سب بھی چائے پیتے ہیں اور
سردیوں میں شام کو بھی پی لیتے ہیں مگر گرمیوں میں تو
بالکل جی نہیں چاہتا۔“ چھوٹی اماں بولیں۔

”یہ آج کل کے سب بچے ایسے ہی ہیں۔ میرا
عابد بھی چائے کے بغیر نہیں رہتا۔“ مگر میں نے سنی ان
سنی کردی میں نے ہاشم کو چائے کی پیالی تھمائی تو وہ مجھے
دیکھتے ہوئے مسکرائے اور پوچھنے لگے۔

”مگر بچہ نشین کے بعد کیا ارادے ہیں؟“

”ماسر زکرنے کا ارادہ ہے۔“

”بہت اچھی بات ہے، لڑکیوں کو پڑھنا چاہیے۔“
”نہیں، نہیں..... بس بہت پڑھ لیا، میں تو اب
اسے اس کے گھر بھیجنا چاہتی ہوں۔“ اماں فوراً بول
اٹھیں۔

”چھو پھو! کیا یہ گھر شمرہ کا نہیں؟“ ہاشم ہنس
کر بولے۔

”نہ پتر..... یہ تو اس کا میکہ ہے۔ یہ طارق اور
شارق کی دہنوں کا گھر ہے، اس کا اپنا گھر تو اس کے سر
کے سانئیں کا ہوگا۔“ اماں نے یہ بات کہتے ہوئے جس
طرح مسکرا کر چھوٹی اماں کو دیکھا میرا دل بے چین ہو
گیا۔ میں نے بے اختیار ہاشم کی جانب دیکھا وہ بھی

کہ اگر ایسی بات ہوتی تو تم سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟“

اس روز جب مجھے اپنے وزٹرز کے آنے کی اطلاع ملی تو میں اس خیال میں آئی تھی کہ بھائیوں میں سے کوئی ہوگا یا پھر ابا جی ہوں گے۔ مگر ابا جی کے ساتھ ہاشم کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی اور خوش تو خیر تھی ہی۔ ابا جی بتا رہے تھے کہ آج ہاشم نے شہر آنا تھا اس نے مجھے کہا کہ چاچا آپ نے بھی شمرہ سے ملنے چلنا ہو تو چلیں۔ میں نے کہا اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

ابا جی خود گاڑی ڈرائیو نہیں کرتے تھے۔ طارق یا شارق بھائی کے ساتھ ہی آتے جاتے تھے۔ پھر ابا جی، اماں اور پھوپھی اماں کی بھیجی سو غائیں دینے لگے۔ ہاشم نے ایک پیکٹ میری طرف بڑھایا۔

”پھوپھو کہتی ہیں تمہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے یہ کچھ کتابیں ہیں جو تمہارے لے لایا ہوں۔“ پہلی بار ہاشم میرے ہاسل آئے تھے اور نہ صرف آئے تھے بلکہ میرے لیے تحفہ بھی لائے تھے۔ بے شک زبان سے ہم دونوں نے کچھ نہیں کہا تھا مگر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ لی تھی۔ ہاشم کی دی ہوئی کتابیں دیکھتے ہوئے میں ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ پروین شاکر کی ”خوشبو“ میں سے ایک پرچہ نکل کر میری گود میں آگرا۔

”شمرہ! اگرچہ یہ بات ابا جی اور پھوپھو ہی کو کرنی چاہیے اور وہی کریں گے بھی۔ لیکن تم ایک پڑھی لکھی، باشعور لڑکی ہو، میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر ہم دونوں مل کر زندگی کا سفر طے کریں تو تمہیں کیسا لگے گا؟ یاد رکھنا اپنی رائے کا اظہار کھل کر کرنا۔ تمہارا ہر فیصلہ مجھے قبول ہوگا اور تم ہمیشہ میرے لیے محترم رہو گی۔“

مجھے یوں لگا ”خوشبو“ نے واقعی مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ ہو میری دعائیں بہت جلد قبول ہو گئیں۔ میں بہت خوش تھی ان ہی دنوں طارق بھائی کی

ہاشم بہت کم گو تھے مگر آج انہوں نے مجھ سے چند باتیں کی تھیں۔ میں نے ان کی نظریں بار بار خود پر اٹھتی ہوں کی تھیں اور ماموں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ آج تو ہاشم اپنی پھوپھو سے ملنے آیا ہے۔ عام طور پر وہ اپنے بی ہاموں میں اتنے مصروف رہتے تھے، اپنے آپ میں مگن رہنے والے بہت کم ہی کہیں آتے جاتے تھے اس لیے آج میں بے حد خوش فہم ہو رہی تھی، لیکن میری خوشی تو جیسے اڑتے بادلوں کی طرح تھی جنہیں میرے پیاسے آنگن کو چھو کر کسی اور کی چھت پر برسنا تھا۔

گھر میں طارق بھائی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے اور پھر پھوپھی اماں کی خواہش، اماں اور ابا کی آرزو اور میری تمنا! سب ہی تشنہ رہ گئیں۔

”حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول کہ میں نے اپنے ارادوں کے نوٹنے سے اپنے خدا کو پہچانا۔“ مجھے اب سمجھ میں آیا۔ طارق بھائی کی شادی کے ہنگاموں کے دوران یوں ہی غیر ارادی طور پر میں نے عابد بھائی اور پھوپھی اماں کی باتیں سن لیں، انہیں میرے انکار کا پتا چل گیا تھا اور پھوپھی اماں مجھ سے زبردستی کی حامی نہ تھیں مجھے پھوپھی اماں یہ بہت پیارا آیا۔ واقعی انہیں مجھ سے دلی محبت تھی مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہاشم اور میری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی مگر..... خیر یہ تو بعد کا قصہ ہے فی الحال تو ذکر کر رہی تھی چھٹیوں کا۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں بہت خوش اور بے فکر سی ہاسل آ گئی۔ روجی اور جمع دونوں ہی اس بات پر متفق تھیں کہ ان چھٹیوں میں، میں اور بھی زیادہ تروتازہ اور خوبصورت ہو کر آئی ہوں۔

”ارے اس گرمی میں تو انسان ویسے ہی بے حال ہو رہا ہوتا ہے اور چہرے کی رونق ماند پڑ جاتی ہے یہ تم کون سے صحت افزا مقام پر گئی تھیں جو یوں کھلی کھلی لگ رہی ہو؟“ وہ دونوں ہنس ہنس کر کہتیں اور میں جواب میں ان سے بھی زیادہ زور سے ہنس دیتی۔

”کہیں تمہاری منگنی وغیرہ تو نہیں ہو گئی یا پھر.....“ روجی کے خدشے پر میں نے اسے یہ کہہ کر چپ کر دیا

موجود تھیں۔ نہ جانے کیوں میں باوجود کوشش اور خواہش کے ان سے ویسی بے تکلفی اور دوستی نہ کر سکی جیسی اس رشتے میں ہونی چاہیے تھی۔ شادی کے بعد وہ مجھ سے کبھی کبھی سی رہنے لگی تھیں، میں نے بتیلیں میں پانی ڈال کر چولے پر رکھا اور رے میں پیالیاں اور پٹیلیں سجائے لگی۔ کل ہی اماں نے لوکی کا حلوہ بنایا تھا جب وہ پلیٹ میں نکالا تو نزہت بھائی جو خاموشی سے کھڑی مجھے دیکھ رہی تھیں پوچھنے لگیں۔

”کس کی خاطر مدارت ہو رہی ہے؟“

”آپ کو نہیں معلوم؟ خالہ اور ماموں آئے ہوئے ہیں۔ اماں نے چائے بنانے کو کہا تھا۔“

”ہاشم بھی آیا ہے؟“ ان کے عجیب سے انداز پر میں نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔

”جی..... وہ بھی آئے ہیں۔“

”یہ تم دونوں کا چکر کب سے چل رہا ہے؟“ ان کے طنزیہ انداز سے بولنے پر میں ششدر رہ گئی۔

”کون سا چکر، کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ تبھی طارق بھائی مجھے بلانے آگئے میں حیران، پریشان سی ٹرے اٹھا کر ان کے ساتھ چل دی۔

”اصل میں ہاشم کو جانا تھا تو میں نے کہا اپنی پسندیدہ چائے تو پیتے جاؤ۔“

طارق بھائی کی بات پر پیالیوں میں چائے نکالتے ہوئے میں نے نظر اٹھا کر ہاشم کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کافی کمزور محسوس ہوئے، چہرے کی رنگت بھی پھیکا تھی۔ میں بے چین ہو گئی مگر انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔

”منہ میٹھا کر لیں۔ ویسے اکلوتا ہمارا بھائی ہے اور اکلوتا بھتیجا۔ انشاء اللہ بہت خوشیاں منائیں گے اور رجب کے منگھائیاں کھائیں گے بھی اور کھلائیں گے بھی۔ اللہ خیریت سے وہ دن تو لائے۔ اماں حلوے کی ڈش مامی اور خالہ کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔“

”پر بھائی یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ ہاشم کے سسرال بات چکی کرنے کب جانا ہے؟“ اماں کی بات

مادی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ میں نے بہت شوق اور دلولے سے تیاری کی تھی۔ بڑے بھائی کی شادی کی خوشی ہی کم نہ تھی کہ ہاشم نے بھی ”خوشبو“ کی زبانی پیغام بھیج دیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ان ہی دنوں میں ہاشم سے کہہ دوں گی کہ ماموں اور اماں جو فیصلہ کریں گے وہ مجھے قبول ہو گا۔ اس سے زیادہ صاف لفاظ میں اقرار کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ مگر نہ جانے کیوں ہاشم مجھے کہیں بھی اکیلے میں مل ہی نہ سکے اور میں ”خوشبو“ کو اپنے دل میں سیٹھے واپس آ گئی۔ اگرچہ ہارات والے روز پھر ولیمہ کے دن میں نے ہاشم کو دیکھا تھا۔ مگر وہ طارق بھائی کے ساتھ ساتھ ہی ہوتے تھے۔ پھر میں واپس ہاسل آ گئی، میں ہاشم تک اپنے دل کی پکار پہنچانے کے لیے بے قرار تھی مگر موقع اور ذریعہ ہی نہ مل رہا تھا۔ پھر امتحانات کی مصروفیت میں کچھ ہوش نہ رہا جب امتحان سے فارغ ہو کر گھر آئی تو وہاں میرے ہوش اڑا دینے کے لیے ایک خبر موجود تھی۔ طارق بھائی کے کسی دوست ”بابر“ کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ اس کے گھر والوں نے اور شاید خود اس نے بھی طارق بھائی کی شادی پر مجھے دیکھا تھا اور رشتہ بھیج دیا تھا۔ اماں اور ابا کا خیال انہی بھی عابد بھائی کے لیے ہی تھا اور اماں مجھ سے بات بھی کرنا چاہتی تھیں مگر میں نے سنا کہ پھوپھی اماں نے انہیں کہا تھا کہ وہ عابد کا خیال چھوڑ کر میری مرضی معلوم کریں اور ہاں کر دیں اور میری مرضی؟ میں اماں سے کیا کہتی؟ ہاشم نہ جانے کہاں غائب تھے۔

اس روز ماموں، خالہ، ابا، اماں، پھوپھی اماں سب ہی ہمارے گھر میں جمع تھے۔ اماں، ابا نے ہی بلایا تھا تا کہ بابر کے رشتے پر غور کر سکیں۔ ماموں اور مامی کے ساتھ ہاشم کو آتا دیکھ کر مجھے آس پیدا ہوئی کہ اب میری دلی آرزو پوری ہو جائے گی۔ اس روز موسم بہت اچھا تھا۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بل بارش برسنے والی ہے۔ اماں کے کہنے پر میں چائے بنانے باورچی خانے میں آئی تو وہاں بھائی نزہت بھی

پر جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی میں نے بے اختیار ہاشم کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں دکھ اور کرب کے سائے بہت واضح تھے۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا مگر اگلے ہی پل اس نے نظریں جھکا لیں۔ نزہت بھابی کی آواز گونجی۔

”مامی جی! آپ نے ہاشم بھائی سے پوچھ لیا ہے کیا یہ اس رشتے پر راضی ہیں؟“

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں! صبیحہ! ہاشم کے بہت پرانے اور گہرے دوست کی بہن ہے اس کا باپ فوج میں کرنل تھا۔ خاندانی زمینیں، جائیداد بھی بہت ہے اور اس کا بھائی اور ہاشم کا دوست ڈاکٹر ہے۔“ مامی تفصیل بتا رہی تھیں۔ خالہ تو بہت چپ چپ تھیں ماموں بھی قدرے خاموش تھے مگر نزہت بھابی کا رویہ اور لہجہ عجیب سا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا ہوا ہے ابھی بھی وہ پوچھ رہی تھیں۔

”صبیحہ کے خاندان کے بارے میں تو تفصیل سے بتا رہی ہیں۔ مگر صبیحہ کے بارے نہیں بتایا کہ وہ کیسی ہے؟ صرف ہاشم بھائی کی ہی پسند ہے یا آپ اور ماموں کبھی بھی پسند ہے؟“ ان کی باتوں پر طارق بھائی نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔

”آپا! صبیحہ کی تو شاید طبیعت ٹھیک نہیں، بالکل چپ بیٹھی ہیں۔ پر نزہت کو سب کچھ جانے کا بہت شوق ہے۔“

دھبے میرا ہاشم اپنے ماں باپ کے کہنے سے باہر نہیں گیا ہے صبیحہ عزت دار، جانے پہچانے خاندان کی پرہیزگار لکھی بنی ہے۔ ہم نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا اور ہاشم سے پوچھا تو اس نے سب کچھ ہماری مرضی پر چھوڑ دیا۔ مامی نے کہا۔

نزہت بھابی مامی کے تکیے لہجے پر تپ گئیں، خالہ کے چہرے پر بھی غصہ صاف نظر آ رہا تھا جو شاید ہاشم نے بھی بھانپ لیا تھا۔ وہ جلدی سے کہنے لگے۔

”اماں ٹھیک ہی تو پوچھ رہی ہیں بھابی! ان کا حق ہے یہ سب جاننے کا، میں بتاتا ہوں ڈاکٹر عرفان اور

میں سکول کے دوست ہیں۔ ہوٹل میں روم میٹ بھی رہے ایف ایس سی کے بعد عرفان میڈیکل لائن میں چلا گیا اور میں ایگریکلچر کی طرف آ گیا۔ مگر ہماری دوستی اسی طرح باقی رہی۔ ایک دوسرے کے گھر میں بھی آنا جانا تھا مگر میں نے آج تک صبیحہ کو نہیں دیکھا کیوں کہ وہ پردہ کرتی ہے۔“

پھر وہ لوگ چلے گئے اور میں جیسے بگولوں کی زد میں آ گئی۔ ہاشم کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

”یہ کیا ہوا تھا؟ کیا مجھے عابد بھائی کا دل توڑنے کی سزا ملی؟ ہاشم یوں اچانک کیوں یکسر تبدیل ہو گئے؟ کیا صبیحہ کی دولت یا پھر حسن نے ان کے راستے تبدیل کر دئے تھے؟ مگر کچھ دنوں بعد مجھے ہاشم کا ایک خط ملا اور مجھے اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔ چنانچہ باہر کے ساتھ شادی تھا تو ابا، اماں اور طارق بھائی کا فیصلہ مگر مجھے بھی اس سے انکار نہ تھا۔“

☆☆☆

میں ہاشم ہوں۔ مجھے ہمیشہ سے فطرت کے مظاہر اور مناظر سے بہت اگاؤ رہا ہے۔ سبزیوں، پھلوں اور پھولوں پتوں اور گندم، چاول کی فصلوں کی دیکھ بھال کرتے مجھے پتا بھی نہ چلا کہ نہ جانے کب شمرہ کے لیے جذبہ محبت کی پٹری میرے دل میں لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے کوئٹہ اور کلیان پھوٹ آئیں۔ ان کی خوش بو میرا تو خیال تھا صرف مجھ تک محدود ہے مگر اس دھیمی سی خوشبو نے کچھ لوگوں خاص طور پر نزہت بھابی تک میری اور شمرہ کی حکایت دل پہنچا دی۔ اور ایک بات جس کا اندازہ مجھے صبیحہ سے شادی کے بعد ہوا وہ یہ کہ جس طرح ایک باقاعدہ کوالیفائیڈ زرعی ماہر ایک عام غیر تعلیم یافتہ کسان کی نسبت فصلوں کی کاشت دیکھ بھال کے زیادہ بہتر طریقے جانتا ہے اور اگر عام کسان زرعی ماہر کے مشوروں پر عمل کرے تو زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے اسی طرح ایک عام مسلمان جو صرف پیدائشی مسلمان ہے اور اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کی روح سے واقف نہیں، اگر قرآن و سنت کا باقاعدہ مطالعہ کرے،

اپنی ذہنی الجھنوں کو غلام اور اس کا لرز کے سامنے رکھے تو یقیناً اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزار سکتا ہے اور دنیا میں پرسکون زندگی اس کا نصیب بنتی ہے اور آخرت میں بھی دائمی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنی کہانی سناؤں تو آپ کو میری اس بات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ میری گزارش ہے کہ مذہب کو صرف عبادات تک محدود نہ رہیں بلکہ روزمرہ زندگی کے ہر پہلو پر لاگو کریں۔ اور پھر دیکھیں کس طرح آپ کی راہ کے تمام کام نئے صاف ہوتے ہیں۔

”شرہ میری پھوپھی زاد تھی، بے حد خوب صورت بہت پر کشش! اگرچہ گزرتے ہوئے کے ناطے ہم بار بار ایک دوسرے سے مل چکے تھے مگر اس روز پھوپھی صفیہ کے ہاں شرہ کو دیکھ کر میری سوچوں میں ارتعاش پیا ہو گیا اور دل کی دھڑکنیں ایک نئی لے پر ہم آہنگ ہو گئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ شرہ کی آنکھیں بھی میرے ہی جذبات کو منعکس کر رہی ہیں۔ ایک روز جب ابا رضیہ پھوپھو کے گھر جانے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ جس پر اماں کا موڈ واضح طور پر بگڑا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ اماں دونوں پھوپھوں کا خیال رکھنے پر ابا سے چڑتی ہیں مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ دل میں اس حد تک بغض اور کینہ بھرے بیٹھی ہیں کہ اپنے بیٹے کی دلی خواہش کا بھی احترام نہیں کریں گی۔

پھوپھو کے گھر گیا تو وہ حسب معمول بہت پیار، بہت مان سے ملیں۔ میری نگاہیں شرہ کو ڈھونڈ رہی تھیں اور جب وہ چائے لیے سامنے آئی تو اسے دیکھ کر دل میں بہار رنگوں کی پھوار برسنے لگی۔ انتہائی گرم دن کی اس سہ پہر میرے دل نے فیصلہ کر لیا کہ میں شرہ سے ہی شادی کروں گا۔ چنانچہ ایک روز میں نے شرہ کی مرضی جاننے کے لیے اس کے پاس ہوشل جانے کا فیصلہ کیا۔ چاچا افضل سے کہا کہ مجھے کچھ سنے بیج وغیرہ خریدنے ہیں اس لیے لاہور جا رہا ہوں، اگر آپ شرہ سے ملنا چاہیں تو آپ بھی آجائیں۔ شرہ تک اپنا پیغام پہنچانے کے بعد میں بہت مطمئن تھا مجھے یقین تھا کہ

اس کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا۔“ کچھ جذبے اظہار کے محتاج نہیں ہوتے۔ آنکھیں اور دل براہ راست گفتگو کرتے ہیں اور ایک دوسرے تک ان کے لفظ پہنچا دیتے ہیں، ایسے ہی ان کے الفاظ کے سہارے میں جانتا تھا کہ شرہ اور میں ایک ہی طرح سوچ رہے ہیں مگر پھر بھی میں چاہتا تھا کہ جب ابا پھوپھو سے باقاعدہ بات کریں تو شرہ کی دلی خواہش واضح، زبانی اقرار کی صورت مجھ تک پہنچ چکی ہو۔ اس روز شرہ سے مل کر آنے کے بعد جب ابا، اماں اور میں اکٹھے بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے تو اماں کہنے لگیں۔

”ہاشم! تو کب تک کنوارہ پھرے گا؟ بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب بہت جلد تیری شادی کر دوں گی۔“

”ہاں..... ہاں! یہی بات میں بھی کہنے والا تھا۔ رضیہ آیا، صفیہ آیا دونوں ہی اپنے بڑے بچوں کی شادیاں کر چکی ہیں اور ہمارا تو ایک ہی بیٹا ہے، ہم کیوں دیر کر رہے ہیں۔“ ابا نے بس کر کہا تو جواب میں اماں بھی بہت خوشی اور اعتماد سے بولیں۔

”میں تو اپنی طرف سے تیاری کر رہی ہوں، اس روز رضیہ آیا طارق کی بری میں لے جانے کے لیے سونے کے کفن اور جھیکے دکھا رہی تھیں تو میں نے بھی ویسے ہی اپنی بہو کے لیے بنانے کو کہہ دیے ہیں۔ باقی زیور ہاشم کی پسند سے شہر سے لے لیں گے۔“

”ہاشم پتر! اپنی ماں کی باتیں سن رہا ہے، بہو ڈھونڈی نہیں اور زیور پہلے بنوا رہی ہے۔“ ابا نے۔

”لو ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب میری اپنی سگی بھانجی سالی موجود ہے پڑھی لکھی اور خوبصورت۔ ہاشم کے ساتھ اس کی جوڑی بہت سچے گی۔“ اماں کی اس بات سے میں بوکھلا گیا، پریشان ہو کر ابا کی طرف دیکھا تو وہ بھی خوش نظر آئے۔

میری منجھلی خالہ لاہور میں ہی رہتی تھیں، خالو کا معمولی سا کاروبار تھا۔ چند سالوں سے نہ جانے خالو کے ہاتھ کون سا گر لگ گیا کہ کاروبار روز بروز بڑھنے

زندگی تمہاری یہی بکواس سنتے گزر گئی۔ ہر رشتے کی اپنی جگہ اہمیت ہوتی ہے جیسے تمہیں اپنی بہن پیاری ہے اس طرح مجھے بھی اپنی بہنیں پیاری ہیں۔ اور یہ کچھ کھا کر قبر میں سو رہنے کی دھمکی ایک اور جہالت کا ثبوت..... اس دنیا میں میری زندگی جہنم کا نمونہ بنائے رکھی اب آخرت میں اپنے لیے دوزخ خرید کر اپنا ہی نقصان کرو گئی۔ لیکن یاد رکھو! ہو گا وہی جو ہاشم چاہے گا۔ کم عقل عورت کیوں اپنی بی اولاد کو مصیبت میں دھکیلنا چاہتی ہو۔“

”اچھا اچھا..... میں کم عقل ہوں عقل مند تو تمہاری بہنیں ہیں، یہ جو ہر روز تمہاری صفیہ آپا کو جیتنے پر لاڈ آ رہا ہوتا ہے، ابھی میوے والے لڈو بنا کر لارہی ہے تو کبھی اس کی سوکھی چھیلکی جیسی بیٹی ثروت اپنے ہاتھ سے سویٹر بن ”ہاشم بھائی“ کے لیے لارہی ہے۔ کیا میں نہیں سمجھتی کہ میرے بٹے کو پھانسنے کے لیے جال پھیلا رہی ہیں تمہاری دونوں بہنیں..... مگر میں کہہ رہی ہوں کہ اس بار میں تم سے ڈر کر چپ ہونے والی نہیں..... اگر ہاشم کو ماں کا ذرہ برابر بھی خیال ہے تو یہ میری مرضی کے بغیر شادی نہیں کرے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

میں سر ہٹام کر بیٹھ گیا یہ کیا گورکھ دھندا تھا اور اس میں نہ ہمت بھائی کی بہن ثروت کا ذکر اف میرے خدا! ایف اے کے امتحان میں وہ انگلش میں فیل ہو گئی تو اسے میں نے دو تین ماہ پڑھایا تھا۔ اس کے عجیب سے انداز سے میں ٹھکا تو تھا مگر کچھ اہمیت نہیں دی تھی کیوں کہ میرے دل میں ایسے کوئی جذبات نہیں تھے۔ اور اب جب کہ میں شمرہ کے لیے خالص اور خاص جذبات محسوس کر رہا تھا تو کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہ تھا۔ آنے والے دنوں میں اماں کو منانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی بلکہ اماں نے اشاروں اشاروں میں پھوپھو رضیہ کو طعنے دینے شروع کر دیے۔ صفیہ پھوپھو کے مقابلے میں رضیہ پھوپھو دو بدو مقابل نہیں کرتی تھیں ہمیشہ اماں کی زیادتیوں پر خاموش ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس بار ان کی بیٹی بدنام ہونے جا رہی تھی۔

اگا اور اسی رفتار سے خالہ اور اس کی بیٹیوں کے خڑے بھی بڑھ رہے تھے۔ سہلی اگرچہ کالج جاتی تھی مگر پڑھائی میں اس کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلے چار پانچ سال سے وہ سینڈ ایئر بھی کلیئر نہ کر سکی تھی۔ خالہ کے گھر جا کر اور سہلی سے مل کر ہی مجھے کوفت ہوتی تھی خاص طور پر سہلی ایک کالج کی طالبہ کی بجائے فلم یا اسٹیج کی اداکارہ سے زیادہ ملتی جلتی دکھائی دی۔ کٹے اور رنگے ہوئے بال، میک اپ اور مختصر سالیاس، وہ تمام فضول اور ”چیپ“ فیشن کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اس سہلی کو میں ہرگز اپنی شریک زندگی نہیں بنا سکتا تھا۔

”اماں..... پلیز! یہ میری پوری زندگی کا معاملہ ہے مجھے ایک سنجیدہ، باشعور اور پڑھی لکھی بیوی چاہیے، اگر خاندان میں ہی شادی کرنی ہے تو پھر شمرہ میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔“ اماں کو تو جیسے آگ لگ گئی۔

”اچھا..... تو یہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ میں بھی کہوں کہ یہ آج کل بھاگ بھاگ کر پھوپھو کے گھر کیوں جا رہے ہو؟ تم جیسے دھوکہ پھانس لینا مشکل نہیں تھا ان ماں بیٹی کے لیے۔ مگر کان کھول کر سن لو چاہے یہ تمہارے دماغ کا خلل ہو یا تمہارے باپ کو ہمیشہ کی طرح بہن اور بھائی کی محبت کا بخار چڑھا ہو مگر میں ہر گز ہرگز شمرہ یا ثروت کو بہو نہیں بناؤں گی۔ اگر تم باپ بیٹے نے کچھ ایسا کرنے کی کوشش کی تو میں کچھ کھا کر قبر میں جا سوؤں گی۔ غضب خدا کا ساری زندگی مندوں کی غلامی میں گزر گئی۔ اب بہو بھی ان ہی کی بیٹی لا کر اپنی مٹی پلید کروالوں۔“

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ اماں، پھوپھو رضیہ اور صفیہ دونوں سے ہی چڑتی تھیں مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے دل میں اس حد تک بغض اور عناد بھرا ہوا تھا۔ میں تو پریشان ہی ہو گیا۔ مگر ابا اور اماں کے جھگڑے پر اپنی پریشانی بھلا کر ان دونوں کا جھگڑا سنبھالنے لگا کیوں کہ بہنوں اور بھانجیوں کا اس طرح ذکر ظاہر ہے ابا کو برا لگا تھا چنانچہ وہ اماں کو ڈانٹ رہے تھے۔

”کیا بکواس ہے یہ..... جاہل عورت! ساری

چنانچہ اس روز انہوں نے پیغام بھیج کر مجھے بلایا اور کہنے لگیں۔

”پتر ہاشم! تم مجھے بہت پیارے ہو، میں نہیں جانتی کہ یہ بھائی کمال کی خواہش ہے یا تمہاری اور شہرہ کی مرضی بھی، شامل ہے۔ لیکن پتر یاد رکھو یہ چند دنوں کی بات نہیں زندگی بھر کا معاملہ ہے، اور بھائی کو میں اچھی طرح جانتی ہوں اس کا پیر ختم نہیں ہوتا۔ اس لیے تم ایسا فیصلہ کرو جس میں تمہیں سکون ملے اور شہرہ کو عزت۔ ہاشم! عزت اور غیرت پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے، سوائے ایمان کے.....“

میں ان کے گھر سے اٹھا تو بجائے اپنے گھر جانے کے عرفان کے کلینک آ گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بے تکلفی اور تپاک سے ملا۔ وہ مصروف تھا میں بھی ویٹنگ روم میں بیٹھا، میگزینز کے صفحے پلٹتا رہا اور شام کو اس کے ساتھ اس کے گھر آ گیا۔ گھر آتے ہوئے اس کے موبائل فون پر ایک کال موصول ہوئی جسے سن کر وہ پریشان سا دکھائی دینے لگا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کی چھوٹی بہن صبیحہ کے رشتے کی بات چل رہی تھی بلکہ کسی حد تک بات چلی تھی کہ لڑکے والوں نے لمبے چوڑے جیز کی فہرست بھیج دی ہے جس کی وجہ سے ابو، امی غصے میں بھی ہیں اور پریشان بھی ہیں۔ یہ ابو کا فون تھا وہ اس رشتے سے اب خوش نہیں، ان کی ڈیمانڈز پوری کر دیں تو کیا گارنٹی ہے کہ صبیحہ کی زندگی میں آئندہ کوئی لالچ، دھونس کا فرما نہیں ہوگا اور اگر انکار کرتے ہیں تو لوگ یقیناً باتیں بنائیں گے کیونکہ خاندان میں بات پھیل چکی ہے۔“

اور جیسے میں ایک دم فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔

”عرفان! تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر تم لوگوں کو اپنی بیٹی کاؤں سمجھنے پر اعتراض نہ ہو تو میں ابا اور اماں کو لے کر آ جاؤں؟“ عرفان میری بات سن کر بہت خوش ہوا۔

”یہ صبیحہ بلکہ ہم سب کی خوش بختی ہوگی۔ تمہاری دوستی ہمیشہ ہی میرے لیے اطمینان اور فخر کا باعث رہی

قربانی کے گوشت کا بیان

عبداللہ بن ابوبکر سیدنا عبداللہ بن واقد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانیوں کا گوشت تین دن کے بعد کھانے سے منع فرمایا ہے۔

عبداللہ بن ابوبکر کہتے ہیں، میں نے یہ عمر سے بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ عبداللہ نے سچ کہا۔

میں نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سنا وہ کہتی تھیں کہ ”رسول اللہ ﷺ کے عہد میں دیہات کے چند لوگ عید الاضحیٰ میں شریک ہوئے کو آئے (اور وہ محتاج لوگ تھے) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ قربانی کا گوشت تین دن کے موافق رکھ لو اور باقی خیرات کر دو (تاکہ یہ محتاج بھوکے نہ رہیں اور ان کو بھی کھانے کو گوشت ملے)

اس کے بعد لوگوں نے عرض کیا! یا رسول اللہ ﷺ! لوگ اپنی قربانیوں سے مشکیں بناتے تھے (ان کی کھالوں کی) اور ان میں چربی پکھلاتے تھے۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”اب کیا ہوا؟“

لوگوں نے عرض کیا کہ ”آپ ﷺ نے قربانیوں کا گوشت تین دن کے بعد کھانے سے منع فرمایا ہے۔“ (اور اس سے نکلا کہ قربانی کا کوئی جزو تین دن سے زیادہ نہ رکھنا چاہیے)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں نے تمہیں ان محتاجوں کی وجہ سے منع کیا تھا جو اس وقت آ گئے تھے۔ اب کھاؤ اور رکھ چھوڑو اور صدق دو۔“

(صحیح مسلم)

ہے۔ انشاء اللہ یہ رشتہ بھی ایسا ہی ہوگا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔“

گھر واپس آتے ہوئے میں مطمئن تھا اگرچہ دل کے ایک کونے سے ٹیس اٹھ رہی تھی کہ شمرہ کا ساتھ میرے دل کی تنہائی مگر مجھے پھوپھو کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اماں کبھی بھی دل سے راضی نہیں ہو سکتی تھیں اور ناراضی کے اظہار کے لیے ان کا طریقہ جی بھر کر بولنے کا تھا۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی تھی کہ ان کی باتوں کے تیر کے زخمی کر رہے ہیں۔ ابھی بھی انہوں نے اگرچہ ابا کے ڈر سے صاف طور پر نہ کہا تھا مگر پھر بھی رضیہ اور صفیہ دونوں پھوپھو کو اشارے کنائے میں یہ بتا دیا تھا کہ وہ دونوں اپنی بیٹیوں کے لیے ان کے بیٹے کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں اور یہ کہ ان کی بیٹیاں چاہے جتنی مرضی کو تشش کر لیں جیت نہیں سکیں گی۔“ رضیہ پھوپھو نے تو نظر انداز کر دیا تھا مگر صفیہ پھوپھو نے ہمارے گھر آنا جانا چھوڑ دیا۔

میں اور ابا جاتے تو بھی اکھڑی اکھڑی رتیں اور نزہت بھائی نے تو کئی بار شمرہ کے حوالے سے مجھ پر فقرے بھی کسے تھے۔ اب اچانک کیا جانے والا یہ فیصلہ مجھے اس سارے مسئلے کا حل محسوس ہوا۔

ابا نے تو میری بات معمولی تردد کے بعد میرے یہ کہنے پر کہ ڈاکٹر عرفان کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ مان لی کہ اماں کو منانے کا یہی ایک طریقہ ورنہ وہ سسلی کے لیے کبھی معاف نہیں کریں گی۔ میں کہوں گا کہ نہ شمرہ، نہ ثروت اور نہ ہی سسلی! بلکہ صبیحہ آپ کی بہو بنے گی، تو پھر بھی انہیں منایا جاسکتا ہے۔ ابا میری بات سمجھ گئے اور پھر جب ابا اور اماں کو لے کر میں ڈاکٹر عرفان کے والدین کے پاس گیا تو صبیحہ سے مل کر اماں کے تمام گلے شکوے دور ہو گئے۔

جب رضیہ پھوپھو کے گھر پھوپھو صفیہ کی موجودگی میں اماں اور ابا نے میری بات طے ہونے کی خبر سنا لی تو رضیہ پھوپھو نے کھل کر خوشی کا اظہار کیا غالباً وہ اماں کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتی تھیں کہ انہیں کچھ پروا نہیں،

اماں خواہواہ ہی شکوک کا شکار تھیں۔ جب کہ صفیہ پھوپھو اور نزہت بھائی کا رویہ ناراضی بھرا تھا اور شمرہ! اس کے چہرے پہ پھپھلی حیرت اور دکھ مجھے بھی دکھی کر گیا۔ میں نے شمرہ کو خط لکھ کر رضیہ پھوپھو کی بات دہرائی اور بتایا کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا؟

میں نے اس کی اور اپنی محبت قربان کر کے دونوں کی عزت بچائی تھی پھر چاہے غلط یا صحیح ”ماں“ کی بات بھی مان لی تھی چاہے آدھی مانی تھی مگر وہ اس پر بھی خوش ہو گئی تھیں کہ شمرہ یا ثروت ان کی بہو نہیں بنیں تھیں۔

صبیحہ نے بھی ماسٹرز کر رکھا تھا اس کے علاوہ وہ پردے کی پابندی تھی اور کافی دینی معلومات رکھتی تھی۔ گزرتے وقت نے مجھے احساس دلایا کہ یقیناً اللہ کے ہر فیصلے میں جو مصلحت اور بھلائی چھپی ہوئی ہے ہم کوتاہ بین انسانوں کو اکثر اس کا ادراک دیر سے ہوتا ہے اور کبھی آخر تک نہیں سمجھ پاتے، صبیحہ کے ساتھ نے مجھے بھی مذہب میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔ میں نے قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر پڑھنی شروع کی تو جیسے اندھیرے سے اجالے میں آتا گیا۔ بعض اوقات کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آتا تو صبیحہ سے ڈسکس کرتا پھر اس کے کہنے پر لاہور میں بعض علماء کرام اور اسکالرز سے ملنا شروع کیا تو جانا کہ نیک لوگوں کی صحبت کیسے اثر انداز ہوتی ہے۔ عطر اور خوشبو کا ساتھ بے مایہ مٹی کو کس طرح خوشبودار بنا دیتا ہے۔

شمرہ کی شادی ہو گئی اور وہ بیرون ملک چلی گئی سالوں بعد جب وہ پاکستان آئی تو خوشحال اور مطمئن ہی نظر آئی تھی مگر پچھلے دنوں جب خاندان کی ایک تقریب سے واپسی پر میں اور صبیحہ گھر پہنچے تو اپنے بال سلجھاتے ہوئے صبیحہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”یہ بابر بھائی کو تو میں بہت سلجھا ہوا انسان سمجھتی تھی۔ مگر وہ تو شمرہ کو بہت بری طرح ڈانٹ رہے تھے۔“

”ہوگی کوئی میاں بیوی کی آپس کی بات۔“ میں نے کہا۔ لیکن دل میں دکھ ضرور ہوا تھا۔

”نہیں..... ہاشم! دراصل بابر بھائی کی باتوں سے مجھے محسوس ہوا جیسے وہ شمرہ پر شک کرتے ہیں آپ کے اور عابد بھائی کے حوالے سے.....“

”کیا..... یہ کیا کہہ رہی ہو؟“ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

”ہاں..... وہ کہہ رہے تھے تمہاری بے وفائی کی وجہ سے عابد نے آج تک شادی نہیں کی اور ہاشم نے بھی تمہاری اصلیت جان کر تمہیں دھتکار دیا تھا۔“

”بابر ایسے کہہ رہا تھا؟“ مجھے دکھ کے علاوہ شدید حیرت بھی تھی۔ میرا اور شمرہ کا تعلق ایسا تو نہ تھا جو یوں شرم ناک طعنہ بنتا اور عابد! کیا وہ؟“

”مجھے لگتا ہے بابر بھائی کو کسی نے شمرہ کے خلاف بھڑکا دیا ہے۔“ صبیحہ کہہ رہی تھی۔

”مگر ایسا کون کرے گا کسی کو شمرہ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“ میرے سوال پر وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ کو یاد ہے ہماری شادی کے شروع کے دنوں میں نزہت بھابی نے مجھے بھی آپ کے اور شمرہ کے متعلق کچھ قصے سناے تھے۔ جو میں نے آپ کو بتا دیے تو آپ میرے ساتھ نزہت بھابی سے ملے تھے اور ان کے سامنے کہا تھا کہ شمرہ میری چھوٹی زادہ ہے میرے ابا اور اس کی اماں سگے بہن بھائی ہیں۔ اگر ان دونوں کے دلوں میں ایسی کوئی خواہش تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اور شمرہ لیلیٰ مجنوں بنے پھرتے تھے۔ آج صبیحہ میری بیوی ہے ہم دونوں کو ایک دوسرے پر اعتماد ہے بہتر ہے کہ آپ ہمیں درغائے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آج بابر بھائی اور شمرہ کے درمیان ویسی ہی انڈراشینڈنگ اور اعتماد کی فضا بن جائے جیسی ہم میں ہے تو کیا بہتر نہیں؟“

”یقیناً بہت اچھی بات ہے، مگر اس سلسلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ صبیحہ کی بات میرے ذہن میں بس گئی دوسرے روز جب میں نماز فجر کے بعد حسب معمول تلاوت کرنے لگا تو شمرہ پر بابر کے لگائے الزامات

میرے ذہن میں گھوم گئے، میں سورۃ الاحزاب کی آیات تلاوت کر رہا تھا۔ تلاوت کے بعد دعا مانگتے ہوئے میں نے گڑگڑا کر شمرہ اور بابر کے لیے ہدایت، رہنمائی اور سکون کی دعا مانگی (اس سورۃ میں پردے اور محرم، نامحرم پر بیان ہے) آج جب کہ مجھے دین کی تھوڑی بہت سمجھ لگی تھی تو احساس ہوا تھا کہ روزمرہ زندگی میں خلاف شرع معمول اپنانے سے بسا اوقات کیسی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

میں شمرہ اور عابد! شرعاً نامحرم تھے، آپس کے میل جول کے باعث ایک دوسرے میں دلچسپی پیدا ہونا ایک فطری امر تھا اور وقتی بھی۔ جی ہاں! سچ کہہ رہا ہوں شمرہ کے لیے اس وقت میرے جذبات اور تھے اور آج یک سر مختلف۔ آج تمام تر جذبات صرف صبیحہ کے لیے ہیں، شمرہ کے لیے کزن ہونے کی حیثیت سے ہمدردی اور خونی رشتے کا احساس اور لگاؤ ہے۔ میں اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن تھا اور شمرہ کی بے سکونی دکھ دے رہی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ اس کی زندگی میں زہر گھولنے والی بھی یقیناً نزہت بھابی ہی ہوں گی نہ جانے وہ اس قدر حامد اور کینہ توڑ فطرت کی مالک کیوں تھیں؟ میں نے ان کی بہن ثروت سے شادی نہیں کی تھی۔ شمرہ کے لیے میرے دلی جذبات کا انہیں اندازہ ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے صبیحہ کو بھڑکایا تھا۔ مگر ان کے حسب خواہش کوئی ہنگامہ نہیں ہوا بلکہ ہم نے انہیں شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی جس پر وہ شرمندہ تو کیا ہوتیں، ہم سے ناراض ہو گئیں۔ میں دوسرے ہی روز عابد سے ملنے چلا گیا اس سے راز داری کا وعدہ لے کر میں نے اسے شمرہ پر بابر کے لگائے الزامات سناے تو وہ بھی پریشان ہو گیا اور کچھ شرمندہ بھی۔

”ہاشم یار! یہ فضول خیالات بابر کے دماغ میں آئے کیسے؟“

”اللہ جانتا ہے مگر ہمیں اس کا شک دور کرنا چاہیے، آخر شمرہ ہماری بہن ہے یہ میرے دل کی پکار تھی

کہ اس کے بسے بسائے گھر کو ایسی فضول سازشوں سے بچانا ہے۔“

”مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ بھلا بابر ہماری بات پر یقین کیوں کر کرے گا؟“ عابد کی بات پر میں مسکرایا۔

”باتوں پر نہ سہی، عمل پر تو یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ یار تم شادی کیوں نہیں کرتے، ہم دونوں تقریباً ہم عمر ہی ہیں میرے دو بچے بھی ہو گئے اور تم ابھی تک بائٹے چھبیلے نو جوان بنے پھر رہے ہو۔“

”تم شاید میری نو جوانی سے جل رہے ہو۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”چلو۔ زیادہ پریشان مت ہو، میں بھی جلد ہی تمہاری صف میں شامل ہونے والا ہوں۔“

پھر عید الفطر کے بعد عابد کی شادی ہو گئی۔

نکاح تو اس کا کراچی میں ہوا تھا ہم دہلی لے کر گاؤں آ گئے اس کی دہلی ”صبا“ بہت اچھی لڑکی تھی صبیحہ

نے بہت جلد اس سے دوستی کر لی۔ عابد کی شادی پر شمرہ کو بلاوا دینے میں، صبیحہ طارق اور شارق، نزہت بھابی اور حنا (شارق کی بیوی) گئے۔ شمرہ اور بابر لاہور میں

رہتے تھے، بہت اچھا سلیقے سے سجا ہوا گھر تھا اور پھر شمرہ کے پیارے سے دونوں بچے۔ میں اور صبیحہ پہلی بار اس

کے گھر آئے تھے اس لیے صبیحہ اس کے، بابر اور بچوں کے لیے تحائف لائی تھی۔ شمرہ نے شاید لینے میں کچھ

تکلف کیا تھا جس پر صبیحہ ہنسنے ہوئے کہا۔

”افوہ شمرہ..... بھابیوں اور بھابیوں سے تکلف نہیں کرتے بلکہ فرمائشیں کر کے لیتے ہیں۔ ابھی تو تم

نے عابد بھابی سے نگلڑا سانیک لینا ہے۔“

”ہاں..... بالکل! آخر اکلوتی بہن ہو۔“ حنا بھابی ہنسنے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ میں بابر کی طرف دیکھ رہا تھا

اس کے چہرے کے تاثرات ناقابلِ فہم سے تھے، میں نے محسوس کیا وہ بار بار نزہت بھابی کی طرف دیکھ رہا

تھا۔ جب کہ وہ اس کی جانب دیکھنے سے گریزاں تھیں۔ میں نے بابر سے صاف بات کرنے کا ارادہ کر لیا

ہمارے گھر میں عابد اور اس کی دہلی کی دعوت تھی باقی سب خاندان والے بھی مدعو تھے۔ بابر اور شمرہ بھی آئے

ہوئے تھے انہیں ہم نے بطور خاص مدعو کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا خاص طور پر جب شمرہ کی پھوپھی نے دولہا

کی بہن اور بہنوئی کی حیثیت سے اسے اور بابر کو خاص اہمیت دی۔ عابد کی دہلی اور خود عابد کے ہاتھ سے

”بہن“ کا ٹیگ دلویا تو بابر کا چہرہ کچھ پرسکون سا دکھائی دینے لگا۔

کھانے کے بعد سب لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اماں رضیہ پھوپھی، صفیہ پھوپھی، عابد کی اماں ایک

طرف بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں اس وقت ان میں کوئی اختلاف کوئی جھگڑا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ثروت کی بھی

شادی طے ہو گئی تھی اور صفیہ پھوپھی اب مطمئن تھیں میں سوچنے لگا کاش کہ یہ خواتین اپنے فضول قسم کے

”جلاپے، سیاپے بھول جائیں تو کتنا اچھا ہو۔“

ساس، بہو، نند، بھواج، دیورانی، جھٹانی کے رشتوں میں ماں، بہن، بیٹی کی طرح محبت اور خلوص

تلاش کریں نہ کہ چھوٹی موٹی رنجشوں کو سازشوں کی ہوا دے کر اپنی اور دوسروں کی زندگی عذاب بنائیں۔ صبیحہ،

صبا بھابی، نزہت بھابی اور حنا بھابی سب ایک دوسرے سے باتوں میں لگن تھیں۔ شادی کی رسمیں، ایک

دوسرے کے زیور، کپڑے موضوع گفتگو تھے البتہ نزہت بھابی کے چہرے پر ایک اضطراب سا طاری تھا اور اس

اضطراب کی وجہ میں جانتا تھا۔ کچھ دیر قبل جب وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو واش روم میں بھیج کر خود باہر کھڑی تھیں تو

میں نے ان کے پاس رک کر کہا تھا۔

”نزہت بھابی! تو بے گھر کیوں کہ میاں بیوی کے درمیان رنجش پیدا کرنا بہت بڑا گناہ ہے، اور خدا سے

دعا کریں کہ آپ کا گھر آباد رہے۔ ثروت اپنے گھر میں خوش ہے کیوں کہ دوسروں کے لیے گڑھے کھودنے

والے خود بھی ان میں گر سکتے ہیں۔ شمرہ، طارق بھابی کی اکلوتی بہن سے اور کیا طارق بھابی اپنی بہن کو بے سکون کرنے والے کو آسانی سے معاف کر سکیں گے؟ اگر وہ

اس کا نام جان لیں تو کم سے کم اس سے اس کی وجہ تو ضرور پوچھیں گے۔“

میں عابد اور بابر کو اپنی لائبریری دکھانے لے گیا۔ طارق بھائی اور نزہت بھائی گھر چلے گئے تھے کیوں کہ ان کی بیٹی کو نیند آ رہی تھی اور وہ اپنے بستر پر سونے کی ضد کر رہی تھی۔ حنا اور شارق، صغیہ چھوپو کے خاندن کے ساتھ پہلے ہی جا چکے تھے۔ بابر کو میری کتابیں بہت پسند آئیں۔ وہ دیکھتے دیکھتے ایک کتاب اٹھا کر اس کے مطالعے میں گم ہو گیا۔

”یار! صبا بھائی کے ساتھ نزہت بھائی بہت گپ لگا رہی تھیں۔ خیال رکھنا ہماری شادی کے شروع دنوں میں انہوں نے میرے اور صغیہ کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ تو شکر ہے کہ صغیہ بہت سمجھ دار ہے، ہم نے وہ مسئلہ ہینڈل کر لیا تھا۔“ میں نے عابد سے کہا۔

”مگر ہاشم! نزہت بھائی کو کیا ملتا اگر تم میاں بیوی میں غلط فہمی پیدا ہو جاتی؟“ اس نے کہا تو میں نے جواب دیا۔

”کچھ لوگ دوسروں کو خوش نہیں دیکھ سکتے، یہ ان کا ماسدانہ جذبہ ہوتا ہے یا فطرت جو شیطان کی نقش قدم پر چل پڑتے ہیں۔“

”تو پھر نزہت بھائی کو سمجھانا تھا نا۔ طارق بھائی خود کس قدر مہربان اور نیک انسان ہیں، ان کی بیوی کو یہ حرکتیں زیب دیتی ہیں، ویسے تم صبا کی طرف سے بھی بے فکر رہو۔ جیسے صغیہ بھائی کو تم پر بھروسہ اور اعتماد ہے، صبا کو شاید اس سے بڑھ کر ہو گا۔“

”ہاں ہونا بھی چاہیے۔ آخر میاں بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہے اعتماد اور بھروسے کا۔ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم اور نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل کا نتیجہ ہے۔“

بابر نے نزہت بھائی کے ذکر پر ہی کتاب رکھ دی تھی اور اب بے غور ہماری باتیں سن رہا تھا، میں نے اپنی بات ختم کر کے اسے بھی ساتھ شامل کیا۔

”کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔ بھلا میاں بیوی سے بڑھ کر ایک دوسرے کا رفیق کوئی ہو سکتا ہے؟“ وہ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلانے لگا۔ پھر پوچھنے لگا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ نزہت بھائی اور صغیہ بھائی کا ذکر کس سلسلے میں ہو رہا تھا؟“

”ہاں بالکل یار! کچھ لوگوں کو فضول باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے، حالانکہ نزہت بھائی ہماری محترم ہیں مگر انہوں نے صغیہ سے میرے اور شرعہ کے متعلق فضول باتیں کی تھیں۔ پلیز تم غلط مت سمجھنا یہ صرف ابا کی ایک خواہش تھی، وہی جو عام طور پر ہمارے بزرگ سوچتے ہیں۔ خونی رشتے ایک نئے بندھن میں جکڑنے کی سوچ! جس کا نزہت بھائی نے افسانہ بنا ڈالا۔“

”کس قدر غلط سوچ تھی ان کی۔ کیا وہ جانتی نہیں تھیں کہ شرعہ ہمیں طارق اور شارق کی طرح سمجھتی تھی اور سمجھتی ہے۔ کتنی بار تو اس نے یہ کہا تھا اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی؟“ عابد سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ہاں! شرعہ جیسی اچھی لڑکی جب ایک بہن کا درجہ رکھتی ہو تو پھر اس کے بارے میں کوئی اور سوچ کیسے آ سکتی ہے؟“ میں نے بابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جب کہ وہ خاموش تھا۔ پھر جب وہ لوگ جانے لگے تو بابر سے مل کر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے کہا۔

”اگر تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔ اگرچہ تم سے میری بہت زیادہ بے تکلفی نہیں مگر شرعہ اور نزہت بھائی دونوں سے میرا ایک ہی رشتہ ہے۔ ان دونوں کی مائیں میری والدہ کی بہنیں ہیں اور اپنے بھائی اور بھتیجے سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ مجھے بھی اس محبت کا فرض ادا کرنا ہے، دونوں کو کسی مشکل کا شکار نہیں دیکھنا چاہتا۔ امید ہے کہ تم کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو گے آخر ایک پڑھے لکھے ہاشم مرد ہو اور اپنی بیوی کو ایک مرد سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔“

”نزہت بھائی کو بھی آپ سمجھائیں گے؟“ اس

کے کہنے پر میں مسکرایا۔
”جب وہ تمہیں اور شمرہ کو، مجھے اور صبیحہ کو، عابد اور

صبا کو خوش گوار با اعتماد زندگی گزارتے دیکھیں گی تو خود
بی سمجھ جائیں گی۔“ اس شب جب صبیحہ چھوٹی سی گول
مٹول عانتہ کو کندھے سے لگائے ٹپک رہی تھی تو میں
نے آنکھیں موندتے ہوئے دل میں دعا کی۔

”یا اللہ! میری ہر چھوٹی بڑی لغزش کو معاف فرما۔
آئندہ کے لیے میری مدد اور رہنمائی فرما اور میری بیٹی کو
ہر آزمائش، تکلیف سے بچانا۔ دین اور دنیا میں کامیابی
عطا فرمانا، نہ وہ نزہت بنے، نہ شمرہ، نہ ثروت بلکہ اپنی
ماں صبیحہ کی گود میں پروان چڑھنے والی عانتہ ہو۔
ہاں..... ہر باپ کی اپنی بیٹی کے لیے سوچ مختلف ہوتی
ہے اور دوسرے کی بیٹی (بیوی اور محبوبہ) کے لیے
مختلف۔ لیکن آج میں باپ تھا، ایک بیٹی کا باپ! شمرہ
سے ایک وابستگی آج بھی تھی۔ وہ وہی جذبہ بے شک نہ
رہا تھا مگر رضیہ پھوپھو کا خلوص اور محبت آج بھی مجھے اچھی
طرح یاد تھا۔ میں نے اپنے دل سے شمرہ کی خوشی اور
سکون کے لیے دعا کی۔

☆☆☆

میں باہر ہوں۔ طارق کے ساتھ زیادہ دوستی تو
میرے کزن محمود کی تھی مگر طارق ایسا بندہ تھا جس کی میٹھی
زبان اور اخلاق سے دشمن بھی گرویدہ ہو جائیں اور میں
تو اس کے دوست کا کزن تھا اس لیے ہماری دوستی بھی
خوب پھیلی پھولی۔ اس نے اپنی شادی پر محمود اور مجھے
اپنے سب گھر والوں سمیت مدعو کیا تھا اگرچہ پچھلے تین
سال سے میں لندن میں تھا مگر پھر بھی میرا اور طارق کا
رابطہ برقرار تھا۔ اور یہ طارق کی محبت اور خلوص تھا جو میں
نے اپنے آنے کا پروگرام اس طرح بنایا کہ طارق کی
شادی اٹینڈ کر سکوں، طارق کی شادی پر آنا اور اماں نے
مجھے شمرہ دکھائی۔ ہم لوگ طارق کی برات لے کر جا
رہے تھے اور شمرہ دولہا کی بہن اس کے قریب کھڑی
تھی۔ آپا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”بابرا! دیکھ تو کتنی پیاری ہے طارق کی بہن، میں
کے کہنے پر میں مسکرایا۔
”جب وہ تمہیں اور شمرہ کو، مجھے اور صبیحہ کو، عابد اور
صبا کو خوش گوار با اعتماد زندگی گزارتے دیکھیں گی تو خود
بی سمجھ جائیں گی۔“ اس شب جب صبیحہ چھوٹی سی گول
مٹول عانتہ کو کندھے سے لگائے ٹپک رہی تھی تو میں
نے آنکھیں موندتے ہوئے دل میں دعا کی۔
”یا اللہ! میری ہر چھوٹی بڑی لغزش کو معاف فرما۔
آئندہ کے لیے میری مدد اور رہنمائی فرما اور میری بیٹی کو
ہر آزمائش، تکلیف سے بچانا۔ دین اور دنیا میں کامیابی
عطا فرمانا، نہ وہ نزہت بنے، نہ شمرہ، نہ ثروت بلکہ اپنی
ماں صبیحہ کی گود میں پروان چڑھنے والی عانتہ ہو۔
ہاں..... ہر باپ کی اپنی بیٹی کے لیے سوچ مختلف ہوتی
ہے اور دوسرے کی بیٹی (بیوی اور محبوبہ) کے لیے
مختلف۔ لیکن آج میں باپ تھا، ایک بیٹی کا باپ! شمرہ
سے ایک وابستگی آج بھی تھی۔ وہ وہی جذبہ بے شک نہ
رہا تھا مگر رضیہ پھوپھو کا خلوص اور محبت آج بھی مجھے اچھی
طرح یاد تھا۔ میں نے اپنے دل سے شمرہ کی خوشی اور
سکون کے لیے دعا کی۔

☆ اس روز شمرہ کے والدین سے ملنے گاؤں گئے۔
وہ بھی طارق اور میری دوستی تو بے شک ابھی بھی تھی
مگر دونوں کی مصروفیات اب بہت بڑھ گئی تھیں اس
لیے روز روز ملنا نہیں ہوتا تھا۔ اماں کے بعد میں بھی
اپنے ذہن کو بٹانا چاہتا تھا۔ گئے تو ہم تین دنوں کے
لیے تھے مگر دوسرے ہی روز آفس سے فون آ گیا۔ مجھے
واپس آنا تھا۔ میں نے شمرہ سے کہا کہ تیار ہو جاؤ۔ وہ
کہنے لگی۔

”اماں اور پھوپھی اماں کہہ رہی ہیں میں ابھی چند
دن رک جاؤں پھر طارق بھائی یا شارق بھائی کے ساتھ
آ جاؤں گی۔“ میں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
”ایک لمحہ بھی میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا یہ تم
اچھی طرح جانتی ہو۔ پھر ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟“
”اوہ آپ بھی ناں بس! اب بھلا میں اماں وغیرہ

سے کیا کہوں؟“

”جو سچ ہے وہی کہو نا۔“

”اف..... تو یہ، شرم کریں۔“

”ارے بھی تو پتہ غلطی اور گناہ پر کرتے ہیں، ہم میاں بیوی ہیں شرعی اور قانونی طور پر محبت ہمارا حق ہے۔ تمہاری اماں تو خوش ہوں گی کہ ان کا داماد ان کی بیٹی سے اس قدر محبت کرتا ہے۔“

”پلیز..... پلیز بابرا! یہ پاکستان ہے، یورپ نہیں۔“

”اچھا چلو وعدہ۔ پکا وعدہ کہ اگلے ہفتے پھر آئیں گے اور تب تین چار دن رہ کر جائیں گے، ابھی تم اپنی اماں کو ساتھ لے چلو۔“

”اچھا..... بس اسنے مشورے رہنے دیں۔“ وہ کچھ خفا سی کمرے سے نکل گئی مگر میں جانتا تھا کہ وہ ہرگز مجھ سے ناراض نہیں رہ سکتی اور نہ ہی وہ میرے بغیر رہ سکتی ہے۔ سچی دروازہ ہلکے سے بجا کر زہت بھابی کمرے میں آ گئیں۔

”بابر بھائی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے مگر ڈرتی ہوں کہ آپ کچھ غلط نہ سمجھ لیں اور میرا گھر بار، سب بکھر کر رہ جائے۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“ میں حیران تھا۔

”آپ بی کے فائدے کی بات ہے۔ طارق آپ کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں، میں بھی بھائی سمجھ کر کچھ بتا رہی ہوں لیکن آپ وعدہ کریں کہ یہ راز بھی کسی کو نہیں بتائیں گے میرا نام نہیں لیں گے اور..... اور بے شک حقیق کر لیں۔“

”آخر ایسی کیا بات ہے! جس کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھی جا رہی ہے۔“ میں حیران تھا، وہ آہستہ سے گویا ہوئیں۔

”دراصل بات ایسی ہے کہ ہم نہیں ہو رہی، شمرہ میری بھی بہن ہے مجھے اس کی اور آپ کی دونوں کی بھائی چاہیے۔“

”آپ پلیز اکل کر بات کریں۔“ میں جھلا گیا تھا

انتظار

باس نے اپنی نئی ٹائپسٹ سے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ جیسے ہی گھڑی پانچ بجاتی ہے تم اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی ہو چاہے اس وقت تم نے پورا جملہ بھی ٹائپ نہ کیا ہوا؟“

”یہ بالکل غلط ہے۔“ ٹائپسٹ نے وضاحت کی۔

”میں نے آج تک کبھی جملہ ادھورا نہیں چھوڑا۔ میں ہمیشہ ساڑھے چار سے ہی پانچ بجنے کا انتظار شروع کر دیتی ہوں اور اس دوران کوئی نیا جملہ ٹائپ ہی نہیں کرتی۔“

(احمد شاہ، لاہور)

اور جب زہت بھابی نے واضح طور پر شمرہ کو اس کے کزنز عابد اور ہاشم کے ساتھ انوالو کیا تو میں جھلس کر رہ گیا۔ میری اتنی شدید محبت اور چاہت کا یہ صلہ! میں تو شمرہ کو بہت معصوم سمجھتا تھا۔

اماں مرحومہ اکثر مجھے نوکنتی تھیں کہ ہر سنی سنائی بات پر جھٹ سے اعتبار مت کر لیا کرو، ایک مرد کو تو خاص طور پر کانوں کا کچا نہیں ہونا چاہیے مگر میں ایسا ہی تھا اور اپنی اس عادت کے تحت اب فوراً ہی زہت بھابی کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ کئی جھوٹے بڑے واقعات جن پر پہلے تو جہنم دی تھی اب اس بات کے تناظر میں یاد آ رہے تھے اور میرا شک یقین میں بدل رہا تھا۔ شمرہ تیار ہو کر میرے ساتھ چلی تو گاڑی میں بیٹھتی ہی میں نے اسے مخاطب کیا۔

”آج تو تمہارا کزن ہاشم آیا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے تم بھی رکنا چاہ رہی تھیں۔“ اس نے کچھ چونک کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

”ہاشم بھائی تو اکثر اماں کے پاس آتے رہتے

ہیں یہ کون سی خاص بات ہے، میں تو ویسے ہی ٹھہرنا چاہتی تھی۔“

”خاص بات تو ہے، بس مجھے ہی دیر سے پتہ چلی۔ شمرہ تم ایک دغلی اور بے وفا لڑکی ہو۔“ اس کی آنکھیں حیرت اور دکھ سے پھیل گئیں۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں باہر؟“ اور پھر مجھے موقع مل گیا۔ وقتاً فوقتاً اس کے سابقہ عشق یاد کرواتا رہتا، شروع شروع میں چند ایک بار اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی مگر بے سود دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

جب بھی کسی موقع پر عابد یا ہاشم کا شمرہ سے سامنا ہوتا میں ان کا بغور جائزہ لیتا مگر مجھے کبھی بھی کوئی ایسی بات یا موقع نہیں ملا جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ ہاشم اور شمرہ میں کوئی خاص تعلق یا ناراضی تھی یا ہے۔ عام نارمل سارو یہ ہوتا تھا اور ہاشم کی بیوی تو شمرہ کا اتنا خیال کرتی کہ مجھے حیرت ہوتی تھی البتہ عابد سے بہت کم سامنا ہوتا شاید وہ ابھی تک شمرہ کی بے وفائی کا دکھ جمیل رہا تھا اس نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی تھی۔

ایک نیک عابد کی شادی کی اطلاع ملی اور پھر اس کی شادی کے موقع پر شمرہ کی پھوپھو، عابد کی اماں اور خود عابد کے انداز اور سلوک سے میرا شک متزلزل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اس روز ہاشم کے گھر دعوت میں اس کی گفتگو نے مجھے حیران پریشان کر دیا۔ بدگمانی اور شک کے اندھیروں نے میری اور شمرہ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ مگر یہ ہاشم اور اس کی بیوی کس آسانی سے ان اندھیروں سے بچ نکلے تھے اور ہاشم کس طرح صاف صاف بات کر رہا تھا۔ واقعی اگر اس کے دل میں چور ہوتا تو کیا وہ مجھ سے اس طرح بات کر سکتا تھا اور عابد! وہ بھی تو ایسی ہی بات کر رہا تھا۔ سنا تھا کہ صبا سے اس کی پسند کی شادی تھی۔

ہاشم اور عابد اپنی بیویوں پر کس قدر اعتماد کا اظہار کر رہے تھے۔ اور میں جس کی شادی کے ابتدائی سال انتہائی محبت اور اعتماد سے بھرپور گزر رہے تھے کہ پھر کسی کے بہکاوے میں آ کر اپنی ہی زندگی اجیرن کر ڈالی تھی۔

شمرہ نے بھی تو تقریباً یہی باتیں کہی تھیں، لڑکیوں کے رشتے آتے ہیں معنی بھی ہو جاتی ہے لیکن شادی وہیں ہوتی ہے جہاں مقدر ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان کا فیصلہ چل رہا ہوتا ہے۔

مجھے خیال آیا اماں اپنی ایک کزن کی بیٹی فرحانہ سے میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ فرحانہ کافی بولڈ اور پرکشش لڑکی تھی۔ اپنے والدین کی وسیع جائیداد کی اکلوتی وارث تھی وہ مجھے بھی اچھی لگی تھی پھر میری شمرہ سے شادی ہوئی تو فرحانہ بھول بھال گئی اگر اب کبھی شمرہ فرحانہ کے حوالے سے کوئی طعنہ دے تو مجھے کیسا محسوس ہوگا؟ خود احتسابی کے ان لحاظ میں، اپنا آپ بالکل بھی بے گناہ محسوس نہ ہوا۔

اس شب میں نے شمرہ سے کہا۔

”عابد اور صبا بھابی بہت خوش ہیں۔“ وہ خاموش رہی۔ میں جانتا تھا کہ یہ میرا ذکر تھا کیوں کہ میں اس کی ہر بات کا ان کا مطلب نکالتا تھا۔ میں نے مزید کہا۔

”ہاشم اور صبیحہ بھابی میں بھی بہت اندر اسٹینڈنگ ہے مگر میرا خیال ہے کہ ہم میں سب سے زیادہ محبت اور اندر اسٹینڈنگ ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھک رہے تھے۔

”پلیز! خدا کا واسطہ باہر۔“ آپ مجھے معاف کیوں نہیں کر دیتے۔ میں سچ کہتی ہوں۔“ اور میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مجھے تمہارا یقین ہے شمرہ! بس میں کسی کے بہکاوے میں آ گیا تھا اور خواہ مخواہ شک اور غصے کے تیروں سے تمہیں بھی چھلنی کیا اور خود بھی اذیت سہتا رہا۔ آدم اور حوا اپنی جنت میں بہت خوش تھے مگر شیطان سے ان کی خوشی برداشت نہ ہوئی اور وہ انہیں بہکانے آ گیا اور پھر جب آدم و حوا نے اپنے دشمن کو پہچان لیا اور اپنے رب سے اپنی غلطی کی معافی مانگی تو اس نے انہیں معاف کر دیا اور زمین پر خلافت عطا فرمائی۔ آؤ ہم بھی گزشتہ تمنائیاں بھلا کر اپنے گھر کی جنت کو سنواریں۔“

شرہ روتے ہوئے میرے شانے سے ٹک گئی میں نے اسے متاع گراں کی طرح سمیٹ لیا۔

☆☆☆

میرا نام نزہت ہے۔ شرہ میری چھوٹی بہن ثروت سے چند سال بڑی اور مجھ سے چھوٹی ہے۔ اس سے میرے دوہرے رشتے تھے۔ خالہ زاد اور پھر نندا نہ جانے کیسے میں بے اختیار اس سے مقابلہ کرنے لگی۔

ہاشم میرا ہم عمر تھا اگرچہ میرا رشتہ طارق سے طے تھا مگر میرے دل میں ہاشم کے نام سے ایک سریلا راگ ضرور محفوظ تھا۔ طارق بھی ایسے گئے گزرے نہ تھے مگر ہاشم ان سے بڑھ کر خوبو تھا۔ عورت مرد سے زیادہ حساس ہوتی ہے اس لیے میں نے ہاشم اور شرہ کے دل کے جذبے اور آنکھوں کی چمک پڑھ لی تھی۔ پھر شرہ کی چھوٹی اور اپنی ساس (چھوپو زنیہ) کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں اس کی عابد سے شادی کرنا چاہتی تھیں مگر شرہ راضی نہیں۔ مجھے شرہ کے نصیب پر رشک آیا۔ عابد بھی خوبصورت جوان تھا اور پھر شرہ کا باسی پڑھا لکھا۔

ادھر اماں چاہتی تھیں کہ ثروت اور ہاشم کا رشتہ ہو جائے، میری بھی یہی خواہش تھی۔ میں نہیں تو وہ میری بہن کا یہی نصیب بن جائے۔

پھر نہ جانے کیوں شرہ اور ہاشم کا رشتہ نہ ہوا بلکہ ہاشم نے اپنے ایک دوست کی بہن سے شادی کر لی۔ حالانکہ میں نے شرہ کی کتابوں میں ایک خط دیکھا تھا اور مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ ہاشم نے لکھا تھا۔ میں دل میں خوش ہوئی تھی کہ شرہ کو بھی ہاشم نہیں ملا۔ مگر اس کا نصیب ہمیشہ زور آور رہا۔ اس کی شادی باہر سے ہو گئی اور وہ بیاہ کر ملک سے باہر چلی گئی۔

اس کی بری دیکھ کر ہم حیران رہ گئے تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی اور نفیس چیز اور زیور شرہ کے لیے آیا تھا۔ میں بھی تو اسی کی خالہ زاد تھی۔ صورت شکل میں اس سے کم نہ تھی۔ پھر میری اور اس کی تقدیر میں یہ فرق کیوں تھا؟ اس کا شوہر باہر اس پر پروانے کی طرح نثار تھا۔ جب بھی ان سے سامنا ہوتا میرے دل کی ناتمام

خواہشیں جیسے پورے بدن میں اشتر پھیلنے لگتیں۔ طارق اگرچہ بہت نرم دل اور اچھے مزاج کے تھے مگر اپنی محبت کا یوں بے ساختہ اور کھلا اظہار نہیں کرتے تھے جیسے باہر، شرہ پر ہر دم نثار ہو رہا تھا۔ پھر خالہ یعنی طارق کی اماں جو باقی سب کے لیے تو بہت اچھی اور مہربان تھیں مگر میرے لیے ان کے پاس ہر وقت ہی کوئی نہ کوئی نصیحت تیار ہوتی۔

میری لاپرواہیاں، فضول خرچیاں انہیں تو یاد رہتی ہی تھیں طارق بھی جتنا نہ بھولتے اور ایسے میں جب ہاشم اور صبیحہ کی مثالیں دی جاتیں تو میں جل بھن کر رہ جاتی۔ ادھر شرہ بھی پاکستان آ گئی تو باہر کی تعریفیں میری جان جلا نے لگیں۔ اس روز موقع پا کر میں نے باہر کو شرہ، عابد اور ہاشم کے بارے میں کچھ جھوٹ سچ ملا کر سنا دیا۔ اتنا تو میں جانتی تھی کہ باہر کانوں کا کچا ہے اور پھر میں نے دیکھ لیا کہ باہر اور شرہ کے تعلقات میں دراڑیں آ گئی تھیں۔ شرہ کا بھجا چہرہ میری حاسد فطرت کو تسکین دے رہا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے صبیحہ اور ہاشم نے تو مجھے بہت شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ تھوڑا سا ڈر تو ضرور تھا کہ طارق کو خبر ہو گئی تو کیا ہوگا؟ نہ جانے کیسے ہاشم کو یہ خبر ہو گئی کہ میں نے باہر کو کچھ کہا ہے کیوں کہ اس روز اس نے مجھے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ اگر طارق کو خبر ہو گئی کہ اس کی بہن کو کون بے سکون کر رہا ہے تو کیا وہ اسے معاف کر سکے گا؟ میں گھبرا گئی تھی۔

آج شرہ اور باہر نے اپنے گھر میں عابد اور اس کی دلہن اور سب خاندان والوں کی دعوت کی تھی۔ دعوت کا انتظام بہت بڑے اور عمدہ پیمانے پر تھا کچھ چیزیں شرہ نے گھر پر تیار کی تھیں اور کچھ باہر سے منگوائی گئی تھیں۔ نوکر چاکر انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ جب کہ شرہ بہت خوبصورت سالاہاس پہنے، قیمتی اور نفیس زیورات سے جٹی، چمکتی دمکتی پھرتی پھر رہی تھی۔ ہاشم کی بیوی صبیحہ بڑی سی چادر میں سر تاپا ڈھکی ہوئی تھی خاندان کی تقریبات میں جب مرد بھی موجود ہوتے وہ ہمیشہ اسی طرح آتی تھی۔ طارق کی کسی بات کے جواب میں ہاشم کہہ رہے تھے۔

”ہاں طارق بھائی! اللہ کا شکر ہے کہ صبیحہ کی وجہ سے میں مذہب سے زیادہ قریب ہوا اور حج کی سعادت نصیب ہونے کے بعد تو واقعی میری زندگی میں خود بخود تبدیلیاں آ رہی ہیں۔“

”یار دعا کرو کہ اللہ یہ سعادت ہمیں بھی نصیب کرے پچھلے کئی سال سے پروگرام بنا رہا ہوں مگر ہر سال ہی کچھ نہ کچھ مسئلہ ہو جاتا ہے۔“ طارق کی بات پر اس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

”نزہت بھابی اور آپ دعا کرتے رہیں۔ طلب اور لگن سچی ہو تو خود بخود اسباب بنتے ہیں اور رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔“ اس کا باریش چہرہ واقعی پہلے سے مختلف اور شاید زیادہ خوبصورت ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ گئی کہ مجھے اپنے قریب بابر کی آواز آئی۔

”نزہت بھابی! آپ نے کھانا ٹھیک سے لیا یا نہیں؟“
 ”شکریہ! بہت اچھا ہے کھانا اور میں نے سب کچھ لیا بھی ہے۔“ میں مسکراتے ہوئے بولی تو وہ ذرا دہلی لیکن صاف آواز میں گویا ہوا۔

”میں نہیں جانتا آپ کی شمرہ سے کیا دشمنی ہے اور آپ نے مجھے اپنی سیدھی باتیں بنا کر ہم میاں بیوی کو لڑانے کی کوشش کیوں کی، مگر خدا کا شکر ہے کہ ہاشم اور عابد نے مجھے سچ اور جھوٹ کا فرق سمجھا دیا۔ وہ دونوں بھی آپ کی حرکتوں پر حیران ہیں۔ آخر دوسروں کے سکون اور خوشیوں کو برباد کر کے آپ کو کیا تسکین ملتی ہے؟ اتنا اچھا شوہر، گھر بچے، عزت، سکون اور دولت سب کچھ میسر ہوتے ہوئے بھی آپ یہ سازشیں کیوں کرتی پھرتی ہیں۔ اگر شمرہ کو آپ کا یہ روپ نظر آ جائے اور شاید کچھ اندازہ تو اسے ہے بھی۔ پھر سب سے بڑھ کر اگر طارق یہ سب جان جائے تو اس کے دل میں آپ کی کیا عزت رہے گی؟“ بابر یہ سب کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ میں سن سی کھڑی تھی کہ ثروت نے آکر میرا ہاتھ تھام لیا۔

”نزہت آپ! یہ بابر بھائی کیا کہہ رہے تھے۔ کیا یہ سب سچ ہے؟“ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ کہنے کے لیے میرے

پاس تھا ہی کیا؟ وہ خود ہی کہنے لگی۔
 ”انسان کی یہ فطرت ہے کہ ہر خوبصورت اور اچھی شے وہ اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے مگر ضروری نہیں کہ اس کی یہ خواہش پوری ہو ہر ایک کو وہی کچھ ملتا ہے جو اس کے مقدر میں رقم ہوتا ہے۔ اماں کی خواہش تھی کہ ہاشم بھائی ان کے داماد بنیں مگر یہ اللہ کو منظور نہ تھا ہم سب کو فراخ دلی سے اللہ کے فیصلے ماننے چاہیں۔

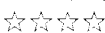
بچپن میں کہانی پڑھی تھی نا۔ کہ بھلا، ہو بھلا تو پھر ہم دوسروں کے راہ میں کانٹے بکھیر کر اپنے لیے پھولوں کی خواہش کیوں کر کر سکتے ہیں۔ آپا کا شرف سے میری ابھی منگنی ہوئی ہے مگر میں نہیں چاہتی کہ میری کسی حرکت سے اس کے دل میں میرے لیے نفرت پیدا ہو، تو کیا آپ کو یہ خدشہ نہیں کہ طارق بھائی کیا سوچیں گے؟ آخر آپ کے پاس کس چیز کی کمی ہے یا دوسروں سے کیا دشمنی ہے جو آپ یہ سب کچھ کر رہی ہیں؟

”چپ ہو جاؤ ثروت۔ چپ ہو جاؤ۔“ میں چیخی۔
 ”میں تو خاموش ہو جاتی ہوں۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”مگر آپ! آپ سوچیں تو یہ حسد، یہ کینہ، یہ بلا وجہ کی دشمنیاں، بدگمانیاں ایسے موزی امراض ہیں جو ہماری زندگیاں تباہ کر دیتے ہیں۔ مختلف امراض سے بچنے کی ویکسین ہوتی ہے اسی طرح ان امراض سے بچاؤ کے لیے اپنے دل اور روح کو قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کا ٹانک دینا چاہیے۔“ میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”یہ باتیں تم نے کہاں سے سیکھیں؟“

”صبیحہ بھابی سے۔ اس جمعے کو آپ بھی میرے ساتھ ان کے گھر چلے گا۔ ہر جمعے کو وہ مختصر سا لیکچر دیتی ہیں اور مبینے میں ایک بار لاہور سے ایک عالمہ درس دینے آتی ہیں۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا۔ صبیحہ بھابی نے بھی پیغام بھیجا تھا مگر آپ نہیں آئیں۔ اب تو آئیں گی نا۔“

میرا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔



اس کے زخم ہرے تھے لیکن آنکھوں
میں آس کے دیے ٹھہرے تھے۔
اور پھر ایک دن قدرت نے چراغاں کر ہی دیا۔

ایک گھر کی کہانی جہاں غلط فہمیوں کے دھوئیں نے ہر منظر دھندلا دیا تھا



ترسا جس وجود کی قربت کو عمر بھر
وہ مل گیا تو اور بھی تنہائی بڑھ گئی!!

طبیعت تو میری پچھلے کئی دنوں سے ایسے ہی مکدر سی
بورہی تھی۔ ایک عجیب سا جوہل پن، ایک کثیف سا
کندھا ڈھونڈ رہا تھا۔
دل یونہی خود ترسی کا شکار ہو رہا تھا، یہاں اس اجنبی
شہر میں میرا اپنا تو کوئی بھی نہیں سوائے ان دو قبروں کے
احساس تھا جو رونے کے بے سبب بہانے بنائے کوئی

جہاں مجھے جنم دینے والے خود گہری نیند سو رہے ہیں۔
 سسرال والوں کے معمول کے طعنیہ جملے بھی
 ”معمول“ سے زیادہ محسوس ہو رہے تھے۔ میرے میاں
 جو سدا کے لاپرواہ ہیں ان کی لاپرواہیاں کچھ زیادہ ہی
 محسوس ہو رہی تھیں۔ میری تو کوئی پروا ہی نہیں کہ میں
 یہاں کتنی اکیلی ہوں۔ کوئی رشتہ دار نہیں کوئی اپنا نہیں،
 پھر بیمار ہوں ان کے گھر والے کتنا برا سلوک کرتے ہیں
 میرے ساتھ، کتنے صبر کے ساتھ برداشت کرتی ہوں
 مجال ہے جو کبھی پاس بیٹھ کر حوصلہ دیا ہو کوئی خوبصورت
 سا جملہ بھی زاد راہ کر دیا ہو کہ دن بھر حوصلہ دیتا رہے۔
 جب بھی بات کر س گے دل جلانے والی ہی کریں گے
 کہ کڑھتی رہو اور رختی رہو۔ ہاں ان مردوں کو فرق بھی
 کیا پڑتا ہے اور لے آئیں گے بس اسی طرح کے
 احساسات تھے میرے جنہوں نے مجھے آج کل گھیر رکھا
 تھا۔

پہلے پہل تو میں نے اسے اپنی پیاری کا باعث جانا
 کہ کچھ دنوں سے بخار ہو رہا تھا۔ شاید بیماری سے
 نڈھال ہو کر میں کچھ پڑ پڑی ہو رہی ہوں۔ خود ہی خود
 کوتسلیمیں دیتی اپنا محاسبہ کرتی لیکن کوئی نہ کوئی بات ایسی
 ہو جاتی جو مجھے دوبارہ اسی منتشر اور ذہنی تناؤ کے الاؤ میں
 جھونک دیتی۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے اب تک کھینچی گئی
 میری تصویر سے کہ یہ کتنی بے چاری دکھوں کی ماری کی
 تصویر ہے۔ سوری یوں کہیے کہ ”رام کتھا“ ہے۔ جی نہیں
 ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میرے میاں ایک بہت بڑے
 انڈسٹریلسٹ ہیں دو فیکٹریز کے مالک ہیں۔ میرا اپنا
 ذاتی بنگلہ بھی تکمیل کے مراحل میں ہے۔ اللہ نے مجھے دو
 اتنے پیارے بچے عطا کیے ہیں کہ ہر دکھ ان کی صورت
 میں بھول جائے۔ دو کام والیاں ہر وقت گھر میں موجود
 رہتی ہیں۔ ہر آسائش میسر ہے مجھے۔

میرے میاں ٹھیک ہیں پر لاپرواہ ہیں، سوٹ دلا دیا
 تو دوپٹہ لانا بھول گئے، وہ نہیں کہتے جو میرا دل سننا چاہتا
 ہے، وہ نہیں سنتے جو میرا من کہنا چاہتا ہے۔ جب کہ

میں ٹھہری شاعرانہ ذوق رکھنے والی، خواب بننے والی
 رنگوں، خوشبوؤں کی باتیں کرنے والی جب کہ وہ بزنس
 کی دنیا کے باسی۔ مگر اتنے بڑے بھی نہیں، مجھے معلوم
 ہے مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آخر اتنی خواری کے
 بعد تو ملی تھی میں انہیں۔ ایک ایسی احساس یہ فخر عورت
 کے ساتھ تادم مرگ چلتا ہے کہ میں ”من چاہی“ ہوں۔
 پھر یہ ہے کہ کبھی کبھار میرے ساتھ بیٹھ کر ڈائجسٹ کا
 کوئی افسانہ یا ”عمیرہ جی“ کا کوئی ناول سن لیتے ہیں۔
 شعر و شاعری بھی کبھی کبھار برداشت کر لیتے ہیں اور
 باقی ان کی لاپرواہیاں میں برداشت کر لیتی ہوں۔ رہے
 سسرال والے وہ تو زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہیں خاص
 طور پر اگر میاں اچھا ہو، اپنی بیوی کے ساتھ تو.....

اس شہر میں میرا اپنا کوئی رشتہ دار نہیں نہ ننھیال نہ
 دو دھھیال، بہن بھائی سب لاہور میں ہیں۔ امی ابو
 جلدی جلدی آگے پیچھے ہمیں چھوڑ کر چل دیے۔ میں
 بیاہ کر خیر سے بھرے پرے سسرال میں آئی ہوں۔
 جہاں چار نندیں اور دو بھائی ہیں۔ سب قریبی رشتہ
 داروں میں چپائی ہوئی اور قریب ہی رہتی ہیں۔ اس
 لیے ہر دم گہما گہما رہتی ہے اور اس جھوم میں میں اور بھی
 اکیلی ہو جاتی ہوں کہ میرے میاں اور بعض اوقات بچے
 بھی اسی میں ”گم“ ہو جاتے ہیں۔

خیر بات ہو رہی تھی اس تناؤ کی، ان منتشر و تلخ
 احساسات کی جنہوں نے آج کل مجھے الجھا رکھا تھا۔
 بلکان کر رکھا تھا اور میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تو بس
 یہی وہ باتیں ہیں جو بعض اوقات مجھے بہت اداس کر
 دیتی ہیں۔ میں نے بھی اسے وقتی کیفیت سمجھتے ہوئے
 خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا کہ کچھ دنوں
 تک خود ہی سب کچھ سچ ہو جائے گا۔

اس دن میں اپنی بیٹی کو سکول روانہ کر کے فارغ
 ہوئی تو پاس پڑی چیئر پر بیٹھ کر نیک لگا لی اور آنکھیں
 موند لیں۔ صبح آٹھ بجے کا ناٹم تھا۔ بیڈ روم میں ابھی بھی
 تاریکی اور خنکی کا احساس تھا کیونکہ اسے سی چل رہا تھا۔
 دروازہ بند تھا اور کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے

غزل عید

ہر شے سے تیرے نام، تجھے عید مبارک
اے شہرہ گل فام، تجھے عید مبارک
میں ہوں کہ سلگتی ہوئی راتوں کا بھرم ہوں
اے نکھری ہوئی شام، تجھے عید مبارک

تو اوج ثریا پہ چمکتا ہوا لمحہ
میں اب بھی لب بام، تجھے عید مبارک
میں ہجر کے لمحوں میں تڑپتا ہوا پنچھی
کہتا ہوں سر عام، تجھے عید مبارک

ہم اپنے لیے در پے الزام ہیں ساجد
اے باعث الزام، تجھے عید مبارک
(ملک عاشق حسین ساجد، ہندوستانی)

باتیں ایک دوسرے سے کہہ لیتی ہیں۔

ان کی ٹیلی کا ج پر جانے کا پروگرام بن رہا تھا مگر
مسئلہ ان کا آٹھ سالہ بیٹا روی تھا۔ جو سکول کی وجہ سے
نہیں جاسکتا تھا۔ مسز حبیب کا بھی میکہ میں کوئی ایسا
نہیں تھا اور سسرال میں وہ خود بچے کو چھوڑ کر جانا نہیں
چاہ رہی تھیں۔ ان کے گھر کے سبھی افراد چ پر جا رہے
تھے۔ میں نے انہیں آفر کی کہ بچے کو میرے پاس چھوڑ
جائیں میرے بچوں کے ساتھ وہ کافی مانوس بھی ہے
یہاں وہ آرام سے رہ لے گا وہ میری آفر پر بہت خوش
ہو گئیں لیکن پھر کہا کہ گھر سے اجازت لے کر بتاؤں
گی۔

اگلے دن آئیں تو بڑی پر جوش لگ رہی تھیں کہنے
لگیں ساس اور میاں جو خوشی مان گئے ہیں۔ میری ساس
کو اور تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ سوائے روٹی کے کتے

تھے۔ میرا بیٹا اور اس کے پاپا گہری نیند سو رہے تھے۔
بہنی ڈرائیور کے ساتھ سکول جا چکی تھی۔ کام والی نے
باہر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

ان دونوں کے دس بجے سے پہلے اٹھنے کا کوئی
امکان نہیں تھا۔ میں نے سوچا میں بھی کچھ دیر لیٹ
لوں۔ چنانچہ اپنے تھکے تھکے مذہال اعصاب اور بدن
کے ساتھ میں اپنے بیڈ پر آئی ہی تھی کہ فون کی بیل بج
اٹھی۔

میں نے اٹھ کر فون اٹھایا تو خلاف توقع میرا
بھائی اور بھائی الماں پر تھے۔ بھائی کے گھر کسی نئی اور
متوقع قافلاری کے خیال سے بی میرا دل دھڑک اٹھا۔
کچھ دیر ان سے بات ہوتی رہی بھائی نے چیک اپ
کے لیے آج جانا تھا۔ بس اسی سلسلے میں مجھ سے مشورہ
کر رہی تھیں۔ ان کا فون سننے کے بعد میں واپس بیڈ پر
آ بیٹھی اپنی آنکھیں موند لیں اور طہانیت سے ایک
طویل سانس کھینچی اور جیرانی سے اپنی سرخوشی کی کیفیت کو
محسوس کیا۔ کچھ لمحے پہلے کی پشیمانی و مایوسی جیسے ہوا ہو
گئی تھی۔ یہی خنکی و تاریکی جو چند لمحے پہلے مجھے اپنا
مقدر لگی تھی۔ اب اس میں سوائے ہونے میرے میاں
اور میرا بیٹا مجھے بہت واضح نظر آنے لگے تھے۔

یہ خنک و تاریک ماحول میرے اعصاب کو سکون
بخش رہا تھا۔ میں خود پہ حیران رہ گئی تھی تو کیا میں ان
لوگوں کو یاد کر رہی تھی۔ ان کے لیے اداس بھی کیا، یہ
سب اسی لیے تھا۔ میں خود ہی تو کچھ وجوہات کی بناء پر
لاہور جانے سے انکار کرتی رہی تھی اور چچیوں میں بھی
نہیں گئی تھی۔ اپنی متغداد کیفیات خود میری سمجھ سے باہر
تھیں۔ خیر میں سر جھٹک کر لیٹ گئی اور سچ بچ تھوڑی ہی
دیر میں بہت سکون سے گہری نیند سو گئی۔

☆.....☆.....☆

ہمارے گھر کے سامنے جو مسز حبیب رہتی ہیں وہ
میری بڑی اچھی دوست ہیں ان کی ساس کے میری
ساس کے ساتھ بہت پرانے تعلقات ہیں۔ ہمارے
بہت سے دکھ سکھ سانچے ہونے کے باعث ہم بہت سی

کے۔ جی ہاں اس کے پاس ایک چھوٹا سا کتا تھا جسے سب "Pommy" کہتے تھے۔ خیر میں نے انہیں کسی طور راضی کر ہی لیا۔

وہ لوگ چلے گئے، بچے میرے پاس رہنے لگا۔ اس کا دل لگ گیا تھا۔ بچوں کے ساتھ کھیلا رہتا تھا۔ میری بیٹی اور اس کا سکول اور یوشن ٹیچر ایک ہی تھے۔ اس لیے اسے ایڈ جسٹ ہونے میں زیادہ وقت نہ ہوئی۔

ابھی پندرہ دن ہی گزرے تھے کہ میں نے محسوس کیا کہ بچہ بعض اوقات کھوسا جاتا ہے۔ والدین کی کمی ایک فطری سی بات ہے حتیٰ کہ وہ معصوم سا جانور بھی مجھے کچھ پریشان اور اداس محسوس ہوا۔ حالانکہ اپنے مالک کے ساتھ تھا میں نے اپنے میاں سے تذکرہ کیا تو کہنے لگے:

”تمہیں تو عادت ہے ہر کسی کے فکر اور غم میں مبتلا ہونے کی خود بھی پریشان رہتی ہو، اب تمہیں وہ کتا پریشان لگنے لگا ہے۔“

میں کڑھ کر ان کے پاس سے اٹھ گئی کہ آپ کبھی میرے احساسات نہیں سمجھ سکیں گے۔ بہر حال میں ان دونوں کا یعنی روٹی اور پیٹی کا زیادہ خیال رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس دن مجھے روٹی کی کچھ چیزوں کے سلسلے میں ان کے گھر جانا پڑا چایاں وہ لوگ مجھے ہی دے گئے تھے۔ ساتھ ہی میں نے سوچا کہ گھر کی صفائی بھی کروادوں گی۔ چنانچہ میں، میری کام والی، روٹی، بمعہ پیٹی اور میرے دونوں بچے ایک چھوٹے سے قافلے کی صورت، سڑک کے اس پار سامنے والے گھر کی جانب چل پڑے۔ میں نے گھر کا دروازہ کھولا کافی گند پڑا ہوا تھا۔ روٹی اور پیٹی بڑی بے قراری سے مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے۔ ان کی بے قراری کو محسوس کر کے میں حیران ہی ہو گئی۔ اندر داخل ہونے پر میں نے دیکھا کہ وہ دونوں بڑی بے قراری اور خوشی و جوش کے ساتھ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ پیٹی بھی اپنی دم بلاتے ہوئے روٹی کے پیچھے پیچھے

تھا۔ وہ ایک ایک کونے کو سونگھ رہا تھا۔ پھر وہ اپنے پیالے کی طرف دوڑ کر گیا پھر روٹی کو پیٹ سے کھینچ کر اپنے Kennel House کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ اور روٹی وہ تو اپنی ایک ایک چیز اس جوش کے ساتھ مجھے دکھا رہا تھا جو میں بار بار پہلے بھی دیکھ رہی تھیں۔

ایک کھٹ کی آواز کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا اور مجھے کچھ روز پہلے والی اپنی سرخوشی کی وجہ سمجھ آ گئی۔ یہ وہی کیفیت تو تھی جس سے آج روٹی اور پیٹی دو چار تھے۔ عورت جس گھر کو چھوڑ آتی ہے وہ اپنی خوشبو کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں ہمیشہ تروتازہ رہتا ہے۔

پیٹری اگتی تو اور جگہ ہے..... لیکن پھل پھول دوسری زمین پر آتے ہیں اسی طرح عورت مکمل اس دوسرے گھر میں ہوتی ہے جو حقیقت میں اس کا اپنا گھر ہوتا ہے، جہاں وہ صحیح معنوں میں نکھر کر ایک عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے، اپنے مرد کی عورت ماں بنتی ہے اور تکمیل کے مراحل سے گزرتی ہے مگر پھر ہر رشتہ پس پردہ چلا جاتا ہے۔

لیکن میکے سے آنے والی ہوائیں بھی اسے خوشی اور طہائیت کا احساس دلا جاتی ہیں جب وہ بوڑھی بو جاتی ہے تو گھر کے کمپنیں بدل جاتے ہیں۔ مگر وہ گھر جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی، گڑیاں کھیلی تھیں ایک نئے گھر جانے کے احساس نے انگڑائی لی تھی۔ اس گھر سے آنے والی کوئی بھی خبر اسے اسی کیفیت میں لے لیتی ہے۔ جیسے وہ اب بھی ساری ماحول کا حصہ ہو۔

یہ کیسا رشتہ ہے؟ جیسے پیٹری کا اپنی مٹی سے، ناموجود سے وجود میں آنے کا رشتہ۔ پہلے گھر کا رشتہ، ماں کی گود کا رشتہ، وہی رشتہ جو پیٹی اور روٹی اس گندے مندے اور خالی گھر میں آ کر محسوس کر رہے تھے اور جس نے انہیں ایک عجیب سی خوش اور مستی سے دو چار کر دیا تھا۔ میں آج بھی سمجھ نہیں سکی اس رشتے کو، آپ سمجھ جائیں تو مجھے ضرور بتائیے گا!

☆.....☆.....☆

انوکھا پندھن

محمد سلیم اختر

محبت کرنے کے بھی انداز ہوا کرتے ہیں۔۔۔
 جذبات اگر اظہار کا ذریعہ نہ بنیں تو دونوں طرف کی خاموشی
 دلوں میں قد و رتیں پیدا کرنے لگتی ہے یہاں تک کہ یہی
 بڑھتے ہوئے فاصلے ایک جان لوگوں کو بھی اجنبی بنا دیتے ہیں۔

عید کے حوالے سے خصوصی تحریر صرف قارئین ریشم کے لیے



رہزن ہو تو حاضر ہے متاع دل و جاں بھی
 رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے

ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا شوہر صرف اور صرف اسی کا ہو..... اور اس کے سوا وہ کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ اسی طرح مرد کی بھی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اس کی بیوی شیشے کی ایسی چار دیواری میں رہے۔ جس پر کسی کی انگلی کے نشان تو کیا کسی کی نظر کا عکس بھی نہ پڑے۔

ہر لڑکی کے دل میں ایک حسرت ہوتی ہے ایک جذبہ..... ایک خواب..... ایک امنگ اور ایک ترنگ ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر مستقبل کا ہیولہ ہوتا ہے۔ پوری زندگی کی قربانی اور وفاداری ہوتی ہے۔ ایک ہم عمر باوقار شوہر اور معاشرے میں عزت اور مقام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر سوکن اور ناپسندیدہ ساتھی برداشت نہیں کر سکتی اسے با وفا اور چاہنے والا شوہر نہ ملے تو اس کی زندگی ابیران ہو جاتی ہے۔ شک کا معمولی سا عنصر جیون بھر کی وفاؤں کو بیل بھر میں روند ڈالتا ہے.....

میں بھی ان ہی عورتوں میں سے ایک ہوں..... بس کبھی بڑی ہی خوشحال اور پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ اپنا گھر تھا۔ پیار کرنے والا شوہر تھا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ شادی سے قبل بھی میں نے والدین کے گھر میں سکھ ہی سکھ دیکھا تھا۔ کوئی غم اور کوئی فکر نہ تھی.....

☆.....☆.....☆

شازیہ میری کالج کے وقت کی دوست تھی ہم ایک دوسرے کی ہمراز تھیں اور ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ شازیہ اپنے کزن شامد سے محبت کرتی تھی۔ جو کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ شازیہ اکثر اس کا ذکر کرتی اور اس کے محبت نامے اور تصاویر مجھے دکھاتی تھی۔ مگر مجھے ان چیزوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے اپنی تعلیم سے غرض تھی۔ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ خوبصورت نظارے، پھول اور خوشبوئیں میری کمزوری تھیں۔ شازیہ کی باتیں سن سن کر میں بھی اسی

کے رنگ میں رنگنے لگی اور میں بھی آئینہ بیل کے خواب دیکھنے لگی۔ میرے اندر بھی یہ تڑپ پیدا ہو گئی کہ کوئی مجھے چاہے اور میں اسے چاہوں۔ جوانی کا دور ہی ایسا ہوتا ہے کہ آنکھیں لیشلی ہو جاتی ہیں..... لبوں پر رس آنے لگتا ہے۔ چال میں بانگن آ جاتا ہے۔ میں بھی ایسے ہی جذبات کے تصور میں الجھ گئی چاندنی راتیں اور بھی حسین لگنے لگیں۔ من میں ہر لمحہ اک آگ سی جلنے لگی۔ مگر میں پھر بھی پڑھائی سے غافل نہ ہوئی۔ مجھے کوئی بھی من کا میت نہ ملا۔

ہم نے تعلیم مکمل کی اور کالج کو خیر آباد کہہ دیا۔ کچھ عرصہ بعد شازیہ کی شادی طے پا گئی۔ اس کی شادی شامد کے ساتھ تھی۔ ہیوری تھی۔ اور وہ بہت خوش تھی اس نے مجھے ایک ہفتہ قبل ہی شادی والے گھر پہنچ جانے کی تاکید کی تھی۔ مگر مجھے گھر والوں سے اجازت نہ ملی۔ اور میں صرف اس کے ولیمہ میں شرکت کر گئی۔

شازیہ کا ولیمہ عید الاضحیٰ کے دو دن بعد تھا..... میں اپنی امی کے ہمراہ اس کے ولیمہ میں شرکت کرنے گئی تھی۔ اس موقع پر شازیہ نے میرا تعارف اپنے ایک دور کے کزن سے کرایا۔ جس کا نام نوید تھا۔ وہ کسی سرکاری ادارہ میں انتہی پوسٹ پر ملازم تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو سلام کیا..... نوید کو سلام کا جواب دے کر ایک طرف چلا گیا..... مگر میرا دل تو دھڑکنے لگا بھول گیا..... نوید کو دیکھ کر یوں لگا کہ جیسے یہی میرے پریم کا سنگم اور میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔ میرے دل کے ویرانے میں اچانک ہی بہار آ گئی۔ ایسے جیسے خزاں میں رنگ رنگ پھول کھل اٹھے ہوں، جیسے پیاسی دھرتی ابر رحمت سے سیراب ہو گئی ہو.....

میں نے مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور شازیہ پر اپنی کیفیت ظاہر نہ ہونے دی اور گھر لوٹ آئی۔ مگر میں نوید کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ بھلا سکی۔ ایسا لگتا تھا جیسے نوید میرے لیے اور میں نوید کے لیے پیدا کی گئی ہو۔ مجھے نوید کے بغیر جیون ادھورا سا لگنے لگا..... مجھے اب شازیہ کے واپس منیہ آنے کا انتظار

تھا..... ایک ہفتہ بعد وہ میکے آئی تو اس نے خود ہی مجھے گھر بلا لیا..... میں اس سے ملی تو وہ بہت ہی خوش لگ رہی تھی۔ اس کے دو مہینے روئیں سے سر تھیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں اس سے نوید کے متعلق بات کرنا چاہتی تھی مگر ہمت نہ کر پارہی تھی۔

باتوں باتوں میں شازیہ کہنے لگی۔
”بتول! اب تم بھی تیاری کر لو۔“

”کس بات کی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”شادی کی اور کس بات کی۔“ شازیہ برجستہ بولی۔

”نہیں شازیہ ابھی نہیں۔ میرے اتنے اچھے نصیب کہاں؟“ میں نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔

”میری جان..... تمہارے نصیب جاگ اٹھے ہیں..... وہ جو بے ناں نوید! میرا کزن تمہارا دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تم اس کے احساسات پر چھان گئی ہو۔“

شازیہ کی زبان سے نوید کی مجھ سے چاہت کا سن کر میرے اندر خوشیوں کی برسات سی ہو گئی۔ میں نے شازیہ کو بتایا کہ میں بھی نوید کو چاہنے لگی ہوں..... مگر میں اس سلسلہ میں بیان نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس سے ملاقات کروں گی۔

مگر شازیہ نہ مانی..... اس نے اپنے ہی گھر میں میری اور نوید کی ملاقات کروادی۔ نوید اور میں نے محبت کا قول اور اقرار کیا۔ نوید نے بتایا کہ وہ اس دنیا میں صرف دو بہن بھائی ہیں۔ وہ ابھی دو ماہ کا تھا کہ اس کی ماں فوت ہو گئی تھی۔ اس کے باپ نے اولاد کو سونپنی ماں کے حوالے نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دوسری شادی نہ کی..... نوید اور اس کی بہن کی پرورش اس کی خالہ نے کی تھی۔ اس وقت وہ گاؤں میں رہتے تھے..... جہاں ان کا گھر اور ڈھیروں زمین ہے۔ نوید جب آٹھ سال کا ہوا تو وہ باپ کی شفقت سے بھی محروم ہو گیا..... اس کی خالہ اور خالو نے اس کی ہر عمل بد اور دلجوئی کی..... گاؤں کے سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے

کے بعد وہ شہر آ گیا۔ جہاں اس نے کالج میں داخلہ لیا اور ساتھ ہی پارٹ ٹائم جاب بھی کرنے لگا۔ اس نے دل لگا کر پڑھا اور محنت کی..... اور آج وہ ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس کی ایک بی بہن تھی جس کی اس نے شادی کر دی تھی۔ جو اب ایک پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے خالو اور خالہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ پھر بھی وہ گاؤں کا چکر ضرور لگاتا تھا۔ گھر اور زمین اس نے گاؤں میں کچھ لوگوں کے حوالے کی ہوئی تھی۔

شہر میں اس نے ایک فلیٹ خرید رکھا تھا۔ جہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا..... وہ جوان تھا، حسین تھا، دولت مند بھی تھا۔ کئی لڑکیاں اسے چاہتی تھیں مگر وہ کسی کو بھی نہ چاہتا تھا۔ وہ اعلیٰ کردار کا مالک تھا۔ اس لیے وہ خواہواہ کسی حسینہ کو اپنے جال میں پھنسا کر اسے برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ جس کو اس نے اپنے من میں بسایا تھا.....

☆.....☆.....☆

نوید کی صاف اور کھری باتوں نے مجھے اس کا گرویدہ بنا دیا۔ اور میں نے اس کی چاہت کا اقرار کر لیا۔ میں اور نوید وہ دنوں ہی خوش تھے کہ خوشیاں ہمارے دامن میں سمٹ آئی ہیں.....

نوید کی بہن اسی شہر میں رہتی تھی۔ اس نے مجھے اپنی بہن سے ملوایا تو اس نے بھی نوید کی پسند کی داد دی..... نوید نے مجھے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ میں پارکوں، باغوں اور ہوٹلوں میں ملنے کا قائل نہیں ہوں۔ بس تم میری پسند ہو، میری زندگی ہو، میں تمہیں مان دوں گا اور تمہیں میرے مان کا بھرم رکھنا ہو گا۔ میں جلد ہی اپنی بہن کے ہمراہ تمہارے گھر تمہارا ہاتھ مانگنے آؤں گا۔ اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں بتا دینا۔ امی کو منانا اور قائل کرنا اب تمہارا کام ہے۔

اپنے ماں باپ سے نوید کے پارے میں بات کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ میں ڈرتی تھی کہ کہیں وہ مجھے غیرت میں آ کر مار ہی نہ ڈالیں۔ اس لیے میں

ماں ہی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ان کو اپنی بہت کی کہانی سناؤں اور اپنی خواہش کا اظہار کروں۔ یوں ہی چند دن گزر گئے اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی اور ہر نوید مسلسل زور دے رہا تھا کہ وہ کس دن اپنی ماں کو میرے گھر بھیجے۔

بالآخر میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ اپنی بہن کو میرے گھر بھیج دے۔ مگر خود ساتھ نہ آئے۔ ایسا ہی ہوا۔ اس کی بہن میری سہیلی شازیہ کے ہمراہ میرے گھر آ گئی۔ شازیہ کو تو میرے گھر والے خوب جانتے تھے۔ اس لیے ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ مگر جب نوید کی بہن نے اپنے بھائی کے لیے میرا رشتہ مانگا تو میرے والدین نے صاف انکار کر دیا کہ بتول کی منگنی بچپن میں ہی برادری میں طے پا چکی ہے۔ نوید کی بہن مایوس اور ناکام لوٹ گئی۔

ان کے جانے کے بعد تو میری شامت آ گئی کیونکہ نوید کی بہن نے میرے گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ نوید اور بتول ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ امی، ابا اور بھائیوں نے مجھے خوب برا بھلا کہا کہ میں عشق کا کھیل، کھیل کر خاندان کی عزت نیا م کر رہی ہوں۔ مجھے طرح طرح کے القابات سے نوازا گیا۔ مگر میں خاموش رہی۔ لمحوں میں میرا وقار خاک میں مل گیا۔ میں تنکوں کی طرح ہلکی ہو گئی جب گھر والوں کی نظر میرے اوپر ہر بھری باتیں حد سے بڑھیں تو میں برداشت نہ کر سکی اور میں نے کہہ دیا:

”ہاں میں نوید سے محبت کرتی ہوں۔ میری محبت ہوس اور آلودگی سے پاک ہے۔ اگر تم لوگوں کی نظروں میں محبت کرنا جرم ہے تو پھر میں یہ جرم زندگی بھر کرتی رہوں گی۔ میری شادی ہوگی تو صرف نوید سے۔۔۔۔۔“

ورنہ پھر حالات کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔۔۔۔۔“ میں غصہ اور جذبات میں آ کر بولتی چلی گئی۔ میں یہ بھول گئی تھی کہ میرے مخاطب صرف میرے بھائی ہی نہیں والدین بھی ہیں۔ جو زمین پر بزرگی اور شفقت کا روپ ہوتے ہیں۔ میری یہ جرات دیکھ کر میرے

بھائیوں نے مجھے روٹی کی طرح دھنک ڈالا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ نہ جانے کب مجھے ہوش آیا۔ گھر والوں نے مجھ سے نگاہیں پھیر لیں۔ ہر کوئی مجھے نفرت اور حقارت سے دیکھنے لگا۔ یوں جیسے میں ان کا خون ہی نہیں ہوں۔ مگر ان کی نفرتوں نے میری محبت کو اور بھی جلا بخشی۔۔۔۔۔ میں نے بھی عہد کر لیا کہ گھر والے مجھ پر جتنی بھی سختی کریں گے نوید کا نام لے لے کر ان کو ستاتی رہوں گی میرا گھر سے باہر جانا بھی بند کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ مجھ سے کوئی بات کرنا بھی گناہ سمجھا جانے لگا۔

مگر میں نوید کی محبت کو دل سے نہ نکال سکی۔۔۔۔۔ میں نے نوید کو خط لکھ کر معذرت کی تھی اور اسے اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کا بھی بتا دیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر میرے گھر والوں نے میری خواہش کی تکمیل نہ کی تو میں اس کی خاطر گھر کی دہلیز عبور کر لوں گی۔ میں تمام رشتوں کو چھوڑ کر تمہارے ہمراہ دنیا کے دوسرے کونے میں چلی جاؤں گی۔ مگر تمہارا ساتھ کسی قیمت پر نہ چھوڑوں گی۔ اب میں تمہارے حکم کی منتظر ہوں۔ مجھے وقت اور جگہ لکھ دو میں تمام دیواریں پھیلاؤں گے۔

☆☆☆☆

شازیہ کو کبھی میرے گھر والوں کا رویہ اور رشتے سے انکار کا انداز ناگوار نہ لگا رہا تھا۔ میری بچپن میں منگنی کا ذکر بھی حقیقت نہ تھی۔ میری کسی سے بھی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے شازیہ میری مدد اور حمایت کر رہی تھی۔ اور میرے اور نوید کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ تھی۔ جب اس نے نوید کو یہ بتایا کہ میں اس کی خاطر گھر چھوڑنے کو تیار ہوں۔ تو نوید نے میرے اس فیصلہ سے اتفاق نہ کیا۔ اس نے میرے نام ایک نامہ بھیجا۔ جس میں لکھا تھا۔

”بتول! مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ تم کو مر کر بھی نہ بھلا پاؤں گا کیونکہ تم میرے دل کی دھڑکن ہو۔۔۔۔۔ میرے خیوں کی چاندنی ہو، مگر اس محبت کو پانے کے لیے جو انداز تم اختیار کرنا چاہتی ہو۔ وہ انداز انسانیت اور

شرافت کی موت ہے..... اپنی آرزوؤں کو کون بامراد نہیں دیکھنا چاہتا۔ کون ہے جو محبت میں ناکامی کا خواہش مند ہو۔ مگر جو طریقہ محبت میں سرخرو ہونے کا تم اپنانا چاہتی ہو وہ انسان کی پستی کی دلیل ہے کہ وہ جذبات اور خواہشات کا اسیر ہو جائے۔ مانا کہ عظمت آدم کا راز محبت ہے مگر وہ اتنی محدود اور جذباتی نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی شریف خاندان کی عزت اور ناموس لے کر عام اچھال دے.....

بتول! میں تمہیں لوٹ کا مال سمجھ کر نہیں بلکہ دہن بنا کر اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری محبت سچی ہے اور میری چاہت میں بھی کھوٹ نہیں ہے تو تم کوشش کرو۔ تمہارے والدین مان جائیں گے..... والدین اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم ان کو خوشی سے راضی کرو..... میں تمہارا ہوں اور تمہارا منتظر رہوں گا۔

نوید کا خط پڑھ کر میرے جذبات جھاگ کی مانند بیٹھ گئے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نوید کی عظمت اور بڑائی کا مینار میری نگاہوں میں بھی بلند ہو گیا..... کئی دن سوچتے ہوئے گزر گئے۔ میں نے والدین اور بھائیوں کا دل مونہ بنے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ بس سے مس نہ ہوئے ان کا رویہ بدستور سرد رہا۔ ابا جان تو بیمار سے رہنے لگے۔ اور سب لوگ مجھے ایک بوجھ سمجھنے لگے۔ نفرتیں اور بے رخی میرا مقدر بن گئیں۔ میں دن رات گیلی لکڑی کی مانند سلنے لگی۔ مگر کسی نے بھی میرا حال نہ پوچھا۔ کسی نے بھی میری دلجوئی نہ کی۔ میری محبت کی پھولاری میں آگ سی دیکھنے لگی اور محبت کے پھول ان شعلوں میں جلنے لگے..... نوید کی چاہت نے مجھے ایک مشکل امتحان میں ڈال دیا تھا۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ جی چاہتا تھا خود کشتی کر لوں۔

ایک روز شاز یہ مجھ سے ملنے آئی تو میں اس کے گلے لگ کر سسکنے لگی..... پھر اسی روز ہم نے ایک طریقہ اپنایا..... شاز یہ نے اپنے گھر جا کر ایک فرضی خط نوید کی طرف سے میرے نام لکھا۔ جس میں لکھا تھا کہ میں

فلاں دن فلاں وقت ریلوے اسٹیشن پر تمہارا انتظار کروں گا۔ ہم اپنی تمام کشتیاں چلا کر آ جانا اور گھر سے جو زیور اور نقدی ہاتھ لگے ساتھ لیتی آنا۔ ہم اس ظالم اور بے دردمان سے بہت دور چلے جائیں گے۔ اتنی دور کہ کوئی ہماری گرد کو بھی نہ پہنچ سکے گا۔

اس قسم کی کچھ اور باتیں لکھ کر پوسٹ کر دیا..... وہ خط میرے بھائی کے ہاتھ لگا۔ اور پھر اسی اور ابا جان نے بھی یہ جان لیا کہ میں ان کی بیٹ دھری کی وجہ سے ان کا مان اور بھرم توڑ کر کہیں چلی جاؤں گی اور یوں ان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ تو انہوں نے تمہارا ڈال دیئے اور ان کے رویہ میں چلک آ گئی۔ انہوں نے نوید کا رشتہ قبول کر لیا۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے مجھ پر واضح کر دیا کہ وہ نوید کے ساتھ میری شادی نہایت ہی دھوم دھام سے کریں گے۔ مگر اس کے بعد میں ان کے لیے مرنے جاؤں گی اور دوبارہ اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔ ہم یہ سمجھیں گے کہ بتول نام کی ہماری کوئی بیٹی ہی نہیں تھی!

☆.....☆.....☆

میں نے نوید کی خاطر یہ ستم برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ پیدا کر لیا..... یوں میری اور نوید کی شادی ہو گئی..... ہم دونوں بہت خوش تھے۔ ہماری محبت کی کونپلیں کھل اٹھیں۔ ہماری راہوں میں کہکشاں بکھج گئی اور زندگی ہمارے لیے پھولوں کی تیج بن گئی..... نوید نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں نہال ہو گئی۔ ہم بنی مون منانے کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف نکل گئے۔ گلگت، سوات، ناران، چترال، مری، ایوبیہ ہر جگہ ہم نے گھوم ڈالی۔ نوید کی محبت پا کر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے چاروں طرف رنگ برنگے پھول کھل اٹھے ہوں اور میں ان پھولوں کے درمیان شہزادی بنی ٹیٹھی ہوں۔ نوید نے میرا ہر امان پورا کر ڈالا۔ اس نے اپنی محبت کے پھول مجھ پر پھینکا اور کر ڈالے.....

شادی تو میری دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ مگر وہ سب دکھاوا تھا۔ میرے والدین اور بھائی دل سے راضی

آڈٹ برانچ میں ہو گئی ہے..... چونکہ اس کے محکمہ کے دفاتر کئی دوسرے شہروں میں بھی ہیں اس لیے اب اسے اکثر آڈٹ کرنے کی غرض سے ان شہروں میں بھی جانا پڑے گا۔ یوں بعض اوقات رات بھی وہاں گزارنی پڑے گی۔

”تو اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ نوکری میں یہ تو ہوتا ہے۔ جس رات تم نے گھر نہ آنا ہوگا۔ اس رات ملازمہ میرے پاس سو جایا کرے گی۔“ میں نے نوید کی پریشانی دور کر دی۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ نوید ہر ہفتے کی شام کو ”بتول! ڈارلنگ، خدا حافظ!“ کہہ کر چلا جاتا اور اتوار کی شام یا پھر سوموار کی صبح کو واپس آ جاتا۔ نوید اب مطمئن اور خوش سارے لگا تھا۔

میں نے ایک دو بار اس سے پوچھا کہ وہ ہفتے کی شام کو کون سے دفتر میں جاتا ہے۔ جبکہ اتوار کو تو عام چھٹی ہوتی ہے مگر وہ عجیب سا بہانہ کر کے ٹال دیتا۔ اور پھر مجھ پر اپنی چاہت کے اتنے بھول نچھاور کرتا کہ میں اس کی وقتی جدائی کا غم بھول جاتی اور اس کی محبت کے طوفان میں ڈوب کر تمام گلے شکوے بھول جاتی اور اس سے کوئی مزید سوال نہ کرتی۔

جب ہر ہفتے کی شام کو ہی اس کا مجھے ”بتول ڈارلنگ خدا حافظ!“ کہہ کر جانا برقرار رہا تو میرے من میں شک کا ناگ بچھن اٹھانے لگا اور میں سوچنے لگی کہ نوید..... ہر ہفتے کی شام کو ہی کیوں جاتا ہے؟ رات اور چھٹی کا دن کہاں گزرتا ہے؟..... کہیں کوئی اور عورت تو میری چاہت کی حصہ دار نہیں بن گئی۔ لیکن میں فوراً ہی اس خیال کو جھٹک دیتی۔ کہ میرا نوید ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو پیکر وفا ہے..... وہ صرف میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔ میں نے اس حقیقت کو جاننے کی لاکھ کوشش کی۔ مگر وہ بڑی خوبصورتی سے اور مسکرا کر اس بات کو ٹال دیتا اور کہتا.....

”بتول! کیا تمہیں میری چاہت پر بھروسہ نہیں ہے۔ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی

نہیں.....“ وہ تو بہروبی لی بنا پر میری شادی نوید کے ساتھ ہو چکی تھی۔ مگر اب وہ بھی میں اور نوید خوش تھے۔ یہ بہانے نے باہر والے میں اب واپس والدین کے گھر کبھی نہ جانوں کی یونکہ میں تو ان کے لیے مر گئی تھی۔ رخصتی کے وقت بھی میرے ماں باپ اور بھائیوں نے مجھے میری حیثیت یاد دلادی تھی کہ میں ان کے لیے مرجی ہوں۔ مگر نوید کی خاطر میں نے یہ سب کچھ گوارہ کر لیا تھا۔ میں نے نوید کو بتا دیا تھا کہ میں نے اپنے والدین کو کیسے منایا ہے اور انہوں نے مجھے کیا کہا ہے۔

نوید کہنے لگا..... ”یہ سب وقتی اور جذباتی فیصلے ہیں..... آہستہ آہستہ وقت گزرے گا ہم اولاد والے ہو جائیں گے تو یہ خونی رشتہ پھر سے ایک ہو جائیں گے۔“

☆.....☆.....☆

بنی مومن سے واپسی پر نوید نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ میں گھر پر اکیلی بہت ہی بور ہوتی تھی۔ نوید نے میرے اور گھر کے کام کاج کے لیے ایک ملازمہ کا بندوبست کر دیا تو میری بوریت کسی حد تک کم ہو گئی۔ نوید کبھی کبھار دفتر سے لٹ آتا تھا۔ جس کی وجہ وہ دفتر میں کام کی زیادتی بتاتا تھا۔ میں اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرتی۔ وہ دفتر سے آتا تو میں بھول کی مانند کھل اٹھتی۔

وہ تھوڑا سا آرام کرتا اور پھر ہم گھومنے نکل جاتے۔ رات کا کھانا ہم اکثر گھر سے باہر ہی کھاتے تھے۔ نوید کی محبتیں اور نوازشیں بڑھتی ہی جاری تھیں۔ میں خوش اور مطمئن تھی کہ مجھے ایک بہترین اور مثالی بیوی مل گئی ہے۔ میں نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ نوید بھی فخر کرتی تھی اور اپنی جوڑی کو ااکھوں میں ایک قرار دیتی تھی۔

ہماری شادی ہوئے دو ماہ مزرے گئے تھے میں چند دنوں سے نوید کو بے قرار سا محسوس کر رہی تھی۔ بعض اوقات وہ کھوسا جاتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے ٹال دیا..... پھر اس نے دفتر میں کام کی زیادتی کا بہانہ بنایا..... اور پھر ایک روز اس نے بتایا کہ اس کی تبدیلی

ہو۔ میں جس دن آئی اور سہ ماہی میں وہاں ۵۰۔۵۱
 دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔
 ”تو پھر تم چھٹی کا دن گھر سے باہر کیوں رہتے ہو۔
 کہاں اور کس کے پاس جاتے ہو؟“
 ”میں اپنے گاؤں جاتا ہوں؟“ نوید نے جواب
 دیا۔
 ”کس کے پاس جاتے ہو؟ وہاں تو اب تمہارا کوئی
 بھی نہیں ہے؟“

”کیوں نہیں ہے میں تو پیدا ہی وہاں ہوا تھا۔ وہاں
 تو میرے کئی چاہنے والے ہو سکتے ہیں۔“ نوید نے
 پراسراری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
 ”کئی چاہنے والوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟
 میں تو کسی کو نہیں جانتی۔“ میں نے فکر مند لہجے میں کہا۔
 ”ایک روز تمہیں معلوم ہو ہی جائے گا کہ وہاں میرا
 کون ہے جس سے میں ہر ہفتے ملنے جاتا ہوں۔“
 ”اگلے ہفتے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی اور
 دیکھوں گی کہ وہ کون ہے۔ جس کی خاطر تم مجھے اکیلا چھوڑ
 کر چلے جاتے ہو۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
 ”ابھی نہیں..... میں خود تمہیں کسی روز لے جاؤں
 گا۔“ نوید نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ اس مسئلے پر میری
 اکثر نوید سے بحث ہونے لگی۔ مگر اس نے مجھے حقیقت
 نہ بتائی۔ کبھی وہ مسکرا کر مذاق کے انداز میں بات کرتا
 اور کبھی سنجیدہ ہو جاتا۔ میں ایک عجیب سی الجھن میں
 گرفتار ہو گئی..... نوید کی باتوں نے میرے اندر شک کا
 بیج بو دیا..... مگر جب ایک روز میں نے اس سے سخت
 لہجے میں بات کی..... اور اس سے روٹھ کر رونے لگی تو
 اس نے میری قسم اٹھا کر کہا کہ.....

”بتول! میں کس لیے گاؤں جاتا ہوں۔ یہ بھی
 تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں
 کہ تم سے بڑھ کر اس دنیا میں مجھے کوئی بھی عزیز نہیں
 ہے۔ پہلے تم ہوا اور اس کے بعد کوئی اور ہے۔
 ”تو پھر تم میرا شک اور وہم دور کیوں نہیں کر
 دیتے؟“ میں نے روہاسی ہو کر کہا۔

”تم نواہ نواہ شک کر رہی ہو۔ یہی زندگی میں
 آنے والی تم واحد لڑکی ہو۔ جسے میں نے چاہا اور پا
 لیا..... اب کوئی میری زندگی میں نہیں آئے گا۔“
 مگر نوید کی باتیں مجھے مطمئن نہ کر سکیں۔ مجھے نوید پر
 یقین تھا کہ وہ صرف میرا ہے۔ مگر کبھی کبھی اس کا بات
 کرنے کا انداز اور ہر ہفتہ گھر سے باہر رہنا مجھے سوئی پر
 لٹکا دیتا تھا۔

☆.....☆.....☆

کسی تہوار کی وجہ سے اس ہفتے میں سوموار اور منگل
 کی بھی چھٹی تھی..... نوید ہفتے کی شام کو مجھے خدا حافظ کہہ
 کر چلا گیا..... میں نے اسی رات شاز یہ کوفون کیا اور
 اس سے نوید کے گاؤں کا مکمل پتہ اور وہاں جانے کا
 راستہ معلوم کیا اور اتوار کی صبح کو اس کے گاؤں روانہ ہو
 گئی۔ شاز یہ نے مجھے تفصیل سے سمجھایا تھا۔ اس لیے
 نوید کے گاؤں تک پہنچنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہ
 کرنا پڑا۔

میں جوں ہی گاؤں کی بڑی گلی میں داخل ہوئی.....
 ایک بزرگ مجھے مل گئے۔ وہ مجھ شہری لڑکی کو دیکھ کر
 چونک سے گئے۔ مگر میں نے بڑے مہذب انداز میں
 ان کو سلام کیا اور ان سے نوید کے گھر کا پتہ پوچھا۔
 انہوں نے سلام کا جواب دیا اور دعا میں بھی دیں
 اور مجھے ساتھ لے کر نوید کے گھر کے دروازے تک چھوڑ
 گئے۔ دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ صحن
 میں ایک مرد اور عورت بیٹھے ہوئے تھے اور جانوروں کا
 چارہ تیار کر رہے تھے۔ مجھے دروازے پر دیکھا تو دونوں
 دوڑے دوڑے آئے اور بولے۔ ”ست بسم اللہ جی
 آیاں نوں۔“

پھر مرد بولا۔ ”آپ بیگم صاحبہ تو نہیں ہیں۔ کیا نام
 بتایا تھا صاحب جی نے بتول.....!“

”جی ہاں میں بتول جی ہوں۔ نوید کی بیگم۔“

وہ دونوں بہت ہی خوش ہوئے۔ میں ان کے ہمراہ
 اندر کمرے تک چلی آئی..... عورت فوراً ہی کسی کا گلاس
 بھر کر لے آئی جس میں مکھن تیر رہا تھا..... میں نے کسی

پینے سے پہلے ان سے پوچھا کہ آپ کون ہیں۔
 ”جی ہم صاحب جی کے ملازم ہیں۔ ہم میاں بیوی ہیں ہم ان کے گھر میں جانوروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ زمینوں کا نظام نشی کے پاس ہے۔“
 ”آپ کے صاحب کہاں ہیں؟“ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑتے ہوئے پوچھا۔

”جی وہ رانو اور راجا کچھ بیمار تھے۔ انہیں وہ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہیں۔ ہمارا بیٹا جانو بھی ساتھ گیا ہے۔“
 رانو..... اور راجا کا نام سن کر میرے من میں آگ سی لگ گئی..... میں نے لسی کا گلاس پیئے بغیر واپس لوٹا دیا اور کہا کہ صاحب آئیں گے تو پھر بی لوں گی۔“
 دونوں میاں بیوی میرے تیور بھانپ گئے کہ میرا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ عورت لسی کا گلاس لے کر واپس چلی گئی..... تو میں نے ملازم سے پوچھا۔
 ”نوید کب تک واپس آئے گا؟“

”بس آتے ہی ہوں گے۔ بی بی جی!“ وہ مودبانہ انداز میں بولا۔
 کافی وقت گزر گیا۔ نوید ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میری جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہونے لگا۔ تو میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی اور ملازم سے کہا کہ میں باہر جا رہی ہوں۔ نوید آئے تو اسے بتا دینا کہ اس کی بیوی آئی تھی۔
 ”بی بی جی! آپ آرام کریں۔ میں آپ کے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ ملازم التجائیہ لہجے میں بولا۔

مگر میں نے اس کی بات نہ مانی اور باہر ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی میں دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ سامنے سے نوید آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو چونک سا گیا۔ ہم ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ نوید کے ہمراہ ملازم کا جوان بیٹا بھی تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں رسی سے بندھی ہوئی دو بکریاں پکڑ رکھی تھیں۔ جن میں ایک نر اور ایک مادہ تھے۔ وہ ان دونوں کو لے کر

اندرا داخل ہو گیا اور ان دونوں کو ایک کھوٹے سے باندھ دیا..... میں ابھی تک نوید کا راستہ روکے دروازے میں کھڑی تھی۔
 ”بتول! تم اور یہاں.....؟“ نوید نے سکوت توڑا۔

”کیوں.....؟ کیا میں یہاں نہیں آ سکتی؟ یہ تو میرا سرال ہے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔
 ”کیوں نہیں.....؟ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ نوید نے کہا اور مجھے اندر چلنے کو کہا۔

”میں اندر نہیں جاؤں گی..... میں تو واپس جانے لگی تھی کہ تم آ گئے ہو..... مجھے بتاؤ..... یہ رانو کون ہے؟ اور اس کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟“ میں نے غصہ سے کہا۔
 ”رانو.....!“ یہ کہہ کر نوید نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”آؤ میں تمہیں اپنی محبوبہ رانو اور اس کے بھائی راجو سے ملاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے میرا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا صحن کی طرف لے گیا..... میں انکار بھی کر رہی تھی اور اس کے ہمراہ چھینچی بھی جاری تھی..... وہ مجھے بکریوں کے پاس لے گیا اور ایک کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا..... یہ میری محبوبہ رانو ہے اور یہ میرا محبوب راجو ہے۔ میں ہر نکتے ان ہی سے ملنے آتا ہوں۔
 ”یہ کیسا مذاق ہے نوید! تم حقیقت سے آنکھیں چرا رہے ہو۔“ میں نے جارحانہ انداز اپنا لیا۔

”بتول! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اور یہ حقیقت ہے مذاق نہیں..... تم بے شک خیر و چارچا اور منیراں چچی سے پوچھ لو۔“ نوید ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
 چچا خیر و اور منیراں چچی بھی ہنسنے لگے اور بولے..... ”یہ تم صاحبہ! صاحب جی ٹھیک کہتے ہیں۔“
 ”نوید.....! یہ کیا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ میں رو ہانسی ہو کر بولی۔

”آؤ کمرے میں چل کر بیٹھو..... میں تمہیں تمام بات بتاؤں گا۔ مگر پہلے اپنی روتی شکل کو تبدیل کرو اور

بہترین اور مکمل دودھ ہوتا ہے۔

بکری کا دودھ پینے کی وجہ سے میری صحت ہمیشہ ہی بہترین رہی ہے۔ دیکھ لو..... اب بھی میں کتنا چاقو چوبند ہوں۔ بکری کی عمر تین چار سال ہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ یا تو طبعی موت مر جاتی ہے یا پھر قسانی خرید کر لے جاتا ہے..... مگر ہمارے گھر سے کبھی کوئی بکری قسانی کے ہاتھوں میں نہیں گئی۔ بلکہ طبعی موت ہی مری ہے۔ میں نے جس بکری کا سب سے پہلے دودھ پیا تھا۔ وہ چھ سال بعد مر گئی۔ تو اس روز میں بہت رو یا تھا۔ بالکل ایسے جیسے میری سگی ماں مر گئی ہو۔ اس کے بعد اس کے بچے جو جان ہو گئے اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ابھی ہمارے گھر جو بکریاں اور بکرے ہیں۔ یہ سب اسی بکری کی اولاد ہیں۔ جس کا دودھ پی کر میں بڑا ہوا تھا۔ مجھے اس بکری سے اور اس کی اولاد سے اس طرح محبت ہے۔ جیسے سگے بہن بھائیوں سے ہوتی ہے۔ میں ان کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ ان کی محبت ہی مجھے ہر ہفتہ گاؤں بھیج لاتی ہے۔

”رانو اور راجو“ ان کے نام میں نے ہی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی مجھے دیکھ کر اٹھکھیلیاں کرنے لگتے ہیں..... یہ بیمار ہو جائیں تو میں ان کو ساتھ والے گاؤں میں شفا خانہ حیوانات لے جاتا ہوں۔ ان کا علاج کراتا ہوں میں اب بھی ان کا دودھ پیتا ہوں۔ مجھے جو مزہ بکری کے دودھ کو پینے میں آتا ہے۔ وہ کسی اور چیز میں نہیں آتا..... میں نے ان بکریوں کے لیے ہی گاؤں سے رابطہ برقرار رکھا ہوا ہے۔ و نہ اب میرا اس گاؤں میں کون ہے..... کوئی چچا نہیں..... چچا خیر و اور چچی منیراں کو میں نے ان بکریوں کی خدمت کے لیے ملازم رکھا ہوا ہے..... یہ ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جس کا میں ان کو معاوضہ دیتا ہوں۔

چچ پوچھو..... میں ان کے بغیر زندگی کو ادھورا سمجھتا ہوں..... میں جب تک ان کو مل نہ لوں۔ دیکھ نہ لوں، ان کا دودھ نہ پی لوں، مجھے چین ہی نہیں آتا..... یہ بے زبان ہیں۔ مگر یہ میری زبان کو سمجھتے ہیں۔ میرا کہا مانتے ہیں۔ اور میں ان کی زبان کو سمجھتا ہوں۔ میرا ان سے

چہرے پر مسکراہٹ بکھیرو..... وہی مسکراہٹ جس نے پہلی نظر میں ہی میرا چین و قرار لوٹ لیا تھا۔

میں نوید کے ہمراہ کمرے میں آ گئی۔ چچی منیراں کھانا تیار کرنے لگی اور چچا خیر و پھر سے لسی کے دو گلاس لے کر آ گیا۔ میں نے کسی گھونٹ گھونٹ کر کے پینی شروع کی تو نوید بولا۔

”بتو! مجھے یقین تھا کہ تم کسی روز میرا چچا کرتے ہوئے یہاں ضرور آؤ گی۔ میں تمہیں سر براز دینا چاہتا تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میں رانو اور راجو کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی وجہ میں تمہیں بتا رہا ہوں..... یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ میں دو ماہ کا تھا کہ میری ماں فوت ہو گئی۔ میں ممتا کی گود کے لمس سے محروم ہو گیا۔ ابا جان نے دوسری شادی نہ کی اور میں خالہ کے رحم و کرم پر رہ گیا.....

میں رات کو ان کے پاس سوتا تھا۔ میری بڑی بہن بھی میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ مگر اصل مسئلہ میری خوراک کا تھا اور میری خوراک اس عمر میں صرف دودھ ہی تھی۔ دودھ کے بغیر میرا زندہ رہنا مشکل تھا۔ میری مرحومہ ماں کو بکریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اور ہمیشہ وہ گھر میں بکری پال رکھتی تھی۔ اتفاق تھا کہ جس دن میری ماں فوت ہوئی۔ اسی رات ایک بکری نے ایک بچے دیا..... میرے ابا جان نے مجھے اس رات بکری کے ایک تھن سے مجھے دودھ پلایا اور دوسرے تھن سے بکری کے بچے کو..... اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا..... بس یہ سمجھ لو کہ میں بکری کا دودھ پی کر بڑا ہوا ہوں۔

میں بچہ تھا اس لیے بکری کو ہی اپنی ماں سمجھتا تھا..... چھ ماہ تک میں اس بکری کا دودھ پیتا رہا۔ اس عرصہ میں دوسری بکری نے دو بچے دیئے۔ تو میں اس کا دودھ بھی پینے لگا۔ یوں تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ میری غذا بکری کا دودھ ہی رہی۔ بکری کے دودھ میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ جو پینے والے کو تندرست اور توانا رکھتی ہے۔ کیونکہ بکریاں جب پہاڑوں اور جنگلوں میں چرنے جاتی ہیں تو وہاں مختلف قسم کی گھاس پتے اور جڑی بوٹیاں کھاتی ہیں۔ جس وجہ سے ان کا دودھ ہر لحاظ سے

بکرے کی ہی ہوگی۔

نیل کی قربانی ساتھ والے گاؤں میں تھی۔ اس لیے نوید عید کی نماز پڑھنے کے بعد وہاں چلا گیا۔

نہ جانے میرے من میں کیا سائی کہ میں نے چچا خیر و کو بھیج کر قسانی کو بلوایا اور راجو کو ذبح کر ڈالا۔ چچا خیر و اور منیراں مجھے منع کرتے رہے۔ مگر میں نے ان کی ایک نہ سنی اور کہا کہ یہ قربانی میری طرف سے ہے۔ میں نے قسانی کو پانچ سو روپے دینے وہ جلدی جلدی بکرے کو کاٹ کر بولیاں بنا کر چلا گیا۔

چچا خیر و اور منیراں اہم گئے تھے اور ڈر رہے تھے کہ نوید آئے گا تو قیامت ڈھا دے گا۔ مگر میں نے ان کو تسلی دی کہ کچھ نہیں ہوگا۔ بکرا ہی تو تھا اور پھر وہ اللہ کی راہ میں اور سنت ابراہیمی کی یاد میں ذبح کیا گیا ہے۔

مگر میری قیاس آرائی غلط ثابت ہوئی۔ نوید واپس آیا اور جب اسے پتہ چلا کہ میں نے راجو کی قربانی کر دی ہے تو اس نے واقعی قیامت ڈھا دی۔ اس نے خیر و اور منیراں کو تو کچھ نہ کہا۔

مگر مجھے کھڑے کھڑے طلاق دے ڈالی۔ اس نے محبت کا تاج محل زمین بوس کر ڈالا۔ میں نے اس کی نینٹیں کیس گڑ گڑائی۔ مگر اس نے میری ایک نہ سنی اور عید والے دن مجھے گھر سے نکال دیا۔ اور میں خالی ہاتھ وہاں سے نکلی آئی۔

☆.....☆.....☆

برسوں بیت گئے ہیں۔ طلاق ملنے کے بعد میں ماں باپ کی دلیز پر نہیں لٹی تھی۔ بلکہ ایک سٹیبل کے پاس رہ رہی ہوں۔ وہ سکول میں ٹیچر ہے۔ میں بھی وہیں پڑھاتی ہوں۔ مگر میری اب کوئی منزل نہیں ہے۔ بے نام منزل کی مسافر ہوں۔ نوید کی یاد آتی ہے تو سینے میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ اس نے مجھے اتنا پیار کیوں دیا۔ اور پھر محض ایک جانور کی خاطر مجھے زندگی سے نکال ڈالا۔ یہاں آ کر میرے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

انوکھا رشتہ ہے۔ ایک انوکھا بندھن ہے۔ ایسا بندھن..... ایسا رشتہ اور ایسی محبت..... کسی نے کم ہی دیکھی ہوگی۔ چچا خیر و..... چچی منیراں کے علاوہ اور کسی کو کم ہی علم ہے کہ میں ان جانوروں..... بلکہ اپنے ان رشتہ داروں سے کتنی محبت کرتا ہوں..... یہ جانور انسانوں سے اچھے ہیں یہ کسی کو دکھ اور تکلیف نہیں دیتے..... میں اور کسی کو اپنی اس محبت میں شریک نہیں کرنا چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا، مگر اب تم یہاں آ گئی ہو۔ اس لیے میں نے تمہیں حقیقت بتا دی ہے۔ اور امید رکھتا ہوں کہ تم بھی میری اس انوکھی محبت کا بھرم رکھو گی اور میرا ساتھ دو گی۔

نوید نے بات ختم کی..... تو میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ نوید صرف میرا ہے۔ اس کی محبت میں کوئی ٹھوٹ نہیں ہے..... پھر میں مسکرائی اور نوید کو ساتھ لے کر باہر حن میں آ گئی۔ میں نے راجو اور رانو دونوں کی گردن میں باری باری ہانپیں ڈال کر ان کو پیار کیا تو وہ بھی اپنی دم بلانے کے ساتھ ”میں..... میں.....“ کرنے لگے۔

میں اور نوید بھی خوشی واپس آ گئے۔ اب میرے من میں شک کا پودا نہیں اگ رہا تھا۔ میں مطمئن ہو گئی تھی..... نوید اب بھی ہر ہفتہ کی شام کو گاؤں جاتا تھا۔ مگر اب وہ اکیلا نہیں ہوتا تھا میں بھی اس کے ساتھ جاتی تھی۔ رانو اور راجو سے ملتی تھی.....

کچھ ہی عرصہ بعد رانو ایک بچے کی ماں بن گئی۔ اس کا بچہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ میں اس کو گود میں اٹھا کر پیار کرتی..... اور رانو کا دودھ بھی پیتی۔

یوں ہی دن گزرتے گئے اور بڑی عید آ گئی۔ میں اور نوید عید گزارنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ کیونکہ قربانی گاؤں میں ہی کرنی تھی۔ نوید نے ایک نیل میں حصہ ڈالا تھا..... میں چاہتی تھی کہ بکرے کی قربانی ہوئی چاہے اور وہ بھی راجو کی۔

مگر نوید نہیں مان رہا تھا، اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے گھر کے بکری کے خاندان کے کسی بھی جانور کو ذبح ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ مگر میں بضد تھی کہ قربانی

خزائن کا رقص

ملک عاشق حسین ساجد

چاہنے والوں کی خوشبودل سے نہیں جاتی
وہ لڑکی بھی اپنی محبت کو بھلا نہیں سکتی تھی
بے وفائی کی کرچیوں نے جن رستوں کو ہولناک کیا تھا
وہ اسے پیار کے پھولوں سے تباہ بنا چاہتی تھی۔۔۔

تنہائی کی دھول میں اتنی زندگی کی تصویر، آئینہ صف تحریر



دروپوار اسی اداسی کا پتہ دیتے ہیں
میرا گھر ہے کہ میری ذات کی سچائی ہے

نومبر دیشیج 2012

اس سے قبل کہ میں کسی سے پوچھتی کہ اس شبو نامی لڑکی میں کیا خاصیت ہے کہ سبھی لوگ یہی کہہ رہے ہیں کہ ”اب مزہ آئے گا۔“

ارشاد بھائی بولے ”اب تک آپ نے جو مترنم آوازیں سنی ہیں شبو کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں..... شبو کی مترنم آوازیں سنیں گی تو جھوٹے بغیر نہیں رہ سکیں گی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے جناب! کچھ سنو! آگے بھی سہی یا پھر تعریفیں ہی کیے جاؤ گے۔“

میرے میاں نے اصرار کرتے ہوئے ارشد بھائی سے کہا۔ جو اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں مہندی لگائے شبو کی جانب دیکھ کر مسکرائے جا رہے تھے۔

”ابھی ہم تیرا ہی انتظار کر رہے تھے کہ ابھی تک شبو نہیں آئی..... چلو اب کچھ سنو..... کوئی سہرا..... گیت..... غزل وغیرہ۔“

ارشاد بھائی کی ایک بہن نے شبو کو گلے لگاتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”نہیں آج میری طبیعت ٹھیک نہیں، لہذا معذرت قبول کرو۔“

شبو نے نالے کے انداز میں بہانہ بناتے ہوئے جواب میں کہا۔

”اے شبو کی بچی! چلو جلدی سے کچھ سنو..... تمہارا موڈ ہی میرے لیے ٹھیک نہیں۔ تمہاری خاطر میں دوسری شادی کروں گا؟ جس میں تم اپنی آواز میں کوئی چیز سنو گی..... ہاں اگر آج کچھ نہ سنایا تو آج کے بعد ہم تیری آواز میں کچھ نہیں سنیں گے..... ورنہ سنا دو.....“

ارشاد بھائی نے آتے ہی اسے حکم سنانے والے انداز میں کہا۔

”دیکھیں ارشد بھائی! میرا گلا خراب ہے۔ ورنہ میں نے کب انکار کیا ہے.....“ شبو التجائیہ انداز میں بولی۔ تو ارشد بھائی نے دوبارہ کہا۔

”شبو بہن! جو بھی آواز ہے کچھ سنو۔ مگر انکار نہ کرو۔ ورنہ میرے یہ خاص مہمان کیا اثر لیں گے پلیز۔“

رات پھیلی ہے تیرے سرئی آنچل کی طرح چاند نکلا ہے تجھے دھونڈنے پاگل کی طرح ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں یہ غزل شبو نے اپنی خوبصورت آواز میں ترنم کے ساتھ سنا لی تو ماحول پر ایک وجد سا طاری ہو گیا۔ چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب لے ساتھ دھرتی کو منور کر رہا تھا۔ ہر طرف چاندنی کا انفریب عکس دل و دماغ میں ایک سکون کا تاثر اور نمذک کا احساس دلا رہا تھا۔ شبو کی سریلی اور پرسوز آواز سامعین کو خوشگوار ماحول میں عجیب سا لطیف دے رہی تھی۔ ہر کوئی کوئل کی آواز کے سحر میں ڈوب کر دل کی آغواں کہانیوں سے داد پسین دے رہا تھا۔

اسے میں نے ارشد بھائی کی شادی پر دیکھا تھا۔ خدا معلوم اس کا اصلی نام جو بھی تھا مگر پیار سے اسے سبھی لوگ شبو کہہ کر پکارتے تھے۔

رسم مہندی کے موقع پر لڑکیاں شادی بیاہ کے مختلف کیت اپنی اپنی ملی جلی آوازوں کے ساتھ گارسی تھیں۔ ارشد بھائی درمیان میں بیٹھے سب کو باری باری مسرور اور مشکور نظروں سے دیکھتے جا رہے تھے۔ کبھی کوئی فقرہ کستایا دو لہا کو چھیڑتا تو فضا میں تہنوں کی آوازیں اس رنگارنگ محفل میں اپنا یادگار تاثر چھوڑ جاتیں۔

ارشاد بھائی دو لہا کے روپ میں بہت ہی خوبصورت اور سب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ان کے رشتہ دار، سبک، جوان اور بوڑھے باری باری ان کے اوپر ”ایلوں“ کی صورت نذرانے کے طور پر اپنی اپنی ”ایاں اور دعائیں کا چٹھا کر رہے تھے۔

اس موقع کی آواز اور سہرے گانے والی لڑکیوں کی آوازیں ماحول میں فرحت بخش سماں پیدا کر رہی تھیں۔

”اب آگئی ہے..... شبو آگئی ہے..... اب مزہ آئے گا۔“

محفل میں شریک کچھ لڑکیوں کے یہ ملے جلے جملے سنا کر ہر طرف ہنسی پھیلنے لگی۔ شبو نے بھی چپچپے مڑ کر دیکھا تو ایک ”موسم چہرے والی نوجوان یوٹیزہ بغیر کسی ”مادہ کپڑوں میں ملبوس آئی دکھائی دی۔

ہم نے بھی ارشد بھائی کی تائید میں اصرار کیا۔

شبو کے پاس انکار کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

چند ہی لمحوں بعد شبو کی پرسوز اور سریلی مترنم آواز گونجی۔ جس نے ماحول کو اپنے سحر میں بکڑ لیا۔

کل تک جو کہتے تھے اپنا، آج وہی بیگانے ہیں
بے گانوں کو اپنا سمجھیں، کیسے ہم دیوانے ہیں

ایک گیت ختم ہوا تو دھڑا شروع..... پھر تیسرا..... چوتھا.....

اسی طرح نصف گھنٹے تک شبو کی سریلی پرسوز آواز ہمارے کانوں میں رس گھولتی رہی۔ میں نے کئی بار شبو کی آنکھوں میں اس کی گائیکی کے دوران موتیوں کے قطرے

جھلک کر تے دیکھے جنہیں وہ بڑی دلیری کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں ضبط کرتی رہی۔ میں نے پوری طرح یہ بات محسوس کر لی کہ وہ اندر سے بہت دکھی ہے۔ کوئی ایسا دکھ

ضرور ہے جو اسے اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ اس کی ادا ہی مجھ سے دیکھی نہ جا رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کر

لیا تھا کہ موقع ملے ہی اس سے اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش کروں گی۔ رات گئے تک شادی کے بنگامے اختتام پذیر ہوئے تو شبو کو میں نے اپنے پاس بلایا۔

”بہت زبردست آواز ہے تمہاری۔ جسے سن کر بہت لطف اندوز ہوئے ہیں ہم“ میں نے اس کی آواز کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”نہی بی بی جی۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں۔ یہ تو آپ کا حسن سماعت ہے۔“

”شبو اگر محسوس نہ کرو تو ایک بات پوچھوں۔“ میں نے اپنا بیت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

”ہاں..... کیوں نہیں بی بی جی۔ آپ حکم کریں۔“ اس نے عاجزی سے جواب میں کہا۔

”میں نے محسوس کیا ہے کہ تم بہت دکھی لڑکی ہو۔ کیا تم اپنے دکھ میرے ساتھ شیئر کرو گی؟“

میں نے دیکھا شبو کے چہرے کی رہی سہی برائے نام مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ وہ گھبرائے انداز میں بولی۔

”نہیں بی بی جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ویسے آج میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ دوسرا میرا مزاج ہی

کچھ سنجیدہ ہے ذرا۔“

”ہاں وہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ تم نو جوان ہو۔ اس عمر میں سنجیدگی کہاں سے آئی۔ بہر حال وجہ جو بھی

ہے۔ میں غلط نہیں سمجھی۔ تمہارے معصوم چہرے کی ویرانی اور شکستہ انداز اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ضرور

کچھ ایسا ہے جو میں تم سے کہہ رہی ہوں۔“ میری اس بات پر وہ سوچنے والے انداز میں کہیں گم

ہو گئی کہ میں واقعی ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ جیسے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ مجھے بتائے یا نہیں۔ اسی دوران میں پھر بولی۔

”دیکھو شبو! مجھے اپنی خیر خواہ اور باجی سمجھ کر دل کا حال سچ سچ بتا دو۔ ہو سکتا ہے اس سے تمہارے دل کا

بوجھ ہلکا ہو جائے دوسرا، ہو سکتا ہے میں تمہیں کوئی نیک مشورہ دے سکوں۔ جس سے تمہاری رہنمائی ہو سکے۔

پلیز انکار نہ کرو۔“ میری بات سن کر شبو نے ایک سرد آہ بھری۔ اگلے

ہی لمحے اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں۔ پھر میرے دلاسہ دینے پر وہ سسکیاں

سی لے کر رونے لگی۔ میں نے اسے کچھ دیر رونے دیا۔ تاکہ اس کے دل کا غبار اتر جائے کچھ دیر بعد میں نے

اسے وقت کی نزاکت کا احساس دلایا کہ وہ رونا بند کرے۔ لوگ کیا تاثر لیں گے۔

”ٹھیک ہے بی بی جی! میں آپ کو اپنے بارے میں سچ سچ بتا دوں گی۔ پھر آپ کا جو بھی مشورہ ہوگا۔ اس پر

عمل کروں گی۔ اس وقت تو میں گھر چلتی ہوں۔ امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ کل رات سے واپسی کے بعد

میں اپنی ساری حقیقت آپ کو بتا دوں گی۔“ ابھی شبو یہی کہہ پائی تھی کہ میرے میاں جہانگیر

آگئے۔ شبو اجازت لے کر گھر کے لیے روانہ ہو گئی اور میں جہانگیر کو لے کر سونے والی جگہ پر آ گئی۔

اگلے دن سہرا بندی کے بعد شام ڈھلے ہم دونوں تنہائی میں بیٹھ گئیں۔

شبو نے دکھی لہجے میں اپنی درد بھری روئیداد سے مجھے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

”میں اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی۔ میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ جس کی کمی میں آج بھی شدت سے محسوس کرتی ہوں۔ کیونکہ بھائی ہی بہنوں کا مان اور سہارا ہوتے ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ بہنیں جن کے بھائی ہیں۔ میں ابھی بمشکل پچھ، سات سال کی تھی کہ میرے ابو فوت ہو گئے۔ میری امی مین جوانی کے عالم میں بیوہ ہو گئیں۔ انہوں نے میری خاطر دوسری شادی نہ کی اور اپنی تمام تر توجہ میری ذات پر مرکوز کر دی۔ ابو کے فوت ہو جانے پر ہمارا ذریعہ آمدنی ابو کی وراثت یعنی چار ایکڑ زمین تھی۔ اس کی پیداوار سے ہمارے گھریلو اخراجات اور ضروریات زندگی احسن طریقے سے پورے پورے تھے۔ اس زمین کی دیکھ بھال میرے ماموں جان نے سنبھال لی تھی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ زمین کی آمدنی سے سب کچھ پورا ہو رہا تھا۔ ورنہ ہمیں در بدر کی ٹھوکریں کھانا پڑتیں۔ صبح سویرے امی مجھے ناشتہ کرانے کے بعد قریبی مسجد میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے روانہ کرتیں۔ پھر میں اسی ہستی میں ایک عورت سے جو رشتہ دار تھی۔ سلائی کڑھائی کا کام کیٹنے چلی جاتی۔ اکثر و بیشتر جب ہم رات کو سونے لگتیں تو امی مجھ سے ابو کی باتیں کرتیں۔ ان کی یادوں کے حوالے سے دیر تک مجھے اپنے سینے سے لگا کر خود بھی روتیں اور مجھے بھی رلاتیں۔ ماموں جان کا گھر ہم سے کچھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ انہوں نے اپنی شادی برادری سے باہر دوسری قوم میں اپنی مرضی سے کی تھی۔ یہ ستم ظریفی تھی یا ہماری بد نصیبی کہ ممانی جان ہمیں کچھ اہمیت نہ دیتیں اور ہمیشہ ہم سے دور ہی رہتیں۔

یونہی زندگی کی گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ ہاں ماموں کے دو بچے تھے۔ ریاض جسے سب راجو کہتے تھے۔ دوسری ندا جو مجھ سے دو جماعت آگے تھی۔ میری منگنی راجو کے ساتھ ابو کے ہوتے ہوئے کی گئی تھی۔ راجو کبھی کبھار ہمارے گھر آتا رہتا تھا اور ندا اپنی ماں کی طرح خود غرض تھی۔ جس نے کبھی بھی سیدھے منہ بات کرنا گوارا نہ کیا۔ یہ دونوں ماں بیٹی ہم سے غیروں کی طرح

پیش آتی تھیں بلکہ ماموں اور راجو کو بھی ہم سے دور رہنے کی ناکام کوشش کرتی رہتی تھیں۔

ان کی یہ کوشش رہتی کہ کسی طرح راجو مجھ سے منگنی تو نہ کر کسی اور جگہ رشتے کا انتخاب کر لے۔ جہاں ان دونوں ماں بیٹی کی مرضی شامل ہو۔ راجو کا تو پتہ نہیں کہ اس کے دل میں میری کتنی عزت و محبت تھی۔ البتہ میں دل و جان سے اسے چاہتی تھی۔ مگر سبھی گفتگو کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی۔ جسے محبت کا نام دیا جاسکے۔

ندا نے میٹرک کلیئر کیا نہ مزید پڑھنے کی کوشش کی۔ بلکہ پڑھائی کے دوران ہی قریبی شہر کے ایک بیونی پارلر میں ملازمت اختیار کر لی۔

میری محنت رنگ لائی میں نے آٹھویں جماعت اچھے نمبروں سے پاس کر لی۔ مجھ سے زیادہ امی کو بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ ابو کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ میں نے امی کے افسردہ چہرے پر حقیقی خوشی کی جھلک دیکھی تھی۔ امی نے مجھے گلے لگاتے ہوئے شاباش دی، ماتھا چوما اور کہا۔

”بیٹی! کاش کہ آج اس موقع پر تیرے ابو زندہ ہوتے تو انہیں کتنی خوشی ہوتی۔“

اس کے بعد امی کتنی دیر تک پتہ نہیں مجھے گلے لگائے ابو کی یاد میں آنسو بہاتی رہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتی رہیں۔ مجھے امی کی شخصیت پر فخر تھا کہ میری کامیابی انہی کی مرہون منت تھی۔ میں ابھی مزید پڑھنا اور امی مجھے پڑھانا چاہتی تھیں۔

عید آئی تو اپنے ساتھ ڈھیر ساری خوشیاں لے کر آئی۔ راجو اس روز ہمارے گھر ٹھہرا رہا۔ تحائف کے تبادلے ہوئے مبارکبادوں کے ذریعے ہماری قربت میں اضافہ ہوا۔ ہنسی مذاق سے سرشار محلات تیزی سے گزر گئے۔ میں نے میٹرک اچھے نمبروں سے کلیئر کیا تو ہمارے گھر میں بہار آ گئی۔ امی خوشی سے چھو لے نہ سارسی تھیں۔ راجو نے اس موقع پر مجھے ایک گھڑی تحفے میں دی۔ یہ انعام کی صورت راجو کی محبت کا اظہار تھا۔ جسے

میں نے بخوشی قبول کر لیا۔

ایک روز امی اور ماموں کے درمیان میں نے کچھ باتیں سنیں۔ انہیں تسلی تھی کہ میں ان کی خفیہ باتیں نہیں سن رہی۔

”بھائی! شبو ابھی مزید پڑھنا چاہتی ہے۔ اگلے دو برس تک اس کی شادی کے بارے میں سوچیں گے۔“

”بہن! تمہیں نہیں معلوم راجو کی ماں اور ندا شبو سے راجو کی شادی کے لیے راضی نہیں۔ وہ اپنی بھانجی کو بہو بنانے کی فکر اور کوشش میں ہے۔ ہر وقت یہ دونوں ماں بیٹی راجو کے کان بھرتی رہتی ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائیں جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔“ ماموں امی کے کہنے کے بعد بولے۔

”مگر بھائی! شبو کی پڑھائی کا معاملہ ہے اس سے شبو کے ابو کا خواب ادھورہ رہ جائے گا۔“

”اے بہن! شبو کو کوئی نوکری کرنا ہے جو آپ ابھی

مزید اسے پڑھانا چاہتی ہیں۔ میری مامیں تو جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ ہاں اگر شبو مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تو شادی کے بعد یہ سلسلہ جاری رکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اکثر لڑکیاں شادی کے بعد پڑھتی دکھائی دی ہیں۔ باقی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جیسے تمہاری مرضی.....“

”اچھا بھائی! میں تو اس معاملے میں رضامند ہوں مگر ذرا شبو سے تو اس کی رائے لے لوں۔ پھر وہی کریں گے.....“

کچھ دیر بعد ماموں چلے گئے تو میں امی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ مگر ہمارے درمیان مذکورہ معاملے پر کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ البتہ میرے اندر مختلف قسم کے خیالات نے پائل چارھی تھی۔ کہ امی بات چھیڑیں تو میں انہیں کہہ سکوں کہ مجھے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔

ایک روز امی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ راجو ہمارے گھر آ گیا۔ جسے دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہو گیا۔ میں نے اسے خوش آمدید کہا۔

”ست بسم اللہ۔ آج ہم غریبوں کے گھر کا راستہ

کیسے بھول گئے ہو جناب!“

”بھولے سے نہیں، جان بوجھ کر اپنی شبو سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔“ راجو نے اپنا ہتھ بھرے انداز میں میری بات کا جواب دیا تو میرے من میں خوشی کے باعث لڈو پھوٹ پڑے۔

”اچھا، میں تو سمجھی تھی کہ دنیا کی رنگینوں میں کھو کر اپنوں کو بھول ہی گئے ہو۔“ میں نے شلوہ کیا۔

”نہیں۔ میری دنیا بھی تم ہو۔ زندگی بھی تم ہو۔ میں بھلا اپنوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ تمہارے بغیر تو میری زندگی ادھوری ہے۔“

راجو کے متحاس بھرے الفاظ اور والہانہ انداز سے میرے سارے دماغے ختم ہو گئے تھے۔ جو میں نے ممانی اور ندا کے بارے میں سن رکھے تھے۔ کہ وہ دونوں راجو کو ہمارے متعلق جھڑکاتی رہتی تھیں۔ میں نے راجو سے ممانی اور ندا کے سخت رویے اور ان کے مافی خیالات کا ذکر کیا تو اس نے مجھے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے یقین دلایا۔

”شبو! تم لوگ ان کی باتوں کی پروا مت کیا کرو۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔“

میں نے راجو کو کھانا دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

”شبو! مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ لہذا تمہاری طرف ایک امید لے کر آیا ہوں۔ بہت جلد واپس کر دوں گا۔“

میں نے امی کا انتظار کیے بغیر ہی اس کی ضرورت پوری کر دی۔ بھلا میں یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ میرے ہوتے ہوئے راجو کی وجہ سے پریشان ہو اور پیسوں کے لیے کسی اور جگہ ہاتھ پھیلائے۔ اپنی جمع پونجی کی رقم دس ہزار روپے میں نے راجو کو دے دی اور یہ بھی کہا کہ یہ ناقابل واپسی ہیں۔

راجو شکر یہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا اور میں راجو کے کام آ کر دل ہی دل میں خوش تھی۔ پھر روز بروز کی معمولی تنگ کلامی نے ایک دن طویل جنگڑے کی صورت

اختیار کر لی۔ اپنی ماں کی طرح ندانے بھی ماموں کو اپنا فیصلہ دو ٹوک لفظوں میں سنا دیا کہ راجو شبو سے شادی نہیں کرے گا۔ شادی ہوگی تو اس کی خالہ زاد ہمارے ہو گی۔ ماموں نے انہیں سمجھایا مگر دونوں ماں بیٹی نے آسان سر پر اٹھا لیا ممانی نے اچھی خاصی ماموں کی بے عزتی کر ڈالی۔ وہ گھر چھوڑ کر ندا کو ساتھ لے کر اپنے میکے چلی گئی۔ راجو اس جھگڑے کے وقت گھر موجود نہیں تھا۔

ماموں بہت پریشان اور غمزہ تھے۔ یہی نہیں کہ وہ دونوں ماں بیٹی راجو کا رشتہ کسی اور جگہ کرنے کی خاطر گھر چھوڑ گئی تھیں بلکہ اپنی جھوٹی انا کی خاطر مقدس رشتوں کی دھجیاں اڑا کر اچھی خاصی بے عزتی بھی کر گئیں تھیں۔

ایک دن میں نے ماموں سے کہا ”ماموں جان! ہماری وجہ سے آپ کے گھر کی خوشیاں روٹی ہیں۔ ہمیں آپ کی پریشانی دیکھی نہیں جانی لہذا آپ وہی کریں جو وہ چاہتی ہیں۔“ ماموں جان میری بات سن کر بولے۔

”ایسا نہیں ہو سکتا، جب تک میری زندگی کی سانسیں سلامت ہیں انہیں اپنی من مانی کا اختیار میں نہیں دے سکتا۔ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ گرمیوں کے دن تھے۔ امی باہر کھیتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ میں گھر میں اکیلی تھی کہ راجو آ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے بتایا کہ بہت جلد ان کے والدین کی صلح متوقع ہے۔ وہ پوری کوشش کر رہا ہے۔ جس میں بہت جلد کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے بعد راجو نے مجھ سے مزید کچھ رقم کا مطالبہ کیا کہ بہت ضروری کام کے سلسلے میں اسے ضرورت ہیں۔ سابقہ رقم کی ادائیگی کے ساتھ یہ بھی وہ واپس کر دے گا۔

میں نے گھر میں پڑے چار ہزار اسے دے دیے کہ وہ اپنا کام کر لے۔ ہماری خیر ہے۔ دو دن بعد راجو نے مجھے اپنے گھر بلایا کہ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں لہذا ضرور آؤ۔ امی کو میں اپنی کسی سہیلی کے گھر جانے کا کہہ کر راجو کے گھر اس کے پاس روانہ ہو گئی۔ ماموں جان کام پر گئے ہوئے تھے۔

”شبو جیسا کہ تجھے معلوم ہے۔ امی اور ندا چاہتی ہیں

کہ میں تم سے منگنی توڑ کر ہمارے رشتے کے لیے ہاں کہہ دوں۔ جو میرے لیے ناممکن ہے۔ تم میں کیا کمی ہے۔ خوبصورت ہو پڑھی لکھی ہو۔ صاحب جائیداد اور سب سے بڑھ کر مجھے پسند ہو۔ بابا کے ساتھ ان کی جھگڑے کی وجوہات بھی یہی ہیں۔ اسی اختلافات کی وجہ سے پوری برادری میں ہماری بے عزتی اور شرمندگی ہو رہی ہے۔ میں کل ان کے پاس جا رہا ہوں کیونکہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ زندگی میں نے گزاری ہے۔ اختیار بھی مجھے ہے۔ امی اور ندا کو اپنا فیصلہ سنا کر ہر ممکن انہیں گھر لے آؤں گا۔ لیکن پیچھی جان کہتی ہیں ابھی شبو کو پڑھائی کرنی ہے تقریباً ڈیڑھ سال بعد شادی ہو گی۔ جبکہ میں کہتا ہوں۔ ہماری شادی ہو جائے۔ اس طرح تم اپنی پڑھائی بھی جاری رکھ سکو گی۔ دوسرا امی اور ندا بھی میری خوشی کے لیے خاموش ہو جائیں گی۔ ورنہ نامعلوم حالات کیا رخ اختیار کر جائیں۔ میری مانو تو تم خود بھی اس شادی کے لیے سر تسلیم خم کر دو اور اپنی امی کو بھی اعتماد میں لے کر راضی کر لو۔“

”راجو! جوں جوں تلخیاں بڑھ رہی ہیں۔ مجھے تو حالات بہتر ہوتے نظر نہیں آ رہے، تم خود اس سلسلے میں امی سے بات کرو۔ ماموں بھی ساتھ ہوں۔ امی مجھ سے میری رائے پوچھیں گی تو میں انہیں دل کی بات کہہ دوں گی کہ تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔“

”اچھا تم مطمئن رہو انہیں میں رضا مند کر لوں گا۔ آخر وہ میری ماں اور بہن ہیں۔ میری نہ مانیں گی تو کس کی مانیں گی..... پھر دیکھنا شبو جب تم اس گھر میں آ جاؤ گی نا تو خوشیاں ہی خوشیاں ہمارا مقدر ہوں گی۔“

میں دل ہی دل میں خوشی کے باعث خود کو ہوا میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ جب راجو ہی میرا ہے تو پھر کسی اور کا کیا غم۔

”ہم سدا ایک رہیں گے۔ کبھی نہ جدا ہونے کے لیے..... تمہیں نہیں معلوم کہ تم مجھے کتنی اچھی لگتی ہو اور میرے دل میں تمہاری کتنی محبت ہے۔“

راجو نے مجھے اپنی ہانہوں میں لے لیا اور حد سے

گزرنے کے لیے اپنی کوششیں شروع کر دیں۔
 ”نہیں، راجو! ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔
 جب ہماری شادی بہت جلد ہونے والی ہے تو پھر یہ
 شیطانی کام اور وہ بھی گناہ کبیرہ.....؟“

میں نے خود کو اس سے الگ کرنے کی ناکام کوشش
 کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو شیو! تم میری ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ
 میں تجھے بہت جلد اپنانے والا ہوں تو پھر یہ انکار کیسا؟ کیا
 تجھے مجھ پر اعتماد نہیں۔ پلیز انکار نہ کرو۔ شیو تم میری ہو
 اور میں تمہارا..... پلیز شیو..... پلیز!“

میں لڑکی تھی۔ اکیلی تھی اور وہ مرد تھا۔ میری تمام
 اپیلیں، مٹتیں، ساجتیں، مزاحمتیں سب بیکار گئیں۔ راجو
 نے اپنی ہوس پوری کر لی۔ میں خود کو نہ بچا سکی اور اسی
 کے گھر میں لٹ گئی۔

”راجو! تم نے اپنے گھر بلا کر میرے ساتھ اچھا
 نہیں کیا۔ اس سے پہلے کہ میں آنے والے وقت میں
 جگ کا تماشا بن کر موت کو گلے لگا لوں، میں تمہارے گھر
 ہی میں مرنا پسند کروں گی۔ میں نے بجلی کی نئی تاروں کو
 نوچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو راجو نے مجھے بڑے پیار
 سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”شیو! میں اپنے موقف پر سو فیصد قائم ہوں۔ مجھ
 پر بھروسہ کرو۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ ہاں، پرسوں اگر میں
 امی سے بات نہ منوا سکا تو جوجی میں آئے میرے ساتھ
 سلوک کرنا۔ میں خدا کی قسم اٹھا کرتی یقین دلاتا ہوں
 کہ تم سے کوئی دھوکہ نہیں کروں گا۔ بلکہ بہت جلد تم سے
 شادی کر لوں گا۔ ایمان سے.....“

اگر میں اس کی باتوں کا یقین نہ بھی کرتی تو کیا بگاڑ
 سکتی تھی۔ روتے ہوئے راجو کو بددعا میں دیتے، کبھی خود
 کو تسلیاں دیتے ہوئے اپنے گھر آ گئی۔ میری عزت تار
 تار ہو گئی تھی۔ میرا وقار خاک میں مل گیا تھا۔ میں اپنی ہی
 نظروں میں گر گئی تھی۔ زندگی سے بیزار خود سے نفرت سی
 ہونے لگی۔ میں بزدل تھی کہ راجو کا کچھ بگاڑ سکی اور نہ خود
 کو مار سکی۔ اس سے تو بہتر تھا خود کشی کر لیتی مگر یہ سوچ کر

کہ یہ تو گناہ عظیم ہے۔ دوسرا میری ماں کا کیا ہو گا جو
 جگ کی رسوائی کا سامنا نہ کر سکتی اور جیتے جی موت کے
 منہ میں چلی جاتی۔

خداوند کریم دلوں کے راز خوب جانتا ہے کہ اس
 میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ نہ مرضی شامل تھی۔ اپنے
 منگیتر اپنے بی بی خون اور اپنے ہی پیار پر اعتماد کر کے گئی
 تھی۔ جس کی مجھے اتنی گھناؤنی سزا ملی تھی۔

ماموں اپنی بیوی اور بیٹی کو لینے گئے تو ناکام واپس
 لوٹے۔ انہوں نے یہ کہہ کر گھر آنے سے انکار کر دیا کہ
 جب تک راجو شیو سے ممکن توڑ کر ہمارے شادی کرنے کا
 اعلان نہیں کر دیتا۔ وہ دونوں ماں بیٹی گھر نہیں آئیں گی۔

مجھے اپنی امیدوں پر پانی پھرتا ہوا محسوس ہوا۔ مگر
 آخری امید راجو تھی۔ مجھے یقین تھا اگر راجو اپنی بات پر
 بضد رہا تو اس کی ماں اور بہن اپنے مقصد میں کامیاب
 نہیں ہو سکیں گی۔ راجو کی ذات پر آس لگائے دن اور
 راتیں گزرنے لگیں۔ راجو کو ماں کے پاس گئے ایک ماہ
 سے زائد عرصہ گزر گیا تھا۔ مگر ابھی تک کوئی مثبت اور
 واضح صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

ایک روز ماموں کی زبانی معلوم ہوا کہ راجو آ گیا ہے
 مگر اکیلا، ہمانی اور ندا اس کے ساتھ نہیں آئی تھیں دوسرا یہ
 کہ راجو نے کسی بھی صورت مجھے حالات سے آگاہ نہ کیا۔
 اسی انتظار میں ایک ہفتہ مزید گزر گیا۔ مجھے دال میں کالا
 سا محسوس ہونے لگا تھا کہ خیر کی بات نہیں ہے۔ صورتحال
 سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ایک روز موقع ملے ہی
 میں راجو کے پاس اس کے گھر چلی گئی۔ دروازہ بند تھا۔
 میں نے ہلکی سی دستک دی تو چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔
 راجو میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھ پر ایک نظر پڑتے ہی
 دروازہ بند کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر ناگواری اور اجنبی
 پن دیکھ کر میرا دل ٹوٹ سا گیا۔

”افسوس ہے راجو! حال احوال تو بعد کی بات ہے
 سلام نہ دعا؟ اندر آنے کو بھی نہیں کہو گے۔ اس قدر
 غیروں جیسا سلوک اور وہ بھی اپنی شیو کے ساتھ.....؟“
 ”کون اپنی شیو۔ میں تو کسی شیو وغیرہ کو نہیں جانتا۔

تھی۔ میری پلکیں جھپکنے لگی تھیں۔

مگر میں بڑے ضبط کے ساتھ آنسو آنکھوں ہی میں جذب کر گئی۔ شبو کو سینے سے لگایا اور اس کی دھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

”تم حوصلہ رکھو شبو۔ تم بے قصور ہو۔ یقیناً تمہارے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ وہ وقت دور نہیں تم دیکھنا جب ظالم اپنے انجام کو پہنچے گا۔ بس تم از سر نو زندگی کو نارمل انداز سے گزارنا شروع کر دو۔ انشاء اللہ حالات تمہارے حق میں زندگی کی حقیقی نوید لے کر آئیں گے۔ تمہیں جینا ہوگا۔ اپنی ماں کی خاطر اپنی خاطر..... اور راجو کے عبرت ناک انجام کی خاطر..... ویسے بھی مایوسی کفر ہے۔ امید کرنی ہوں شبو کہ میری باتوں پر تم عمل کرو گے۔“

اقرار میں اس نے گردن ہلا دی اور گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا بی بی جی! اب میں چلتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”ٹھیک ہے شبو! خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ زندگی رہتی تو پھر ملیں گے..... اور ہاں اگر کبھی زندگی میں میری ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں گی۔“

شبو گھر چلی گئی۔ اسی دوران شادی کی بقیہ رسومات ادا کی گئیں اور کھانا کھا کر ہم لوگ واپس گھر چلے آئے۔

☆.....☆.....☆

کچھ روز تک شبو کا تصور میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تصور دھندلاتا گیا اور میں اپنی زندگی کی مصروفیات میں مستغرق ہو گئی۔

بسلطہ معاش میرے میاں کو سعودی عرب میں مقیم ایک رشتہ دار نے بلوایا۔ سبھی اخراجات و انتظامات انہی نے ادا کیے تھے۔ اپنے میاں کے بغیر میرا دل اداس رہنے لگا۔ کسی بھی صورت مجھے چین نہیں آ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی اس سرزمین مقدس میں اپنے سرتاج کے ساتھ رہوں۔ میں نے اس خوانش کا اظہار ان سے کیا تو انہوں نے ایک سال بعد مجھے بلایا۔ میرے شب و روز

بہ اتم سے کوئی تعلق ہے اور نہ کوئی رشتہ۔ یقیناً تم غلط جگہ پہنچی ہو۔ اس سے پہلے کہ کوئی یہاں آ جائے اور خواہ وہ کی بدنامی ہو جائے۔ تم واپس چلی جاؤ۔ میں کسی ضروری کام میں مصروف ہوں۔“

’راجو یہ تم کہہ رہے ہو..... تم نے تو مجھے یقین دلایا تھا کہ تم بہت جلد مجھے اپنا لوگے خدا کی قسم اٹھا کر کہا تھا کہ تم فراڈ نہیں کرو گے۔ ہر صورت میرا ساتھ دو گے.....؟‘

میں نے اسے اس کا وعدہ یاد دلانا چاہا مگر وہ اپنے تلخ رویے پر بدستور ڈنکا رہا میری بات کو سننے بغیر وہ دروازہ بند کرنا چاہتا تھا کہ میں جلدی سے اس کے قریب پہنچ کر دروازے کے درمیان میں کھڑی ہو گئی اور احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

”ظالم! تم نے میری شرافت سے فائدہ اٹھا کر مجھے برباد کر ڈالا۔ عزت لوٹ لی میری۔ پھر جھوٹے وعدے اور قسمیں کھا کر اس طرح مجھے یقین دلایا کہ تم بہت جلد مجھے اپنی عزت بنا لو گے۔ اتنا عرصہ میں اسی انتظار میں رہی کہ تم اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے مجھے اپنا لو گے۔ مگر آج میں تمہارے پاس آئی ہوں تو تم مجھے ٹھکرا رہے ہو۔ اپنے تعلق سے انکاری ہو رہے ہو۔ وقتی طور پر تو تم مجھے ذلیل کر کے خود کو آزاد کر رہے ہو۔ مگر یاد رکھو خدا کے غضب سے کبھی نہ بچ سکو گے۔ دنیا و آخرت میں اپنے کیے کی سزا ضرور پاؤ گے.....“

”بکواس بند کرو۔ اپنی منوس شکل لے کر واپس چلی جاؤ۔ جو کرنا ہے کرو۔“ راجو غصے کی حالت میں چلایا۔

میں نے مزید کچھ کہنا چاہا تو اس نے دوپٹہ سرسید کر

دیے اور دروازے ہی سے باہر نکال دیا۔ میں دور جا گری۔ بے بسی سے پلٹ کر دیکھا تو دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اپنی قسمت کا رونا روتی، لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ دیواروں کا سہارا لے کر اپنے گھر پہنچی..... میرے ساتھ راجو نے اچھا نہیں کیا تھا۔ یہی زخم مجھے اندر ہی اندر رکھائے جا رہا ہے۔ بس یہی دکھ ہے جو بہت جلد مجھے قبر تک لے جائے گا۔ شبو اپنی دکھ بھری داستان سن چکی

انتہائی مسرور کن اور ایمان افروز گزرنے لگے اور پورے چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ اپنے دیس کی یاد اور والدین و رشتہ داروں سے ملنے کی امنگ جاگی تو پانچویں برس ہم اپنے وطن لوٹ آئے۔

ہمارا گھر خوشیوں اور رونقوں کا مرکز بن گیا اور گرد و اور دور دراز سے رشتہ دار اور جاننے والے ہمیں ملنے کے لیے آنے لگے۔ جن میں ارشد بھائی اپنی فیملی کے ہمراہ آئے تھے۔ راشدہ بھائی اور ارشد بھائی کی خوبصورت جوڑی مثالی ثابت ہوئی تھی۔ ان کے دو بچے بیٹا اور بیٹی بڑے ہی پیارے لگے تھے مجھے۔ دو دن ہمارے ہاں ٹھہرنے کے بعد یہ لوگ واپس گھر چلے گئے مگر ہمیں اپنے گھر آنے کا خلوص دل سے دعوت نامہ دیتے گئے۔ ہم ایک ہفتہ بعد ارشد بھائی کے گھر گئے۔ بڑے خلوص و پیار سے انہوں نے ہماری آؤ بھگت کی۔ ان کے والدین، رشتہ دار، سبھی نے ہماری خدمت و عزت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ماضی میں بیتے لمحات کی یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔

میں برآمدے سے اٹھ کر راشدہ کے ہمراہ ان کے کمرے میں گئی تو شیاف میں رکھی ایک پرکشش خدوخال والی کسی لڑکی کی تصویر پر میری نظر پڑی۔ جسے دیکھتے ہی قدرے شناسائی کا احساس ہوا۔ ذہن پر کچھ زور دے کر غور کیا تو مجھے پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔

یہ شبو کی تصویر تھی..... شبو کی تصویر اور اس گھر میں..... حیرانگی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں بھائی! یہ میری سہیلی کی تصویر ہے۔“ بھائی نے میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

”جس کا نام شبو ہے۔“ میں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

”تو گویا بھائی آپ اس کو جانتی ہیں؟“ بھائی نے حیرت بھری نظروں سے مجھ سے دریافت کیا۔

”صرف جانتی ہی نہیں بلکہ آپ کی شادی تک کے اس کے حالات سے بھی واقف ہوں.....“ میں نے

قدرے تفصیل کے ساتھ شبو کے بارے آکاہ کیا۔ جتنا میں جانتی تھی یا جو اپنے بارے شبو نے مجھے بتایا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھائی سے شبو کے متعلق پوچھتی۔ انہوں نے خود ہی اس بیچاری کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے لب کشائی کی۔

”شبو نے رو دھو کر اپنا معاملہ اللہ کی عدالت پر چھوڑ دیا تھا۔ راجو اپنی ماں، بہن کی مرضی کے مطابق وہ سب کچھ کرنے لگا جو وہ چاہتی تھیں۔ شبو کے ماموں نے احتجاج کیا مگر انہوں نے نا صرف اپنی من مانی کی بلکہ بے عزت کر کے گھر کے سر براہ کو بھی گھر سے نکال دیا۔ وہ بے چارے دھکے کھا کر اپنی بہن اور بھانجی کے پاس آ گئے اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی اور ساتھ ہی ان سب کو اپنی جائیداد سے بھی عاق کر دیا۔

راجو کی ماں ندا کو لے کر اپنی بہن کے پاس راجو کا رشتہ لینے گئیں مگر ہما کے والد نے نا صرف اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا بلکہ خوب برا بھلا بھی کہا۔ کہ راجو جیسے گھٹیا قسم کے آوارہ اور والد کے نافرمان و گستاخ لڑکے کو اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دے سکتے۔ جائیداد سے عاق ہونے والی اولاد کبھی کسی سے مفلس نہیں ہو سکتی۔

اپنی بے عزتی و رسوائی کا گہوارا رخ اور شکست کا تاثر لیے دونوں ماں بیٹی گھر پہنچیں اور راجو کو باجرا کہہ سنایا اب اس گھر میں خوشیاں برائے نام رہ گئی تھیں۔ وہاں نحوست و بدبختی نے ڈیرے ڈال لیے۔

راجو ہما کو پسند کرتا تھا اور اس کی ماں اور بہن بھی یہی چاہتی تھیں کہ اس گھر میں ہما بہو بن کر آئے۔ مگر جب ہما کے والد کے ہاتھوں خوب بے عزتی و ناکامی ہوئی تو اسی شرمندگی اور صدمے نے راجو کو بستر مرگ پر پہنچا دیا۔

ہما کی ایک کھاتے پٹیتے گھر آنے میں شادی کر دی گئی جہاں وہ خوشحال و کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ ندا جس جگہ بیوی پارلر میں کام کرتی تھی۔ وہاں ایک اور فرج نامی لڑکی بھی ملازمت کرتی تھی۔ ایک ہی جگہ اکٹھے کام کرنے سے ان دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا

رہتا تھا۔ فرح کی ملاقات راجو سے ہوئی تو بات شادی تک جا پہنچی۔

وہ کتنا دردناک منظر ہو گا۔ جب رگد اکھوتا بیٹا دو لمبے کے روپ میں بارات کے ساتھ جا رہا ہو گا۔ اور باپ غم و اندوہ کی ملی جلی کیفیت میں غیروں کی طرح بارات کو جاتا دیکھ کر آنسو بہا رہا ہو گا۔ جس میں وہ شامل نہ ہو سکا اور نہ اسے بلایا گیا۔

شادی کے بعد راجو نے فرح کو دکان پر کام کرنے سے روک دیا۔ ندا اب تنہا دکان پر جانے لگی اور ساتھ اپنے پروپر انٹرانچم کے ساتھ عشق کی پیٹنیں بڑھانے لگی۔ اس تمام صورتحال کو فرح نے راجو تک پہنچایا۔ راجو نے اپنی بہن ندا کو تبھایا اور دکان پر جانے کے لیے بھی منع کر دیا۔ ندا نے ناصر انکار کیا بلکہ اننا بھابی فرح پر بھی الزام لگا دیا کہ اس کے بھی انچم سے تعلقات ہیں۔ اس طرح وہ گھر جنگ کی آماجگاہ بن گیا۔

ایک روز راجو نے ندا کو انچم کے ساتھ کسی جگہ پر اکٹھے موٹر سائیکل پر سوار دیکھا تو شام کو گھر آنے پر ندا کو مار پیٹا۔ اس کا زلزلہ یہ نکالا کہ اگلی صبح ندا گھر سے غائب تھی۔ وہ چائے میں نشہ آور گولیاں کھلا کر انچم کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ راجو اب کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ اس کی بدنامی اور بے عزتی اتنی زیادہ ہوئی کہ گھر میں قید ہو کر رہ گیا۔ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ ندا کو تلاش کر سکتا یا پھر انچم پر کوئی مقدمہ دائر کر سکتا۔ وہ تو اب گھریلو اخراجات کے لیے بھی تنگدستی کا شکار ہو گیا تھا۔ دوستوں سے جو اپنی شادی پر قرضہ لیا تھا۔ اس کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے وہ پہلے ہی بہت پریشان تھا۔ اب تو فرح بھی میکے والوں سے روز روز خرچہ وغیرہ لا کر تھک چکی تھی۔ اسے تو اب محبت کی شادی کرنے پر ملنے ملنے لگے تھے۔

ادھر ندا کی شادی کو دو سال سے اوپر کا عرصہ ہو گیا تھا۔ مگر ابھی تک ان کا آنگن اولاد جیسی نعمت سے محروم تھا۔ ندا کو بعد میں معلوم ہوا کہ انچم پہلے سے شادی شدہ ہے اور چار بچوں کا باپ بھی ہے۔ اس نے شور مچانا چاہا تو اسے سختی سے منع کر دیا گیا کہ اس گھر میں رہنا ہے تو

خاموشی سے رہے ورنہ چپکے سے جہاں جی چاہے چلی جائے۔ اب ندا سوائے رونے اور پچھتانے کے کیا کر سکتی تھی۔ اسے اس گھر میں تسلیم کیا گیا اور نہ اسے کچھ اہمیت دی گئی۔ سبھی افراد اس سے نفرت کرتے تھے۔ انچم کے بچے ہر وقت اس کی بے عزتی کرتے رہتے تھے۔ وہ انچم سے شکایت کرتی اننا وہ بھی مورد الزام ٹھہراتا۔ لہذا ندا کا اس گھر میں جینا بذات خود ایک عذاب بن کر رہ گیا۔ اس نے تو انچم کی رفاقت کے سببے خواب دیکھتے تھے۔ مگر اب زندگی کا ہر ایک لمحہ اسے ڈسنے لگا تھا۔ ہر وقت خود کو ہینٹی اور روٹی رہتی تھی۔

ماں کی یاد الگ ستانی بدنامی و رسوائی الگ اسے ملی تھی۔ سکون نام کی چیز اور ایک لمحے کی خوشی کو وہ ترس کر رہ گئی۔ مزاج میں چڑچڑاہٹ آ گیا بلکہ ایک نفسیاتی مریض بن کر رہ گئی تھی۔

ایک روز انچم نے اس کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔ ”چلو تمہیں تمہاری ماں سے ملو الاؤں۔ وہ جو کچھ کہیں گی ہم سنیں گے اور اپنی غلطی تسلیم کر لیں گے۔“ ”اگر راجو نہ مانا، تو؟“ ندا نے بھائی کے بارے خدشے کا اظہار کیا۔

”اسے بھی راضی کر لیں گے۔ یہ اتنا سنگین مسئلہ نہیں ہے۔ جتنا تم سمجھ رہی ہو۔“ انچم نے مطمئن کر دینے والے انداز میں کہا۔

کتنے عرصے سے ندا اپنی ماں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرنے کے بارے سوچ رہی تھی کہ انچم نے اس کی یہ مشکل حل کر دی۔

ندا، انچم کے ساتھ اپنی ماں سے ملنے ان کی چار دیواری میں پہنچی۔ راجو اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ ندا کی ماں نے انہیں دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ندانے معافی مانگنے کے لیے ہاتھ جوڑے ہی تھے کہ اس کی ماں نے آسمان سر براٹھا لیا۔

خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ انچم کو تو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اپنی نوجوان ندا کے ساتھ ایک پینتالیس سالہ شوہر کا وجود ایک جھٹکے سے کم نہ تھا۔ دونوں

دو چار سو ندا کو خرج لے لیے دیے اور کہا۔
 ”ان سے فی الحال گزرا کر کے نہیں رہو۔ کیونکہ
 میرے بیوی بچے تمہاری وجہ سے ناراض ہوتے ہیں۔
 بلکہ اب تو میرے والدین بھی اس شرط پر راضی ہوئے
 ہیں کہ تم اپنی ماں کے پاس رہو۔ میں ہر ماہ خرج وغیرہ
 دے کر تمہاری خبر گیری کر جایا کروں گا۔“ ندا پر حیرتوں
 کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

”یہ تم کہہ رہے ہو..... انجمن.....؟“
 ندا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وہ اس کی بات کاٹ کر بولا:
 ”ندا! جس طرح تمہاری ماں اور بھائی کو منانے میں دیر
 نہیں لگی۔ اسی طرح میں اپنے گھروں والوں کو بھی منا
 لوں گا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد میں تجھے یہاں سے لے
 جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ میں تیرے لیے الگ مکان کا
 بندوبست بھی کروں کیونکہ ایک ہی کوٹلی میں ہمارا کٹھے
 رہنا مناسب نہیں۔“

یہ باتیں جاری تھیں کہ راجو آ گیا۔ انجمن نے پیسے
 کے متعلق راجو کو مطمئن کر دینے والے انداز میں کہا۔
 ”میں نے ایک دوست سے تیس ہزار روپے لینے
 تجھے۔ اس نے اگلے ماہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ایک ماہ
 بعد تمہیں رقم ضرور مل جائے گی۔“

راجو نے پس کر خاموشی اختیار کر لی۔ بھلا اس نے
 انجمن سے کوئی قرض تھوڑا ہی لینا تھا جو ناراض ہوتا۔ مگر یہ
 بات راجو کو کھٹکی ضرور تھی کہ انجمن اس سے صرف بہانا بنا
 رہا ہے۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں لگی تھی اسے۔

کچھ روز بعد جب گھر میں فاقے ہونے لگے اور
 کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے گھریلو اخراجات
 پورے ہونا ناممکن ہو گئے تو ندا اور فرح کے درمیان ان
 بن شروع ہو گئی۔ جو روز بروز طول پکڑتی گئی۔ ایک روز تو
 بات باتھا پائی تک پہنچ گئی۔ فرح اپنا سامان سمیٹ کر
 اپنے میکے چلی گئی۔ اور عدالت میں راجو کے خلاف منشیخ
 نکاح کا دعویٰ دائر کر دیا کچھ ماہ بعد وہ راجو سے ہمیشہ کے
 لیے علیحدہ ہو گئی۔

اکلی صبح راجو مردہ حالت میں پایا گیا۔ اللہ جانے اس

میاں بیوی ماں کے قدموں میں گر کر اپنے کیے کی
 معافیاں مانگنے لگے۔ آخر وہ ماں تھی۔ اسے ندا پر ترس
 آ ہی گیا۔ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں۔ ویسے بھی اب کیا
 ہو سکتا تھا۔ وہ تو کب سے اپنے دل میں ندا کو دیکھنے کے
 لیے بے تاب تھی۔

شام کو راجو اپنی بیوی فرح کے ساتھ گھر آیا تو ندا اور انجمن کو
 دیکھ کر غصے سے آگے بڑھا مگر ماں درمیان میں آ گئی۔

”راجو بیٹا! میں تسلیم کرتی ہوں ندا نے اچھا نہیں کیا
 تھا۔ اس میں انجمن بھی برابر کا شریک ہے۔ یہ دونوں اپنی
 غلطی کی معافی مانگنے اور ہم سے صلح کرنے کے لیے
 ہمارے پاس چل کر آئے ہیں۔ کسی کو معاف کر دینا ہی
 انسانی عظمت کی دلیل ہے۔ لوگ تو گھر آئے دشمن سے
 بھی برا سلوک نہیں کرتے یہ تو پھر بھی تمہاری بہن ہے۔
 اور اپنی بہن کے سبب کے لیے انجمن کو بھی معاف کر دو۔
 جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔“

ماں کا پر اثر لکچر ابھی جاری تھا کہ انجمن نے اپنی
 جیب سے پانچ ہزار روپے نکال کر راجو کی جیب میں
 ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہ فی الحال پانچ ہزار روپے ہیں۔ اس سے گھر کا
 خرچہ چلاؤ۔ تم اگر کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہو تو الگ سے
 تمہاری امداد بھی کرنے کو تیار ہوں۔“

راجو کا غصہ کافور ہو گیا کیونکہ وہ تو کوڑی کوڑی کا
 محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔ اتنے سارے نوٹ دیکھ کر ششدرانہ
 ہوتا تو اور کیا کرتا۔ دوسرا یہ بھی کہ اسے انجمن کی طرف سے
 مزید رقم کا عندیہ مل گیا تھا۔ جس سے اس کا قرضہ اتر سکتا
 تھا اور کوئی من پسند کاروبار بھی کر سکتا تھا۔

انجمن اگلے روز گھر روانہ ہو گیا یہ کہہ کر کہ وہ چند روز
 بعد جب ندا کو لینے آئے گا تو راجو کے لیے مزید کچھ رقم
 کا بندوبست بھی کرتا آئے گا۔ جس سے راجو اپنے
 پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گا۔

بختہ پورا گزر گیا مگر انجمن واپس نہ آیا۔ انتظار کی
 گھڑیاں طویل ہوتی گئیں۔ پورے دو ہفتے گزر گئے مگر
 آئی نہ انجمن۔ سواہویں دن انجمن آ گیا مگر خالی ہاتھ۔ صرف

اپنا محسوس ہونے لگا۔ میری آنکھوں میں نمی سی آگئی۔
میں اٹھ کر شبو کی تصویر کے نزدیک ہو گئی۔ وحشہ لائی
ہوئی آنکھوں کے سامنے شبو کا چہرہ غور سے دیکھا۔ تو مجھے
یوں لگا جیسے شبو سکیاں لے کر کہہ رہی ہو۔

”دیکھا بی بی جی! میری محبت کا انجام اور قسمت کا
فیصلہ؟ منزل تو قسمت والوں کو ملتی ہے اور خوشیاں ہر
انسان کے نصیب میں کہاں؟“

آنسوؤں کی لڑیاں میری آنکھوں سے رواں ہو گئیں۔
”شبو! مجھے افسوس ہے میں تمہارے کسی کام نہ
آ سکی۔ تم تو بغیر بتائے کہیں چلی گئی ہو۔ مجھ سے سی
کسی طرح رابطہ کیا ہوتا، میں تمہیں اپنے پاس بلا لیتی یا
پھر کوئی اور تدبیر سوچتے جس سے تم ایک سکون کی زندگی
گزار سکتیں۔“ تصویر اتار کر میں شبو سے بولی۔

”کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی۔“ شبو! میں
نے بھی تو کبھی تمہاری خبر نہ لی۔ اپنی دنیا میں مگن رہی۔
تمہارے بارے کسی سے رابطہ کرنی۔ میں بے وا
ہوں۔“ شبو۔ مجھے معاف کر دو۔“ میں سسکی۔
میں نے دیکھا جیسے شبو کے لب بلے ہوں اور وہ کہہ
رہی ہو۔

”بی بی جی! آپ تو مجھے رونے کے لیے منع کرتی
تھیں۔ اور آج آپ، خود ہی رورہی ہیں۔ ایسا نہ
کریں۔ مجھ سے آپ کا رونا دیکھا نہیں جاتا۔“ پلیز
بی بی جی۔ نہ روئیں۔“ پلیز۔“ میں نے تصویر کو
سننے سے لگا یا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور دیر تک رونی
ہی رہی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے سکون سا آنے لگا تھا۔

ایک احساس، طمانیت کا احساس، جیسے کوئی ایٹوں کو
کھونے کے بعد پالے تو ایک انجانا سا سکون مل جاتا ہے۔
راشدہ بھابی نے مجھے سنبھالا تو دل و دماغ قدرت
نارمل ہوا۔

کمرے سے باہر نکل کر دیکھا تو سورج کی دم توڑنی
کر نہیں دن کے اختتام کی خبر سنا چکی تھیں اور شام کے
سامنے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

کی موت کا سبب خود کشی تھا یا طبعی موت؟ تاہم شکستہ
حالات کے پیش نظر دل برداشتہ راجو خاموشی سے اپنی
زندگی کی یازی بار گیا تھا۔ صرف بات یہاں تک آ کر ختم
نہیں ہوئی تھی۔ راجو کی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی اچانک
جہانی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی تھی۔ ابھی راجو کا سوگم تھا
کہ وہ بھی اپنے بیٹے سے جا ملیں۔

کچھ ہی دنوں بعد نندا کو انجم کی طرف سے ایک لیٹر
ملا۔ وہ سمجھی تھی کہ انجم نے اسے کوئی سر پرانہ دیا ہے یا پھر
کوئی ایسا محبت نامہ جس سے اس کی دھارس بندھانے
کی کوئی راہ ہموار کی گئی ہے۔ مگر لافہ کھلا گیا تو یہ دیکھ کہ
سکتے کی سی حالت میں گر گئی۔ کہ یہ انجم کی طرف سے
طلاق نامہ تھا۔ خوشیاں عارضی ثابت ہوئی تھیں۔ سب
کچھ اس سے چھین گیا اور ہر طرف اسے اندھیرا ہی
اندھیرا نظر آنے لگا۔

راشدہ بھابی سب کچھ بتا کر خاموش ہوئیں تو مجھے
یوں لگا۔ جیسے شبو کی بددعا نہیں اپنا اثر دکھائی تھیں۔ راجو
اپنی پہلی سمیت نشانِ بھرت بن گیا تھا۔ شبو کے ساتھ ظلم
و زیادتی کی سزا بھی پا چکے تھے۔ آخرت کا حساب و
کتاب تو ابھی باقی تھا۔

میری نظر شبو کی معصوم تصویر پر پڑی تو میں نے فوراً
بے صبری سے پوچھا۔

”بھابی! آپ نے بے چاری شبو کے متعلق تو کچھ
بتایا نہیں۔ وہ کیسی ہے۔ کہاں ہے اور آج کل اس سے
ملاقات کہاں ہو سکتی ہے؟“

بھابی نے ایک سرد آہ لیتے ہوئے پر غم آنکھوں کے
ساتھ اس کی تصویر کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
”ہاں بے چاری شبو! جس دن راجو کی شادی تھی۔
تو ایک دن پہلے اس نے گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ اور آج تک
واپس نہیں آئی۔ خدا معلوم کہاں ہے۔ کس حال میں
ہے۔ زندہ بھی ہے یا مر گئی ہے۔ اور اس کا ماموں
زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے۔“

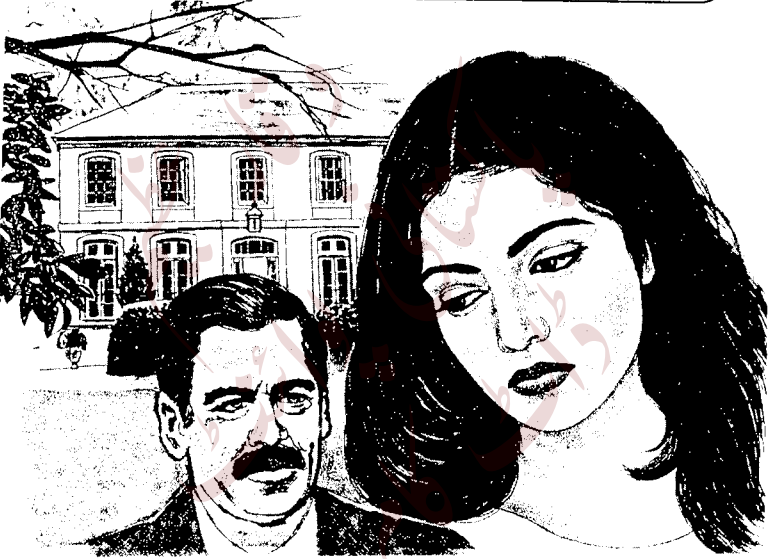
میرا شبو سے خون کا رشتہ تو نہیں تھا۔ صرف
انسانیت کے ناطے خلوص و پیار کا رشتہ تھا اس کا دکھ مجھے

قربانی

مجید احمد جانی آف مائانی

اپنے لیے تو سبھی جیتے ہیں، لیکن
دوسروں کے لیے جینا
ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہی
انسانیت کی معراج ہے۔

ایک شخص کا قصہ جو قربانی کے مفہوم سے آشنا ہو چکا تھا



مسکرا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا میں موسم میں خلتی پیدا کر رہی تھی،
زین آفس کی تیاری کر رہا تھا، صرف ناشتہ کرنا باقی تھا۔
افشاں، اس کی بیٹی، روز صبح سویرے اپنے پاپا جانی
کو ناشتہ تیار کر کے دیتی تھی۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ
سے، زین اسے حد سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ ماں باپ کی
لاڈلی تھی۔ ہر فرمائش پل بھر میں پوری کر دی جاتی تھی۔
گلمت، زین کی بیوی، باپ بیٹی کی محبت دیکھ کر ناز کرتی
رہتی تھی۔
زین برآمدے میں بیٹھا ناشتہ کا انتظار کر رہا تھا۔

”افشاں کہاں ہو؟ جلدی کرو ناں، بہت دیر ہو رہی
ہے۔“
زین نے اپنی بیٹی کو آواز دی، جو کچن میں ناشتہ تیار
کرنے میں مصروف تھی۔
”ابھی آئی پاپا جانی۔“ افشاں نے کچن سے بی
آواز دی۔
عید الاضحیٰ قریب تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر
ہادلوں کے جھرمٹ ایک دوسرے کے ساتھ اٹھلیاں کر
رہے تھے۔ سورج ان سفید، نیلے ہادلوں کا تماشا دیکھ کر

کے ساتھ اقیقہ کا منہ نہانے لگی۔“

زین کا گھرانہ تین افراد پر مشتمل تھا۔ ماں، باپ عرصہ ہوا وفات پا چکے تھے۔ کوئی بہن، بھائی نہیں تھا۔ باپ کی طرف سے وراثت میں اچھی خاصی زمین ملی تھی۔ لیکن زین کو کاشت کاری سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے ٹھیکے پر دے دی تھی۔ وہاں سے اچھی رقم مل جاتی تھی اور خود سرکاری جاب کرتا تھا۔ گھر میں روپے میسے کی کمی نہ تھی۔ رب تعالیٰ نے برنعت سے نوازا تھا۔

زین کی بیوی نگہت..... زین کے آفس میں ہی ساتھ کام کرتی تھی۔ دونوں میں دوستی ہوئی جو محبت میں تبدیل ہو گئی اور بات شادی تک جا پہنچی۔

نگہت کا تعلق غریب گھرانے سے تھا۔ ماں باپ بوڑھے تھے۔ تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ جو ابھی چھوٹے تھے۔ نگہت ہی گھریلو اخراجات پورے کر رہی تھی۔ جب سے زین سے دوستی ہوئی تھی۔ تو زین اس کی ہیلپ کر دیتا تھا۔ اس طرح نگہت کی پریشانی کم ہو جاتی اور گھر میں بہار سماں ہوتا۔

زین اور نگہت کی دوستی جب محبت کا رنگ اپنا چکی تو اس نے نگہت کے والدین سے، نگہت کا ہاتھ مانگ لیا یوں ایک دن نگہت زین کی ہمسفر بن کر آ گئی۔

زین بہت محبت کرنے والا، خوشیاں بانٹنے والا، بہت ہنس مکھ تھا۔ نگہت کے ساتھ شادی کیا ہوئی۔ زین کے گھر خوشیوں کے میلے لگ گئے۔ نگہت بھی بہت خوش تھی۔ اور اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کر رہی تھی۔ جو اتنا اچھا ہمسفر مل گیا تھا۔ زین نے نگہت کے والدین اور بھائیوں کی ذمہ داری بھی سنبھال لی تھی۔

شام کے سائے ڈھلنے والے تھے جب زین آفس سے گھر لوٹا۔ نگہت کی طبیعت خراب تھی۔ زین فوراً اسے ہسپتال لے کر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں افشاں کی صورت میں خوبصورت پری جیسی بیٹی سے نوازا دیا۔ زین بہت خوش تھا۔ اسے خوشیاں ہی خوشیاں مل رہی تھی۔ ہر طرف سے مبارکباد کی آوازیں گون رہی تھیں۔ نگہت کا ساتھ پا کر زین تو کھل اٹھا تھا۔ قدم قدم پر کامیابیاں اس کے

”لے لے لے لے..... بہت دیر کر دیتی ہو۔“

زین نے افشاں کو آواز دیتے ہوئے کہا۔
تھوڑی دیر میں افشاں گرما گرم ناشتہ لے کر آ گئی۔

”لیجئے..... میرے پیارے پاپا جانی..... ناشتہ حاضر ہے۔“

پرائیویٹ کے ساتھ، ساتھ انڈے اور لسی افشاں نے نیبل پر رکھتے ہوئے پاپا سے کہا۔

”اب تم بھی جلدی سے آ جاؤ۔ ورنہ آفس سے پھر لیٹ ہو جاؤ گا۔“ زین نے جواب دیا۔

”ابو آپ شروع تو کریں۔ میں ابھی آئی۔“
دونوں، باپ، بیٹی روزانہ ایک ساتھ ناشتہ کرتے

تھے۔ اس کے بعد زین آفس چلا جاتا اور افشاں اپنے کالج چلی جاتی، نگہت بیگم سارا دن گھر کے کام نہماتی رہتی تھی۔

”پاپا..... جانی.....“ افشاں نے ناشتہ کرتے ہوئے باپ کو مخاطب کیا۔

”ہوں.....“ زین نے نوالہ چباتے ہوئے جواب دیا۔

”پاپا..... اس دفعہ قربانی نہیں کرنی کیا؟ دن تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔ بکرے میاں کب تشریف

لائیں گے؟ ابھی تو میں نے اسے سنا نا بھی ہے۔ مہندی لگانی ہے۔ گلے میں پھولوں کی مالا ڈالنی ہے۔ اس کی خدمت نبھی کرنی ہے۔“

”افشاں بیٹی، بس آج آفس سے واپس آتے ہوئے بکرے میاں کو ساتھ لیتا آؤں گا۔ اب خوش۔“

”چلو..... برتن اٹھاؤ اور جلدی سے تیاری کر کے آؤ۔ کالج نہیں جانا کیا؟“

”پاپا..... ایک تو آپ بھول جاتے ہیں۔ رات کو ہی میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کل کالج سے چمٹی ہے۔“

افشاں نے برتن اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

”اوکے بیٹا اللہ حافظ..... آج اکیلے ہی جانا پڑے گا۔“

زین ناشتے سے فراغت پانے کے بعد، بانیٹ اسٹارٹ کرتا آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور افشاں مٹی

میں قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ زین کافی دیر تک وہاں گھومتا رہا۔ آخر تھک بار کر گھر کی طرف چل پڑا۔

شام کے بادل چھا گئے تھے۔ اندھیرا پھیلنے کو تھا۔ زین اپنے محلے میں پہنچا تو اپنے گھر سے چند گھر پہلے رونے کی آوازیں سن کر رک گیا۔ خدا خیر کرے کیا ماجرا ہے؟ بے اختیار اس کے قدم اس طرف اٹھ گئے۔

وہ گھر آنٹی فاطمہ کا تھا۔ جو عرصے سے اپنی بیٹیوں کے ہمراہ یہاں مقیم تھی۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے آنٹی فاطمہ نے آواز دی۔

”کون ہے؟“

”آنٹی..... میں..... زین۔“

آنٹی فاطمہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
”بیٹا آؤ..... اندر آ جاؤ۔ آج میرے گھر کا راتہ کیسے یاد آ گیا؟“

”وہ..... وہ آنٹی..... ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ سے ملتا جاؤں۔ کافی دن ہو چلے تھے۔ ادھر آنا نہیں ہواناں۔“

زین نے انجان بستے ہوئے آنٹی فاطمہ کو جواب دیا۔

”ہاں بیٹا..... تم تو بھول ہی گئے۔ کون یاد رکھتا ہے ہمیں۔ آخر غریب جو بھرے ہم.....“

آنٹی نے درد میں ڈوبی آواز میں کہا۔
”آنٹی ایسی بات نہیں۔ دراصل آپ کو پتہ ہے

مصروفیات بہت ہیں۔“

”اچھا آؤ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں آؤ بیٹھو۔“
”رائی بیٹی! تیرے زین بھائی آئے ہیں۔ چائے تو

بناؤ۔“

”آنٹی چائے کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی آفس سے پی کر آیا ہوں۔“ زین نے جواب دیا۔

”بیٹا تمہارا اچھا گھر ہے۔ غیروں جیسی باتیں نہ کیا کرو۔“

پھر چائے کے ساتھ ساتھ آنٹی اور زین باتیں

قدم چومتی تھی۔ خوشیوں کے اس حسین سنگھم میں وقت پر لگا کر اتار با اور دو سال مزید بیت گئے۔

افشاں اب محسن میں چلنے لگی تھی۔ نگہت پھر امید سے تھی۔ زین کے گھر خوشیاں رقص کرتی تھی۔ پھر نجانے کس بد نظری کی نظر کھا گئی۔ نگہت کی طبیعت خراب ہوئی تو زین کو آفس سے گھر بلوایا گیا۔ زین کے آتے ہی نگہت کو قریبی ہسپتال لے جایا گیا۔

ڈاکٹروں نے بتایا کہ دونوں میں سے ایک کی زندگی بچ سکتی ہے۔ یا تو بچہ بچ جائے گا یا پھر بچے کی ماں۔ آپریشن ہونا تھا۔

زین کے کہنے پر ماں کو بچایا گیا لیکن ساتھ ہی یہ خبر زین پر قیامت بن کر گری کہ نگہت پھر کبھی ماں نہیں بن پائے گی۔ زین تو جیسے سکتے میں آ گیا۔ زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی قدرت کے آگے کسی کی مرضی چلتی ہے۔ زین بھی قدرت کی رضا سمجھ کر خاموش ہو گیا۔ اب نگہت اور افشاں ہی اس کی کل کائنات تھی۔ انہی کے دم سے اس کی خوشیاں تھیں۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ انہیں کوئی غم نہ ملے۔

نگہت تو پہلے ہی غموں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب سے اس کے ماں، باپ اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ پہلے ماں اور پھر اچانک باپ کی وفات نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اس دوران زین نے اسے بہت سنبھالا۔

نگہت کو ڈرتھا کہ کہیں زین اسے چھوڑ نہ دے۔ لیکن زین پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ وہ سب سمجھتا تھا اور نگہت کو کبھی تنہائی محسوس نہ ہونے دی پھر وقت گزرتا چلا گیا۔ نگہت کے بھائیوں کو نوکریاں دلوا دیں اور انہیں گھر بھی تیار کروا دیے۔ پھر تینوں بھائیوں اور بہن کی شادی بھی عمدہ طریقے سے کر دی گئی نگہت کو اب کوئی غم نہ تھا۔ اس کے بہن بھائی اپنے اپنے گھر کے ہو گئے تھے۔

زین آفس کے بعد بکر منڈی چلا گیا۔ وہاں سے اس نے اپنی بیٹی کی خواہش پر خوبصورت بکرا لینا تھا۔ کافی دیر منڈی میں گھومتا رہا لیکن کوئی بکرا اسے پسند نہ آیا۔ اس کے اندر عجیب سی بے چینی تھی۔ بے سکونی تھی فکر منڈی

کرنے لگے۔

☆.....☆.....☆

افشاں برآمدے میں بے چینی سے کبھی ادھر کبھی ادھر چکر کاٹ رہی تھی۔ خدا خیر کرے ابھی تک پاپائیں آئے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ دوسرے ہی لمحے خیال آیا۔ ہاں آج تو انہوں نے بکرا لینے جانا تھا۔ وہیں دیر ہو گئی ہوگی۔ ہواسے دروازہ بجا تو افشاں دوڑ کر گئی۔ پاپا جانی آگئے ہیں۔ بکرا ابھی لے آئے ہوں گے۔ اسی خیال سے دروازہ کھولا تو باہر تو کوئی بھی نہیں تھا۔ مایوسی سے واپس پلٹ آئی۔ نگہت بیگم افشاں کی بے قراری کو بھانپ چکی تھی۔

”افشاں بیٹی..... ادھر آؤ..... میرے پاس۔“ نگہت نے افشاں کو آواز دی۔

”ابھی آئی ماما.....“ افشاں نے قراری، مایوسی سے دروازہ سے واپس آتے ہوئے بولی۔

”امی ابھی تک پاپائیں آئے، اندھیرا بہت ہو چکا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے خدا خیر کرے۔“ افشاں، نگہت کے پاس بیٹھی ہوئے بولی۔

”بیٹی آتے ہی ہوں گے۔ تم نے انہیں کال نہیں کی؟“

”او..... مائی گاڈ ماما میں تو بھول ہی گئی۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ خواہ مخواہ پریشان ہوئی جا رہی ہوں۔ موبائل کس مرض کی دوا ہے۔ کال کر کے معلوم کر لیتی۔“ موبائل یاد آتے ہی افشاں اپنے کمرے کی طرف دوڑی۔ موبائل اٹھایا تو زین کی کئی مس کالز موجود تھیں۔

”او مائی گاڈ..... میں بھی ناں۔“

افشاں نے بوڑھاتے ہوئے زین کا نمبر ڈائل کر دیا۔

”ہیلو پاپا جانی..... کہاں ہیں آپ؟“

اس نے ایک سانس میں کئی سوالات کر لیے۔

”بیٹی میں بس آنے ہی والا ہوں۔ تم دروازے پر پہنچو کتنی دیر ہو گئی نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھی۔“ زین نے کہا۔

”بس پاپا موبائل اندر تھا۔“

”او کے..... میں ابھی آیا۔“ اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا اور افشاں ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گئی۔

ٹھک ٹھک، زین نے گھر پہنچتے ہی دروازہ کھٹکھٹایا۔ افشاں دوڑ کر گئی اور دروازہ کھول دیا۔ اور پاپا کو خالی ہاتھ دیکھ کر فوراً بولی۔

”پاپا بکرا میاں کہاں ہے.....؟“

”وہ بیٹا..... وہ“

”وہ..... کیا؟ بس..... بس رہنے دیں..... میں نے نہیں بولنا آپ سے۔ اتنے لیٹ بھی ہو گئے اور بکرا ابھی نہیں لائے۔ میں نے مہندی تیار کر لی تھی۔ اس کے لیے پھولوں کی مالا بھی تیار پڑی ہے۔“ افشاں رو ہانسی ہوئے لگی۔

افشاں تو رو ہی پڑتی اگر عین اسی لمحے زین اسے آواز نہ دیتا۔

”افشاں بیٹی۔ میری بات تو سنو۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ زین نے بیٹی کو پیار سے اپنے پاس بلا یا۔

زین نے برآمدے میں بیٹھی نگہت بیگم کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے افشاں کو آواز دی۔ تو وہ موڈ بنائی پاپا کے پاس آ گئی۔

”بیٹی..... میری بات غور سے سنو۔ میں بکرا لینے گیا تھا۔ لیکن کوئی پسند نہیں آیا۔ سو چا صبح آ کر لے جاؤں گا۔ لیکن جب واپس آیا تو.....“

”تو.....“ تو کیا ہوا پاپا۔

افشاں بات کا نٹے ہوئے بولی۔

”وہ آنٹی فاطمہ ہیں ناں.....“ زین پھر گویا ہوا۔

”ہاں کیا ہوا انہیں، بولیں ناں پاپا.....“ افشاں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”بیٹی..... جب میں آنٹی فاطمہ کے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا تو اندر سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں وہاں رک گیا۔ جب آنٹی کے پاس گیا تو آنٹی نے چائے پلائی۔ میں نے رونے کا سبب پوچھا تو آنٹی فاطمہ نے بتایا کہ ”رائی کی شادی کی فکر ہے۔ جو بھی رشتہ آتا ہے، ڈیمانڈ کی لمبی لسٹ تھما دیتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے میرے پاس ہے ہی کیا؟ تمہارے چچا جب سے اس

دنیا سے گئے ہیں۔ گھر کا چولہا بمشکل سے چلتا ہے۔ بیٹیوں کا ساتھ اور بوڑھی بڑیاں کیا کریں؟ آج ہی اک رشتہ آیا تھا۔ انہوں نے رانی بیٹی کو پسند کیا۔ لیکن ساتھ ہی لمبی چوڑی ڈیمانڈ کر دی رانی کمرے میں کھڑی سن رہی تھی۔ جیسے ہی وہ لوگ گئے۔ رانی نے اپنے کو ختم کرنا چاہا اب تک شاید جل بھن گئی ہوتی۔ اگر میں اچانک بچن میں نہ جاتی۔ خدا کسی کو بیٹیاں نہ دے اگر بیٹیاں دیتا ہے تو ان کے نصیب بھی اچھے دے۔

رانی روز، روز کی باتیں سن کر دل برداشتہ ہو گئی ہے۔ کہتی ہے مری جاؤں تو اچھا ہے۔ روز مرنے سے بہتر ہے اک ہی دن جان ختم کروں۔ اب بیٹا میں کیا کروں؟ میرے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے کہ تیری بہن کے ہاتھ پیلے کر سکوں۔ تمہارے چچا زندہ ہوتے تو..... ساتھ ہی آنٹی رونے لگی۔

میں نے انہیں تسلیاں دی کہ آنٹی آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اپنی رانی بہن کی شادی کروں گا اور دھوم دھام سے کروں گا۔ اتنا جہیز دوں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ آپ بس جو رشتہ بھی آئے ہاں کر دیجئے گا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ بیٹی..... میں آنٹی فاطمہ کو تسلیاں دیتا، وہاں سے لوٹ آیا ہوں۔ اب تم بتاؤ میں نے غلط کیا۔

تم مجھے جان سے زیادہ پیاری ہو۔ تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں نہیں دیکھ سکتا۔ پر بیٹی رانی کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاؤں گا۔ ہمسایوں کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ ان کو ہماری ضرورت ہے۔ ہم ان کے کسی کام آئیں گے تو کوئی ہمارے بھی کام آئے گا۔ تمہارے لیے ہزاروں بکرے قربان کر دوں گا۔“ زین پار اور درد کے طے جلے جذبات میں بہت کچھ کہہ گیا۔ آنکھیں میچنے لگیں۔ تو افشاں پایا کے کندھے سے لگ گئی۔

”نہیں پایا..... ایک بات بولوں۔“

”کیوں نہیں بیٹی..... بولو۔“

”پاپا اگر اس دفعہ ہم قربانی نہ کریں اور رانی کی

شادی دھوم دھام سے کر دیں تو کوئی مضائقہ تو نہیں۔“ افشاں یہ کہتی ہوئی کمرے کی طرف چلی گئی اور زین اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

نجانے افشاں یوں اچانک اندر کیوں چلی گئی ہے۔ زین کے ذہن میں خیال آیا۔ تھوڑی دیر میں افشاں آئی تو ہاتھوں میں کافی رقم تھی۔

”پاپا یہ رہی میری جمع پونجی۔“

”میں اس کا کیا کروں افشاں بیٹی۔“

”پاپا..... میری طرف سے یہ روپے رکھ لیں اور رانی کے لیے کپڑے خرید لیں۔ رانی کی شادی ہم دھوم دھام سے کریں گے۔ عیدیں تو زندگی میں ہزاروں آتی ہیں۔ ہم گلی دفعہ بکرے میاں کو راضی کر لیں گے۔“ مذاق کے موڈ میں افشاں نے پاپا سے کہا تو زین مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

عید گزر گئی تو آنٹی فاطمہ کے گھر ایک رشتہ آیا۔ آنٹی فاطمہ نے فوراً ہاں کر دی۔ ادھر زین نے رانی کے لیے جہیز خریدا اور خوب سامان اکٹھا کر دیا۔ آنٹی فاطمہ زین کے صدرے واری جاری رہی تھی۔ افشاں رانی کو چھیڑے جا رہی تھی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب رانی اپنا پیا گھر سدھا رہ گئی۔ افشاں بہت خوش تھی۔ اس نے رانی کو خوب سجا یا، مہندی لگائی، بہت سے ڈیزائن بنائے۔ تاروں کی چھانوں میں دعاؤں کے نذرانے دیتے ہوئے دونوں باپ بیٹی گھر کو لوٹ آئے یوں افشاں اور زین کی چھوٹی سی پیکلی سے ایک بیٹی ایک بہن کی زندگی بچ گئی۔

دونوں باپ بیٹی گھر آئے تو نگہت مٹھائی کے ساتھ پھولوں کے بارے لیے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ افشاں کے لیے دوسری خوش خبری تھی۔ وہ بی اے کے امتحان میں فرسٹ آئی تھی۔ اس کی قربانی کام آگئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے خوشیوں سے نواز دیا تھا اور نگہت نیگم کہہ رہی تھیں زین میں نے افشاں کے لیے دولہا دیکھا ہے یہ سن کر افشاں شرماتے ہوئے پاپا کے کندھے سے لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

اجنبی راستے

خوین حسن

وہ سراپا وفاق تو تھا مگر نہ جانے کب اُس سے ایک بھول ہو گئی۔
ایک بے صبریے کی کہانی اُس نے اپنی محبت کا روپ کسی اور چھاؤں میں ڈھونڈ لیا تھا
دو چھلکتے نیشنل کا قصہ، صدیوں پرانی محبت کی نئی نویلی کہانی





”آپ نے بلایا مجھے؟“ وہ بہت غلت میں
 میزہیاں اترتا ڈانگنگ ٹیبل تک آیا۔
 ”ہاں بیٹا میں نے بلایا تھا آپ کو، ارے کبھی کبھار
 تو آپ چھٹیوں میں گھر آتے ہو اور وہ بھی اپنے روم
 میں یا باہر آوارہ گردی میں گزار دیتے ہو، دو گھڑی ہمیں
 بھی ٹائم دے دیا کرو، آخر ہم بھی تمہارے کچھ لگتے
 ہیں۔“

زریاب حیدر نے پیار سے بیٹے کو گھر کا جبکہ ساتھ
 والی کرسی پہ بیٹھی ستارہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئی۔ ریان
 حیدر بادل خواستہ بیٹھ گیا۔ پایا نے اپنے ہاتھ سے بریڈ
 پہ مکھن لگا کر اس کی پلٹ میں رکھا۔
 ”دھیان سے کھاؤ بیٹا، ناشتہ میں غلت نہیں کرنی
 چاہیے۔“ انہیں آج بیٹے پہ بہت پیار آ رہا تھا اور یہ
 بات ستارہ بیگم کو ہنسنے پر بھی تھی۔
 ”ارے زریاب صاحب! اس طرح کی سر پھری
 اولاد سے بھتر ہے کہ اولاد ہو ہی نہیں، لگتا نہیں کہ یہ
 آپ جیسے ڈینٹ انسان کا ہے۔“ آخر ستارہ کی زبان
 نے زہرا گل ہی دیا۔

ریان نے نظریں اٹھا کر اس بھی سنوری ہوئی اپنے
 باپ سے بہت کم عمر کی عورت کو دیکھا۔
 اسے یاد تھا کہ کیسے بابا اس ماڈل کی زلفوں کے
 اسیر ہوئے تو ماما بہت روئیں، بابا کے سامنے التجائیں
 کیں مگر بابا اس چڑیل کو گھر لے ہی آئے۔ ماما اندر ہی
 اندر گھلتی رہیں اور اسے اکیلا چھوڑ کر سکون سے اس دکھ
 کی نگری کو چھوڑ گئیں۔ پیچھے رہ گیا اکیلا ریان، تو اسے
 بابا نے باسل داخل کر دیا۔
 ”تم اپنی گندی زبان بند رکھو“ ایک جھٹکے سے کرسی
 پیچھے گراتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا پیچھے
 ستارہ غصہ سے چلائی اپنے روم کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

رات کے نہانے کس پہر اس کی آنکھ کھلی تو اسے
 سخت پیاس محسوس ہوئی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے بیلڈ
 کی سائیڈ پہ پڑے گلاس کی تلاش میں آگے بڑھا۔ گلاس

جب رات کی ناگن ڈستی ہے
 نس نس میں زہر اترتا ہے
 جب چاند کی کرنیں تیزی سے
 اس دل کو چیر کے آتی ہے
 جب آنکھ کے اندر ہی آنسو
 زنجیروں میں بندھ جاتے ہیں
 سب جذبوں پہ چھا جاتے ہیں
 تب یاد بہت تم آتے ہو
 دل چلی گئی..... ہمیشہ کے لیے چلی گئی..... شب کی
 تاریکی میں دور تلک سناٹا چھایا تھا۔ گاؤں کی خاموشی
 میں وقفے وقفے سے چھینگروں کی آوازیں یا آوارہ کتوں
 کی بھونکنے کی آوازیں ماحول میں اشتعال پیدا کر رہی
 تھیں۔ اس کا خوبصورت سراپا، مومی ہاتھ اور چاند سا
 چہرہ..... سب ایک دھندلا سا نشان بن کر رہ گئے تھے۔
 اس ایک بیڑھ ہفتے کی قید تہائی نے اسے بخر
 زمین ساختہ حال بنا دیا تھا۔ یہ بات تصور کی حد تک بھی
 خوفزدہ کر دیتی ہے کہ ایک مردہ شخص کی فرش پہ بکھری
 باقیات کے ساتھ دن رات گزارنا..... مجھے میرے ضمیر
 نے کچوکے لگانے شروع کیے مگر اب تو بہت دیر ہو چکی
 تھی۔

”اوہ میرے خدا، میں نے اس انتقام کی بھٹی میں
 جل کر کیا کر دیا۔“ لائٹر کی مدھم روشنی کمرے کے پتھوں
 بیچ لٹکے اس کے وجود کے گرد دائرہ بنارہی تھی۔ پتھوں سے
 لٹکا وجود اس عہد کے ظالم ترین انسان ریان حیدر کے ظلم
 کی منہ بولتی تصویر تھا۔ وہ ظالم اب شکستہ حال قدموں
 سے چلتا اس کے قریب آیا اسی لمحے کمرے میں رچی
 ایک ہفتہ بھر پہلے قتل ہوئے انسان کی باقیات سے اٹھتی
 ہو اور رات کے سناٹے میں روح کو چہرے کی جھنجھوٹی اس
 کے اسنے ضمیر کی ملامت نے اس کے پیروں سے جان
 نکال لی تھی اب وہ وہیں ڈھے گیا تھا۔ دولاٹوں کے
 پاس، ایک زندہ لاش کی صورت.....

☆☆☆

ایک نو مہر لڑہ تھا۔ گارڈز نے اسے روم میں لے جا کر اندر بند کر دیا اور باہر سے لاک لگا دیا۔ وہ چیختا رہا اور دیر تک دروازہ توڑنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کرتا رہا مگر..... آخر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ وہیں ڈھس گیا۔

☆☆☆.....

اس حادثہ کے بعد جلد ہی اسے باطل داخل کر دیا گیا۔ ستارہ بیگم نے دونوک کہہ دیا تھا کہ اسے ڈر لگتا ہے کہ کسی دن موقع پا کر وہ اسے قتل ہی نہ کر دے۔

پاپا سے اس نے بہت مار بھی پڑوائی تھی۔ انہوں نے اسے اتنا مارا تھا کہ تھک بار کر صوفے پر ڈھس گئے تھے۔ مگر ریان نے ایک سسکی بھی نہیں بھری تھی۔ وہ چپ چاپ مار کھاتا رہا جیسے پتھر کا مجسمہ ہو۔ مگر اس نے نگاہ اٹھا کر اس ڈائن کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے اتنا زہر، اتنی نفرت تھی کہ ایک لمحہ کو ستارہ جیسی چالباز عورت بھی گھبرا گئی اور خوفزدہ ہو کر اپنے روم کی جانب بڑھ گئی۔

وہ رات ستارہ نے گھر سے باہر گزاری تھی کہ وہ اب ایک پل اسے یہاں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پاپا نے اسے روم میں بند کر دیا وہ رات اس نے گھر میں ایک قیدی کی طرح گزاری۔ رات آہستہ آہستہ بتی جاتی رہی تھی۔ اسے ایک پل سکون نہ تھا۔ وہ دونوں گھنٹوں کے گرد بازو لپیٹے روئے لگا۔ اسے یوں لگا کہ وقت مزید بیتا تو اس کا دل غم سے پھٹ جائے گا۔ وہ اٹھ کر اپنی رائٹنگ ٹیبل تک گیا۔ قلم اٹھایا اور وہیں ڈائری کھول کر بیٹھ گیا۔

”ڈائن..... چیل، گھنٹیا عورت.....“

اس کے دل میں جو آیا لکھتا گیا۔ ستارہ کے لیے اپنی نفرت کا بھرپور طریقے سے اظہار اسے اندر ہی اندر سکون بخش رہا تھا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ آنسو دھیرے دھیرے اس کے گال بگڑتے رہے اور وہ سب لکھتا رہا، جو کہ نہ سکتا تھا۔ اس کے اپنے لفظوں نے اسے متاسی آغوش بخشی تھی۔ رات بتی رہی اور لفظ اس کی ہمرای

س نے ہاتھ میں آ لیا۔ وہ اپنی منہرہ بند۔ یہ ہی پڑا تھا۔ بپ کی دھم روشنی میں اسے جگ بھی نظر آ گیا مگر جگ سے پانی گلاس میں اندھیلے ہوئے اسے احساس ہوا کہ جگ بالکل خالی تھا۔

”اوہ ماما جان! آپ کیسے بھول گئیں کہ میں رات کو پانی پیتا ہوں ورنہ مجھے برے برے خواب سنا تے ہیں۔“ ریان حیدر خود سے مخاطب تھا۔ وہ منید میں ڈوبی آنکھیں ملتا بید سے اترا، چیل پہنے اور چلتا ہوا روم سے باہر آ گیا۔

مگر..... مگر یہ کیا ڈائننگ ہال میں ہر جگہ روشنی ہی روشنی تھی۔ کسی انگلش گلوکار کی آواز چہار سو بھری تھی اور مرد و زن بانہوں میں بانہیں ڈالے ناچنے میں مشغول تھے۔ اسے سب یاد آئے لگا۔ ماما یہاں نہیں تھیں۔ وہ تو یہ دنیا جھوڑ کے دور کسی انجان وادی میں چلی گئی تھیں۔ گلاس ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں آگے بڑھتا گیا۔ کچھ دور اسے پاپا نظر آئے مگر

وہ مدہوشی میں جھوم رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک سیاہ فام پتلی سی لمبی لڑکی ناچ رہی تھی اس کی حالت بھی پاپا جیسی مدہوش والی تھی۔ ہال میں ہر سو شراب و شباب کی بو پھیلی تھی۔ وہ نیم برہنہ عورتیں اور ان کے ہمراہ ناچتے نفس پرست مرد۔

اچانک اس کی نظر ستارہ پہ پڑی۔ وہی گھنٹیا ڈائن جس کی وجہ سے اس کی ماں دنیا سے چلی گئی۔ اس لمحہ اس تیرہ سالہ نو عمر لڑکے کے اندر آندھیاں چلنے لگیں۔ وہ تیزی سے چلتا اس گھنٹیا عورت کے قریب پہنچا جو کسی انجان مرد کی بانہوں میں بانہیں ڈالے مورخہ تھی۔ ریان نے ہاتھ میں پکڑا گلاس پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔

فضا میں ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی اور ہر جانب افراتفری پھیل گئی۔ گارڈز نے بے قابو ہوتے ریان کو پکڑ لیا۔ اس کے پاپا اور چند لوگ اس گھنٹیا عورت کو ہاسٹیل لے جانے کو باہر بھاگے۔ خوشیوں، فتنہوں سے بھری محفل میں خوف و ہراس پھیل گیا اور اس کی وجہ

معاف نہیں کروں گا کبھی بھی نہیں۔

☆☆☆.....

ڈیئر ڈائری!

آج میں اپنے کالج کا بیسٹ پلیئر ہوں، میں ہر تقریری مقابلے میں کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہوں، مگر اس دفعہ مجھے کچھ خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ کالج میں تقریری مقابلہ منعقد ہو رہا ہے اور صوبے بھر کے بڑے بڑے کالج اس میں شمولیت کریں گے مگر ایک نئے اسٹوڈنٹ ڈیشان سکندر میں کچھ ایکسٹرا کوالیفیز ہیں، نیچر زکو لگتا ہے کہ وہ ایک اور ریان حیدر ثابت ہوگا۔

مگر..... مگر ریان کی جگہ یا اس جیسا وہ کیسے بن سکتا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس کا خون پی جاؤں۔ میرا ریکارڈ وہ کیسے توڑ سکتا ہے۔ میں نے خود کو بنانے کے لیے کتنی محنت کی، کتنی اذیت سے گزرا اور آج وہی اسٹوڈنٹس مجھ سے دوستی کے خواہاں ہیں جو مجھے بدتمیز کہتے تھے۔ مجھے اپنے تھیل میں شامل نہیں کرتے تھے۔ میں ڈیشان کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ..... بابا بابا، ارے میری جان تیرا تو میں کل بینڈ بجاؤں گا، ذرا صبر تو ہونے دے..... بابا بابا، گڈ نائٹ سویٹ ڈریز.....

☆☆☆.....

”ہیلو! ڈیشان سکندر سے بات کرادیں۔“

ایئر بیس سے ابھرتی دلکش نسوانی آواز اسے حیران کر گئی وہ پہچان کے مراحل طے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”جی میں ہی ڈیشان سکندر ہوں، مگر آپ کون ہیں محترمہ؟“ وہ حیرانی سے بولا تو وہ والی مزید چمکنے لگی۔

”ارے ڈیشان مجھے بھول گئے مگر میں تو تمہیں نہیں بھول سکتی۔ تم تو میری سانسوں میں بے ہو اور میرے دل کی ہر دھڑکن پہ تمہارا نام ہے۔“

وہ سیدھا سا وہ انسان بری طرح گھبرا گیا۔ ”سوری

میں نے آپ کو نہیں پہچانا؟“

”نام تو نہیں بتا سکتی مگر آپ نہیں جانتے ہیں آپ سے کس قدر.....“ ڈیشان نے کال ڈراپ کر دی۔

میں درد کا صحرا عبور کرتے اس کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑے چلتے رہے۔ اس کے دل کو قرار سا آ گیا تھا۔ اس نے اپنے غموں کو لفظوں کے ذریعے صفحے پر بکھرتے دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دوست مل گیا ہے۔

اب وہ اکیلا نہیں تھا اور اس احساس نے اسے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ صبح کا سورج اسے یکسر تبدیل کر چکا تھا۔ یہ نئی صبح اسے بیدار کر کے ایک نئی منزل کی جانب رہنمائی کر رہی تھی۔ پاپا نے کمرہ کھولا تو ان کا لہجہ و انداز قدرے بہتر تھا۔

”چلو بیٹا! آپ فریش ہو جاؤ، رحیم بابا آپ کا سامان پیک کرتے ہیں، آپ کو آج باٹل جانا ہے۔ میں آفس جاتے ہوئے آپ کو ڈراپ کرتا جاؤں گا سو بری اپ ٹینگ مین.....“ پاپا اسے ہدایات دیتے روم سے باہر نکل گئے۔ وہ خاموشی سے واش میں چلا گیا کہ یہ تو اس نے سوچ ہی لیا تھا کہ اب رونا نہیں، رانا ہے صرف رانا ہے۔

☆☆☆.....

”ڈیئر ڈائری!“

پاپا مجھے شہر کے مینے سکول کے ایک باٹل میں لے آئے۔ یہاں سکول میں کوئی اسٹوڈنٹ مجھے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اگر مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پہ غصہ آ جاتا ہے تو کیا غلط ہے۔ میرے ساتھ زندگی نے جیسا گیم کھلایا۔ اگر ان سب اسٹوڈنٹس کے ساتھ ایسا ہو تو پھر پوچھوں گا کہ تم سب کیسے خوش رہ پاتے ہو؟ کوئی بھی تو میری جانب دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ میں ماں کے بعد اس بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ وہ زندہ تھیں تو میریائف کتنی کمپلیٹ تھی۔ میرے بہت سے فرینڈز تھے، میں محفل کی جان تھا مگر آج..... آج وہ سب چھوڑ گئے۔ ماں میرے کھانے پینے کا دھیان رکھتی میرے روم کی ڈیکوریشن، میری برتھ ڈے، میری ہر کامیابی کو بھرپور طریقے سے سیلبریٹ کرتیں مگر اس گھٹیا عورت، ڈائن نے میری ماں کو مجھ سے جدا کر دیا، میں اسے بھی

وہ ہاتھ میں گلفٹ پکڑے اس بیٹھ تک آیا جس پہ
دانی ریڈ ساڑھی اور وگ لگے نل میک اپ میں بیٹھا
تھا۔ دانی کے نین نقش اور ذیل ڈول بہت نہیں تھے۔ تو
ہم نے اسے پری ویش کا کردار بنادیا اور فون پہ ڈیٹان کو
یاگل بنانے والی بھی ہمارے گروپ کی ضویا تھی۔ اسے
ایکٹنگ کا شوق تھا اور ہم نے اسے یہ موقع فراہم
کیا۔۔۔۔۔ بابا بابا۔

مگر وہ سامنے آنے سے کتراری تھی کہ کالج میں
وہ ہمارے ساتھ رہتی تو ڈیٹان اسے فوراً پہچان لیتا۔

جوہنی ڈیٹان قریب آیا، دانی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔
اپنے ہاتھ میں پکڑا سرخ گلاب بہت شرماتے لگاتے
اسے پیش کیا۔ جسے جھپکتے ہوئے اس نے تقام لیا۔ ہم
سب فرینڈز جو ادھر ادھر چھپے یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔
بہتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ہم سب کے ہاتھوں میں
سرخ گلاب تھے۔ جن کی پتیاں توڑ کر ہم اس پہ پھینکنے
لگے۔ دانی نے اسی طرح شرماتے ہوئے ڈیٹان کے
ہاتھ میں پکڑا گلفٹ تقریباً ایک لیا۔ سب تالیاں پیٹ
رہے تھے اور ہمارے قہقہے فضا کو چرتے سامنے کھڑے
اس شخص کو شرمندگی و ندامت کا احساس دلارہے تھے۔
اس کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا اور اس کی
آنکھوں میں ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ ہم دس بارہ
فرینڈز نے اس کا خوب ریکارڈ لگایا۔ دانی نے گلفٹ
کھولا تو اس میں خوبصورت ہینڈ وائچ تھی۔

”بابا بابا بھئی دانی یہ تم اپنی گرل فرینڈ کو دے دینا
کیونکہ اس ڈرامے میں تم نے بہت ایشیئل رول پلے کیا
ہے۔“

میں یہ کہتا ڈیٹان کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔
”نہیں اب کیا ہو گیا ہے، کالج میں تو بہت بڑھ
چڑھ کر اچھڑ کرتے ہو اب بھی گردناں، اب کیوں بھیگی
جلی بنے ہو۔“ میں یہ کہتا ہوا زور زور سے قہقہے لگانے
لگا۔ اس نے ایک نفرت آمیز نظر مجھ پہ ڈالی اور لمبے
لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا اور پیچھے ہم سب کے
قہقہے بلند ہوئے مگر اچانک ضویا ہمارے سامنے آ گئی۔

بے وقوف اپنا اور دوسروں کا نام ”ویسٹ کرتی ہیں
ایسی لڑکیاں۔“ اس نے دل میں سوچا اور تھوڑی دیر بعد
وہ اس لڑکی اور اس کی باتوں کو یکسر بھلا چکا تھا مگر یہ
سلسلہ رکنا نہیں وہ چاہے فرینڈز کے ساتھ ہو یا سٹڈی
میں مصروف، صبح و شام اس کے ایس ایم ایس اور کالز
سے عاجز آ گیا۔ آخر تحک بار کر اس نے دو نوک بات
کرنے کا فیصلہ کر بی لیا۔ مگر اس کی بے تائیاں ڈیٹان
سکندر کو گھائل کر بی گئیں۔

اب اس کا دن اس لڑکی کی کھلتی آواز سے شروع
ہوتا۔ وہ اسے کال کرتا یا وہ خود کمریتی پھر سارے دن کی
پلاننگز کی جاتیں اس کا حلقہ احباب محدود سے حدود ہو
گیا۔ پڑھائی میں اس کی دلچسپی صفر ہو گئی۔ تقاریر میں
نمایاں پوزیشن لینے والا ڈیٹان اب بہت پیچھے رہ گیا۔
جہاں اس کے والدین پریشان تھے، تو اساتذہ اس سے
زیادہ حیران مگر کوئی نہیں جان پایا کہ یہ ایک سوچی سمجھی
سازش کا نتیجہ تھا۔

آخر بہت اصرار پر پری ویش اس سے ملنے پر آمادہ
ہو گئی۔ آج اسے اپنی محبت کا دیدار کرنا تھا۔ وہ صبح سے
ہی بے چین رہے قرار شام پانچ بجنے کا انتظار کرنے
لگا۔ حتیٰ کہ صبح سچ طرح ناشتہ بھی نہ کیا۔ پھر کپڑوں کی
سلیکشن میں بھی پری ویش کا فیورٹ کمریڈ ٹی شرٹ اور
بلیک پیٹ کا انتخاب کیا۔ ساڑھے چار بجے وہ تیار ہو کر
گنگنا تا ہوا بلیک کی چابی گھما تا گھر سے نکلا۔

☆ ☆ ☆

ڈیز سیٹ ڈائری!

آج میں بہت خوش ہوں، مجھے اپنی ہنسی پہ کنٹرول
مشکل ہے۔ آج ہم فرینڈز نے شام پانچ بجے ڈیٹان
سکندر کو ڈیٹ پہ بلایا۔

بلکہ نہیں ہم نے نہیں بلکہ ہماری فرینڈ ضویا نے
ہمارے کہنے پہ اسے بلایا۔ پری ویش بھی میرا تخلیق کردہ
نام تھا جو اس ضویا نے اپنا رکھا تھا۔ خیر ڈیٹان بہت بن
ٹھن کر آیا تھا۔ اتنا تو وہ کالج فکشنز پہ بھی تیار نہ ہوتا
تھا۔ بابا بابا۔۔۔۔۔ ریڈ ٹی شرٹ اور بلیک پیٹ۔

وہ بری طرح رو رہی تھی۔

”ارے..... ارے تمہیں کیا ہوا؟“ ہم سب فریڈ زکھرا گئے۔

”تم سب انتہا درجے کے گھٹیا انسان ہو، تم میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں تم لوگوں کی وجہ سے آج ایک معصوم، ذہین انسان ذلیل ہوا۔ تم لوگوں نے مجھے نارگٹ بنایا، میں پاگل بھی کہ تمہاری باتوں میں آگئی میں نے اس سب کو انڈونچر سمجھا، میں اسے کالج فکشن میں پیش کیا جانے والا ڈرامہ بھی مگر آج مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کتنی بڑی بھول ہوگئی۔ مجھے تم جیسے شیطان صفت لوگوں سے کوئی دوستی نہیں رہنی اور ریان حیدر! تم سمجھتے ہو کہ تم جیت گئے، نہیں میری نظر میں تم ایک ہارے ہوئے کمزور انسان ہو، بزدل، کم ظرف۔“

وہ نفرت انگیز نظر ہم سب پر ڈالتی بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اب ماحول میں قدرے سوگوار چھا چکی تھی۔ ہم میں سے اکثر فریڈز واقعی نادم ہو گئے۔ مگر میں نے انہیں ریلیکس کیا لیکن دل ہی دل میں مجھے افسوس ہوا کہ اس لڑکی کو ساتھ کیوں لے آئے۔ اچھا بھلا انجوائے کر رہے تھے۔ مگر عین ناٹم پہ اس نے ڈرامہ کمری ایٹ کر دیا۔

واقعی لڑکیاں ہوتی ہی اتنی ہیں، اتنی اچھی تھی تو پہلے نہ کرتی سارا ڈرامہ..... اوکے ڈیئر ڈائری اب نیند مجھے اپنی آغوش میں لے رہی ہے۔ بائے۔

☆☆☆.....

”ولیم شکسپیر نے کہا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے۔“ شاید یہ حقیقت ہے کہ ہم ہر دم یہاں سرگرم رہتے ہیں۔ اسٹیج اداکاروں کی طرح لائیو پرفارمنس، ریان حیدر اسٹیج رائٹر بن گیا تھا۔ اس کے لکھے ڈرامے کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے وہ اپنی زندگی میں بہت کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

ڈرامہ رائٹر اپنے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے۔ جن کا تعلق ساج کے تمام افراد سے ہو، ان کی خوشیاں، رسم و رواج اسے پیش نظر رکھنا پڑتے ہیں۔

ریان حیدر بھی اپنے اندر کے انسان کو دیکھنے کے لیے اس کو تلاش کرنے اور اس کے ہمراہ چلنے کے لیے لفظ تراشتا تھا پھر ان لفظوں کو متحرک کرنے کے لیے اس نے اسٹیج کا رخ کیا تھا۔

وہ زندگی میں اس قدر مصروف ہو گیا کہ اب اس کے پاس ماضی کی تلخ یادوں اور سوچنے کا بھی ناٹم نہیں تھا۔ مگر اس نے لکھنے سے جو عشق کیا تھا وہ آج بھی قائم تھا بلکہ وقت نے اس کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا تھا۔

زندگی اپنی پوری رفتار سے چل نہیں بلکہ دوڑ رہی تھی کہ اچانک اس کی زندگی میں انتشار برپا ہوا۔ اس کے پایا کے پرسل سیکرٹری نے اسے بتایا کہ اس کے پایا کا سارا بڑا بس دیوالیہ ہو گیا، میڈم ستارہ ان کی ساری دولت سمیٹ کر اپنے آشنا کے ساتھ ملک سے فرار ہو گئی ہے۔

اسے ایک لمحے کو دھچکا لگا۔ وہ تو تقریباً ایک سال پہلے اپنے پایا سے اپنے حصے کی خطیر رقم لے کر ایک طرح سے ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ آیا تھا۔ مگر اب تو صورتحال مختلف تھی۔ وہ اس عورت کو گھٹیا سمجھتا تھا مگر وہ اس قدر گھٹیا ہوگی، یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ فوراً سب کام چھوڑ کر اپنے پایا کے پاس کراچی چلا آیا تھا مگر یہاں آ کر زندگی ایک نئی طرح سے اس پہ آشکار ہوئی تھی کہ ایک لمحہ کو وہ چکر کر رہ گیا۔

گھر پہلے جیسی حالت میں نہیں تھا تمام قیمتی سامان غائب تھا۔ اور نوٹے پھوٹے فرنیچر کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ پایا کے بیڈ روم کی جانب بڑھا ایک لمحہ کو بند دروازے کے پاس آ کر اسے گمان گزرا کہ ابھی اندر سے پایا اور ستارہ کے قہقہوں کی آواز بلند ہوگی مگر ایسا نہ ہوا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا مگر اندر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ جیسے جنون میں آ کر کوئی ہر چیز توڑ مروڑ دیتا ہے۔ بیڈ شیٹ آدھی نیچے ڈھلک رہی تھی کشن پھٹے ہوئے اور ان میں روٹی نوچی ہوئی باہر نکلی اپنی رسوائی پہ اجڑی ہوئی لگ رہی تھی

کمرے میں ایک ناگوار سی بو پھیلی تھی۔

میری بات سنو

بڑی دعاؤں سے تجھ کو پایا تھا
اک پھول کی طرح میں نے تجھ کو پایا تھا
تیری ہنسی جب گھر میں گونجتی تھی
میرے دل کی کلی کھل جاتی تھی
میری بانہوں میں جب تو آتی تھی
مجھے دنیا کی دولت مل جاتی تھی
آج تیری لڑیا کی شادی تھی
تو اپنی سہیلیوں کو بلانا چاہتی تھی
بار بار دروازے پر جاتی تھی
بہت دیر ہو گئی تو نہ آئی، میں بہت گھبرائی
میں پریشان ہو کر باہر نکلی، تجھے ڈھونڈنے چلی
برگلی میں تجھے دیکھا، ہر ایک سے پوچھا
گلی گلی تجھے آواز دیتی تھی، میری پری تو کہاں تھی
جلدی سے گھر آ جا، میری بانہوں میں سما جا
تو ملی تو کہاں سے کوڑے کے ڈھیر پر
خون سے بھری تھی، کھکیاں جھنسنے لگی تھیں
کسی ظالم نے تجھ کو جھنجھوڑا تھا
جلد جلد سے تجھ کو کاٹنا تھا، نو چا تھا
میرے خدا تو کہاں تھا، میرے خدا تو کہاں تھا
تو تو دیکھ رہا تھا، تو تو سن رہا تھا

(مسز عارف جہاں، اسلام آباد)

آٹو گراف دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس کی
آنکھوں میں خون اتر آیا۔

پھر اچانک اس خوبصورت خاتون کے اسرار
سے سیکڑی نے اس کے کان میں کچھ کہا تو وہ مداحوں
کے جھرمٹ سے بہت باوقار انداز میں نکلتی اپنی گاڑی

صوفے کے ایک جانب ایک نحیف و مردہ وجود
آدھ کھلی آنکھوں سے فضا کو گھور رہا تھا۔ وہ بھاگ کر ان
کے قریب آیا وہ اس کے پایا تھے زریاب حیدر..... جن
کی نفاست اور وجاہت کے چرچے تھے۔ جن کی
خوبصورتی کی لوگ مثالیں دیتے مگر ایک بری عورت
نے ہمارے ہنستے ہنستے گھر کو تباہ کر دیا تھا، پہلے میری ماں
پھر پایا کو بھی جیتے جی مار دیا تھا۔

”پایا..... یہ کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے اپنا، اور
گھر کا اتنا برا حال، اوہ مائی گاڈ..... میں سوچ بھی نہیں
سکتا تھا کہ وہ اس قدر گھٹیا ہوگی۔“
بے بسی سے میری آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

”ریان..... بیٹا آ گیا۔“ نحیف مردہ وجود میں
زندگی کی لہر دوڑی۔

”میں آپ سے کہتا تھا ناں وہ گھٹیا عورت صرف
ہماری دولت کی بھوکی ہے۔ اسے آپ سے، اس گھر
سے کوئی دلچسپی نہیں مگر نہ مانی آپ نے میری بات.....
میں نے زندگی آپ سے دور ہاسٹل میں گزار دی۔
سڑکوں پہ رلتا بڑا ہوا، میں نے اپنے آنسو خود ہی پونچھ
ڈالے اور وہ کتیا..... وہی تو ہے اس بربادی کی ذمہ دار،
میں..... میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔“ اس کے اندر کا ولن
بھر پور انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد سب
سامان سمیٹ کر یہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ اس شہر میں
رکا نہیں۔ بہت سی تلخ یادیں اسے بے چین کر رہی
تھیں۔ بابا کو وہ اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔

☆☆☆.....

وہ ایک ثقافتی طائفے کے ساتھ لندن میں موجود تھی
اس کے شوز نے وہاں کے عوام میں خاصی پذیرائی
حاصل کر لی تھی اور آج کل میں اس کا ارادہ واپسی کا
تھا۔ اپنی سرخ ساڑھی کا پلو پکڑے چرے پہ میک اپ
کی بہار دکھائے وہ کہیں سے بھی پچاس یا پچپن کی نہیں
لگتی تھی گزرتے وقت نے اس کے حسن کو مزید نکھارا
تھا۔ وہ شو کے اختتام پر مسکراتے ہوئے اپنے مداحوں کو

کے قریب آئی اور ایک ادا سے پرستاروں کو ہوائی بوسہ دیتے گاڑی میں سوار ہو گئی۔

یہ سب دیکھتے ہوئے دور کھڑا نوجوان شدت ضبط سے اپنی مٹیوں کو پھینچ رہا تھا۔ اس خاتون کی گاڑی کے تعاقب میں نوجوان کی گاڑی بہت احتیاط سے چل رہی تھی کہ کہیں خاتون یا اس کے ڈرائیور کو کوئی شک نہ ہو جائے۔

خاتون کی گاڑی شہر کے مینے ایریا میں داخل ہوئی، وہ گاڑی سے اتری اور اس شخص کی گاڑی بھی ان کی گاڑی سے قدرے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ خاتون کا باوردی گاڑا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ خاتون اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے جا کر رک گئی۔ باوردی گاڑا باہر کھڑا تھا۔ وہ لاک کھول کر اندر چلی گئی۔

اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ اپارٹمنٹ کیسے پہنچنا ہے۔ وہ اکیلا نہیں تھا، اس ہومل کے عملے میں ایک دو لوگ اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ وہ مختلف مراحل طے کرتا اس کے بیڈ روم تک پہنچ چکا تھا۔ وہ خاتون کافی کا کپ تھا اسے بیڈ روم میں آ گئی۔

آج دن بھر کی بھاگ دوڑ سے وہ بری طرح تھک چکی تھی مگر اس میں بھی ایک سرور تھا۔ دولت، کامیابی، شہرت..... یہ سب اس کی باندیاں تھیں۔ کافی ٹی کر فریش ہونا پھر تھوڑی دیر آرام کر کے خود کو نائٹ فنانش

کے لیے تیار کرنا اس کے پان کا حصہ تھا۔ نرم صوفے پہ بیٹھے وہ کسی انگلش میگزین کی ورق گردانی کے ساتھ کافی کے چھوٹے چھوٹے سپ لے رہی تھی کہ اچانک لائٹ آف ہو گئی۔ وہ ایک دم سے چونکی کسی انہونی کے احساس نے اسے بے چین کر دیا، گرم کافی کا کپ اس کے ہاتھ سے میں کانپا اور اس کے خوبصورت لباس کو بھگو گیا اندھیرے کمرے میں کسی کے بھاری بوتلوں کی چاپ صاف سنائی دینے لگی۔

وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی، وہ جلدی سے مٹن دبا کر ہر طرف روشنی کرنا چاہتی تھی اور مختلف چیزوں کو ٹوٹو لیتے ہوئے دروازے تک پہنچنے کی کوشش میں تھی۔

اس نے موبائل نجانے کہاں رکھ دیا تھا۔

ایک دم ہی اس پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ زور

زور سے چلانا چاہتی تھی مگر آواز اس کے اندر ہی کہیں دم توڑ چکی تھی۔ قدموں کی آواز اس کے قریب آ کر ختم گئی۔ قدموں کی چاپ رکتے ہی اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ نجانے کیسی طاقت اس کے اندر ابھری کہ وہ کرنٹ کھا کر اس سے کئی قدم دور بھاگی۔ جیسے دلدل انسان کو نہننے کا ایک موقع دیتی ہے، اپنی گہرائیوں میں سمونے سے پہلے باہر اچھالتی ہے۔ مگر مقابل اس سے بھی چست و چالاک نکلا، وہ ایک ہی جست میں قریب آ پہنچا اور اس کی نازک گردن کو اپنے آہنی ہاتھوں سے دبوچ کر اسی حالت میں اسے بیڈ کے قریب لے آیا۔

اسے بستر پہ پھیلتے ہوئے تکیہ اس کے منہ پر رکھا اور پوری قوت سے دبا یا کہ چند لمحوں میں ہی اس کا سر ایک جانب کو لٹک گیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دنیا کی بے ثباتی پہ نوحہ کنناں تھیں۔ اس کا مردہ جسم بھی بہتر حالت میں قاتل کو گوارہ نہ تھا لہذا جھٹ سے اس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے تیزاب کی بوتل نکالی اور ڈھلن کھول کر اس کے خوبصورت چہرے پر گرانے لگا۔

جب تک وہ اور اس کا جسم جل کر خاکستر نہیں ہوا، اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اس کی خوبصورت آنکھوں کی جگہ گہرے گڑھوں نے لے لی تھی۔ اس کی قیمتی ساڑھی جل چکی تھی اور اس کے وجود سے چمٹے زیورات جو شاید پہلے اپنی قسمت پہ نازاں تھے مگر اب ایک جملے ہوئے وجود نے ان کے حسن کو بھی گہنا دیا تھا۔

ریان نے ایک نفرت سے بھرپور نظر اس پہ ڈالی۔
”سر..... یہ رائٹ مینڈ پے واش روم ہے اس میں جو کھڑکی ہے اس سے باہر نکلنے کا راستہ آسان ہے۔“

ریان نے ایک نظر کنبے والا کو دیکھا۔
”اوکے پیک کرو اسے۔“ وہ جلدی سے لاش سیاہ پلاسٹک کے مضبوط تھیلے میں ڈال کے اس کے پیچھے

لے آیا۔ کھڑکی قدرے چوڑی اور لمبائی میں مناسب تھی۔ اسے ایک وقت میں ایک آدمی آسانی سے عبور کر سکتا تھا۔ اس کی اوپے کی سلاخوں کو اس کے کارندے نے مہارت سے اکھیڑا ریان حیدر نے اپنے اعتماد کے ساتھیوں کو چنا تھا۔

کھڑکی سے باہر گھنے درختوں کے جھنڈ تھے اور اس سے آگے کسی میڈیکل سٹور کی بیک تھی۔ اس سٹور کے سامنے سڑک تھی پہلے وہ کارندہ نیچے اترتا پھر ریان نے پلاسٹک میں بند ستارہ کی لاش اسے تھمائی پھر پارٹمنٹ پہ ایک طائرانہ نظر ڈالتے وہ خود بھی نیچے اتر آیا۔ اتنے میں ان کے ساتھی تھیلے کو گاڑی کی ڈیگی میں ڈال چکے تھے۔ گاڑی میں ریان کے داخل ہوتے ہی گاڑی چل پڑی۔ ایک گھنٹے بعد گاڑی دریا کنارے روکی گئی۔

سیاہ تھیلے کو گاڑی سے نکالا گیا۔ اس دریا کے قریب لے جایا گیا اور پھر اسے دریا کی گہرائیوں میں اتارتے ہوئے ریان کے ہونٹوں پہ پرسکون سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس کی ماں کی قاتل، اس کے پورے گھرانے کو تباہ و برباد کرنے والی ستارہ بیگم کو آج زمین کا ٹکڑا بھی میسر نہیں تھا۔

”گھٹیا عورت..... میں نہیں چاہتا تھا کہ تجھے زمین کا ٹکڑا بھی میسر ہو یا تجھے لکھن کا سفید کپڑا نصیب ہو اس لیے..... میرے نزدیک تیرا انجام دریا کی گہرائی ہی تھا جہاں تیری لاش، تیرے جسم کے ایک ایک ذرے کو نوچا جائے، تو مر کے بھی چین نہ پا سکے گھٹیا عورت۔“ وہ وہاں رکا نہیں آج اس کے من سے ایک بہت بڑا بوجھ سرک گیا تھا۔ وقت نے اسے مقدر کا سکندر بنا دیا تھا۔ کسی فاج کی طرح چلتا وہ گاڑی تک آیا مگر جاتے ہوئے ایک نفرت بھری الوداعی نظر اس پر ڈالنا نہ بھولا۔

☆☆☆.....

”مس دل آویز میں ایک بات آپ کو یاد کروا دینا چاہتا ہوں کہ اداکاری کے فن کو جاننے کے لیے اداکار کو ہدایت کار کی ہدایات پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ میں مسلسل دیکھ رہا ہوں کہ آپ تماشا بینوں کی جانب

پشت کیے رکھتی ہیں۔“ اس نئی اداکارہ کو سمجھاتے ہوئے ریان کو خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔ جس کی ایک جاننے والے نے بہت تعریفیں کی تھیں اور اب ڈرامہ پیش کرنا تھا۔ ان کے پاس صرف دو دن تھے۔ آخر تک ہار کر ریان نے اس سے دونوں بات کرنے کا فیصلہ کیا، وہ اپنے ڈرامے کے بارے میں کوئی کمپروماز کرنے کو تیار نہیں تھا۔

”آپ شاید جانتی نہیں کہ اسٹیج ڈرامے میں زیادہ دیر تک تماشا بینوں کی جانب پشت کیے رکھنا ایک ناگوار حرکت سمجھی جاتی ہے۔ اداکار کو ہمیشہ پر اعتماد اور تماشا بینوں کے سامنے اپنی صلاحیتوں کا بھرپورا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ مکالمہ بولتے ہوئے اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔“

اب وہ بہت رسائیت سے اسے سمجھا رہا تھا۔ دیکھو میری بات سنو اگر اداکاری کا بے حد شوق بھی ہے اور تمام صلاحیتوں کے باوجود خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ تو آپ ایک بڑا آئینہ لیں، لوگوں کے سامنے پرفارمنس سے پہلے آئینہ کے سامنے خوب پریکٹس کریں۔“ وہ اس دوران سر جھکائے بظاہر اپنی رنگین انگلیوں سے کھیتی رسی مگر اس کی بات کے اختتام پہ پہلی دفعہ بولی تو اتنا کہا۔

”سراگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟“ وہ قدرے جھجک رہی تھی۔

”جی نہیں؟“ وہ پوری طرح متوجہ ہوا۔

”کیا میں آپ کا کچھ ٹائم لے سکتی ہوں مطلب اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو میں شام یا رات کے کچھ اوقات میں ایک آدھ گھنٹہ آپ کے پاس آکر پریکٹس کر لیا کروں، اگر آپ برا نہ مانیں تو؟ اس کے لہجے میں یقین کی شمع روشن ہوتے دیکھ کر اس کا جی انکار کرنے سے گھبرانے لگا۔

”ہوں..... اوے شام پانچ بجے کے بعد کسی بھی وقت میری سیکرٹری سے ٹائم لے لیجئے گا۔“ وہ یہ کہتا اٹھ کر چلا گیا مگر دل آویز کے لبوں پہ انہی سی مسکان

اداکار اپنی ذات کو فراموش کر کے صرف اس کردار میں ڈھل جاتا ہے جو اسے پر فارم کرنا ہے۔ وہ اسی کردار میں جیتا اور مرتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ اسٹیج پہ پر فارم کر رہا ہے اور بہت سے تماشا بین اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے لیکچر کے دوران ہی ملازمہ چائے لے کر آ گئی۔ وہ حسب معمول چائے بنانے کو آگے بڑھا تو وہ اس سے پہلے آگے بڑھی۔

”سراٹر میں چائے بنا دوں تو آپ مانیڈ تو نہیں کریں گے، کیونکہ مجھے شرمندگی ہوگی اگر آپ یہ زحمت کریں گے۔“ وہ بہت یلحی سی مسکان لبوں پہ سجا کر بولی۔

”ارے نہیں..... میں اپنے گیسٹ کو چائے یا کافی اپنے ہاتھوں سے بنا کر دیتا ہوں کیونکہ میرے اور میرے بابا کے سوا یہاں کوئی نہیں..... اپنی دے ایز یو وش، آپ بناؤ چائے۔“

وہ پھر سے صوفے پہ سیدھا ہو بیٹھا۔ اب چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے دوسرا کپ لے کر وہ اس کے ساتھ والے صوفے پہ بے تکلفی سے بیٹھ گئی جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ شب کی تنہائی میں ایک جیتی جاگتی قیامت کی موجودگی اس کے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں تھی۔ اب وہ جلد از جلد اس سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ایک طلسم تھا جو ٹوٹ گیا۔ ریان کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرا اور اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ یہ دل آویز کا مو بائل تھا اور کسی نے غالباً مس نیل دی تھی۔

”اوہ سوری سر.....“ وہ شرمندگی سے سرخ ہو گئی۔ وہ جلدی سے اپنے پرس سے رومال نکال کر اس کی شرٹ صاف کرنے لگی۔ اسے اس قدر قریب پا کر وہ مہوت سا رہ گیا۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک اس کی آنکھوں کا جامل، اس کے لبوں کی سرخی، اس کے گالوں کی لالی، اس کی سانسون کی حدت کچھ بھی تو نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا۔

وہ اس وقت بد دلی سے چیخیل سرچنگ میں مصروف تھا۔ دل آویز نے آنے میں دیر کر دی تھی۔ اس کو ایک دو جگہ ضروری کام سے جانا تھا مگر اپنے وعدے کی پاسداری میں وہ گھر پر ہی گیا تھا۔

”سر..... مے آئی کم ان؟“ اچانک اس کے عقب میں دلکش نسوانی آواز ابھری۔

”جی، جی آجائیں بہت دیر کر دی آپ نے تو۔“

ایک لمحہ کو تو وہ گھبرا گیا کہ پہلے کبھی گھر میں کسی اسٹوڈنٹ کو ٹریننگ نہیں دی تھی مگر پھر اس کی فطری خود اعتمادی لوٹ آئی۔ اس نے اسے سامنے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ آج وہ نجائے کیوں دل ہی دل میں کچھ الجھن محسوس کر رہا تھا۔ پھر مقابل اپنی تمام حشر سامانی کے ساتھ اس کے ایمان کو متزلزل کر رہی تھی۔ وہ بلیک شنون کی ساڑھی جس کے لاؤز کی آستین اچھی خاصی گہری تھی اور اس کے دامن پر سلور اور ٹی پینک ستاروں کا کام جو ساڑھی کے بارڈر پہ بھی تھا اور اوپر سے اس کی معصوم ادائیں..... یوں لگتا تھا جیسے وہ مقابلہ حسن میں شرکت کے لیے آئی ہو۔

”جی مس دل آویز صلیب! اس سے پہلے آپ نے کسی ڈرامے، فلم یا اسٹیج یہ ایکٹنگ کی؟“

”نہیں سر! مجھے چانس ہی نہیں ملا۔“

”اوہ..... مطلب آپ کو ابھی اتنا تجربہ نہیں۔“

ریان نے پرسوچ انداز میں تھوڑی کوچھوا۔ ”توکل سے میں مس کوئل (پرنسلیکریٹری) کو بھی یہاں بلا لیا کروں گا، ہو پ کہ ڈرامہ براہ راست پیش کرنے سے پہلے ہم آپ کو تیار کر لیں گے۔ مگر اس کے لیے آپ کی توجہ اور محنت ضروری ہے، آپ کے تعاون کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔“ اسے محسوس ہوا تھا کہ اس پری وش میں ایسی بات ضروری ہے جو مقابل کو چومکنے پہ مجبور کر دے۔

”اور ہاں دل آویز میں آپ کو ہوتا دوں کہ ایکٹنگ میں مکمل طور پر کردار میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ ایک اچھا

وہ ہمیشہ صنف نازک سے ایک فاصلے پہ رہا تھا۔ حالانکہ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کا واسطہ اکثر ان سے ہی رہتا تھا۔ مگر اس لمحے اس کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے موبائل پہ بلا وجہ نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”مس دل آویزا! میری ایک بہت اہم مینٹنگ ہے، آپ جا سکتی ہیں۔ پھر اگر ضروری ہوا تو آپ کو بلا لوں گا ورنہ ہم اسٹوڈیو میں ہی آپ کو پریکٹس کروا دیں گے۔ میرا خیال ہے یہ زیادہ بہتر رہے گا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ رکنا نہیں، بیڑھیاں چڑھتا اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی گیٹ سے باہر آ گئی وہ سمجھ گئی تھی کہ شکار جال میں پھنس گیا ہے۔ بس سمندر سے نکالنا باقی ہے۔

☆☆☆

”سر آج میرا برتھ ڈے ہے۔ میری وش ہے کہ آپ میری خوشیوں میں شریک ہوں۔“ ایئر پیس پر دل آویز کی دلکش آواز ابھری۔

”ہاں میں آتو جاتا مگر مس دل آویز میں کچھ پیڑی رہوں گا سو آئم سوری۔“

چاہنے کے باوجود اس نے صاف انکار کر دیا۔ ارے دل آویز آپ رو رہی ہیں۔ اوہو ہو..... اوکے میں آ رہا ہوں مگر پلیرز رو نہیں تھیں۔ اس کے رونے کی آواز سے میں گھبرا گیا اور فوراً اس کی بات مان لی۔ جب وہ اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو ہر جانب خاموشی تھی۔ لمحہ بھر کو اسے محسوس ہوا کہ وہ غلط جگہ پہ آ گیا ہے مگر اگلے ہی لمحے وہ دشمن جاں اس کے سامنے موجود تھی۔

”سر آپ نے اتنی دیر کر دی؟“ شائنگ پنک اور سلور کے لمبی نیشن ساڑھی بغیر بازو کے گہرے گلے کے بلاؤز کے ساتھ وہ ہاں ہاں سو کبھی مات دے رہی تھی۔ لمبے لمبے آویز سے گلے اور کانوں میں پہنے سیاہ کرلی پالوں کو کندھے پہ بکھیرے وہ بہت قیامت لگ رہی تھی۔

”آنکس سر میں آپ کو اپنا روم دکھاؤں۔“ وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑے فی وی لاؤنچ سے اندر بیڈ روم میں لے گئی۔ وہ کمرہ سرخ پھول، پتیوں سے سجایا گیا تھا۔ فرش پر جیسے سرخ گلاب کا قالین بچھا ہو۔ کمرے کے دائیں کونے میں ایک چھوٹی سی گول میز جس کے گرد تین کرسیاں بچھی تھیں۔ میز پر ایک اور اس کے گرد ایک دائرے میں موم بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ مگر یہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

”میں ہمیشہ اکیلی اپنی برتھ ڈے سیلبریٹ کرتی ہوں، آج نجائے کیوں دل نے کہا کہ کوئی تو ہو جو میری اس خوشی میں میرے ساتھ ہو۔ میں کیک کانوں تو وہ تالیاں بجائے، میرے ساتھ خوب ہنسے اور..... سر میں نے بلا وجہ آپ کو تنگ کیا سوری۔“ بہت چپکٹی ہوئی دلکش آواز ایک دم مدھم ہو گئی۔

”ایک معصوم سی پری۔“ اس کے دل نے اسے سراہا۔

”ارے نہیں، میرے لیے یہ سر پرائز سے کم نہیں۔ مجھے تو بہت مزہ آ رہا ہے۔ ہمیشہ میں نے برتھ ڈے کا فنکشن ایک بڑے ہال نما کمرے میں خوب ڈھیر سارے لوگوں کی بھیڑ میں منعقد ہوتے دیکھا مگر اس میں وہ پرائیویسی، وہ اپنا پن کہاں..... اپنی دے اب کیک کانیں تاکہ باقاعدہ اس فنکشن کا آغاز ہو۔“ بہت فریٹنگی کہتا وہ ایک کرسی گھسیٹ کر اس پہ آ بیٹھا۔ وہ معصوم پری مسکرا دی اور اس کے گال پہ ہنستے ہوئے ابھرتے گڑھوں میں اس کا دل ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

”میری چچی بہت ظالم خاتون تھیں۔ وہ اپنے معذور بیٹے کے ساتھ میرا بیاہ رچانا چاہتی تھیں۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا مگر اب یہ ظلم برداشت سے باہر تھا۔ تعلیم تو میں نے گریجویشن تک جیسے تیسے حاصل کر لی تھی۔ پھر میں وہاں سے بھاگ آئی۔ یہاں لاہور آ کر میں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ مختلف ریڈیو اسٹیشنز پہ کام کیا۔ ایف ایم ریڈیوز میں ٹیلنٹ تو نمایاں

بڑھایا۔

”اے جولیٹ..... آئی لو یو، کین یو میری می؟ وہ بالکل فکارانہ انداز میں اس سے اظہار محبت کر رہا تھا ایکدم ہی دل آویز بے ساختہ ہنسے لگی اتنا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اس کے بڑھے ہاتھ پہ اپنا مومی ہاتھ رکھے اس کو اقرار کا مژدہ سنا چکی تھی۔ ایک دم ہی ریان نے اسے بازوؤں میں گھیر لیا اور دور افق میں ڈوبتا ابھرتا ستارہ اور سمندر کی وسعتوں میں چاند کا عکس رات کے اس پرسوں لٹھوں میں ان کی محبتوں کی نئی داستان پہ جیسے خوشی میں رقص کرنے لگے تھے۔

☆☆☆.....

ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ رنگارنگ روشنیوں سے سجا تھا۔ اس تقریب کی مناسبت سے ڈاننگ روم، ڈراننگ روم اور لالوچ کی شیشے کی دیواروں کو ہنا کر ہال کو وسعت دی گئی تھی۔ یہاں انواع و اقسام کے مشروبات کا دور چل رہا تھا۔

دل آویز جواب مسز ریان حیدر تھیں خوبصورت گرین اور پنک لمبی نیشن والا لہگا پہنے، خوبصورت ہنیر اسٹائل، قیمتی جیولری اور ہاتھ میں میچنگ پرس پکڑے کسی دور دیس کی شہزادی لگ رہی تھی۔ اس کے ہمراہ چلتا ہوا شہزادوں جی آن بن رکھنے والا ریان حیدر خوبصورت سیاہ شیروانی میں لمبوس تھا۔ دونوں کو چاند سورج کی جوڑی قرار دیا جا رہا تھا اس میں جھوٹ نہیں وہ واقعی زبردست کپل قرار دیے جاسکتے تھے۔

آہستہ آہستہ محفل کی سرشاری بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر جانب انگریزی موسیقی کے ساز بکھر رہے تھے اور اس کی لے میں جھومتے بدست زن و مرد.....

اچانک ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا کھانسا ہوا نکلا۔ اس کی آنکھوں پہ موٹے عدسوں کا چشمہ لگا تھا وہ آگے بڑھتا گیا۔ اس کے سامنے اس کا حسین ماضی لہرانے لگا جب وہ اور ستارہ نیگم..... ایسی ہی رنگین محفلیں مگر..... مگر پھر اسے اس کا انجام اپنی زندگی کا وہ ہسیانک رخ پوری جزئیات سے یاد آنے لگا

ہوتا ہے مگر مالی مشکلات..... میں ایک جاننے والے کے توسط سے اسٹیج تک آئی اور پھر وہاں آپ مل گئے۔“ سمندر کنارے اس کے ہمراہ چلتے ہوئے اپنا ماضی کھول بیٹھی تھی۔ اب اکثر فارغ اوقات وہ ایک ساتھ گزرتے، زندگی میں پہلی دفعہ ریان حیدر نے اپنے اندر کسی کو پانے کی چاہ کی تھی۔ اسے اب من کے ویران قبرستان میں بے چین روحوں کی سسکتی آنہوں سے ڈر لگنے لگا تھا اسے سکون کی تلاش تھی۔ کسی کاندھے کا سہارا، کسی آغوش کی طلب کہ جس پر سر رکھ کر وہ دنیا جہاں سے بے خبر ہو جائے۔ وہ ہمیشہ ہی فیصلہ کرنے میں جلد باز اور ضدی رہا تھا۔ اس کے بہت سے فیصلوں نے اسے ترقی کی بلندیوں تک پہنچایا تھا۔ اب تک اپنی جانب بڑھتے قدموں اور بہت سی نظروں کو نظر انداز کیے بیٹھا تھا۔ مگر آج..... آج اس کی زندگی کے شوریدہ سمندر کو کنارہ مل جائے گا۔ سمندر کی لہروں میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

”یہاں اس شہر میں آنے مجھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر یہاں آ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ایک اکیلی لڑکی کا تنہا دنیا کی کالی بھیڑیوں میں رہنا کس قدر مشکل ہے۔ خشک ہتے پہ لرزتی زندگی.....“ وہ فنی سے مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ننھے قطروں اور ہنسیکے لہجے نے میرے اندر گہرائیوں میں شور برپا کر دیا۔

”دل آویز، شاید آپ مجھے بھی ان بہت سی کالی بھیڑیوں میں ایک قرار دیں مگر زندگی میں پہلی دفعہ آپ کو دیکھ کر احساس ہوا کہ آپ ہی تو وہ پہلی انسان ہیں جس کے ساتھ کی طلب میرے دل میں جا گئی ہے۔ پہلی دفعہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں کسی رومیو کی طرح ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھ جاؤں۔“

بالکل اچانک ہی وہ اس کے سامنے اسی انداز میں آ بیٹھا اور وہ اپنی اپنی پلکیں جھپک کر کسی مومی گڑیا کی طرح جیرانی سے دیکھتی رہی۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کو کمر کے پیچھے لگا کر دائیں ہاتھ کو اس کی جانب

اور وہ زور زور سے چلانے لگا۔

حادثہ

”کیا تمہیں کبھی ٹرین میں حادثہ پیش آیا؟“

”ہاں..... ایک مرتبہ میں ٹرین میں کونستہ جا رہا تھا۔ میرے سامنے والی سیٹ پر باپ بیٹی بیٹھے تھے۔ ٹرین ایک سرنگ سے گزری ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر سہلانا شروع کر دیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں نے لڑکی کے بجائے اس کے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا..... اف کتنا خوفناک حادثہ تھا۔“

(عمران، کراچی)

اسکراف گلے میں لپٹے وہ اس سے کچھ فاصلے پر اسی بیچ پر بیٹھ گئی۔

”آئم سوری سر..... آج میں لیٹ ہو گئی مگر میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا وہ تو سرک کراس کرتے ہوئے اس اسٹوپڈ ٹریفک پولیس والے سے فائٹ ہو گئی۔ ایٹنی شنی دکھاتے ہیں.....“

اوکے چھوڑیں ہم اپنا کام کرتے ہیں پہلے اتالیٹ ہو گئی میں۔“ بے ساختہ ہی اس بوڑھے کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہ باتونی سی رائٹر انہیں شروع دن سے آج تک حیران ہی کرتی رہی تھی خود ہی سوال، خود جواب دیتی سامنے والے کو بولنے کا کام ہی موقع دیتی۔ ان کی پہلی ملاقات اس سے اسی سمندر کنارے ہوئی تھی۔ جہاں وہ اپنا ماضی اپنے غم سے چھپھا چھڑانے کے لیے دو گھڑی آ جاتے تھے۔ یہاں کراچی کے ساحل پہ کھیتے، سپیاں تلاش کرتے بچے انہیں۔ کچھ دیر کے لیے پرسکون کر دیتے تھے۔

”سارا حسن اور خوبصورتی اسی فطرت میں ہی تو ہے۔“

وہ اکثر سوچتے، مگر اس دن جب وہ مقررہ بیچ پہ

”بند کرو یہ سب، چھوڑو یہ سب، بند کرو..... بند کرو۔“ وہ زور زور سے چیخا اتنا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑنے لگے۔ اچانک دل آویز جو کسی کے ساتھ گفتگو میں مشغول تھی۔ وہ غصے سے تنہائی اس کی جانب بڑھی۔ اسے دور سے اس میں ستارہ بیگم کی جھلک نظر آئی۔ اچانک اس میں بجلی سی بھر گئی اس نے قریب پڑا کرسل کا گلدان اٹھایا اور پوری قوت سے اس پر وار کر دیا۔ آہ..... ایک نسوانی چیخ سے ہال گونج اٹھا۔ سب مہمانوں نے اس کے گرد دائرہ بنا لیا اب مسلح گارڈز اس ہانپتے ہوئے بوڑھے کو پکڑے کھڑے تھے۔

ریان غصے سے اس بوڑھے کی جانب بڑھا اور پوری قوت سے پتھر ان کے گال پہ جڑ دیا۔

”بشیر، نعمان، غازی..... کہاں مر گئے تھے تم سب، لے جاؤ انہیں ان کے روم میں اور باہر سے لاک لگا دینا۔“

وہ غصے سے مٹھیاں بھیجنے رہا تھا مگر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی محبت اس کی شریک حیات زہنی ہیں وہ جلدی سے انہیں ہاسپٹل لے جانے کے لیے روانہ ہوا۔ اس گھر کی درو دیوار نے ماضی کو پلٹتے ہوئے دیکھا تو سو گوارے سے چپ کی ہلکے مارے خاموشی کی وادیوں میں کھو گئیں۔

☆☆☆.....

وہ بوڑھا جو یقیناً 55 یا 60 کے پیٹے میں تھا وہ روزانہ وہاں آتا۔ مگر چند دنوں سے وہ ایک وعدے کی پاسداری کے لیے وہاں آنا ضروری سمجھتا تھا۔ موسم چاہے جیسا ہو مگر مسلسل ایک ڈیڑھ ماہ سے وہ باقاعدگی سے یہاں ایک آدھ گھنٹے کے لیے آتا تھا۔ جہاں ایک بائیس تیس سالہ خوبصورت سی لڑکی اس بوڑھے کی شدت سے منتظر بیٹھی ہوتی تھی۔ مگر آج اس سنگی بیچ پر بوڑھا تو آ گیا تھا مگر وہ لڑکی ابھی نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی غلت میں بھاگتی ہوئی اس کی جانب آ رہی تھی..... سیاہ جینز کے ٹراؤزر اور سفید کرتے کے ساتھ رانیں

آئے تو پہلے سے وہاں ایک اداس لڑکی موجود تھی۔ انہوں نے اسے دیکھا پھر کسی اور بیٹج کی جانب آگے بڑھ گئے مگر اچانک انہیں احساس ہوا کہ کوئی انہیں پکار رہا ہے۔ وہ مڑے تو وہ لڑکی ان کے پیچھے بھاگی آ رہی تھی۔ ”آپ..... آپ کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں آ رہا پلیز اپنا نام بتائیے گا۔“

”میں ریان حیدر“ اس نے رک کر سنجیدگی سے مختصر جواب دیا۔ ”اوہ ریان حیدر، اسٹیج پر فارمر، ون آف دی بیسٹ آرٹسٹ، ایک فینس رائٹر..... اوہ مائی گاڈ..... آپ میرے سامنے موجود ہیں، مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ وہ بچوں کی طرح اچھل رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہیں پر بھنگڑے ڈالنے شروع کر دے۔

ریان نے دلچسپی سے اس زندگی سے بھرپور لڑکی کو دیکھا اسے ریان یاد آیا جو کبھی ایسا ہی تھا ناجتا گاتا مسکراتا..... اور آپ کون ہیں، مجھے کیسے پہچانا آپ نے؟

وہ وہیں رک گیا تھا۔ ”میں ونیزہ احمد..... ایک معمولی سی رائٹر، میں کراچی میں ہی رہتی ہوں مگر میرے پاپا سوئٹزر لینڈ میں ہیں..... میرا ارادہ بھی کچھ دنوں تک پاپا کے پاس سوئٹزر لینڈ جانے کا تھا کہ میں ایک ناول لکھنا چاہتی ہوں مگر یہاں..... یہاں رہ کر مجھے کوئی اچھوتا کچھ نیا نیا کب نہیں ملا۔ اب وہ لڑکی بے تکلفی سے ان کے ہمراہ چلتی کسی پرانے دوست کی طرح ان سے اپنی پریشانی و سکس کر رہی تھی۔

”سر مجھے خوش ہوگی اگر آپ میرے ساتھ چائے کا ایک کپ پیئیں گے۔“ وہ اس ملاقات کو طول دینا چاہتی تھی..... نجانے کیوں۔ اس نے پرسوج انداز میں اس لڑکی کو دیکھا پھر حامی بھر لی۔ وہ اس مقصوم سی مگر دلچسپ رائٹر کو انکار نہیں کر سکا۔

☆☆☆☆

ڈیز ڈائری:

اس رائٹر نے چائے پیتے ہوئے بالکل اچانک ہی مجھ سے میرے ماضی کی کہانی، میری کامیابیاں اور میری

ان یادوں کو چھیڑنے کی درخواست کی جنہیں میں بھلا دینا چاہتا تھا۔ وہ چھوٹی سی مقصوم رائٹر ایسی ہی تھی۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ ان سے پہلی دفعہ ملنے پہ ہی محسوس ہو کہ ہم اس سے پہلے بھی انہیں جانتے تھے۔

ایسے خالص لوگ دنیا میں بہت نایاب ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں کوئی حرص نہیں ہوتی یہ بن دیکھے ہی آپ سے پیار کرنے لگتے ہیں وہ بھی ان لوگوں میں سے ایک تھی۔

”سر اسٹیجی مجھے ناول لکھنا تھا۔ بالکل مختلف اور بیسٹ سِلر ہو، جسے لوگ اپنے نٹکے کے نیچے رکھیں اور ہر رات بہت فراغت سے اس کے ایک ایک لفظ کو دل میں اتارتے چلے جائیں۔ جو ہمیشہ ان کی یادوں ان کی لاہریریوں کا حصہ رہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں امرتیل، الکھ نگری، پیار کا پہلا شہر، آگ کا دریا جیسے ناولوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر میں اس کوشش اس لسٹ میں شامل ہونے کی خطا کر سکتی ہوں۔“

”اس کی آنکھوں میں اتنی امید تھی کہ اسے تو زنا میرے لیے مشکل تھا۔ پھر میں جو کچھ بچپن سے اب تک اپنی ڈائریوں میں لکھتا آیا تھا اس سے آگے میں اس لڑکی سے بیاں کرنے لگا۔ روزانہ ایک آدھ گھنٹہ اس رائٹر کے ساتھ گزرتا، ہم کبھی اس بیٹج پر تو کبھی چائے یا کافی پیتے ہوئے اس چھوٹے سے ہوٹل میں اپنی کہانی تکمیل کے مراحل تک پہنچا رہے تھے۔“

☆☆☆☆

ماضی کے صفحے پلٹنا وہ بہت کھویا کھویا رہنے لگا تھا۔ جیسے وہ تمام واقعات پوری جزئیات کے ساتھ اس کے سامنے آ کر اپنی سیاہ چادر کو اس کے گرد تاننے لگے ہوں۔

دل آویز دھیرے دھیرے مجھے کھوکھلا کرتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے مومی ہاتھوں سے میرے لیے چائے، کافی یا جوس لاتی اور اس میں نشہ آور دوا ڈالنا نہ بھولتی۔ میرے پرانے ملازمین نکال کر وہ اپنے اعتماد کے ساتھی لے آئی تھی۔ وہ قطرہ قطرہ زہر میری رگوں میں اتار رہی

تھی۔ میری جسمانی و ذہنی حالت ابتر ہونے لگی۔ میری سماجی زندگی مفلوج ہونے لگی۔ بابا تو اس حادثے کے اگلے روز جب انہوں نے دل پر حملہ کیا، میں نے دل کے کہنے پر ہی انہیں مینٹل ہسپتال ایڈمٹ کرا دیا تھا۔ جب دل کو معلوم ہوا کہ میں نے وہ آخری کارناما بھی گھر سے نکال پھینکا ہے تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔

”ریان آپ مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں، آئی لو یو نو“ میرے کندھوں پہ سر رکھے وہ بہت اپنی اپنی سی لگی اور میرے دل میں جو احساس ندامت تھا اپنے بوڑھے باپ کو در بدر کرنے کا وہ فوراً ختم ہو گیا۔ میں نے دل کو اپنی انہوں میں سمیٹ لیا۔

اب دل میرے ساتھ اسٹیج پر ہدایت کاری کے رموز سیکھ رہی تھی۔ اسے اسٹیج پر ایکٹنگ کرنا ٹھیک سے نہیں آیا تھا مگر مسز ریان حیدر کا لیل خود پر لگا کر وہ بہت آسانی سے ترقی کے منازل طے کرتی جا رہی تھی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میں کسی قابل نہ رہا۔ ہر وقت شراب کے نشے میں بدست، اب وہ چھوٹے چھوٹے کام اپنے ذمے لینے لگی تھی۔ جیسے اداکاروں کا انتخاب، ان کی پے منٹ، لوکیشن.....

سب اس کی پسند و ناپسند پر ہونے لگا۔ میں بالکل کھ پتلی بن گیا۔ اس کے اشاروں پر ناچنے والا کھلونا.....“ مگر شاید خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میں نے اپنے ڈاکٹر کے مشورے پر لندن سے مکمل چیک اپ کروانے کا پلان بنایا۔ میں نے دل کو بھی ساتھ چلنے کو کہا کہ میرے بغیر وہ بھی اکیلی نہیں رہی تھی اور بہت جلد ادا اس ہو جاتی تھی مگر صد حیرت کے اس نے خلاف توقع ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور جب اس کے انکار کی وجہ مجھے معلوم ہوئی تو مجھے اس پر بے حد پیار آیا۔ جب اس نے کہا۔

”آپ جاؤ کیونکہ آپ کو مکمل چیک اپ کی ضرورت ہے۔ میں یہاں رہ کر گھر اور آفس سنبھالوں گی کیونکہ کسی کے ہاتھ میں یہ سب دینا مجھے گوارہ نہیں۔“

میں قدرے مطمئن ہو کر وہاں سے روانہ ہوا۔ مگر میری گاڑی ابھی آدھے رستے پر پھنسی تھی کہ بارش اسٹارٹ ہو گئی۔ پھر میری طبیعت بھی بگڑنے لگی ڈرائیور تو میرا پرانا ملازم تھا وہ مجھے قریبی ہسپتال میں لے گیا۔ میں نے سنبھلتے ہی ڈرائیور کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ دل کو کچھ نہ بتائے کہ وہ پریشان ہو جائے گی۔

آخر رات کی آخری شب میری طبیعت سنبھلی تو میں نے گھر جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میری فلائٹ تو مس ہو گئی تھی۔ میری گاڑی گھر کے گیٹ میں داخل ہوئی تو چوکیدار نے ایک لمحہ کو چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے اس ڈبلی گیٹ جانی کو استعمال کیا جو اس خیال سے میں نے بنوائی تھی کہ کبھی دیر سویر ہو جائے تو دل ڈسٹر ب نہ ہو۔ میں جونہی گھر میں داخل ہوا تو لائٹس آف تھیں میرا موٹر بگڑ گیا کہ میں ہمیشہ نوکرانی سے لائٹیں روشن رکھنے کا کہتا ہوں وہ ہمیشہ اس بات کو یاد رکھتی تھی مگر آج میری غیر موجودگی کا سن کر پھر بھول گئی۔

”یہ نوکر بھی ایسے ہی ہوتے جب تک سر پہ رہ کر کام نہ کراؤ ٹھیک سے کوئی کام نہیں کرتے۔“

خیر میں نے جب سے لائٹ نکالا اور اس کی روشنی میں سوچ تلاش کیا، لائٹیں جلائیں۔ اپنے روم میں جانے سے پہلے۔ میں پکیں میں گیا، پانی پیا اور روم کی جانب بڑھا مگر دروازے پر ہی میرے قدم رک گئے۔ اندر سے کسی کی دلی دلی ہنسی اور باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ دل آویز آئینے میں تھی اس کے ساتھ کوئی مرد بھی تھا مگر کون؟ میں وہیں رک گیا۔

”اس وقت اگر تمہارا شوہر آ جائے تو سوچو کیا ہوگا، ارے جلدی اینڈ کرو بہ ڈرامہ میری بلبل۔“

وہ مرد بڑی بے تابانی سے بولا تھا۔ ”تم بہت ہی بے صبر ہے ہو، اتنی جلدی کیا جلدی سے اور میرے لیے وہ شطرنج کے مہرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، مجھے اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے، اپنا نام بنانے کے لیے پیار کا ڈھونگ رچانا پڑتا ہے پھر قطرہ قطرہ زہر دے کر

”دل اٹھ گئیں آپ..... کیسی ہو جان؟ میں اسی
دربار انداز میں مخاطب تھا۔

”میں نے سوچا تمہیں ڈسٹرب نہ کروں، نیند پوری
کر کے تمہیں بیدار تو ہونا ہی تھا۔“ وہ ناہنجی کی حالت
میں جہاں کھڑی تھی وہیں جیسے پتھر کی ہو گئی۔
”ارے کیا ہوا، رک کیوں گئی ہو۔“ میں نے لہجے
میں بے تابی سولی۔

”آں..... ہاں آپ گئے نہیں۔“ اس کے لبوں
نے ہلکی سی جنبش کی۔

”ہاں دراصل رات اچانک میری طبیعت بگڑ گئی۔
میں نے واپسی کا ارادہ کیا اور رات ڈاکٹر سفیر کے پاس
ہی گزاری سوچا تم خواہو ڈسٹرب نہ ہو تو میں نے
اطلاع نہیں دی، میں ابھی کچھ دیر پہلے آپا ہوں۔“
میں نے ایک گہری پرسکون سانس لیتے اسے
دیکھا۔

”اوہ..... اچھا، اچھا آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔“
وہ پہلے کی طرح چپکتی ہوئی میرے پہلو میں آ بیٹھی۔
ڈارلنگ ریڈی رہنا، ہمیں کل کہیں جانا ہے۔ میں نے
اسے اچانک اطلاع دی۔

”کہاں..... کہاں جانا ہے۔“ وہ لمحہ بھر کو چوکی۔

☆☆☆.....

”ریان..... چلیں ناں، یہ کہاں لے کر آ گئے مجھے
آپ۔“ وہ آبادی سے دور اس فارم ہاؤس میں آ کر
مستقل آدھے گھنٹے سے تقاضا کر رہی تھی کہ واپس چلیں
مگر وہ باہر کرسی بچھا کر مزے سے آنکھیں موندے بیٹھا
رہا۔

”مگر ڈارلنگ ہمیں اب یہیں رہنا ہے۔“ میری
بات سن کر وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی جیسے اسے میری
دامنی حالت پر شبہ ہو۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے ریان، نیور..... مجھے آپ کا
یہ مذاق بالکل اچھا نہیں لگا۔ ارے شام گہری ہو رہی
ہے۔ ہمیں گھر چلنا چاہیے۔ چلیں اٹھیں پلیز۔“ وہ اب
اس کا ہاتھ پکڑے اسے اٹھنے اور جانے کی ضد کرنے لگی

ہی میں اسے کھوکھلا کرنا چاہتی ہوں کہ اس کی موت بھی
ہمارے لیے فائدہ مند ہو۔“

دل آویز کی دلکش آواز اس کے کانوں میں سیسہ
انڈیل رہی تھی۔ باہر کھڑا ریان حیدر شہید طوفانوں میں
گھر گیا تھا۔ ماضی کی محرومیوں نے اسے جہاں بہت
سے غموں سے آشنا کیا تھا وہیں اس میں ضبط برداشت
کی صلاحیت بھی پیدا کر دی تھی۔ وہ شکست قدموں سے
چلتا لیکن کی جانب بڑھا اور فریج سے پانی نکال کر ایک
ہی گھونٹ پر ساری بوتل حلق میں انڈیل دی۔

اس کے حواس کچھ ٹھکانے آئے۔ وہ اب جو کچھ
بھی کرنا چاہتا تھا مکمل ہوش و حواس میں رہتے ہوئے
کرنا چاہتا تھا وہ رات اس نے گھر سے باہر گزاری وہ
چاہتا تو اسی وقت کمرے میں داخل ہوتا اور ان دونوں
گوگولیوں سے بھون دیتا مگر نہیں..... وہ اب انہیں پل
پل سزا کی لذت سے آشنا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے گھر
کے تمام ملازمین کو حراست میں لے لیا تا کہ کوئی مخبری نہ
کر سکے اور گھر کے اندر اور باہر اپنے اعتماد کے ساتھیوں
کو کھڑا کر دیا۔

☆☆☆.....

ڈیز ڈائری:

تخیل..... جی ہاں میری خوشیوں کا قائل، دل
آویز کے عاشق کو میرے ساتھیوں نے اگلی صبح ہی اپنی
حراست میں لے لیا تھا۔ اور اسے میرے فارم ہاؤس
نہیں بلکہ زندان میں پہنچا دیا تھا۔ اپنے مخالفین کو یہیں
اس ویرانے میں لاکر سزا میں دلواتا تھا۔

اس وقت میں لاؤنج میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔
ساتھ ساتھ تازہ اخبار کی ورق گردانی بھی ہو رہی تھی کہ
وہ فریش ہو کر لاؤنج میں آئی ”زیرینہ..... کدھر گم
ہو، جلدی سے فریش اور نچ جوس کا گلاس.....“

اچانک مجھے سامنے دیکھ کر لفظ اس کے منہ میں ہی
گم ہو گئے میں نے اخبار سے نظر ہٹا کر بہت محظوظ
ہوتے ہوئے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو
دیکھا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس کی اس ادا پر غار ہو جاتا۔
مگر اس لمحے میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

ایک جھٹکے سے میں نے اپنا بازو اس کے مومی ہاتھوں سے آزاد کر لیا۔ اور اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اس اندھیر کوٹھڑی میں لے گیا۔ جہاں اس کا عاشق نکلیل پہلے ہی زنجیروں میں قید تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا چند لمحے تو وہ اپنی آنکھیں چھپکا کر دیکھنے کی کوشش کرتی رہی مگر جب منظر اس کے سامنے واضح ہوا تو خوف سے اس کا چہرہ فق ہو گیا۔

”بولو..... چپ کیوں کر گئی ہو بتاؤ کون ہے یہ؟“
میں دھڑاڑ۔

”یہ..... یہ ریان۔“ لفظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے وہ پیچھے دیوار کے ساتھ لگی نیچے بیٹھتی گئی۔ میرے اشارے پر کبیرا نکلیل پر ہنسر برسانے لگا، اس پر ڈنڈے گھونسنے برسائے گئے اور ہر طرح سے اذیت دی گئی تھی۔

”صاحب..... یہ سارا پلان دل آویز کا تھا، یہ میرا کوئی تصور نہیں یہ طوائف.....“
نکلیل کے منہ سے اس کے لیے گندی گالیاں نکل رہی تھیں۔

”یہ حقیقت ہے کہ جرم کی دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ سن لیا تم نے..... یہ تیرا عاشق تجھے کیا کہہ رہا ہے، اس کی خاطر تم نے میرے جذبات سے کھلا مجھے تباہ کرنے سے تم کو کیا مل جاتا، پیسہ..... شہرت..... تم مجھ سے کہنتیں میں تمہیں اتنی دولت دیتا کہ تم سے سنبھالی نہ جاتی مگر میرے اعتبار کا خون کر کے تم نے اچھا نہیں کیا۔“

میرے اشارے پر صغیرا، گاما، رستم باہر چلے گئے واپس آئے تو ان کے ساتھ دو شکاری کتے بھی تھے۔ میں اپنے بدترین دشمن کو ایسے ہی سزا دیتا تھا۔ اس کہینے کو کتوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ اس کی بوٹیاں نوچ رہے تھے اور وہ چیخ رہا تھا۔ اس کی آہ و بکا سے آسمان کا سیدہ شق ہو رہا تھا میری آنکھوں کے سامنے اس کو وہی

سزا مل رہی تھی جو میں چاہتا تھا۔ آخر وہ زنجیروں میں جکڑا التجائیں کرنے لگا کہ مجھے گولی مار دو یا سر قلم کر دو مگر اس اذیت سے بچاؤ۔ مگر مجھے تو اس لمحے ایک کمینی سی خوشی ہو رہی تھی۔ میں نے چاہے زندگی میں ایک غلط فیصلہ کیا تھا مگر وہ عورت تو کیا دنیا کی کوئی طاقت بھی مجھے ہرا نہیں سکتی تھی۔

ایک دفعہ پھر سب میرے ہاتھ میں تھا میں زریاب حیدر کی طرح ایک عورت کے ہاتھوں تباہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی سانسوں کی دُور میرے ہاتھ میں تھی میں جب چاہتا جیسے چاہتا اسے کھینچتا اور تڑپا کر موت کے منہ میں ڈال دیتا۔ اب میں نے ایسا ہی کرنا تھا۔ اس کی موت میرے ساتھ ساتھ دل آویز کی آنکھوں نے بھی دیکھی۔

”دل..... دیکھو یہی ہے ناں جس کے ساتھ مل کر تم نے مجھے تباہ و برباد کرنے کا پلان بنایا۔ دیکھو ادھر یہی ہے ناں۔“ وہ گہری غنودگی میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ میں اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ مگر وہ اسی حالت میں رہی۔

نکلیل موت کی آرزو کرتے کرتے مر گیا تھا۔ میرے اندر کے درندہ صفت انسان کو سکون نہ آیا میں نے سوچا اسے اتنی جلدی نہیں مرنے دیتا ہر روز مرنے اور جیتنے مگر.....

☆☆☆.....

رات کے آخری پیر اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں ناگوار تازہ خون کی بو پھیلی تھی ہر سو اندھیرا۔

”قبر.....“ اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا۔
”نہیں..... نہیں میں مرنے نہیں سکتی میری سانس چل رہی ہیں۔ میرے تن پہ کفن نہیں، نہیں یہ قبر نہیں پھر؟ اس کے دل میں سوال لہرایا۔ باہر آوارہ کتوں اور چیخندگروں کی آوازیں ماحول کو پر اسرار بنا رہی تھیں۔ اسے آہستہ آہستہ سب یاد آنے لگا۔ وہ دیواریں ٹوٹتی دروازے تک پہنچی اور پوری قوت سے دروازے کو پیٹنے لگی۔
ریان حیدر نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی۔

سامنے اندھیر کوٹھڑی کا دروازہ رات کی خاموشی میں زور زور سے پیٹا جا رہا تھا۔ اس عورت کی چیخیں، سسکیاں فضا کو چیر رہی تھیں۔ وہی عورت جس کا ایک آنسو ریان کو بے چین کر دیتا تھا۔ مگر آج وہ بالکل ساکت بے حس بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ رات کی بے چین گھڑیوں میں وہ روتی رہی جیچتی چلاتی رہی اور پھر نجانے کب خاموشی چھا گئی۔ یقیناً وہ خود تھک ہار کر ڈھس گئی تھی۔ اس نے موت کے خوف سے اور اپنی زندگی سے شکست کھائی تھی۔

وہ ایک پورا دن غنودگی میں رہی، پانی و خوراک سے بے نیاز۔ یہاں آکر اسے پانی کی بوند بھی میسر نہ آ سکی تھی۔ اگلے دن ریان نے کمرہ کھولا تو وہ دیوار کی ایک ٹکڑ پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ خوفزدہ آنکھوں میں آنسو ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کی آہٹ پہ اس نے سر اٹھا لیا۔ کچھ لمحے پہچان کے مراحل طے کرنے کے بعد وہ بھاگتی ہوئی آگے بڑھی۔

”ریان..... ریان احمد خدا کے لیے مجھے معاف کر دو، میں مانتی ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا مگر اس سب کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔ میں لب بھینچتا باہر نکل گیا۔

درحقیقت میں بھی اس راز کو پانا چاہتا تھا۔ جس کی بنیادوں میں وہ حقیقت لمبی تھی جس نے میرے اعتماد کا خون کیا۔ وہ بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آئی اور میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا یہ تھا کہ میں دھاڑا۔

”دور ہو جاؤ مجھ سے گندی گھٹیا عورت۔“ وہ ایک لمحے کو ساکت ہوئی پھر زور زور سے بننے لگی..... ہاں میں ہوں گھٹیا عورت، میرا تعلق تھا اس گھر آنے سے جہاں کی عورتوں کو تم جیسے عزت دار رات کے اندھیروں میں تو دل بہلانے کا سامان بنا لیتے ہو مگر دن کے اجالے میں ہم سے منہ چھپاتے پھرتے ہو، ہمیں گندی گالیاں دیتے ہو۔ میرا باپ بھی ایک بہت بڑا جاگیردار تھا۔ جو چند راتیں میری ماں سے دل بہلانے کے بعد کہیں غائب ہو گیا مگر میری صورت ایک سیاہ دھبہ اس کی کوکھ میں چھوڑ گیا۔

ہو لو..... جواب دو ریان حیدر کیا میں چاہ سکتی تھی کہ میں طوائف کے گھر پیدا ہو جاؤں۔ میرا اس دنیا میں آنا مقدر میں لکھا تھا، میں آگئی مگر میرے ماتھے پر طوائف کا سیاہ دھبہ لگا تھا۔

میری ماں نے مجھے پڑھایا کیونکہ میری ماں اور نانی کا خیال تھا کہ آج کے جدید دور میں پڑھی لکھی طوائفوں کا ریٹ بہت ہائی ہے۔ مگر برا ہوا میرے ساتھ کہ علم نے مجھے میری ذات کا شعور بخش دیا۔ مجھے خود سے، اس معاشرے سے نفرت ہونے لگی۔ میں یہاں سے دور جانا چاہتی تھی۔

میری نانی نے بہت جتن کیے کہ میں ناچ گانے کی طرف آ جاؤں مگر میرے پیروں میں جوئی گھنکر و ڈالے جاتے میں تھر تھر کا پینے لگتی مجھے مردوں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ پھر میری زندگی میں ٹھیکل آیا۔ وہ پہلے دن اپنے کسی دوست کے ساتھ آیا تھا۔ مگر پھر میں نے اکثر اسے اپنا پیچھا کرتے دیکھا۔ آخر تک آکر میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا میں نے اس سے کہا۔ ”دیکھ ٹھیکل میں نانی سے تیری شکایت لگاؤں گی، باز آ جا ورنہ بہت برا ہو گا۔“ مگر وہ بے غیرتوں کی طرح بننے لگا میں اس دن اکیلی تھی کالج سے واپسی پر سمنان بڑک چ۔

”ارے کیا بتائے گی کہ ایک خوبصورت بینڈم سا بندہ مرتا ہے مجھ پہ۔“

اس نے اپنی ہتھیلی کھولی اور میرا دل چاہا کہ ایک کسے سے اس کے دانت توڑ دوں۔

”تو چاہتا کیا ہے؟“ میں اس سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں تھی۔

”میں تجھے چاہتا ہوں میری بلبل“

وہ میری سوچ سے زیادہ کمینہ تھا۔ اس کا مجھے اندازہ ہو گیا آخر ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا۔ ”کل ڈیڑھ بجے سہ پہر کالج سے واپسی پر تیرا انتظار کروں گی میں آ جا نا۔“

میں یہ کہہ کر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا

پیشگی سرور کا نیا سلسلہ وار مطالعہ

پیل صراطِ محبت

بہت جلد

صرف قارئین ریشم کیلئے



گھر آ گئی، یقیناً وہ سوچ رہا تھا کہ میں اس کے جال میں پھنس گئی۔ مگر وہ بھول گیا تھا کہ طوائف کبھی وفائیں کرتی یہ اس کے پیشے کا تقاضا ہوتا ہے۔

اگلے دن میں نے اسے کہا تھا کہ مجھے اس دنیا سے دور لے جائے، اپنا نام دے مجھے ایکٹنگ کرنی ہے سنیج پائی وی پر..... کیونکہ میں جانتی تھی کہ میں اکیلی کبھی کچھ نہیں کر سکتی۔

ایک تنہا عورت کو زمانہ بہت جلد ذلیل و سوا کر دیتا ہے۔ مجھے سہارے کی تلاش تھی اور وہ میرا سہارا بن گیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کچھ بن گئی تو بھی تیری نہ بنی تو بھی تیری ہی رہوں گی۔ ہم لاہور سے کراچی آ گئے اور پھر ٹھیک کی کوششوں سے ہی میری آپ تک رسائی ہوئی۔ آپ کی شکل میں مجھے میری منزل مل گئی میں آپ کے ذریعے بہت جلد وہ حاصل کر سکتی تھی جو میرا خواب تھا۔ مگر ٹھیک کو اپنے پلان میں شامل کرنا ضروری تھا۔

ہم نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ بہت جلد آپ کے ذریعے خوب دولت اکٹھی کر کے بیرون ملک روانہ ہو جائیں گے۔ ہاں میں مانتی ہوں مجھے بھی کسی مرد سے محبت نہیں ہوئی۔ نہ ٹھیک سے اور..... اور نہ آپ سے۔

اس کے اقرار نے مجھے توڑ دیا تھا۔ مگر میں پھر بھی کھڑا تھا اپنے قدموں پر..... ہے ناں حیرت کی بات۔ خیر پھر اس نے بتایا کہ ٹھیک اور وہ اپنے پلان کو بہت عمدگی سے تکمیل کے مراحل تک پہنچا رہے تھے۔

”میں اچھی ایکٹر ہوں یا نہیں مگر جان بوجھ کر غلط ایکٹنگ سے میں نے آپ کو اپنی جانب متوجہ کیا اور اس طرح بہت کامیابی سے آپ کے دل اور گھر میں داخل ہو گئی۔“

پھر میں آپ کو ذہنی و جسمانی طور پر مغلوب کرنے کی کوششوں میں لگی رہی۔ میں شاید اپنے باپ اور ان تمام مردوں کا بدلہ آپ سے لے رہی تھی۔ جو ہم طوائفوں کو کھلونا بنا کر چھوڑ دیتے ہیں مگر اب مجھے

احساس ہو رہا ہے کہ بعض دفعہ انسان کس قدر غلط فیصلے کرتا ہے۔ پھر میری زندگی میں وہ بھیانک رات بھی آ گئی شاید خدا نے اب تک میری نافرمانی کی رسی ڈھیلی چھوڑی تھی۔ اب اس کی خدائی جوش میں آئی تھی۔ میرے گناہوں کی سزا مجھے ملنی تھی۔ ٹھیک اس رات آپ کے جانے کے فوراً بعد آ گیا۔ کیونکہ گھر میں کچھ ملازم جو میں نے اپنی پسند سے رکھے تھے وہ سب ٹھیک کے اعتماد کے بندے تھے۔

وہ اسے گھر کی ایک ایک رپورٹ دیتے تھے ایک طرح سے میں بھی اس کی مرضی کی غلام تھی۔ بہت سخت نگرانی کی جاتی تھی۔ اس رات میں ٹھیک سے آنے والے دنوں کی لانگ کرتی رہی مگر میں تو اس سے بھی نفرت کرتی تھی شادی اور کسی مرد کا تصور ہی میری روح میں زہر گھول دیتا تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ موقع پا کر ٹھیک کا قصہ بھی پاک کر دوں گی اور اسے قتل کروا کر آپ کی دولت سمیٹ کر ہمیشہ کے لئے یہ ملک چھوڑ دوں گی۔ میں ٹھیک جیسے مردوں کو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے بہلا تو سکتی تھی مگر اپنا قرب اپنا آپ اسے سوچنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس رات بھی میں اس سے ایک فاصلے پر رہی اور اپنی دلچسپی باتوں کے جال میں پھنسائے رکھا۔

ایک دم ہی میری کنپٹیوں میں درد کی لہریں اٹھیں اور میں بری طرح اسے پیٹتا، اس کا سینہ چہرہ نوچتا اسے بالوں سے گھسیٹتا ہی اندھیرے کمرے میں پھینک آیا جہاں ٹھیک کی لاش کے ٹکڑے اور ان سے اٹھتی بو نے کمرے کو انتہائی کریہہ بنا دیا تھا۔ رستم نے جلدی سے اس دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا کیونکہ وہ پاگلوں کی طرح دروازے کی جانب لپکتی تھی۔ اس کے سر اور منہ سے خون بہہ رہا تھا اس کی چیخیں دور تک میرا تعاقب کرتی رہیں اور میں اپنی گاڑی میں شہر کی جانب روانہ ہوا گیا۔

☆☆☆

بھی معاف کر دیتا ہے جب وہ ساری دنیا گناہوں سے بھرنے کے بعد ذرہ سے احساس ندامت میں ڈوب کر تو یہ کرتا ہے مگر میں کتنا ظالم تھا کہ ان کو ان کے تڑپنے، سسکنے کے باوجود، ان کی لاکھ التجاؤں کے باوجود انہیں ذلت و اذیت سے لبریز موت دی۔ انہیں آسانی سے مرنے بھی نہ دیا۔

”میں دل آویز کے اعتراف جرم کے بعد دل میں اس کی ساری خطائیں معاف کیے اسے ایک دفعہ پھر اپنی زندگی میں شامل کروں گا، اسے اتنا پیار دوں گا کہ وہ اپنی سب محرومیاں بھول جائے گی۔“ اس نئے تصور نے مجھ میں توانائی سی بھر دی تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور شام ہونے سے پہلے فارم ہاؤس پہنچ گیا۔ میں گاڑی سے اتر کر تیزی سے بھاگتا ہوا اس زندان کے قریب پہنچا اور دروازے پہ متعین چوکیدار سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ دروازہ کھلا اور میں آگے بڑھا۔

چار سو اندھیرا تھا مگر دو دن پہلے اس شخص کی ٹکڑوں میں بکھری لاش سے اٹھتی بو ماحول کو ناقابل برداشت حد تک کریمہ کر رہی تھی۔

ایک دم ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے زیادہ درندہ صفت بھی کوئی اس دنیا میں ہوگا۔ میں نے ایک شخص کو ٹکڑوں میں مروا کر ایساں پھینکا تو اس کے ساتھ ایک زندہ وجود ایک جیتے جاگتے انسان کو دو دن خوب، بھوک، تنہائی اور قید کا عذاب دینے کو چھوڑ دیا۔ چوکیدار نے لائٹر جلا دیا۔

”صاحب جی صبح سے کمرے میں خاموشی تھی۔ میں نے سوچا کھول کر دیکھوں مگر یاد آیا کہ آپ نے سختی سے منع کیا ہے۔“ غفور بھی کسی انہونی کے احساس سے دوچار تھا۔

”روشنی کرو جلدی۔“

میں چلا یا مگر اس روشنی نے میری زندگی میں اندھیرا بھر دیا۔ کمرے کے بیٹوں بیچ اور چھت کے پرانے خستہ حال پتکے پر لٹکا وجود..... یقیناً دل کا تھا، نیچے وہ جھانگا سی چار پائی کچھی تھی۔ جس پر چڑھ کر اس نے آسان

میں کراچی لوٹ آیا۔ نجانے کیوں ہر گناہ کا تھک سا گیا تھا۔

صبح کا انتظار کیے بغیر میں مینٹل ہاسپٹل میں بابا سے ملنے گیا۔ آہ میرے پیارے بابا! جن سے میرا خون کا رشتہ تھا۔ اس پوری دنیا میں میرے، اپنے انہوں نے میری خاطر مجھے اس گھٹیا عورت سے بچانے کے لیے ہی اس پر حملہ کیا تھا مگر میں انہیں سمجھ نہ سکا تھا۔

دو بری عورتوں نے ہم باپ بیٹا کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ میں ہاسپٹل میں داخل ہوا مگر جب میرے دوست نے مجھے بتایا کہ آج سے تھیک ایک ماہ پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا تو یوں سمجھو اب۔ لے لے کر میری زبان، میرے دل کی دھڑکنیں سب خاموش ہو گئیں۔ میں ہسپتال کے عملے کی نشاندہی پر ان کی قبر پر گیا۔

وہاں ہر سو ویرانی بکھری ہوئی تھی۔ میں خوب رونا چاہتا تھا۔ ان کی قبر پہ، بیٹھ کر خوب چلانا چاہتا تھا۔ مگر صد حیرت کہ آنسو میرے اندر ہی دم توڑ گئے۔

میرا دل سینہ چیر کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا مگر میرے لبوں پہ موت سا سناٹا چھایا تھا۔ ”موت“ میرے دل پر کسی نے دستک دی۔ مجھے میری ہستی حقیر سی لگنے لگی۔ ایک لمحہ کو میں نے خود کو قبر کی تاریکی میں اترتے محسوس کیا۔ مجھے ہوش آ گیا تھا۔ میرے دل پہ دستک ہونے لگی میرا ضمیر ملامت کرنے لگا کہ مجھے کسی کو اتنی اذیت ناک موت دینے کا کوئی حق نہیں۔ مجھے دل آویز پر کیا گیا ظلم یاد آنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے دو انسانوں کو کسی بری طرح قتل کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ اگر وہ ظالم تھے، انہوں نے برا کیا تھا تو میں کہاں کا اچھا تھا۔ میں نے بھی تو سو گنا زیادہ انہیں سزا دی۔

حالانکہ سزا و جزا کا حق تو صرف خدا نے اپنے ہاتھ میں محفوظ رکھا ہے۔ مگر ہم لوگ اس کی قدرت پہ بھروسہ کرنے کی بجائے خود خدا بن جاتے ہیں۔ دوسروں کی سانسوں کی ڈوری اپنے ہاتھوں میں لے کر جیسے چاہیں انہیں سزا دیں۔ مگر وہ قادر مطلق جو انسان کو اس وقت

آہٹ پہ آنکھیں کھول کر مسکراتے ریان حیدر آج خاموش تھے۔ اسے یکدم گہری اداسی اور پریشانی نے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

”سر..... پلیز اسٹیجے سر.....“ وہ اب ان کے بازوؤں کو بولے بولے چھبھو رہی تھی مگر پھر اس نے ان کا سر ایک جانب ڈھلکتے دیکھا۔

”سر..... نہیں.....“ وہ زور سے چیخی اور باہر کو بھاگی۔

سمندر کی لہروں پر کاغذ کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ان کاغذوں پہ بھری سیاہی ان لفظوں کی کہانی سمندر کی گہرائیوں میں اپنے راز اتار رہی تھی۔ وہ لڑکی سیاہ جینز اور سیاہ کرتے کے ساتھ اس کا ہم رنگ اسکارف سر پہ لیے ختم آنکھوں کے ساتھ اس ناول کو سمندر کے سینے میں اترتے دیکھ رہی تھی جس ناول پر اس نے پورے تین ماہ دن رات محنت کی تھی۔

وہ اس کے ذریعے پاکستان اور اس سے باہر بین الاقوامی سطح پر اپنی پہچان بنا سکتی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے دن رات ان لفظوں اور اس کہانی کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ اسے کہانی میں موجود تمام کرداروں سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ ان کے راز فاش نہیں کر سکتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ دنیا میں ایک بھی ایسا انسان نہیں جو ان کرداروں کو ان کی نفسیات کو اس کی نظر سے دیکھے گا۔

اسے لگنے لگا کہ لوگ ریان حیدر کو برا بھلا کہیں گے مگر وہ ان کی محرومیوں کو محسوس نہیں کریں گے۔ یہ ہم سب کا المیہ ہے کہ ہم ہر اس انسان کو برا کہنے لگتے ہیں جس سے برے افعال سر زد ہوں۔ مگر ہم یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس نے اتنا برا کام کیوں کیا؟ اسی لئے ونیزہ احمد بھی اس کہانی کو سمندر کی وسعتوں میں اتارنے چلی آئی تھی کہ انسان کے دل میں وہ گہرائی کہاں جو اس المناک حقیقت کو جان پائے۔

☆☆☆

موت کی خاطر خودکشی کا انتخاب کیا تھا۔ میری آنکھیں سہکت باہل تصویر کی صورت اس لٹکتے وجود پر مرکوز تھیں۔ میرا وجود غلامیں تحلیل ہو رہا تھا، مجھے میرا ہوش نہ رہا تھا کہ میں کہاں تھا میرا وجود کہاں تھا۔ بس ہر طرف اندھیرے کی دیوار چادر بھیلی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی کہانی مکمل کر چکی تھی۔ کل رات ہی تو اسے معلوم ہوا تھا کہ ریان حیدر کو بہت سخت ٹیپر پیچ رہے اور وہ رات دیر تک ان کے پاس بیٹھی رہی مگر پھر ان کے بے حد اصرار پر کہ ماما پریشان نہ ہوں وہ گھر آ گئی تھی واقعی ماما اس کے دو بجے کے قریب گھر پہنچنے پر ناراض ہوئی تھیں مگر اس کے چہرے پہ فکر مندی کے آثار دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئی تھیں۔

نجانے کب وہ ناول لکھتے لکھتے ریان حیدر کے قریب آ گئی تھی۔ وہ ان سے محبت کرنے لگی تھی۔ ایسی محبت جو کسی تعلق کسی غرض کی محتاج نہیں ہوتی پھر اسے احساس ہوا تھا کہ یہ شاندار انسان درحقیقت اندر سے کسی قدر شکستہ رہا ہے۔ یہ جو زندگی میں طاقت کا نشان مانا جاتا تھا۔ درحقیقت اندر سے ریت کی دیوار ثابت ہوا جو ذرا سے ٹھوکر سے ٹوٹ گئی۔ وہ رات سوئی نہیں اور صبح فجر کی نماز ادا کر کے ریان حیدر کے خوبصورت اپارٹمنٹ کی جانب جانے کو تیار ہوئی۔ وہ جلدی سے ان کے روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ ہر جانب اندھیرا تھا۔ یکدم ہی وہ گھبرا گئی۔

”سر پلیز یہ ونڈوز سے پردے ہٹا لیا کریں، میں آج آپ کا روم اچھی طرح صاف کروا کر سیٹ کروں گی اور ذیلی تازہ پھول لانا بھی میری ذمہ داری۔“ وہ اپنی دھن میں بولتی پردے سرکانے لگی۔ پھر وہ بستر تک آئی وہ ابھی تک سو رہے تھے۔

”اوہ سر..... گڈ مارننگ، اٹھ جائیے صبح ہو گئی اور آج آپ نے فجر کی نماز بھی ادا نہیں کی، مجھے تو بہت نصیحتیں کرتے ہو آپ.....“

وہ اب زور زور سے بول رہی تھی مگر اس کی ایک

پیارے تو جیون خوش

ایم ارشد وفا

دیں۔

”اب کیا ہے۔“ شہر یار کی ماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا!

”یہ دیکھے۔“ صبا نے اپنے گیلے کپڑے آنٹی کو دکھاتے ہوئے کہا۔

جب کہ شہر یار وہاں سے بھاگ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب شہر یار واپس گھر آیا تو صبا کو ابھی تک وہاں موجود پایا۔

”تم گئی کیوں نہیں ابھی تک۔“

”اس میں کیوں والی کون سی بات ہے۔ میری پھوپھو کا گھر ہے۔“

”اٹھاؤ اپنی پھوپھو اور بھاگو یہاں سے۔ بڑی آنٹی پھوپھو ہے میری۔“ شہر یار نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”شہر یار میری بات سنو۔“

”جی ماں۔“

”بیٹا ماشاء اللہ اب تم سیکنڈ ایئر کے سٹوڈنٹ ہو لیکن ایک بات بتاؤ۔ کہ تمہیں عقل کب آئے گئے۔“

”عقل ہاں ماں رات کو میری عقل سے فون پر بات چیت ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہی کہہ رہی تھی۔“ شہر یار کی ماں نے غصے سے اس کو ڈانٹا:

”میری بات سنو اور اپنی بکواس بند کرو فی الحال۔“

”جی ماما۔“ شہر یار ایسے ہو گیا۔ جیسے اس جیسا شریف بچہ اس دنیا میں موجود ہی ناں ہو۔

”آنٹی میں بتاتی ہوں اسے عقل کب آئے گی۔ جب اس کے سر پر سینگ نکل آئیں گے۔“ صبا نے باہر سے آتے ہوئے کہا۔

”تو اس محترمہ کی کمی تھی۔“

”کیا کہا۔“

”اوہ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔۔۔۔۔ میں نے محترمہ کی بے عزتی کر دی۔“

”ساڈی ماں نوں پتر نہیں ملے، تینوں یار۔۔۔۔۔ بہتر ہے۔۔۔۔۔“ شہر یار عرف خرم نے اپنی کزن صبا کو دیکھتے ہوئے گانا شروع کر دیا۔ شہر یار کے گانے سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی چھوٹی بہن نمرہ اور کزن صبا نے ناچنا شروع کر دیا۔ جب شہر یار کی ماں اندر کمرے میں داخل ہوئی تو یہ منظر دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”شہر یار تیرا اللہ حافظ ہے۔“ مگر شہر یار پھر بھی باز نہ آیا۔ وہ مسلسل گانا گا رہا تھا۔ آخر جنگ آ کر شہر یار کی ماں نے جوتا اٹھایا اور اس کی طرف مارنے کے لیے دوڑی جب کہ شہر یار باہر کی طرف لپکا۔

”آنٹی آنٹی۔“

”جی بیٹا“ شہر یار کی ماں نے صبا کے بلانے پر کہا۔

”آنٹی یہ جوتا چھوٹا ہے، یہ بڑے والا مارو۔“ اور آنٹی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ جب کہ شہر یار دروازے کے پاس کھڑا صبا کی طرف غصے سے دیکھ رہا تھا۔

”صبا میں تیرے دانت توڑ دوں گا۔“

”چل بھاگ دانت توڑ دینے ہیں پہلے آنٹی سے جو تے تو کھاؤ پھر بات کرنا ہم سے۔“

”صبا۔ شہر یار کے ماموں کی بیٹی تھی۔ شہر یار صبا کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ لیکن ستانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ جب شہر یار کی ماں اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی تو شہر یار کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں نمرہ اور صبا ہنس رہی تھیں۔ شہر یار نے پانی کا جگ بھرا اور صبا پر پھینک دیا اور ساتھ ہی اس کے بالوں کو زور سے کھینچا۔

”اب پکڑو جوتا۔“

”آنٹی آنٹی۔۔۔۔۔ امی جی امی جی دونوں نے یک جان ہو کر شہر یار کی امی کو آوازیں دینا شروع کر

”ہاں جلدی کرو۔“ شہر یار نے بانٹک باہر نکالی۔
صبا بھی جلدی جلدی باہر گئی۔

”صبا آؤس کریم کھانی ہے۔“ اس کو ایک اور
حیرت کا جھٹکا لگا اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ ”نہیں“
شہر یار نے بھی آج کوئی شرارت نہ کی اور اسے گھر
چھوڑ کر واپس آنے لگا تو صبا نے کہا۔
”چائے تو پیتے جاؤ۔“

”نہیں صبا بس ایک بات کرنی ہے۔ صبا بات یہ
ہے کہ میں..... تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ اور
تم کو اپنی ہمسفر بنانا چاہتا ہوں..... کیا تم میرا ساتھ دو
گی۔“ وہ اس کی نظروں کا سامنا نہ کر سکی اور اندر بھاگ
گئی۔

شہر یار نے اس کو فون کر کے کہا کہ عدنان بھائی کی
شادی سے پہلے پہلے مجھے تمہارا جواب چاہیے۔

آخر عدنان کی شادی کا دن بھی آ گیا۔ مہندی
والی رات سب گھر والے شادی پر گئے۔ اگر کوئی نہ
گیا تو صرف شہر یار۔ آخر سب کزنز نے آپس میں
مشورہ کیا کہ جا کر شہر یار کو لے کر آتے ہیں۔ جب کہ
صبا الگ پریشان تھی۔ آخر ہمت کر کے اس نے شہر یار
کو فون کیا۔

”ہیلو جناب! تم آئے نہیں۔“

”پہلے میری بات کا جواب دو۔“ شہر یار نے کہا۔

”بس تم جلدی سے آ جاؤ۔“

”میں تب تک نہیں آؤں گا جب تک میری بات کا

جواب نہیں ملتا۔“

”شہر یار میں کیا کہوں۔“

”جودل میں آئے کہہ دو۔“

”اگر میں کہوں کہ میں بھی تمہیں چاہتی ہوں تو

پھر۔“

”کیا۔“

”ہاں بالکل چلو اٹھو اور جلدی آؤ۔“

”جو حکم میری جان کا۔“

”بس بس اب زیادہ کھنکھن نہ لگاؤ اور جلدی آؤ۔“

اس سے پہلے کہ شہر یار کے منہ سے اور لفظ نکلتا ہی
اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا جس کی وجہ سے شہر یار کی
ہاتھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

یوں کہ آج تک ماں نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا
آج زندگی میں پہلی بار شہر یار کی آنکھوں میں
آنسو دیکھ کر سب ہی تڑپ اٹھے۔ شہر یار اٹھا اور اپنے
غریبوں میں جا کر لیٹ گیا۔ آج وہ زندگی میں پہلی
بار آیا تھا۔

”ماں آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ شہر یار
واہ و بندہ کر کے آنسو بہا رہا تھا۔ آخر یہ خبر پورے
عدنان میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ کیوں
کہ آج تک کسی نے اس پر ہاتھ نہ اٹھایا تھا۔ یہ سب
کے لیے نئی بات تھی۔

نمرہ نے پیپا کو دہائی فون کر دیا۔ ادھر تھوڑی دیر بعد
عدنان والے شہر یار کے گھر میں تھے اور ہر کوئی اس کو
واہ و بندہ کھولنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مگر شہر یار کمرے میں
ہلکا سا آنسو بہا رہا تھا۔ آخر اس کی ماں نے اپنی قسم
سے کر اسے دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ جب انہوں
نے شہر یار کی آنکھوں میں بے تحاشہ آنسو دیکھے تو سب
کی تڑپ اٹھی۔ اس کی ماں نے آگے بڑھ کر بیٹے کو
چمکے لگا لیا۔

”بس بیٹا..... اب نہیں رونا، چلو مسکراؤ جلدی
سے۔“ جواباً شہر یار بھی دھیرے سے مسکرایا۔

☆.....☆.....☆

شہر یار کے ماموں زاد کی شادی کی تیاریاں جاری
نہیں۔

”شہر یار پلیز مجھے گھر چھوڑ آؤ۔“

”تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں میں۔“ پھر ناجانے
اس کے ذہن میں کیا خیال آیا کہ اس نے کبس ایک
طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”چلو یار میں تم کو گھر چھوڑ آؤں۔“

صبا کو 440 کا جھٹکا لگا۔

”کیا۔“

مصر صبا نے ادھر اپنے سب کزنز میں اعلان کر دیا
شہریار تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں لیکن کوئی
کسی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ پھر فیصلہ یہ
شرط رکھی جائے اگر شہریار آ گیا تو یہ سارے پیسے
لے اور اگر نہ آیا تو اتنے ہی پیسے آپ کو دینا پڑیں

ادو کے مجھے منظور ہے۔“ صبا نے پر جوش لہجے میں
میرے عزیز کزنوں شہریار تو کیا اس کے فرشتے
ہیں گے۔“

کس کے فرشتے؟“ شہریار جو صرف فرشتوں کا
نہ نہ تھا بول پڑا۔ جب کہ سب اس کا منہ
لگے۔

کس کے فرشتے جناب۔“ شہریار نے پھر سوال
نہرایا۔“ صبا نے اس کو آنکھیں دکھاتے

بلو جی جلدی جلدی سارے پیسے نکالو۔ بہت
بھلی پر خارش ہو رہی تھی۔“

یہ پیسے؟“
تاب شرط لگی تھی۔“

ی شرط؟“ شہریار نے تفصیل پوچھی بس پھر کیا
ان نے پوری رام کہانی شہریار کو سنادی۔

بابا جی اب اس میں سے ہاف میرے، ہاف
بیوں کہ شرط مجھ پر لگی تھی۔ میرا حق مجھے دے

س دوں گی۔“

شہریار نے گھر کے صحن میں احتجاج شروع کر
نے بہت سے بچوں کو ساتھ ملا کر پورا گھر سر پر

برصبا کو اسے آدمی رقم دینا پڑی۔ اب شہریار
منگوا ڈال رہا تھا اور ساتھ میں پیسے گن رہا

شادی کی تقریب بہت احسن طریقے سے اپنے
اختتام کو پہنچی تو شہریار نے اپنی ماں سے کہا کہ میں صبا
سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ صبا کی بچپن میں ہی
منگنی ہو چکی ہے۔“ ماں نے ڈانٹا تو شہریار مزید ایک
بھی لفظ نہ سن سکا اور اٹھ گیا۔

”اتنا بڑا دھوکہ صبا میں تم کو کبھی معاف نہیں کروں
گا۔“ تھوڑی دیر بعد شہریار صبا کے گھر میں تھا۔ صبا ان
میں پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

”صبا“ شہریار اس کے پاس پہنچتے ہی غصے سے
بولا:

”سچ سچ بتاؤ کہ تمہاری منگنی کس کے ساتھ ہوئی
ہے۔“ صبا بے اختیار ہنس پڑی۔

”پتہ نہیں۔“
”صبا پلیز میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں
ہوں۔“

”مجھے نہیں پتا۔“ میں سچ کہہ رہی ہوں۔

تم کو کسی بات کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔ شہریار نے غصے
سے کہا اور اندر آنٹی کے پاس چلا گیا جب کہ صبا بے
چاری دل تھام کر بیٹھ گئی۔

”آنٹی آنٹی۔“ شہریار نے پورا گھر سر پر اٹھالیا۔
”بیٹا میں ادھر ہوں کچن میں۔“

شہریار جلدی جلدی آنٹی کی طرف بھاگا جہاں صبا
کی امی کچھ پکانے میں مصروف تھیں۔

”آنٹی ایک بات بتائیں کہ صبا کی منگنی کس کے
ساتھ ہوئی ہے۔“ یہ سن کر صبا کی امی بھی ہنس دیں۔

”آنٹی میں نے کوئی جوک نہیں سنایا۔“
”بیٹا صبا تیری منگنی ہے۔“

”کیا“ شہریار کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”انہوں نے
میرے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیا میں ان کو معاف نہیں

کروں گا۔ بس آنٹی آپ کسی کو کچھ بھی نہیں بتائیں
گی۔“

پھر شہریار نے پاس پڑے گا اس سے پانی اپنے منہ

پر پھینکا اور باہر چلا آیا۔ جہاں صبا اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے کہا کہ: ”شہر یار کیا تم رور ہے ہو“
 ”صبا پلیز مجھے بھول جانا“ اور پھر جلدی جلدی باہر نکل آیا۔ جب کہ صبا اس کو آوازیں دیتی رہی۔
 گھر پہنچ کر اس نے اپنا کمرہ لاک کیا اور فل آواز میں ڈیک پر گانا گایا۔

”شہر یار، صبا تیری ہے۔ اور تو آرام سے بیٹھا ہے ارے ایسی خوشی میں بھٹکا ہوا جائے۔“ شہر یار نے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا۔ بیٹا دروازہ کھولا۔
 ”ماں آپ چلی جائیں۔“ شہر یار مسلسل ناچ رہا تھا۔ اس نے خوشی میں رات کا کھانا بھی نہ کھایا۔ صبح جب وہ کالج جانے لگا تو ماں نے روک لیا۔
 ”بیٹا کہاں جا رہے ہو۔“
 ”کالج اور کہاں۔“

”دیئے اتوار والے دن کون سا کالج کھلا ہوتا ہے۔“ وہ بے چارہ خوشی کی وجہ سے یہ بھی بھول گیا تھا کہ آج چھٹی ہے۔ موبائل بھی اس کا آف تھا۔ صبا الگ پریشان تھی۔
 آخر وہ شہر یار کے ہاں آئی تو وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ جب وہ واپس گھر آیا تو صبا کو وہاں موجود پایا۔ اور پھر دوبارہ باہر نکل گیا جب کہ اس کا دوست احمد اسے سمجھا رہا تھا۔ کہ ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔ چلو گھر اور آرام سے بیٹھو۔

جب شہر یار گھر آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صبا بھی اس کے پیچھے کمرے میں پہنچ گئی۔
 ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ناں تم کو پتہ ہے کہ میں کس کی منگیتر ہوں اور میری منگنی کس سے ہوئی ہے، تو سنو میں تمہاری منگیتر ہوں اور میری منگنی تمہارے ساتھ ہوئی ہے۔“
 شہر یار اپنی جگہ سے نہ بلا صبا کو ایسی امید نہ تھی۔
 پھر شہر یار سرف اتنا ہی کہہ نکلا۔
 ”پتہ ہے۔ چل اٹھ یہاں سے اور بھاگ جا۔“

”کیا..... تمہیں کیسے پتہ ہے۔“

”کل پتہ چلا تھا۔“

”کس نے بتایا ہے۔“

”میری ساس نے اور کس نے۔“ شہر یار نے اپنا سر صبا کی گود میں رکھ دیا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں کوئی یا گل لڑکی ہوگی جو تم جیسے بے وقوف سے پیار کرے گی۔“

اتنی دیر میں نمہ کمرے میں داخل ہوئی اور شہر یار سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہاں تو اب میں آپ کو کیا کہوں دوست، کزن یا بھابی۔“

”چل بھاگ یہاں سے“ وہ وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

خاندان والوں کی مرضی سے شہر یار اور صبا کی شادی کی ڈیڑھ فکس ہو گئی اور تب تک دونوں کے ملنے پر پابندی لگ گئی۔

آخر کار برات والا دن بھی آ گیا۔ شادی کی پہلی رات جب شہر یار کمرے میں داخل ہوا تو آج وہ لڑکی خاموش بیٹھی تھی۔ جو شہر یار کی ہر حرکت پر نقطہ چینی کرتی تھی۔

شادی خیریت سے انجام پائی اور دو پیار کرنے والے ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے۔

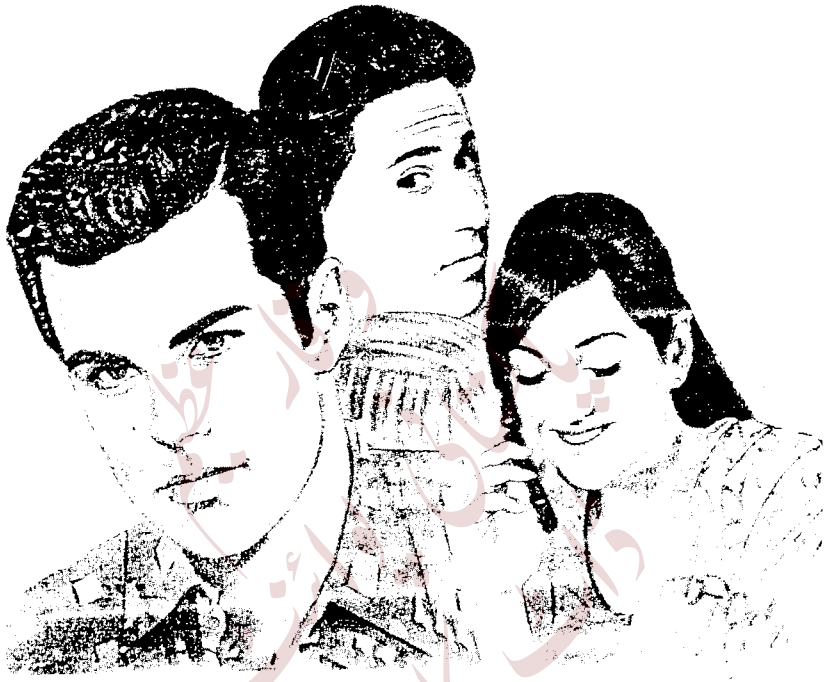
اللہ پاک نے انہیں ایک پھول جیسی بیٹی سے بھی نوازا جس کا نام انہوں نے دعا رکھا اور وہ اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔ اور اپنی شادی کی سالگرہ ہمیشہ دھوم دھام سے مناتے تھے۔

آج بھی شہر یار صبا سے ایک ہی بات کہتا ہے:
 میری آنکھوں سے تیری یاد کا سایہ نہیں جاتا
 میں نے مان لیا تم کو بھلا یا نہیں جاتا
 اک مدت سے کوئی نام لکھا ہے دل پر
 میں مٹانا بھی چاہوں تو مٹایا نہیں جاتا

☆.....☆.....☆

دوسرا جنم

حمید قیصر



میں اپنے عشق میں سچا ہوں اور کہتا ہوں
مری رگوں میں بہت زہر سے رقابت کا
ہزار اس نے یہ چاہا کہ میں بکھر جاؤں
سو میں نے صبر کیا، صبر بھی قیامت کا

سو تیرا باپ تھا اور وہ اپنے باپ کو بہت قریب سے جانتا تھا۔ خول کے اندر کے باپ کو جو اس نے دوسروں کے لیے چڑھا رکھا تھا۔ اس کا باپ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھا، گھر میں بھی اپنا جوش خطابت دکھاتا رہتا۔ بات بے بات سبھی کو جھاڑ پلاتا۔ کبھی انتہائی معمولی بات پر اس کی ماں کے ساتھ جھگڑتا۔ بہانے بہانے سے دوسروں کی تذلیل کرتا اور اپنے آپ کو سوسائٹی کا

اس نے جب سے ہوش سنبھالا تو معلوم ہوا کہ اس کا باپ قصبے کی مسجد کا خطیب ہے جس کی وجہ سے سب لوگ انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کا باپ ہر نماز، خاص طور پر جمعہ کی نماز سے قبل لاؤڈ سپیکر پر بڑے جذباتی انداز میں تقریر کے دوران نمازیوں کو نصائح کرتا اور اخلاقیات کا درس دیتا تھا مگر اس کو اپنے آپ کی کوئی بات اچھی نہ لگتی شاید اس لیے کہ وہ اس کا

بہترین انسان گردانتا رہتا۔ ”یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔“

بچوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے احسن کی ہر وقت شامت آئی رشتی اور احسن سے چھوٹے بہن بھائی اپنی اپنی باری کے انتظار میں رہتے۔ وہ گھر کے گھٹھے گھٹھے ماحول سے تنگ آ گیا تھا۔ اُسے اپنے باپ سے ایک طرح کی چوس ہو گئی تھی۔ گھر میں باپ کی سلطنت کی بے جا پابندیوں میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

احسن نے عربی فاضل امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے نصاب کے علاوہ دیگر کتابوں میں اپنی الگ دنیا بسالی۔ گویا سلطنت کے اندر سلطنت، احسن نے ٹائون کمیٹی کی لائبریری کی ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ اس کی سوچ کا آزاد پرندہ اونچی، بہت اونچی پرواز کرنا چاہتا تھا..... مگر باپ کی سلطنت اور اس کی تفصیلات بہت تنگ تھیں جس میں وہ اپنے آپ کو باوجود ہزار ہا کاوشوں کے فٹ نہیں کر سکا تھا۔ باپ بیٹے کے درمیان فاصلہ کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ ماں کے ذریعے پتہ چلا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد باپ اسے اپنا جانشین بنانے کا آرزو مند ہے تاکہ اس کے بعد وہ قصبے کی مسجد کا منبر سنبھال سکے مگر معاشرے کو سدھارنے والے باپ کو کیا معلوم کہ وہ تو کسی اور ہی دنیا کا باسی تھا۔

جب احسن کے باپ کو اس کی ماں کے ذریعے احسن کے خیالات معلوم ہوئے تو وہ جوان اولاد کے ساتھ سختی پر اتر آیا۔ باپ کے سخت رویے نے اس کے حساس دل و دماغ میں بغاوت کا زہر بھر دیا۔ اب تک اسے جس جذبے نے انتہائی قدم اٹھانے سے روک رکھا تھا، وہ تھا اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے لیے محبت کا جذبہ! احسن نے دیکھا کہ اس کے باپ کی ضد اور ہٹ دھرمی کے آگے کسی کی پیش نہ چلتی تھی۔ سب کے سب بے بسی تھے۔ اس سے پہلے کہ بات بڑھ کر مار پیٹ تک پہنچتی احسن کی سوچ کے پرندے نے جُست بھری اور ایک لمبی اڑان پر نکل گیا۔

وہ بھاگتے بھاگتے مڈسھال ہو چکا تھا اور جب اُسے

بوڑا آیا تو وہ اتنی دور نکل آیا، جہاں اس کے باپ کی کڑک دار آواز تو کیا اس کی ہوا بھی نہ پہنچ سکتی تھی۔ ویسے بھی اس کے لیے لڑکپن میں پتو کی سے بہاؤل پور تک کا فاصلہ، انڈی کو تھل سے کراچی کے برابر ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ جیسے جیسے جوان ہوا یہ فاصلے سٹ کر اپنی جگہ پر آ گئے۔

اب وہ تیس سال کا ایک خوبصورت اور کڑیل جوان تھا۔ زندگی کی امنگوں سے بھرپور ذہین اور پختہ ارادوں کا مالک احسن، جس نے بچپن سے جوانی تک حوادثِ زمانہ کو اس پامردی کے ساتھ سہا تھا کہ اب کوئی بھی مشکل، اُس کے لیے مشکل نہ رہی تھی۔ اس کے سر آپے میں اس کا بڑا سر اور گھنے بال بہت نمایاں تھے۔ جناح میڈیکل کالج میں اس کا دوسرا سال تھا۔ احسن کی وجاہت اور اعلیٰ ادبی ذوق کے، کیا لڑکیاں اور کیا لڑکے سبھی قائل تھے۔ وہ کالج کی تمام علمی، ادبی اور نصابی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتا تھا۔ مطالعہ کی چاٹ تو اسے بچپن ہی سے لگی تھی۔ وہ جس کسی کو جہاں کہیں بھی نظر آتا کتاب، مجبورہ کی طرح اس کے بغل میں ہوتی۔ حتیٰ کہ سٹوڈنٹ یونین کی سیکریٹری شپ کے ایک ایکشن کے لیے اسے کتاب خصوصی طور پر انتخابی نشان کے طور پر الاٹ کی گئی۔ راوی کہتا ہے کہ گھر سے بھاگنے کے بعد احسن اگر کسی فنٹ یا تھتہ پہ بھی سویا تو صبح سر کے نیچے سے کتاب ہی برآمد ہوتی۔ کسی انسان کے اندر کثرتِ مطالعہ اپنے لیے ذرائع اظہار خود ہی تلاش کر لیتا ہے۔ احسن مجلسی تنقید کا بادشاہ بن گیا۔ اسٹوڈنٹ لائف میں مخالفین، کالج یا ضلعی انتظامیہ سے کسی بھی مسئلہ پر مذاکرات میں ایسی دلیلیں ڈھونڈ کر لاتا کہ مد مقابل بغلیں جھانکتے رہ جاتے۔ انہیں مسئلہ حل کئے بغیر کوئی راستہ نہ ملتا۔ کسی پروفیسر کو بھی کہیں کسی کوئشن کے لیے لائبریری سے کتاب نہ ملتی تو وہ احسن کو ڈھونڈتا۔ میرا غالب اسے پورے کے پورے آڑ برتتے۔ مگر شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھنے کے باوجود وہ نثر لکھتا تھا۔ نثر میں انشائیہ اور ڈرامہ اسے زیادہ مرغوب تھے۔ ”آتش ہے

اردو زبان

اک دور تھا کہ اردو بھی شاہی زبان تھی اس دور میں تو اردو کی کیا آن بان تھی اردو زبان سیکھنے کا سب کو شوق تھا اردو جو ٹھیک بولتا تھا اس کی شان تھی وہ دور تھا کہ اردو کا رتبہ بلند تھا اور نام بھی تھا اردوئے معلیٰ رکھا گیا دنیا میں ساری دھوم تھی اردو زبان کی پہچان تھی یہ ہند میں ہر مسلمان کی مسلم میں اتحاد کا مظہر تھی یہ زبان تحریک پاکستان کی اردو ہی جان تھی اللہ کا لاکھ شکر ہے عظمت ہمیں ملی اور ملک پاکستان کی نعمت ہمیں ملی تو قیر اردو دان کی کرتا نہیں کوئی اردو میں بات کرو تو سنتا نہیں کوئی بے اعتنائی اردو سے اتنی ہے آج کل اردو زبان شوق سے پڑھتا نہیں کوئی اب پہلے جیسی اردو کی عزت نہیں ہی سچ پوچھیے تو اردو کی وقعت نہیں رہی اسے کاش لوٹ آئے وہ گزری ہوئی بہار اسے کاش ہر کوئی کرے اردو کو پھر سے پیار ہے التماس آپ سے کوشش تو کیجئے شاید کہ اس کو مل سکے کھویا ہوا وقار شاہد کی طرح آپ بھی ہمت نہ ہاریے فرصت ملے تو گیسوئے اردو سنواریے (غضنفر علی شاہد، منگا! کینٹ)

دود“ اس کا خوب صورت ڈرامہ تھا جو کئی بار کالج کے پلیٹ فارم پر سٹیج بھی کیا گیا۔ اپنی ان تمام خوبیوں کی بنا پر سبھی اسے اپنا رفیق رکھتے تھے مگر احسن کے دو بی دوست تھے ایک ممتاز اور دوسرے انوار جو اس کے بڑے وقتوں کے دوست تھے، دونوں احسن کے بڑے سر کی وجہ سے اسے ”گن سرا“ کہتے تھے۔

اس کا سگریٹ کب کا بجھ چکا تھا۔ وہ جناح میڈیکل کالج کی ایک خاموش اور اداس سی بالکنی کی ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے حسب معمول سگریٹ کا فلٹر چبائے جا رہا تھا۔ اس کا گزرا ہوا تلخ ماضی کسی فلم کی طرح اس کے ذہن کی سکرین پر چل رہا تھا۔ اس نے سگریٹ کا چپایا ہوا فلٹر ریلنگ سے نیچے ٹھوک دیا۔ خزاں کی اداس شام دھیرے دھیرے اپنے پڑ پھیلا رہی تھی۔ آوارہ ہوا پتیل کے پتوں کو طوفان کی زد میں آئے۔ جبروں کی طرح اٹھا کے ادھر ادھر پھینک رہی تھی۔ ایسے میں آج احسن کو جانے کیوں اپنے والدین اور چھوٹے بہن بھائی بے طرح یاد آ رہے تھے۔ اللہ جانے وہ سب کس حال میں ہوں گے؟ نہ میں نے کوئی پتہ دیا نہ ان کی کوئی خبر پائی۔ معلوم نہیں ماں کیسی ہوگی؟ ان سب سے نیچھڑے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ چھوٹے سے قصبے سے نکل کر اونچی عمارتوں، طویل اور کشادہ سڑکوں والے شہر میں آ جانا اور پیچھے کی جانب مڑ کر نہ دیکھنا اب ایک ذراؤنا خواب سا لگتا تھا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ لڑکپن سے جوانی تک ایک کٹھن طویل اور صبر آزمات سفر طے کر چکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بڑھ لکھ کر کسی مقام تک پہنچنے کا سودا تو اس کے سر میں بچپن ہی سے سما ہوا تھا مگر اس کے باپ کے سخت رویے اور ناروا پابندیوں نے ہمیز کا کام کیا تھا اور اسے ایک دم ایک کمزور بچے سے بہادر اور کڑیل جوان بنا ڈالا تھا۔

بہادر تو شاید وہ جنم جنم سے تھا۔ اتنی سی عمر میں باپ سے بغاوت کر دینا گھر کی ساری آسائشیں بچ کے اچانک زمانے کی چیلانی دھوپ میں اجنبی اور ان دیکھی راہوں پر تنہا نکل آنا بھلا بہادری نہیں تو اور کیا تھا؟

احسن نے لمحہ بھر کو پھر سے سوچ کی کڑیاں ملائیں اور نیا سگریٹ ساکا کر دھوئیں کے مرغولے چھوڑنے لگا۔ اتنے میں اسے ممتاز دور سے کالج کے گیٹ سے اندر آتا دکھائی دیا۔

”ارے! میرے شہزادے آج اخبار کے دفتر نہیں جانا کیا؟ میں اب تک ”پان ہاؤس“ پہ تیرا انتظار کر رہا تھا۔“ ممتاز نے وہیں سے ہانک لگائی۔

دھت تیرے کی..... یہ سالا اخبار بھی ہمارے لیے شاہراے زیت کا سنگ گراں ہو چلا ہے۔ جواب اٹھائے نہیں اٹھتا..... احسن نے بے دلی سے کتابیں سکیٹیں اور سیٹھیاں اترتے ہوئے نیچے آن پہنچا۔ اس نے ایک لمبا سانس لے کر سگریٹ کا دھواں ممتاز کی طرف اچھال دیا۔

”پورا ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکے ہیں یا تم جانتے ہو خاکوئی صاحب کتنے غصے والے ہیں، وقت کے معاملے میں تو وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ وقت کے اس قدر کچے ہیں جیسے گھڑیال کی سونوں کے ساتھ بندھے رہتے ہوں۔“ ممتاز حسب معمول پان کی گھوری سمیت لفظوں کی جگالی کرنے لگا۔

”ممتاز اپنا من تو صبح سے ریڈیو کی جانب کھینچ رہا ہے یار۔ آج تو ناشتہ بھی شہناز کا ریڈیو پروگرام سننے ہوئے کیا تھا۔ کالج میں سارا دن کانوں میں جلتنگ سے نہجتے رہے اور ذہن پر اس مابتاب کا سراپا چھایا رہا۔ چل اعنت بھیج اخبار پر، ریڈیو اسٹیشن چلتے ہیں آج رات کو پھر اس کا پروگرام آن ایئر جانا ہے۔“ احسن بچوں کی سی معصومیت سے کہہ گیا۔

نا۔ بابانا، اپنے تو بچوں کی روزی روٹی کا معاملہ ہے، تو تو جھڑو اچھاٹ ہے تیرا کیا ہے نا کوئی آگے نا پیچھے اور ویسے بھی ہمیں ریڈیو والوں نے اگلے ہفتے کے لیے بک کر رکھا ہے۔ اس سے پہلے یوں بن بلائے جانے سے انسان ہلکا ہوتا ہے سمجھے؟“ ممتاز نے چشمہ ناک پر بٹھاتے ہوئے رائے دی۔

”یار! کبھی کبھی مجھے تم میں پتو کی کے کسی محلے کی

چھوٹی سی مسجد کے خطیب کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔“ یہ کہہ کر احسن ممتاز کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی ہنسی روکنے لگا۔ ممتاز نے چشمے کے اوپر سے احسن کو گھورتے ہوئے رکشہ روکنے کے لیے ہاتھ لمبا کر دیا۔

”استاد! یہ شہناز کے معاملے میں تو مجھے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ دکھتا ہے۔ یار، اس ریڈیو اناؤنسر میں ایسی کیا بات ہے جو ٹو پڑی سے ہی اتر گیا ہے؟“ رکشہ چل پڑا تو ممتاز بیک کی پچکاری مار کر بولا۔

”یار! مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی کہ میرے ساتھ کیا واردات ہوگئی ہے؟ پہلے پہل تو وہ مجھے ریڈیو اناؤنسر کی حیثیت میں آواز کا جادو جگاتے ہوئے بھلی لگتی تھی۔ خوبصورت جسم و جاں رکھنے والی ایک بھرپور عورت! اس سے زیادہ شہناز کے بارے میں ہمیں اور کچھ نہیں جانتا تھا مگر جب سے کالج کے پلیٹ فارم پر اسے اپنے سٹیج ڈرامے میں کلاسکل رقص کرتے دیکھا ہے، تب سے مجھے ساری دنیا رقص کرتی دکھائی دیتی ہے۔“

یہ سن کر پہلی بار رکشہ والا بھی شیشے میں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

”بلے بھی اور وہ جو کالج میں آٹھ دس انچا ماڈرن شہزادیاں تیری دانش کے گن گاتی پھرتی ہیں ان کا کیا ہوگا؟“ ممتاز نے استفسار کیا۔

”ارے، وہ تو پاگل ہیں سالی بڑے گھروں کی بگڑی ہوئی اولاد، انہیں کیا معلوم عشق کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا؟“ احسن نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”یار میرے اندر تو مٹھنے زیدی سے بھی قربت کا احساس جاگنے لگا ہے کہ اس کی محبوبہ کا نام بھی شہناز تھا۔“ احسن نے کہا۔

”چل استاد تو تو گیا کام سے!“ ممتاز نے شوخی سے کہا۔

رکشہ اخبار کے دفتر کے سامنے جاز کا۔ ابھی دونوں دفتر کی سیڑھیوں پر ہی پہنچے تھے کہ انوار سے مذہم بھڑک بول گئی۔

”ارے احسن! تیرے کالج والے سٹیج ڈرامے

ریڈیو سے فون آچکا ہے۔ بار بار آپ کا ہونٹنی ہیں مگر کوئی پیغام نہیں دیتیں..... فاروقی۔

”لو بھیا! دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“ ممتاز کے لہجے کی شوخی برقرار رہی۔ احسن نے اخبار ڈیسک پر چھوڑ کر چٹ ممتاز سے لے کر یوں پڑھنا شروع کر دی جیسے اسے ممتاز کی زبان پر یقین نہ آیا ہو۔ ”دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ آج مجھے اخبار کے بجائے ریڈیو پر ہونا چاہیے تھا۔“

احسن اخبار لپیٹ کر لفافے میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ممتاز بدستور ناک پر ٹیک ٹکائے ڈیسک پر پہنچنے والی خبروں کی ایڈیٹنگ کرتا رہا۔ احسن فونو گرافر سے جب تک تصویریں لے کر آیا تب تک چائے آگئی۔ ”یار ممتاز! میں چائے پی کے ایمر جنسی کا بہانہ کر کے نکلتا ہوں، شہناز کے فون تو فاروقی صاحب ویسے بھی کئی بار ایڈیٹ کر چکے ہیں۔“ احسن نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے شہزادے! نکل لے تیلی گلی سے!“ ممتاز کی آشیر باد ملتے ہی احسن نے فاروقی صاحب کو بتایا اور ریڈیو روانہ ہو گیا۔

نہایت قلیل عرصہ میں جو چند واضح تبدیلیاں احسن کی شخصیت اور روزمرہ معمولات میں رونما ہوئیں، انہوں نے ممتاز کو پریشان کر دیا۔ زندگی سے بھرپور، احسن ہر شے سے بے نیاز ہو گیا۔ مسلسل غیر حاضریوں کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں شام کا اخبار چھوٹ گیا۔ کالج سے بھی رشتہ واجبی سارہ گیا۔ دودن جاتا اور ہفتے کے بقیہ دن ریڈیو اسٹیشن کی نذر کر دیتا۔ پہلے پہل ممتاز اور انوار نے احسن کو اپنے اپنے طریقے سے سمجھایا مگر احسن، شہناز کے عشق میں اس بری طرح مبتلا ہو گیا تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی جاتی رہی تھی۔ ایک دن احسن نے ممتاز اور انوار دونوں کو منہ پھرا کر کہہ دیا کہ تم دونوں مجھ سے جلتے لگے ہو۔ دونوں دوست جہاں دیدہ اور سمجھدار تھے۔ آپس میں صلاح کر کے انہوں نے احسن کو اس کے حال پہ تنہا چھوڑ دیا۔

کی رپورٹ اور تصویریں چھپ گئی ہیں۔“ احسن نے بچوں کی طرح انوار کے ہاتھ سے اخبار چھپٹ لیا اور پورا اخبار دونوں ہاتھوں میں کھول کر تصویریں دیکھنے لگا۔

”واہ، کیا کلاسیکل پوز ہیں، خاصی پروفیشنل معلوم ہوتی ہیں موصوفہ،“ ممتاز نے احسن کی اخبار پر پھسلتی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے جملہ کسا۔

”ارے ہاں احسن! تقریب کی اصل تصویریں فونو گرافر سے لے لینا اور تمہارے لیے اخبار کی تین کاپیاں میز کی دراز میں رکھی ہیں مجھے ایک جگہ ضروری پہنچنا ہے پھر ملیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے انوار نے اخبار لپیٹا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ دونوں جلدی جلدی ایڈیٹر کے کمرے میں حاضری لگا کر اپنے ڈیسک پر جا بیٹھے۔ خوش قسمتی سے خاکوئی صاحب ان کی جانب پشت کیے پیسٹر سے کاپی جو وار ہے تھے۔

احسن نے چھوٹے ہی پورا اخبار ڈیسک پر پھیلایا اور زاویے بدل بدل کر شہناز کے رقص کے انداز جانچنے لگا۔ ممتاز جو قدرے حیرانی اور پریشانی سے احسن کے آئینہ چہرے پر قوس قزح کے رنگوں کو اترتے چڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر اندیشوں کی لکیریں اور گہری ہونے لگیں۔

”احسن صاب جی!“ کینٹین والا احسن کو مخاطب کرنے لگا۔

”آئے آئے چھٹکی استاد، کیا بات ہے، کیوں چڑا رہے ہو؟ دیکھتے نہیں صاحب مصروف ہیں؟ میرے شہزادے، ایک ڈبی گولڈ لیف اور دو لڑک دودھ پتی، فوراً سے پہلے آ۔“ احسن کے بجائے ممتاز نے اسے پکارتے ہوئے پچاس کا نوٹ تھمایا۔

”صاب جی! ایڈیٹر صاب نے یہ چٹ بھی دی ہے۔“ جواباً چھوٹے نے ممتاز کو چٹ پکڑائی اور لوٹ گیا۔ ممتاز نے احسن کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چٹ با آواز بلند پڑھنا شروع کر دی۔ ”احسن صاحب! آج گیارہ بجے سے اب تک سات مرتبہ کسی شہناز صاحبہ کا

عشق کا بھوت اترے گا تو خود ہی اپنے اصل کی جانب لوٹ آئے گا۔“ اس کے بعد احسن سے ان کی ملاقاتوں کے درمیان وقفے بڑھتے گئے۔ روزانہ ہونے والی ملاقاتیں ہفتوں اور مہینوں پر محیط ہو گئیں مگر ممتاز اور انوار احسن کی برابر خبر رکھتے۔ اس صورت حال میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال بیت گیا۔

ایک دن ممتاز ابھی کام سے گھر لوٹا ہی تھا کہ دستک ہوئی۔ ممتاز نے دروازہ کھولا تو سامنے بنستا مسکراتا احسن کھڑا تھا۔ ”استاد! اندر آنے کو نہیں کہو؟“

”آ..... میرے شہزادے گلفام..... کیسے ہو؟ آ جاؤ..... آ جاؤ“

ممتاز نے اپنی روایتی شوخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”یار ممتاز وہ شادی کے لیے راضی ہو گئی ہے.....“ احسن گلاب کی مانند کھل رہا تھا۔

”اچھا..... یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“ ممتاز نے اپنی دلی کیفیت چھپا کر احسن کی خوشی میں خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔

”بھئی یہ خبر تو انوار کو بھی سنانی چاہیے..... شاید اس کی آج نائٹ شفٹ ہے کل اسے گھر پر پکڑتے ہیں.....“ ممتاز نے پلان دیا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے.....“ احسن خوش ہو گیا۔

”شہزادے..... اتنے روز گزر گئے تم نے درشن ہی نہیں دیئے کیا بہت زیادہ مصروف ہو گئے تھے؟“ ممتاز نے پوچھا۔

”بھیا..... ریڈیو پر کئی ایک پروگراموں کے سکرپٹ لکھ رہا ہوں، وقت کہاں ہے میرے پاس؟“ احسن نے گویا نئی خبر سنائی۔

”اچھا پھر تو بہت مال بنا رہا ہوگا ہمارا یاد“ ممتاز نے خوشی کا اظہار کیا۔

”زندگی کا دھارا اک نئے رخ پر بہہ نکلا ہے.....“ اب دیکھنے کیا ہوتا ہے؟“ لمحہ بھر کو احسن کی چوڑی پیشانی پر طوفان کے آثار نمایاں ہوئے۔

”یار ممتاز ارڈیو پر مجھے کسی نے بتایا ہے کہ شہناز طوائف زادی ہے..... پر مجھے اس سے کیا..... ہے تو انسان نا..... ایک خوبصورت آرٹسٹ ہے..... ریڈیو پر اس کا بڑا نام ہے..... محنت کر کے اپنا رزق کمائی ہے..... اور سب سے بڑھ کر ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں..... اور اب جلد نئی زندگی کا آغاز کرنے والے ہیں..... میرا ناقص علم تو یہی سکھاتا ہے کہ ہم سب انسان ہیں اور باہمی احترام لازمی شرط ہے۔ ہمیں کسی کے ماضی سے کیا لینا دینا اور پھر اپنا ماضی کون سا اتنا شاندار ہے گھر سے بھاگ کر..... دھکے کھا کھا کر فٹ پاتھوں پر پل کر جوان ہوئے..... نہ ماں کا پتہ..... نہ باپ کی خبر.....!!“ یہاں پہنچ کر احسن کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گیا۔ ممتاز نے اُسے اپنے بازوؤں میں بھر کر تسلی دی۔

”میری جان..... تو سچ کہتا ہے..... فکر نہ کر، سب ٹھیک ہو جائے گا میں اور انوار جو تیرے ساتھ ہیں..... پورے گیارہ آدمی.....“ ممتاز نے ماحول بدلنے کی اپنی سی سعی کی۔

اس رات احسن دیر تک بیٹھا، ممتاز کے ساتھ مل کر اپنے مستقبل کی نقشہ بندی کرتا رہا۔ جب سکرپٹوں کے دھوئیں میں دونوں ایک دوسرے کو دھندلا دیکھنے لگے اور اگلے روز کا آغاز ہو چکا تو احسن صبح دم رخصت ہو گیا۔

جب احسن اپنے ڈیرے پر سو کر اٹھا تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر ریڈیو اسٹیشن پہنچا تو دو بج چکے تھے۔ شہناز پہلے ہی اس کی منظر تھی اور قدرے پریشان بھی..... اُس کی ماں نے احسن کو اکیلے شام کی چائے پہ بلایا تھا۔ شہناز جس نے اپنے تئیں اب تک آگ اور پٹرول کو نزدیک آنے سے روک رکھا تھا، مزید مزاحمت نہ کر سکی تھی۔ وہ اپنی ماں کے احسن کو اس طرح اکیلے گھر بلانے کا مفہوم اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کی زندگی کی آشنائیں ایک بار پھر ماں کی کاروباری ضرورتوں کی بھینٹ چڑھنے کو تیار تھیں

ہمت مرداں

ایک صاحب کو ہسپتال کے ڈاکٹر نے بتایا
”آپ کی بیوی صرف چند گھنٹے کی مہمان ہیں۔ آپ
پریشان تو ضرور ہوں گے“، لیکن ہمیں افسوس ہے
کہ اب ان کے لیے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

وہ صاحب بولے۔

”کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحب جہاں اتنے
برس پریشان رہا چند گھنٹے کی پریشانی اور جھیل لوں
گا۔“

(سلمان، لاہور)

ہائیں گی نا..... تمہاری طرح صرف رُو بھی پھیلی گفتگو تو
نہیں فرمائیں گی..... ذرا تیل بجائیے خلیفہ جی راہداری
میں پڑے کب سے اُٹھ رہے ہیں۔“

آواز پر خلیفہ جی چائے اور سموں کا
آرڈر لے کر چلے گئے۔ احسن نے دیکھا کہ شہناز کی
دراز پلکیں جھج رہی ہیں۔ احسن یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”احسن! میرا دل بیٹھا جاتا ہے..... مجھے ڈر لگ رہا
ہے، اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، میں کیا کروں؟“
اس کی آواز بھر اگئی۔

احسن نے درمیان میں حائل میز پر جھک کر شہناز
کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔ کمرے سے باہر
پرندوں کے چچھانے کی آواز ماحول کو مزین کر رہی تھی۔
احسن دل و جان سے شہناز پہ واری جانے کو تیار بیٹھا تھا
مگر شہناز آنے والے وقت کے بے رحم اندیشوں میں
گھری سو گوار بیٹھی تھی۔

”جان من! تم دل چھوٹا نہ کرو، میں تمہاری ماں
سے مل کر سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔“

احسن نے شہناز کے ہاتھ کو پرندے کی
مانند سہلاتے ہوئے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا۔

”احسن! تم بہت بھولے ہو اور میری ماں بہت
شاطر اور مکار عورت ہے۔ تم اس کی چالوں کی تاب نہ

۔ شہناز جانتی تھی کہ احسن کس قدر دیوانہ وار اسے چاہتا
ہے مگر وہ ماں کی ”بزنس میننگ“ کی تاب نہ لاسکے گا۔
اس نے احسن کو سب کچھ بتانے کا ارادہ کر لیا۔ شہناز اپنا
ریڈیو پروگرام کر چکی تھی جب کہ رات کا پروگرام آن
ایر نہیں جانا تھا۔ احسن کمرے میں داخل ہوا تو شہناز
اضطرابی کیفیت میں ٹہل رہی تھی۔

”احسن آپ کہاں رہ گئے تھے..... اتنی دیر سے
انتظار کر رہی ہوں؟“ اس نے چھوٹے ہی دریافت کیا۔
”مابذلت ممتاز کے گھر سے رات کو دیر سے لوٹے
تھے اور خواب خرگوش سے فرار پاتے ہی قرار پانے ادھر
آنکھ ہیں..... کیا حکم ہے شہزادی صاحبہ۔“ احسن نہایت
خوش گواری سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کونش بجالایا۔

”احسن میں بہت پریشان ہوں..... تم جانتے ہو
میں اب تک تمہیں اپنے گھر کیوں نہیں لے کر گئی اور اپنی
ماں سے کیوں نہیں ملوایا؟“ شہناز سبزہ زار کی جانب
کھٹنے والے در سے پتے سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
احسن اس کے کمر سے نیچے لٹکتے گیسوؤں میں الجھ کر رہ
گیا۔

”احسن! میری ماں طوائف ہے..... شہناز نے
جیسے یہ جملہ اپنی تمام تر توانائیاں جمیع کر کے ادا کیا اور
اس جملے کا رد عمل دیکھنے کے لیے احسن کی طرف پلٹی۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟..... میں یہ سب
پہلے سے جانتا ہوں“ احسن نے کرسی سے ٹیک لگا کر
سکریٹ سگاتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر آپ میری ماں کی کاروباری طبیعت سے
بالکل واقف نہیں.....“

شہناز کے سینے پر سے ایک بھاری پتھر ڈھلک گیا
مگر طبیعت کا اضطراب بدستور قائم تھا۔ نائب قاصد کل
کے لیے پروگرام شیڈ اور تازہ ڈاک میز پر رکھ کر
خاموشی سے لوٹ گیا۔

”ماں نے آج شام آپ کو گھر پر بلایا ہے.....“
شہناز اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اجی..... گھر آئے مہمان کو کم از کم چائے تو

لا سکو گے..... اور میں تمہیں اس کے سامنے رُسا ہوتا نہیں دیکھ سکتی..... میری ماں انسانی جذبات کو کار، کوٹھی اور بینک بیلنس میں تولنے کی عادی ہے..... جذبے اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے..... میں اس کی باقی ماندہ زندگی کا وہ آخری اور قیمتی اثاثہ ہوں، جسے داؤ پر لگا کر وہ صرف اور صرف جیتنا چاہتی ہے، بارنا نہیں..... اسے میری اور تمہاری آرزوں سے کوئی سروکار نہیں.....“ شہناز دھیرے دھیرے اپنے من کا بوجھ ہلکا کرنے لگی۔

خلیفہ جی چائے اور سمو سے میز پر رکھ کر چاچکے تھے۔ احسن اضطراب میں سگریٹ پھونکنے جا رہا تھا۔ اس کی بے قراری دیدنی تھی۔
”دیکھو شہناز میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا..... زندگی پہلے ہی مجھ سے میرا سب کچھ چھین چکی ہے اگر تم بھی مجھ سے چھین گئیں تو..... پھر میں زندگی سے بھی سب کچھ چھین لوں گا، یہ میرا وعدہ ہے تم سے.....!“

”احسن میری ماں دور شتے پہلے بھی زد کر چکی ہے، اسے کسی بڑے کاروباری کی تلاش ہے..... وہ میرا رشتہ نہیں، سودا کرنا چاہتی ہے۔ وہ تو اللہ بخشے چاہے کرم دین طبلہ نواز کو جس نے بدلتے ہوئے حالات میں میری ماں کو مجھے پڑھانے کا مشورہ دیا تھا اور آج انہی کی بدولت میں یہاں ریڈیو پروڈیوسر ہوں..... ورنہ آج میں بھی کسی کو نہ پڑھتی.....“

”پھر تو میں اس عورت سے ضرور ملوں گا جو اپنے آپ کو تمہاری ماں کہتی ہے“ احسن نے غصے سے کہا..... شہناز خاموش رہی۔ اس کی کیفیت یوں تھی جیسے نہ وہ احسن کو جانے کا کہہ سکتی ہو اور نہ ہی روک سکتی ہو۔

”آؤ چلیں.....“ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر احسن اٹھ کھڑا ہوا۔ شام کے چار بجے تھے شہناز بھی تھکی تھکی سی پرس اٹھا کر چلی دی۔ شہر کے خوب صورت رہائشی علاقے میں درمیانے سائز کی ایک کوٹھی کے سامنے ان کا رکشہ جاڑ کا۔ احسن پہلی بار شہناز کے گھر آیا تھا مگر اب اُسے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ شہناز کی

ماں سے نہیں بلکہ کسی بازاری اور کاروباری عورت سے ملنے آیا ہے۔

شہناز کے پیچھے پیچھے احسن بھی گیٹ کے اندر داخل ہوا۔ کوٹھی کے چھوٹے سے لان میں ایک طرف کرسیاں بچھی تھیں۔ گیٹ کی جانب رُخ کیے ایک ادھیڑ عمر خاتون شوخ رنگ کی ساڑھی پہنے مردوں کی طرح ٹانگ یہ ٹانگ رکھے بے نیازی سے سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے سامنے میز پر ایش ٹرے اور روایتی پان دان اپنی مالک کی عمر رفتہ کی پُغلی کھار رہا تھا۔ شہناز نے قریب پہنچ کر سلام کیا اور موز ب کھڑی ہو گئی۔

”اچھا تو یہ ہیں تمہارے عاشق نامراد..... کیا نام بتایا تھا..... حسن؟ ہاں احسن۔۔۔۔“ بیٹھے، ایسے انداز سے کہا جیسے کہہ رہی ہو، ”مت بیٹھے۔“ اس سلوک پر احسن کا جی تو نہیں چاہتا تھا مگر بات بیٹھ کر ہی کرنی تھی، اس لیے وہ سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

احسن نے خاتون کو بے اعتنائی اور بے پروائی کی ایکٹنگ کرتے دیکھا تو اسی کے انداز میں ٹانگ یہ ٹانگ رکھ کر پاؤں ہلانا اور لکھنویوں سے اس کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔ خاتون نے آخری کش لگا کر سگریٹ کیاری میں اچھال دیا تھا۔ اس نے ماہ و سال کی ریکھاؤں، اور بڑھاپے کو مصنوعی سراپے اور چہرے کی جھریوں کو غارے کی دبیز تہہ میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رکھی تھی۔ کافی دیر وہ اس کرب میں مبتلا رہی کہ بات کہاں سے شروع کرے؟ پھر اچانک ہی جیسے پھٹ پڑی۔

”ہاں تو لڑکے کیا ہے تیرے پاس شہناز کو دینے کے لیے؟“

”وہ سب کچھ جو بنیادی انسانی ضرورتوں کے زمرے میں آتا ہے۔“ احسن جیسے ہر طرح کے حملے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

”بھئی! میں تم سے صاف صاف بات کرنا چاہتی ہوں..... شہناز سے شادی کے لیے تمہیں اپنا گھر لینا ہوگا اور ایک لاکھ روپے حق مہر ادا کرنا ہوگا..... اگر تمہیں

منظور ہے تو ٹھیک ورنہ..... اپنا راستہ لو۔ ”انہاؤں نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”شہناز کے والد صاحب کہاں ہیں.....؟“ احسن نے اچانک پینٹر ابدلا۔

”جی..... کیا مطلب.....؟؟“ خاتون چکراسی گئی۔

”دیکھئے محترمہ! سوال بہت ہی سادہ ہے۔“ احسن نے اطمینان سے کہا۔ شہناز یہ سنتے ہی اٹھ کر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں ملازمہ چائے اور لوازمات میز پر رکھ کر پلٹ گئی مگر شہناز اندر چین نہ پا کر دوبارہ باہر آگئی اور خاموشی سے چائے بنانے لگی۔

”تمہیں اس سے کیا..... تم اپنے مقصد کی بات کرو۔“ وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

”آپ تو شہناز کی ماں بھی نہیں ہیں، باپ کے بارے میں کیا بتائیں گی؟“ احسن نے کمال ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرا سوال داغ دیا۔ خاتون شٹا گئی اور شہناز کو مشکوک نگاہوں سے گھورنے لگی، جواب تک خاموش تھی اور چائے بناتے ہوئے حیرت سے کبھی احسن تو کبھی ماں کی طرف دیکھتی تھی۔

”اگر یہ تمہاری سگی ماں ہوتی تو اسے تمہاری خوشیاں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتیں اور اس طرح کی سودے بازی نہ کرتی۔ بیٹی کی زندگی کو اپنی نا تمام خواہشات کی بھینٹ چڑھانے والی ”ماں“ نہیں ہو سکتی“ احسن جذبات میں کہے چلا جا رہا تھا۔

”تو سن گستاخ لڑکے، ہم بھڑک لوگ تیرے جیسے لاوارثوں کو اپنی بیٹی نہیں دیتے۔ بڑے بڑے سا ہوکار ہماری منہ میں ہوتے ہیں تو کس شہر میں ہے؟“ اُس نے جگالی کرتے ہوئے دانتوں میں آئی سپاری غصے سے باہر تھوکتے ہوئے کہا۔

احسن غصے سے سگریٹ کا فلٹر چبانے لگا، اس کی نظریں بار بار شہناز کی جانب اٹتی تھیں جو کافی دیر سے نظریں زمین میں گاڑے بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ چائے پیالیوں میں بڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ احسن ایسے

منظور ہے تو ٹھیک ورنہ..... اپنا راستہ لو۔ ”انہاؤں نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”شہناز کے والد صاحب کہاں ہیں.....؟“ احسن نے اچانک پینٹر ابدلا۔

”جی..... کیا مطلب.....؟؟“ خاتون چکراسی گئی۔

”دیکھئے محترمہ! سوال بہت ہی سادہ ہے۔“ احسن نے اطمینان سے کہا۔ شہناز یہ سنتے ہی اٹھ کر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں ملازمہ چائے اور لوازمات میز پر رکھ کر پلٹ گئی مگر شہناز اندر چین نہ پا کر دوبارہ باہر آگئی اور خاموشی سے چائے بنانے لگی۔

”تمہیں اس سے کیا..... تم اپنے مقصد کی بات کرو۔“ وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

”آپ تو شہناز کی ماں بھی نہیں ہیں، باپ کے بارے میں کیا بتائیں گی؟“ احسن نے کمال ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرا سوال داغ دیا۔ خاتون شٹا گئی اور شہناز کو مشکوک نگاہوں سے گھورنے لگی، جواب تک خاموش تھی اور چائے بناتے ہوئے حیرت سے کبھی احسن تو کبھی ماں کی طرف دیکھتی تھی۔

”اگر یہ تمہاری سگی ماں ہوتی تو اسے تمہاری خوشیاں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتیں اور اس طرح کی سودے بازی نہ کرتی۔ بیٹی کی زندگی کو اپنی نا تمام خواہشات کی بھینٹ چڑھانے والی ”ماں“ نہیں ہو سکتی“ احسن جذبات میں کہے چلا جا رہا تھا۔

”تو سن گستاخ لڑکے، ہم بھڑک لوگ تیرے جیسے لاوارثوں کو اپنی بیٹی نہیں دیتے۔ بڑے بڑے سا ہوکار ہماری منہ میں ہوتے ہیں تو کس شہر میں ہے؟“ اُس نے جگالی کرتے ہوئے دانتوں میں آئی سپاری غصے سے باہر تھوکتے ہوئے کہا۔

احسن غصے سے سگریٹ کا فلٹر چبانے لگا، اس کی نظریں بار بار شہناز کی جانب اٹتی تھیں جو کافی دیر سے نظریں زمین میں گاڑے بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ چائے پیالیوں میں بڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ احسن ایسے

ممتاز اور انوار کو بتادیا جائے مگر احسن نے منع کر دیا وہ کسی منطقی نتیجے پر پہنچنے کے لیے مکمل ایک سوئی چاہتا تھا۔

مہینوں بعد ایک دن ممتاز جزل شفٹ ختم کر کے پیدل گھر آ رہا تھا کہ اچانک فٹ پاتھ پر اس کی احسن سے مدد بھیجی ہو گئی۔ ممتاز نے پہلی نظر میں احسن کو نہ پہچانا۔ احسن ممتاز کو دیکھ کر رُک گیا، تب ممتاز کو ایک دھچکا سا لگا کیونکہ احسن وہ پہلے والا احسن نہ رہا تھا۔

اُس کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ بڑھا ہوا شیوہ، پتکے ہوئے گال، بکھرے بال، میلے کپڑے، بالکل گم سم اور خاموش! اسے دیکھ کر ممتاز جیسے دوست نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس پر کیا ہتی ہوگی؟ گرمیوں کی اور شاموں کی طرح وہ شام بھی سہانی اور خوبصورت تھی۔ ممتاز نے احسن سے کچھ نہ پوچھا۔ وہ اسے لے کر کمپنی باغ کے ایک گوشے میں آ گیا۔ دونوں گھاس پر یوں ڈھیر ہو گئے جیسے میلوں کا سفر کر کے آئے ہوں۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو تنکے رہے اور خاموشی باتیں کرنے لگی۔ کمپنی باغ کیا تھا، شہر کے بیچوں بیچ پھولوں کے تختوں کے درمیان اک لخت تباہی، جہاں پہنچ کر منظر اور بھی خوبصورت ہو گئے تھے۔ شہر سے قدرے اونچا ہونے کی وجہ سے ہوا کے معطر جھونکوں نے ساری تنکھن اتار کر انہیں ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ چاروں طرف طرح طرح کے پھولوں کا بھرا تھا۔ باغ میں آئے بچوں اور پرندوں کا چہچہانا ایک جیسا معلوم ہوتا تھا۔

”ممتاز میں ٹوٹ گیا ہوں یار..... تم لوگ ٹھیک کہتے تھے“ احسن کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔

”میں ہی عشق میں اندھا، بیہرہ اور خود غرض ہو گیا تھا۔ شہناز سے جو امیدیں باندھی تھیں سب خاک میں مل گئیں۔ وہ خاتون، اس کی ماں نہیں بلکہ کسی کوٹھے پر بیٹھی نانیکہ ہے جو اس کی زندگی کی قیمت سے اپنی عاقبت سنوارنا چاہتی ہے۔ بڑی بولی کے گلے تنک..... وہ شہناز کو اپنی قید میں رکھنا چاہتی ہے..... شہناز اس کی دھلتی عمر کا واحد سہارا ہے۔“ احسن نے سگریٹ ساگایا اور پھر سے کہنا شروع کیا۔

”ممتاز! میں اپنا شمار ان مردوں میں نہیں کروانا چاہتا جو عورتوں کے پیچھے پاگل اور دیوانے ہو جاتے ہیں..... بوش کھودیتے ہیں۔ ناکام عشق کا روگ ایسا ہی ہے جس کا فطری نتیجہ پاگل پن اور دیوانگی ہوتا ہے۔ لیکن دوست..... میں مرد ہوں، دیوانگی کی سرحد کو چھو کر زندگی کی طرف لوٹ آیا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ زندگی ایک تلخ حقیقت اور ایک بڑا معرکہ ہے۔ میں ہمیشہ زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیا ہوں..... اب میں اس کے آگے گھٹنے نہیں ٹیک سکتا۔“ احسن خاموش ہو گیا۔ ممتاز، اس کی تمام ترکیفیات کو پوری طرح سمجھتا تھا اس لیے کوئی تبصرہ کرنے اور بحث کرنے کی بجائے اس نے اپنے رویے سے احسن کو یہ احساس دلایا کہ ہاں احسن تم واقعی بہادر اور ذی بوش مرد ہو..... اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اسے اپنے گھر لے آیا۔ گھر پہنچ کر احسن یوں سویا کہ دو دن تک بے خبر سوتا ہی رہا..... یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں کا جاگا ہوا ہو۔ جب بیدار ہوا تو ایسا ہلکا پھلکا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں!

”ممتاز! آج میں بھی تمہارے ساتھ اخبار جاؤں گا۔“ احسن نے میز پر رکھے اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں..... سب تمہیں یاد کرتے ہیں، پوچھتے ہیں وہ کُن سرا کدھر گیا؟ انوار بھی خاصا پریشان تھا تمہاری وجہ سے۔“ ممتاز خوش ہو کر بولا۔

”اور ہاں تم خاکوانی صاحب کی فکر نہ کرو، ان سے میں خود ہی بات کر لوں گا۔ ممتاز نے اسے تسلی دی تو وہ اٹھ کر تیار ہونے لگا۔ جب احسن اتنے عرصے بعد ممتاز کے ساتھ اچانک دفتر پہنچا تو شام کی شفٹ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انوار کو احسن کے آنے کی اطلاع ہو گئی تھی۔ وہ جزل شفٹ ختم کر کے احسن کا انتظار کر رہا تھا۔ ممتاز نے پہلے ہی سے سب کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس لیے کسی نے بھی احسن سے کوئی الٹا

سیدھا سوال نہ کیا۔

موت کے بعد

- 1- مال: وارثوں کے لیے
- 2- روح: ملک الموت کے لیے
- 3- گوشت: کبڑوں کے لیے
- 4- ہڈیاں: مٹی کے لیے
- 5- نیکیاں: قرض خواہوں کے لیے

(عاشر عظیم، کراچی)

کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں ناں؟“ احسن نے اچانک قلم چلاتے ہوئے رک کر ممتاز سے پوچھا۔
”میرے بھولے بادشاہ یہ بڑے لوگ خبریں اور تصویریں چھپوانے کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے ہیں۔“ ممتاز بولا۔

”مگر میں سیاسی و سماجی شعبہ نازوں کی نہیں، اُن معصوم لوگوں کی بات کر رہا ہوں، جو اُنجانے میں جان پر کھیل کر خبر بن جاتے ہیں۔“ احسن نے کہا۔
”ہوں..... شاید“ ممتاز عینک ناک پر ٹکائے کسی خبر پر باہر سر جن کی طرح جھکا ہوا تھا۔

”مگر..... وہ بے چارے اپنی خبر کے متن سے بھی بے خبر ہی مر جاتے ہیں، دوسرے لوگ لمحہ بھر کے لیے بوئیل دل کے ساتھ خبر پڑھتے ہیں..... اور پھر سے زندگی کی چٹکا پٹو ند میں گم ہو جاتے ہیں۔ زندگی بھی عجیب گورکھ دھندہ ہے۔“ احسن خود کا مٹی کی کیفیت میں کہے چلا گیا۔

”ممتاز صاحب! آپ کو فاروقی صاحب نے یاد کیا ہے۔“ قاصد نذر نے دروازے سے پکارا اور ممتاز سگریٹ بجھا کر کمرے سے نکل گیا۔ احسن تادیر موت و حیات کے فلسفوں پر مبنی الجھی گتھیاں سلجھاتا رہا۔

”چل شہزادے تیرا کام ہو گیا..... فاروقی صاحب نے تجھے بحال کر کے بڑی فیوردی ہے یار۔“ ممتاز نے آدھے گھنٹے بعد کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خوش

سب نے اس کے واپس آنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ کسی نے کہا لو بھئی ہماری گمشدہ ڈکٹسری واپس آگئی..... کوئی بولا دانشور لوٹ آیا۔ خاکوئی صاحب کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ فاروقی صاحب نے پوری شفٹ کے لیے چائے بسکٹ منگوائے اور تھوڑی دیر تک خوب ہنگامہ رہا۔ اس کے بعد احسن، ممتاز اور انوار اپنے کمرے میں آ گئے۔

”انوار! وہ تمہارے تنقیدی اجلاس کیسے چل رہے ہیں؟ احسن نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔
”یار..... سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے بغیر کسی بھی محفل میں رونق نہیں رہی۔ سچی تمہارا پوچھتے ہیں، ایک دم وی آئی پی ہو گئے ہوسم سے..... نہیں تو کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا.....“ انوار نے شوخی سے کہا۔
”اور وہ جوس“ خاموش“ ہے ناں۔۔۔ تمہارے فراق میں اس نے بھی چپ کا روزہ توڑ دیا ہے..... خوب بولنے لگی ہے۔“ ممتاز نے بھی لقمہ دیا۔
”اور حلقے کے جلسوں میں بھی بڑی باقاعدگی آگئی ہے۔“ انوار بتانے لگا۔

”وہاں آج کل بڑے بھر پور تنقیدی اجلاس ہو رہے ہیں۔ جن میں چیدہ چیدہ سچی شاعر و ادیب شامل ہوتے ہیں۔ آئندہ ہم بھی حلقے کے کسی اجلاس میں دوبارہ جائیں گے۔“

”ہاں بھئی! وہاں کے لوگ نثری نظم کی بحث والے اُس یادگار اجلاس کو آج تک نہیں بھولے، جس میں تم نے بیٹھے بیٹھے اٹھ نثری نظمیں لکھ کر شرکت کی تھی۔“ ممتاز نے یاد دلایا۔

”پرسوں شام کو ہے ناں اجلاس؟..... ممتاز، احسن کو ضرور ساتھ لانا..... میں اب چلتا ہوں..... اوکے؟“
انوار اجازت لے کر چلا گیا۔ ممتاز اور احسن کل کے اخبار کا پیٹ بھرنے کے لیے نئی، پرانی خبروں کے آپریشن میں جُت گئے۔
”یار! بڑی بڑی خبروں میں آنے والے یہ لوگ

سے کہا۔

احسن نے کسی بھی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا، جیسے اسے یہ سب پہلے ہی سے معلوم تھا۔
 ”اُوئے نخل سرے! تجھے خوشی نہیں ہوئی؟“
 ممتاز نے احسن کو پیار سے چیخڑا۔

”میرے لیے اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔
 کیا خوشی اور کیا غم؟..... سب ایک برابر ہیں“ احسن کا ردِ عمل بھانپ کر ممتاز بھی خاموش ہو گیا۔

”اور..... یہ جو بڑے سُر ہوتے ہیں ناں، یہ سرداروں کے ہوا کرتے ہیں..... تم لوگ شاہ دولے کے چوہوں کی طرح چھوٹے سروں والے..... محدود سوچ والے، اپنے اپنے دائروں میں قید لوگ..... آگے کی سوچ ہی نہیں سکتے“ احسن اپنی ترنگ میں کہے چلا گیا اور ممتاز سمجھ گیا کہ اسے پھر سے دورہ پڑ گیا ہے..... اُس کے اندر کا غبار کہیں نہ کہیں تو نکلنا ہی ہے، اس لیے خاموش رہا۔

چند ہی دنوں میں بظاہر زندگی اپنے معمول پر آ گئی۔ احسن اپنی کمرائے کی بیٹھک میں شفقت ہو کر اخبار کے دفتر آنے لگا۔ ”ایک شام حلقے کے اجلاس میں شرکت کے لیے ممتاز اور احسن جب ہال میں داخل ہوئے تو اجلاس شروع ہو چکا تھا۔ انوار نے دونوں کو سرگوشی کے انداز میں گھور کر دیکھا۔ کسی نوجوان شاعر کی غزل پر صاحب صدر اپنی حتمی رائے دے رہے تھے۔ دونوں بچھیلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد صاحب صدر نے نوجوان افسانہ نگار ظہیر کمال کو اپنا افسانہ تنقید کے لیے پیش کرنے کی دعوت دی۔ افسانے کا عنوان تھا۔ ”زرد کار کے تعاقب میں“، ظہیر کمال نے افسانہ پڑھا۔ ”افسانے کا مرکزی کردار، ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس کی زرد کار کا بار بار تعاقب کرتا ہے..... اسے پانے کی خاصی جدوجہد کرتا ہے بالآخر لڑکی راضی ہو جاتی ہے مگر جب بات لڑکی کے گھر والوں تک پہنچتی ہے تو وہ صاف انکار کر دیتے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار اس قدر جذباتی ہوتا ہے

کہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ افسانے پر گفت گو کے آغاز میں نوجوان شرکاء میں سے کوئی اسے مرکزی کردار کا جذباتی پن تو کوئی اسے محبت کی جیت قرار دیتا ہے۔ ایک آدھ نے اسے سطحی افسانہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔ ایک سینئر ادیب نے اسے افسانہ ماننے سے ہی انکار کر دیا۔

صاحب صدر نے بحث و مباحثہ کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ یہ افسانہ ضرور ہے مگر خودکشی کا عمل زندگی سے فرار اور بزدلی ہے، آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ یوں گفت گو کو بنی سمت مل گئی تھی۔ بہت سے سینئر لکھنے والے جنہیں کچھ سمجھائی نہ دے رہا تھا صاحب صدر کی بات کی تائید کرنے لگے۔ ایک نے کہا کہ خودکشی حرام ہے۔ انوار نے کہا کہ یہ بے جس معاشرے کے خلاف گھلا احتجاج ہے۔ ممتاز نے کہا کہ آپ خودکشی کے عمل کو کچھ بھی کہیں مگر یہ بے مشکل کام۔ ہمارے بزرگوں کو فرسودہ روایات ترک کر کے نئے سویرے کا کھلے دل سے استقبال کرنا چاہیے۔ مس خاموش نے بھی اپنی موجودگی کا احساس یوں دلایا اور کہا کہ نئی نسل اور بزرگوں کے درمیان فاصلوں کی وجہ سے ایسے ایسے جنم لیتے ہیں۔ دونوں کے درمیان دوستانہ روابط کی ضرورت ہے، جس کی ابتدا بزرگوں کی طرف سے ہونی چاہیے۔ ایک سینئر دانشور نے انتہائی جذباتی ہوتے ہوئے کہا کہ نوجوان نسل بالکل بڑبچکی ہے اور بے راہ روی کا شکار ہے۔ کہانی کا کردار انتہائی بُردل اور مایوس نوجوان ہے جو زندگی جیسی متاع کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسے جوش کی بجائے ہوش کے ناخن لینا چاہیے تھے۔ اس سے قبل کہ صاحب صدر اپنے اختتامی کلمات کے لیے منہ کھولتے احسن بول اٹھا، صاحب صدر! میرے نزدیک خودکشی کا عمل عین بہادری ہے۔ اس عمل کو بُردلی قرار دینے والے خود پر لے درجے کے بُردل اور ڈرپوک ہیں۔ زندگی کی صداقتوں کو جھٹلاتے جھٹلاتے آج دانشور بن بیٹھے ہیں، خودکشی نہ تو راہ فرار ہے اور نہ ہی آسان بلکہ یہ انتہائی صبر آزما اور مشکل کام ہے۔ یہ کام بہادر اور

کہیں ذرا طویل ہو گئے ہیں ان پر توبہ کی نصیحت ہے۔ ”اسن نے مشورہ دیا۔ ”اسن بھائی! ایسا ہی ہوگا، ظہیر نے سعادت مندی سے کہا۔

اس گفتگو کے دوران ممتاز اور انوار پاس کھڑے اپنی گپ شپ کرتے رہے۔ بہت سے سینئر شاعر و ادیب اجلاس ختم ہوتے ہی صاحب صدر سمیت چلے گئے تھے۔ اس کے بعد ظہیر کمال کے ہمراہ ”مس خاموش“ اور دوسرے نوجوان بھی رخصت ہو گئے۔

”اے بھائی! اگر تمہاری مجلسی زندگی میں ذرا سی گنجائش ہو تو میں بھی کچھ کہوں؟“ ممتاز اپنے روایتی شوخ انداز میں کہا جس پر احسن اور انوار ہنس پڑے۔

”آپ سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے“..... انوار جلدی سے بولا۔

”چل بھائی مولوی پہلے تو بول لے.....“ ممتاز نے مصنوعی ناراضگی دکھائی۔

”یار آج بلو کی سالگرہ ہے، گھر پہ سب انتظار کر رہے ہوں گے تم لوگ اگر چاہو تو میرے ساتھ گھر چلو“ انوار نے پروگرام پیش کیا۔

”یار پہلے سب میرے گھر چلو، مجھے اباجی کی دوائی گھر پہنچانی ہے۔ اس کے بعد وہیں کھانا کھاتے ہیں۔“ ممتاز نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

”لیکن مجھے آج کسی چار دیواری میں قید نہیں رہنا، آزاد..... بہت آزاد فضاؤں میں پھرنا ہے..... تم بیویوں والے ہمیشہ گھر جانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہو۔“ احسن اپنے انداز میں بولا۔

اچھا بول کر تے ہیں میں چلتا ہوں، تم احسن کے ہمراہ اباجی کو دوائی دے کر آ جانا، کیا خیال ہے؟ انوار یہ کہہ کر چلتا بنا۔

”یار احسن میرا خیال ہے تم بھی تھک گئے ہو گے، آرام کرو چل کر اور میں گھر چلوں اباجی انتظار کرتے ہوں گے..... ہوں؟ ممتاز نے بھی تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

منفرد لوگ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر (احسن جانے کس وقت چوکیدار کے باورچی خانے سے چھری اٹھالایا تھا) آپ اشارہ کیجیے اور میں آپ کے سامنے اپنے ہاتھ کی انگلیاں کاٹ دیتا ہوں.....“ احسن نے یہ کہتے ہوئے اپنی انگلیاں کاٹنے کے لیے چھری بائیں ہاتھ پر رکھی تو ممتاز نے احسن کو چھتے ہوئے ایسا کرنے سے منع کر دیا..... ”اور اگر آپ میں سے کوئی میرے کہنے پر ایسا کر گزرے تو میں اسے بہادر مان لوں گا.....“

”ممتاز نے آگے بڑھ کر احسن سے چھری لے لی۔ صاحب صدر نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے بالآخر کہا کہ ”حاضرین میں سے تو بحث کو نیا رنگ دینے کے لیے خود کشی کو زندگی سے فرار اور بڑی قرار دیا تھا جبکہ افسانے پر بہت اچھی گفت گو ہوئی۔ اپنی جان کو ختم کرنا آسان نہیں ہوتا یہ واقعی مضبوط ارادے والے بہادر لوگوں کا کام ہے“ اور اجلاس ختم کر دیا گیا۔

اجلاس کے ختم ہوتے ہی سب نے احسن کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ کسی نے کہا ”بھئی! ہم نے اتنے عرصے میں آج پہلی بار احسن کو ایک نئے روپ میں دیکھا ہے۔“ ایک بولا ”بات کرنا بہت آسان ہوتا ہے مثل کرنا سہل نہیں ہوتا“، ظہیر کمال منونیت تھری نظروں سے احسن کو نیکے چلے جا رہا تھا۔ ”ارے احسن بھائی! آپ ہیں کہاں اتنے عرصے سے..... ایمان سے جلسوں کی رونقیں ہی ختم ہو گئی تھیں۔ آج اگر آپ نہ ہوتے تو میرے افسانے کو ان بڑوں نے کنارے لگا دیتا تھا۔“ پاس ہی مس خاموش کھڑی آنکھیں چپکا رہی تھی۔ ”آپ نے اتنی مضبوط دلیل دی کہ سب سینئر زکو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا، وہ بولی۔“ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے بولنا شروع کر دیا ہے..... ہماری مجلسی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے..... اس کے بغیر انسانی شخصیت کے جوہر کھلتے ہی نہیں“ احسن بولا۔ اور ہاں ظہیر صاحب..... آپ کا افسانہ مجموعی طور پر تو ٹھیک تھا، مگر کہیں چھپوانے سے پہلے کہانی کے ٹریٹمنٹ پر اور اس کے مکالمے جو کہیں

خوش نصیبی

مریض نے بڑی تشویش سے ڈاکٹر سے کہا۔

”مجھے عجیب و غریب مرض لاحق ہو گیا ہے، جب بھی میری بیوی بولتی ہے مجھے کچھ سناٹی نہیں دیتا۔“

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ مرض نہیں، نعمت خداوندی ہے۔“

(شرنبل عابد، لاہور)

اہمیت تھی۔

بس یہی کوئی پانچ دس منٹ..... پھر چلتے ہیں اللہ کا نام لے کر..... انجن ڈرائیور خوش دلی سے بولا۔

اُستاد جی! آپ تنگ نہیں آجاتے دن رات کی چٹکا چٹک..... چٹکا چٹک سے؟“ احسن نے یونہی بات بڑھائی۔

انجن ڈرائیور جواباً مسکرایا اور بولا! ”بھائی میرا روز کا کام ہے، میری تربیت ہی اسی شور شرابے کی ہے..... تنگ کیا آنا؟ تقسیم سے پہلے میرا باپ بھی ریلوے میں تھا اور پھر جاتے جاتے مجھے بھی ریلوے میں بھرتی کرا گیا۔“

”اچھا آپ کو نیند آ جاتی ہے آسانی سے؟“

”جنتا! انسان تھکا ہوا ہو تو کبے میں سولی پہ بھی نیند آ جاتی ہے۔“

”یہ تو ہے..... اُستاد جی!“ احسن نے یوں کہا جیسے کہہ رہا ہو ”حیرت ہے ہمیں تو بستر پر بھی نہیں آتی اور.....“ احسن نے انجن کے پیچھے بڑے زنانہ ڈبے کی طرف دیکھا تو ایک شریسی مسکرائی نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔ ایک پانچ سالہ بچہ کھڑکی سے سر نکالے اپنی حرکتوں میں مصروف تھا۔ دوسری جانب اس کی ننھی مٹی بہن فیڈر سے دودھ پی رہی تھی۔ اتنے میں ایک ریڑھی والا ٹافیاں اور بسکٹ بیچتا زنانہ بوٹی کے قریب آ گیا۔

تھا۔ اس کا بیشتر وقت ریلوے بک سٹال پر کتب و رسائل کی ورق گردانی میں گزرتا۔ چند ہی لمحوں میں وہ ریلوے بک سٹال پہ تھا اور اس کے ہاتھ میں اپنے محبوب شاعر فیض احمد فیض کا شعری مجموعہ ”شام شہر یاراں“ تھا۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے احسن کو اپنی گزری شام شہر یاراں کا ایک ایک لمحہ پوری تفصیل کے ساتھ یاد آنے لگا..... وہ ایک ایک کر کے اپنے سب دوستوں اور چاہنے والوں سے مل لیا تھا، چپکے چپکے..... کسی کو بتائے بغیر وہ ان سب سے رخصت لے آیا تھا۔ بھلا وہ اسے آنے دیتے اگر احسن انہیں شہر چھوڑ کر جانے کا بتا دیتا تو.....؟ کبھی نہیں..... جس شہر کے کلی کو چوں میں احسن نے اپنی حبسیں اور شامیں کی تھیں، جن دوستوں کے ساتھ ابتدائی زندگی کے سرد و گرم سہے تھے..... وہ اسے یوں چپ چاپ کیسے رخصت کر دیتے..... احسن نے کبیر والا کا ٹکٹ لیا اور زاو سفر کے طور پر کتاب ”شام شہر یاراں“ خرید لی تھی۔

چلتن ایکسپریس جموتی جھانسی پٹیاں بجاتی بھاول پور اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ پلیٹ فارم کی گھڑی میں گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو چلے تھے۔ چلتن لے پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی بائیل سی ٹنگ گئی تھی۔ جیسے جیسے لے منہرے ہوئے پانی میں کسی بے بڑا سا پتھر پھینک دیا

ہ۔ اوگ بھاگ کر سب ایک ہی وقت میں گاڑی میں وار ہونا چاہتے تھے۔ کوئی چندہ، بیس منٹ کی دھجکا

”ہتی کے بعد پلیٹ فارم پھر سے پرکون ہو گیا۔

احسن نے ذبیہ کے آخری سکریٹ کا آخری کش لے کر ریل کے نیچے اچھال دیا تھا۔ چلتن کی روانگی میں اہمی شاید پہلے وقت باقی تھا..... احسن آہستہ آہستہ بے لانی لے ہاتھ چلتے ہوئے انجن ڈرائیور کے پاس آ گیا۔

وہ اپنے ٹک سے ٹھونٹ ٹھونٹ چائے پی رہا تھا۔ احسن نے پٹی مہر، کچی رنگت والے انجن ڈرائیور کو مسکرا کر دیکھا تو وہ ابابہ بھی مسکرایا۔

”اُستاد جی! اتنی دیر ہے.....“ احسن نے روایتی

والا ”اُستاد جی! اس نے اپنے لیے اس سوال کی بڑی

چلتن کی روانگی میں زیادہ وقت نہیں تھا..... احسن نے جلدی سے ٹافیاں اور بسکٹ خریدے اور اپنے معصوم دوست کے قریب جا کر اسے پکڑا لگا۔
 ”تمہارا نام کیا ہے؟“ احسن نے اسے ٹافیاں اور بسکٹ پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

”جی احسن.....“ بچہ بولا..... ”احسن؟“ اس عجیب اتفاق پر احسن بھونچا رہ گیا۔ ”شام شہر یاراں“ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے پٹی - بچے نے احسن کے ہاتھ سے ٹافیاں اور بسکٹ بغیر تردد کے یوں لے لیے جیسے اس نے اپنی ہی جیب سے نکالی ہوں۔ بچے کی مایاں دونوں کو اپنائیت بھری نظروں سے دیکھے جاری تھی۔ اُس نے دودھ پتی بنی گوگو میں بھر رکھا تھا۔ چلتن نے آخری وسل دی اور آہستہ آہستہ ریٹلنا شروع کر دیا۔ ننھا احسن..... احسن کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھے جا رہا تھا۔ احسن کو اور کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ریل نے ابھی پلیٹ فارم نہیں چھوڑا تھا۔

احسن آہستہ آہستہ ریل کے ساتھ چل رہا تھا..... ابھی لمبا پلیٹ فارم باقی تھا..... ننھے احسن نے جب اسے ریل کے ساتھ چلتے دیکھا تو الوداعی جذبے سے سرشار ہو کر ہاتھ بلانا شروع کر دیا۔ جواباً احسن نے بھی ہاتھ بلایا۔ ریل کی رفتار میں اضافہ ہوتا چلا گیا احسن نے انجین سے آگے دوڑنا شروع کر دیا۔ جونہی انجین نے پلیٹ فارم چھوڑا احسن نے چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ انجین کے آگے چھلانگ لگا دی۔

انجین کی رفتار اس قدر تیز ہو چکی تھی کہ ڈرائیور کے ایمر جنسی بریک لگاتے لگاتے نصف ٹرین کی بوگیاں اس کے اوپر سے گزر گئی تھیں..... ابھی چند ٹاپیے پہلے پلیٹ فارم پر ہاتھ بلاتے، بچوں کے ساتھ ہاتھیں کرتے احسن کی لاش خاک و خون میں لتھڑی ریلوے ٹریک کے درمیان میں پڑی تھی۔ اس کی روح کا برسوں سے بے چین پرندہ فتنس جاں سے نکل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو چکا تھا مگر ”شام شہر یاراں“ اس کے کٹے ہوئے ہاتھ کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی تھی۔ کوئی گھٹے بھر کی تنگ

ودو کے بعد اس کا دیدہ بدن ریلوے ایبویلیس کے سٹریچر پر سفید چادر سے ڈھکا پلیٹ فارم کے وسط میں رکھا تھا۔ جیب سے برآمد ہونے والی احسن کی آخری تحریر شہناز کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ خط میں لکھا تھا۔

”مجھے کسی عربی مفکر کا ایک قول یاد آ رہا ہے کہ اگر انسان کبھی یہ محسوس کرے کہ اس کی زندگی عذاب ہو چکی ہے تو اسے اپنی باقی سانسیں عزرائیل کے منہ پر دے ماریں چاہیں۔“ میری زندگی عذاب تو نہیں ہوئی مگر میں چلتے چلتے ایک ایسی ہندگی میں پھنس کر رہ گیا ہوں جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ میں نے اپنے لیے ہمیشہ مشکل راستوں کا انتخاب کیا ہے اور ایسا بہادر لوگ کیا کرتے ہیں اور بہادر لوگ کبھی بے بس نہیں ہوتے..... پھر میں بے بس کیوں ہوتا؟ چنانچہ اپنے لیے یہ راستہ بھی میں نے ہی چنا ہے..... میں ”لاوارث“ ہرگز نہیں..... مگر مجھے میرے وارثوں کے حوالے کرنے کی بجائے جناح میڈیکل کالج کے اُن سٹوڈنٹس کے سپرد کیا جائے، جو انسانی زندگی کی بقائے دوام کے خواب دیکھتے ہیں۔ جو کبھی میں بھی دیکھا کرتا تھا..... شاید اُن خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے اب مجھے دوسرا جنم لینا ہوگا۔ اپنے دوستوں ممتاز، انوار اور شہناز سے انتہائی معذرت کے ساتھ!

احسن شہناز سر شام، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر احسن کی تلاش میں ہر جگہ ماری ماری پھرتی تھی۔ رات گئے ممتاز کے گھر پہنچی تو پتہ چلا کہ احسن اخبار کے لیے کسی خبر کی تلاش میں ریلوے اسٹیشن کی طرف نکلا ہے..... بھاگ بھاگ جب شہناز ریلوے پلیٹ فارم تک پہنچی تب تک اُس نے دیکھا کہ احسن نے اپنے خون سے کل کے اخبار کی سرخی رقم کر دی تھی.....!!

☆.....☆.....☆

ٹوٹے خوابوں کی گرچیاں

ماجرہ فففور

جب دل سے قریبی رشتوں کے درمیان
غلط فہمیاں جنم لے لیں اور مجبوریاں ایک
محرم کو مجرم کی صف میں لاکھڑا کریں تو ایسے میں
خلوص و وفا کا رشتہ آپ ہی آپ چکنا چور ہو جاتا ہے۔

ایک ایسے شخص کا قصہ جو سچی محبت کا متلاشی تھا



کاش ہم تم کو منا لیتے نہ جانے دیتے
مدتوں بعد یہ احساس خطا یاد آیا

میں گمراہ ہو چکا تھا میں اپنے نفس کو سنبھال نہیں سکا
تھا اور نادانی میں اپنا نقصان کر بیٹھا تھا۔
”میرے کپڑے پر لیس ہو گئے۔“

میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تھوڑی سی دیر رکا اور
ماسی زبیدہ سے پوچھا کیونکہ میں جاگنگ پہ جانے سے

بہت پہلے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جنت دو قدم
پہلے اور میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ جنت دو قدم پہ
تیسے ہو سکتی ہے؟ کسی بزرگ نے فرمایا کہ ”ایک قدم تم
اپنے نفس پہ رکھ دو تو دوسرا قدم خود بخود جنت میں پہنچ
جائے گا۔“

پہلے انہیں کپڑے پر لیس کرنے کا کہہ گیا تھا۔

”جی صاحب جی شمو نے کر دیے ہیں۔“ شمیم ماسی زبیدہ کی بہت ہی پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی اور ہمیشہ خلوص سے پیش آتی جسے وہ کبھی کبھی لاڈ سے شمو کہتی تھی۔ ماسی نے مجھے دو تین دفعہ کہا کہ میں اس کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کروں۔

ماسی ہمیشہ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی تھی اور ہر دکھ سکھ مجھ سے شیئر کرتی تھی میں بھی خاموشی سے ان کی بات سن لیتا تھا۔ وہ اپنی شمو کے فرض سے آزاد ہو کر سکھ کا سانس لین چاہتی تھی۔ دنیا میں لڑکوں کی کمی نہ تھی مگر کوئی سمجھدار لڑکا نہیں مل رہا تھا جو اپنی ذمہ داری کو نبھاسکے میری کوشش ابھی تک جاری تھی۔

”صاحب جوتے پالش کر دوں؟“ میرے خیال کے تسلسل کو شمو کی آواز نے توڑا میں نے ریک پہ رکھے جو تول کو دیکھا تو سب ہی گندے ہوئے پڑے تھے۔

”آج براؤن شوز کر دو۔“ میں نے ناشتہ کرتے ہوئے اس کو کہا۔ وہ برش اور پالش لے کر میرے سامنے قالین پر چوکنری مار کے بیٹھ گئی اور اپنا کام شروع کر دیا وہ ہر کام جی جان سے کرتی تھی نہ بھی کوئی کام ہوتا تو ڈھونڈ کے خود ہی کرتی رہتی تھی۔ ماسی کہتی تھی کہ اس میں ہڈی نہیں ہے صرف ماس ہی ماس ہے اور میں ماسی کی بات پہ ہمیشہ مسکرا کے رہ جاتا تھا جو اپنی بیٹی کو ہر وقت ڈانٹتی رہتی تھی۔

میں جلدی سے آفس جانے کے لیے تیار ہوا کیونکہ آج آفس میں ایک اہم میٹنگ انیڈ کرنا تھی اور میٹنگ کے بعد سائٹ پہ جانا تھا۔ پھر شام کو زری آپا کے ساتھ میٹنگ کا ارادہ تھا۔ جس میں مجھے ان سے آج فائنل بات کرنا تھی اپنی شادی کے بارے میں، اپنی اور ایمان کے متعلق اور اپنی محبت کے بارے میں کیونکہ میں ایمان سے محبت کرتا تھا۔

جبکہ زری آپا میرے لیے اپنی تند کو پسند کیے بیٹھی تھیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس پسند کو میرے بہنوئی فرحان بھائی بھی جانتے تھے اس لیے میرا انکار مہنگا بھی پڑ سکتا

تھا۔ اگر وہ طیش میں آجاتے تو مجھے ایمان سے یقیناً ہاتھ دھونا پڑ سکتے تھے خیر اللہ کا نام لے کر میں نے آج کے دن کا آغاز کیا تھا اب دیکھنا یہ تھا کہ ہوتا کیا ہے۔

سارا دن میں نے بے حد مصروفیت میں گزارا تھا جس کی وجہ سے کچھ محکمے بھی ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود زری آپا کی آمد اور ان سے میٹنگ کے وقت میں خاصا جاق و چوبند تھا اور آج اپنا کیس کسی وکیل کی طرح لڑ رہا تھا۔ آخر قیصر فرحان بھائی کی آمد تک ملتوی کر دیا گیا تھا تاکہ ان سے پوچھ لیا جائے کہ ان کو اپنی بہن سے رشتہ نہ کرنے پر طیش تو نہیں آئے گا اگر ان کا جواب نہیں میں ہوا تو سو فیصد ایمان غلی میری ہوگی۔ دل میں میں نے بہت سی منتیں مان لی تھیں ویسے بھی میں پرہیزگار اور نمازی نائپ بندہ تھا اکثر لوگ جو میرے حلقہ احباب میں شمار ہوتے تھے میری عادت اور پابندی کی پختگی دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کیونکہ جب بھی نماز کا وقت ہوتا تھا میں اہم سے اہم کام چھوڑ کر نماز ادا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ سگریٹ نوشی اور عورتوں سے ناجائز تعلقات سے میں ہمیشہ دور بھاگتا تھا۔ میں نے وہ آنکھیں ایسی دیکھی تھیں جن میں ہمیشہ میرے لیے محبت اور چاہت ہی رہی تھی وہ آنکھیں میری ایمان کی آنکھیں تھیں۔

میری اس چاہت میں فرحان بھائی ڈھال بننے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے فیصلہ میرے حق میں دے دیا تھا اور میرے قدم ہواؤں میں تھے۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا اور میری خوشی میں اس وقت سبھی شریک تھے۔ میں نے مٹھائی لا کر دی اور خود جلدی سے ایمان کو کال کرنے باہر نکل پڑا۔ کیونکہ کل زری آپا، فرحان بھائی نے ان کے گھر جانا تھا۔

ایمان میری کلاس فیلو ہی نہیں میرے بابا کے دوست کی بیٹی بھی تھی اور میری آئیڈیل بھی۔ اس کی محبت میرے لیے فخر کا باعث تھی۔ میرے شریک سفر کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا میں یعنی فخر چوہدری آج بے انتہا خوش تھا۔

”فخر، زری آپا شادی پہ اصرار کر رہی ہیں۔“
”لیکن!“

”لیکن کیا۔“ ایمان کو لیکن پہ نہہرتے دیکھ کر میں نے جلدی سے اس کی طرف دیکھا۔ آج اتفاقاً وہ اپنی مٹی کے ساتھ مارکیٹ میں نظر آگئی تھی اور میں آنٹی سے اجازت لے کر اسے اپنے ساتھ لچ کے لیے لے آیا تھا۔

”بولونا ایمان۔“

”تم جانتے ہو پچھلے چند ماہ سے پایا کا بزنس کافی کرائس کا شکار رہا ہے۔ اب چند دنوں سے حالات سنبھلے ہیں تو پایا چاہتے ہیں کہ دو تین ماہ تک وہ اپنے بزنس پہ توجہ دیں اور بعد میں شادی کی تیاری کریں۔“ اس نے ساری بات کہہ دی۔

”دیکھو ایمان زری آپا بھی اپنی جگہ درست ہیں دراصل فرحان بھائی کے پوسٹنگ آرڈر آگئے ہیں اور اگر وہ چلے گئے تو شادی کے انتظام کون کرے گا؟ زری آپا کے سوا تو میرا اور کوئی سگارشہ بھی نہیں ہے۔“

”وہ سب ٹھیک ہے لیکن فخر، مٹی پایا اس شادی کے مسئلے پہ بہت پریشان ہیں اور ان کی پریشانی مجھے بھی پریشان کر رہی ہے پلیز آپ ابھی خاموش رہیے۔“ ایمان کافی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور میں اتنی سنجیدگی کبھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ مجھے اس کا ہنسا مسکراتا فریش چہرہ اچھا لگتا تھا۔

”ڈونٹ وری یار میں کبھی آپ کو ڈسٹرب دیکھنا نہیں چاہتا جیسا آپ چاہو گی ہمیشہ ویسا ہی ہوگا اب خوش۔“ ویٹر کے آنے تک میں اسے ہر پریشانی سے آزاد کر چکا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا اور شکریہ ادا کرنے لگی۔

”آپ بہت اچھے ہیں فخر۔“

”میں جانتا ہوں“ اس کی بے ساختہ تعریف کرنے پہ میں نے جواب دیا تو وہ ایک دم ہنسی نہی۔

میں بل پے کر کے اس کے پیچھے ہی نکل آیا تھا۔ ایمان مجھ سے دو قدم آگے چل رہی تھی۔ ریسٹورنٹ کی

سیڑھیاں اترتے ہوئے بے ارادہ ہی میری نظر سامنے سے آتی لڑکی پہ پھہر گئی تھی وہ غیر معمولی حسن کی مالک تھی لیکن انتہائی سادہ لباس اور اے کارف میں لمبوس تھی۔ میں اس کے غیر معمولی حسن کو دیکھ کر چونک سا گیا اور اک دم رک گیا۔ وہ لڑکی میرے پاس سے گزر کر بہت دور جا چکی تھی مگر ایمان نے مجھے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”فخر یہ مرد ہر چہرے پہ کیوں فدا ہو جاتے ہیں؟“ میں سنجیدہ تھا اور اس کے سوال کو بھی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

”جہاں تک میری سوچ ہے کہ مرد ہر چہرے پہ فدا نہیں ہوتا بلکہ اس کا نفس فدا ہو جاتا ہے۔“ میں نے ایک سچی اور کھری بات کہی تھی۔ کبھی کبھی مرد صرف جسم دیکھتا ہے اور کبھی چہرے، جن کو دیکھ کر مرد کے اندر زرد کتا یعنی کس نفس دم بلانے لگتا ہے جو مرد اور عورتیں اسے ہمیشہ کے لیے دبا لیتے ہیں۔ وہ بہت عظیم اور طاقتور ہوتے ہیں اور میں ان لوگوں میں آج تک شامل نہیں ہو۔ کا اور ایسی چوٹ کھائی کہ مرہم کی تمنا بھی شرمندگی اور ندامت کا باعث لگتی تھی۔

☆.....☆.....☆

”شمو یہ سارے کپڑے اٹھا کر صاحب کے کمرے کی الماری میں رکھ آؤ۔“ زری آیا آج میرے گھر شاپنگ کی کچھ چیزیں لے کے آئی تھیں جن میں ایمان کے زیورات اور ڈریسز تھے۔

”تھک گئی ہوں گی آپا، میں آپ کا سر دبا دوں۔“ شمو نے بہت ہی معصومیت سے کہا تو اس کی بات پہ میں اور آپا مسکرا کے رہ گئے۔

”کیا ہوا آجی؟“

”پگلی جب کوئی تھک جاتا ہے تو اس کے پاؤں اور ٹانگیں دبائی جاتی ہیں سر نہیں۔“ زری آپا نے اس کے پیار سے پکٹی دی۔

”تو میں پاؤں دبا دیتی ہوں۔“ وہ جھٹ سے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”ارے نہیں ایسی بھی تھکن نہیں بس تم چائے بنا کے لاؤ فرحان آتے ہی ہوں گے پھر جانا بھی ہے۔“ اس نے زری آپا کو چائے پلائی اور وہ گھر چلی گئیں میں وہیں صوفے پہ لیٹ گیا۔

”صاحب میں آپ کے پاؤں دبا دوں؟“ وہ اب میری طرف آئی۔

”نہیں میں ٹھیک ہوں تم اپنا کام کرو۔“ میں ریوٹ اٹھا کر نیوز چینل لگا کر دیکھنے لگا وہ ابھی اتھی ہی تھی کہ علی صاحب نے دھاوا بول دیا تھا۔

”شیم میڈم آج میرے کھانے کا انتظام بھی نہیں یہ کر دینا، میرا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ علی میرا اگوتا دوست اور ہمارا تھا وہ اکثر میرے گھر آتا رہتا تھا اور شیم کو اکثر میڈم شیم آراء کہہ کر پکارتا تھا۔ شو بھی کافی اچھی تھی کیونکہ وہ میرے گھر میں ہی بل کر جوان ہوئی تھی اس لیے کبھی ہماری بات کا برا نہیں مانتی تھی۔

”جی صاحب کر دوں گی۔“

”اوسے ذلیل مکینے شادی کی تیاری بھی شروع کر دی اور ہمیں خبر ہی نہیں۔“

”واہ جی واہ کیا دوست ہے وہ میرے قریب آ کے بیٹھ گیا۔“

ارے ایسی بات نہیں ہے ابھی تو سارے کام بڑے ہیں جو تیرے سے پوچھ کے کرنے ہیں۔ تو تو اپنا جگری یار ہے نا۔“ میں نے اس کے کندھوں پہ تھکی دی۔

”اوائے میاں مٹھو میں تجھے جانتا ہوں اچھی طرح تو بڑا مکینہ ہے۔ وہ جلے دل کے چھپو لے پھوڑ رہا تھا۔

”نہیں آج تو پی کر تو نہیں آیا کیا۔“ میں نے اسے گھورا۔

”پی کہ آتا تو کسی لڑکی کے پاس ہوتا، تیرے جیسے نمازی پرہیزی بندے کے پاس نہ آتا۔“ اس کی بات پہ میں نے زور سے قہقہہ لگایا اور اب وہ مجھے گھور رہا تھا۔ لگتا ہے آج کسی نے لفٹ نہیں کروائی ہے چارے کو۔ میں نے اس کی دھکتی ہوئی رگ پہ ہاتھ رکھا۔ اس کا

کام تھا ہی لڑکیوں کی زلفوں سے کھینا اور میں ہمیشہ اسے روکنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

”تم جانتے ہو فخر چوہدری کہ علی انصاری لفٹ لیتا نہیں دیتا ہے۔“ وہ بڑے فخر یہ انداز میں یہ بات کہہ رہا تھا۔ اس لیے تو کہتا ہوں کہ لینا بھی چھوڑ دے اور دینا بھی۔ حرام انسان کو برباد کر دیتا ہے۔ سیدھے راستے پہ آ جاؤ میں نے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی اور اس کے لیے ایک شعر پڑھا۔

پسند اللہ کو کیا آجائے اے بندے مجھ کو شرم گناہ کی تجھ کو تکبر ہے عبادت کا اس شعر نے میرے وجود پر ایک ہم سا گرا دیا۔

”یہ کیا بولتے رہتے ہو اللہ معاف کرے میں کب تکبر کر رہا ہوں یار۔“

فخر بات سیدھی ہے دوسروں کو سمجھانا بہت آسان ہوتا ہے جبکہ خود سمجھنا بہت مشکل۔ بے شک تم نمازی ہو، پرہیز گار ہو اللہ کو چاہئے اور اللہ کا حکم ماننے والے ہو لیکن ان سب باتوں کا مزاق تو تب آئے گا جب تم یہ اللہ نے آزمائش کا وقت ڈال دیا۔ پھر دیکھیں گے تمہاری عبادتوں کا اثر ویسے یار عبادت میں صداقت نہ ہو تو اللہ عبادتیں واپس پھیر دیتا ہے۔“ علی عجیب لا پرواہی سے مجھے بلارہا تھا میرے اندر کا انسان مزید کمزور ہونے لگا یار میں تو ہمیشہ تمہیں سیدھی راہ.....

”دیکھو فخر تم اچھے ہو ہمیشہ اچھے ہی رہو، لیکن اپنی اچھائی اور عبادتوں سے ہمیں شرمندہ تو مت کیا کرو سیدھی راہ صرف مصلیٰ بچھا لینے سے نہیں ملتی اس کے لیے نیت اور دل کو بھی صاف رکھنا چاہیے۔“ اس نے مجھے سنجیدگی سے ٹوکا۔

☆.....☆.....☆

اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنی زندگی بھی اپنی نہیں رہتی لوگوں کی ہو جاتی ہے اور یہ صرف ہماری غلطی اور گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مجھ سے بھی ایک گناہ ہوا تھا میں اندھا ہو گیا تھا مجھے سب بھول گیا تھا مجھ پہ شیطان حاوی ہو گیا تھا اور اس شیطان نے اس سوئے

روشن مستقبل آپ کی دہلیز پر



خواب تاروں کی مانند ہیں تان پر کئے گئے ڈالی جاے.....

آپ پر کشش شخصیت کی مالک ہیں اور گیرے سے نظریں ملا
کر ماڈلنگ کی دنیا میں تہلکہ مچا دیئے گا عزم رکھتی ہیں تو....

ماہنامہ



کاسرورق ان ادھرے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے کر منزل
تک پہنچنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

سوٹ نمبر 1، فلور نمبر 4 بلاک نمبر 12، میاں جمیل ریل روڈ لاہور

پوسٹ بکس نمبر 716، جی پی او لاہور

فون: (042) 6280008

فیکس نمبر: 042-6370732

Email: Raysham_Editor@yahoo.com

ڈائجسٹ پبلی کیشنز



بھڑکایا۔ اور میں جو کہ گناہ ثواب کا دامن چھوڑ بیٹھا تھا اس کے ہاتھوں سے کپڑے اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آ گیا اور پھر دو قدم کی جنت گنوا نے کے لیے قدم اٹھالیا ایسا قدم جو گناہ کبیرہ تھا اور میں وہ گناہ کر بیٹھا تھا۔ شعو کے تمام تر احتجاجات اور چیخ و پکار دم توڑ گئی وہ بے دمی ہو گئی تھی۔

اور پھر اگلی صبح میرے گناہ کی صبح تھی میرے گناہ کی زندگی شروع ہو چکی تھی۔ شیطان خوش ہو چکا تھا اور وہ زرد کتا لمبی تان کے سو چکا تھا۔ لیکن ضمیر کی آنکھ کھل چکی تھی اور اس کے جاگنے سے بہت کچھ جاگ چکا تھا۔ گناہ کا احساس، ندامت کا احساس، کچھ کھودینے کا احساس اور اپنے مقام سے گرنے کا احساس جس کے باعث میرے دل و دماغ میں کانٹے سے اک آئے تھے۔ میرا صاف ستھرا دامن گندگی سے بھر گیا تھا اور ساتھ ہی اس لڑکی کو بھی تباہ کر ڈالا تھا جو اپنی معصومیت اور لاپرواہی کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔

جب انسان شیطان کے برکادے میں آتا ہے تو وہ کبھی بھی اللہ کی آزمائش پہ پورا نہیں اتر سکتا اور جو اللہ کی آزمائش پہ پورا نہیں اترتا وہ سکھ کیسے پاسکتا ہے۔ وہ تو اپنے لیے جہنم کی آگ خریدتا ہے گناہوں کے عوض جہنم ہی مل سکتی ہے جنت تو نہیں نا۔ وہ فخر چوہدری جسے اپنے کردار پہ فخر ہوتا تھا شاید یہی فخر مجھے منہ کے بل گرا گیا تھا۔ میں ہر فخر سے خالی ہو گیا تھا بالکل خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے دفع ہو جاؤ یہاں سے کبھی میرے سامنے مت آنا اوکے۔“ میں حلق کے بل چیخا تھا۔ شعو اس وقت سہمی سہمی میرے لیے ناشتے کا پوچھنے آئی تھی۔ ایسے ہی اب غصہ میرے سر پہ سوار ہونے لگتا تھا۔ میں بات بہ بات جھگڑنے لگا۔ اس کیفیت کو زری آ پا، ایمان اور علی نے بھی نوٹ کیا۔ میں اپنا گناہ اپنا جرم کیسے بتاتا؟ کہاں سے اتنا حوصلہ لاتا کہ سب کے سامنے خود کو زمین بوس کر سکتا، اپنی غلطی اپنا گناہ دکھا سکتا کیسے کہتا کہ میں نے کسی کی عزت روندی ہے۔

ہوئے زرد کتے کو چکا دیا تھا جو مجھے اور میری ذات کو کھٹا گیا تھا۔ جس نے فخر چوہدری کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا اور میں آج تک پچھتا رہا ہوں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب زری آیا روزانہ میری شادی کی تیار یوں میں میرے گھر آتی تھیں اور شام کو چلی جاتی تھیں۔ گھر کے کام تو پہلے ہی ماسی زبیدہ اور شمیم نے سنبھال رکھے تھے۔

ایک دن ماسی واشنگ مشین لگا کر پڑے، بیڈ شیٹس، شش کو روکھو دھو کر پھیلائے جارہی تھیں جبکہ شعو خشک ہو جانے والے کپڑوں کو استری کرنے کا کام سر انجام دے رہی تھی۔ عصر کے وقت ماسی کے گاؤں سے کسی فونگنی کی اطلاع آ گئی سو وہ آنا فانا گاؤں چلی گئی اور شعو کو یہیں چھوڑ گئی اس کو ہمیشہ مجھ پر اعتبار رہا تھا۔ سب کاموں سے فارغ ہو کر شوکھانا بنانے لگی اور پھر فارغ ہو کر وہ دن بھر کے بھرے ہوئے کپڑے میٹھے لگی میں کھانا کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ کر لیٹ گیا پتہ نہیں کب میری آنکھ لگ گئی اور کب بارش اور طوفان نے بلہ بول دیا اچانک زور دار دھماکے پر میری آنکھ کھلی تھی۔ اتنا شدید طوفان ہے؟ میں نے کھڑکی کے قریب جا کے کھڑکی بند کرنا چاہی۔

صاحب یہ کپڑے۔“ میرے پیچھے شمیم کی چھوٹی ہوئی سانسوں کی آواز آئی میں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ ”کچھ کپڑے اوپر ہی رہ گئے تھے۔ سوچا طوفان سے کہیں اڑ نہ جائیں اس لیے جا کر لے آئی یہاں رکھ دوں سارے بچھکے ہوئے ہیں۔“ اس نے فرش پہ ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ کیونکہ باقی سب دروازے تو اس وقت بند تھے۔

”صاحب کپڑے رکھ دوں۔“ اس نے جملہ دھرایا جبکہ میری نظریں اس پہ جمی تھیں۔ اس کی بے خبری اور لاپرواہی کے باعث اس کے کئی پوشیدہ راز کھل رہے تھے اور میری خود فراموشی کے باعث میرے ضمیر کی ٹھونٹی سے بندھا ہوا زرد کتا کھل چکا تھا۔ میں ہر چیز بھول گیا تھا۔ شیطان نے میرے اندر کے زرد کتے کو خوب

کاش میں پاگل ہو جاؤں کاش میرا دماغ مفلون ہو جائے میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور چند سیکنڈ بعد میرا سیل بجنے لگا۔ نمبر دیکھا تو اسکرین پر ایمان علی کا نام جگمگا رہا تھا لب پہنچ کر میں نے سیل آف کر دیا تھا ایک انسان کی غلطی کی سزا اس کے اپنوں کو بھی بھگتنا پڑتی ہے اور ایسا ہی میرے اپنوں کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ میں بے چینی سے اٹھ کر آفس سے نکل آیا تھا۔ ایمان کی ممی اور پایا شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کا کہہ رہے تھے اور میں دوبار انہیں ٹال چکا تھا میں وجہ بتاتا تو کہیں کا نہ رہتا سبھی مجھ پر تھوک دیتے اور میں میں.....

ہر مقام پر اپنے رب سے مدد مانگتا ہے انسان، جیسے آج میں مانگ رہا تھا۔ جیسے میں ٹھہر رہا تھا جیسے میں سوچ رہا تھا اور میرا رب فیصلے کی ڈور میرے ضمیر کو تھما رہا تھا اور ضمیر نے یہ ڈور تب تھامی جب مامی زبیدہ میرے پاس آئی۔

”صاحب جی آپ نے شمو کے لیے کوئی لڑکا دیکھا ہے؟“ میں ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا سوچوں میں بھٹک رہا تھا۔ جب میری سوچوں کا تسلسل مامی زبیدہ کی آواز نے توڑا اور میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ اچانک میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

مجھے مامی زبیدہ کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت محسوس ہوئی ان آنکھوں میں جہاں ہمیشہ میرے لیے محبت ہوتی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی میرا گریبان پکڑ کر مجھے ماریں گی مجھ پر لعنت بھیجیں گی۔ مجھے بدعنائیں دیں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا یہ سب میرا وہم تھا۔ میں چور تھا ڈرو تو لگتا تھا۔

”صاحب جی آپ ٹھیک تو ہیں۔“ میری چوروں جیسی آنکھیں اور ماتھے پر آیا پسینہ دیکھ کر مامی کوتاہی ہوئی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ آپ کس لیے آئی ہیں، میں ان کا سوال بھول گیا۔

”صاحب جی شمو کے لیے لڑکا دیکھنے کا کہا تھا۔“

میں اب بہت جلد اس کا بیاہ کر دینا چاہتی ہوں۔ بے وقوف کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ چپ لگ گئی ہے اور بیٹھے بیٹھے رونے لگتی ہے۔ اب تو کام بھی نہیں کرتی مجھے ڈر ہے کہیں روگی نہ ہو جائے۔“ مامی بولتی چلی گئی اور میں نظریں جھکانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کچھ دن انتظار کرو مامی میں کوشش کروں گا۔ مامی کو تسلی دے کر میرے دماغ نے ایک فیصلہ کیا تھا اک ڈور تھامی تھی۔ بس دل کو سنبھالنا باقی تھا اور ویسے بھی جن لوگوں کے جسموں میں نفس کا زور چلتا ہو وہاں دل کو جینے کی راہ نہیں ملتی۔ سو میرے دل کو بھی جھلا کہاں جینا تھا؟

ضمیر کی موت اتنی آسانی سے ممکن نہیں ہوتی اور میرا یہ فیصلہ مزید پختہ تب ہوا جب میں نے بہت دنوں بعد شیم کو دیکھا تھا۔ وہ میرے گناہ کا آئینہ تھی۔ اس کا ویران حلیہ اور اجاڑ آنکھیں مجھے زمین میں گاڑ گئیں وہ اپنے آپ سے ابھی خفا لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ وحشت زدہ ہو کر واپس اپنے کوارٹر میں بھاگ گئی۔

شیم آج بہت زیادہ بیمار تھی۔ مامی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی واپسی پر مامی نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا بچاؤ کرنے کی بجائے مار کھاتی رہی۔ شاید وہ اپنے آپ کو سزا دے رہی تھی اپنی لاپرواہی اور معصومیت کی سزا۔ اس کا مجرم میں تھا اور اب جو بھی سہنا تھا مجھے سہنا تھا۔ اسی لیے مامی کا ہاتھ روک دیا۔

”مامی آپ کا مجرم میں ہوں یہ نہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں صاحب۔“ مامی زبیدہ کی آنکھیں پھٹ گئیں تھیں۔

”ہاں یہ بے گناہ سے غلطی مجھ سے ہوئی ہے آپ سزا مجھے دیتے ہیں آپ کی ہر سزا کے لیے تیار ہوں میری گردن جھکی ہوئی تھی۔“ میرے لیے آج کا دن روز حشر کا دن تھا۔

”کیسے صاحب جی؟“ شمو فرش پر بیٹھی رو رہی تھی

اور مامی بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے معاف کر دو مامی میں نے اپنی عزت کا پاس

رکھ رکھا نہ تمہاری عزت کا۔“ میں نے مامی کے سامنے

باتھ جوڑ دیئے تھے۔ گناہ کے بعد معافی مانگتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے لیکن ایسی بات نہیں کہ وہ اللہ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں نہ رہے۔

☆.....☆.....☆

”یہاں!“ ایمان مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ میرا ان کے گھر اب آنا جانا نہیں رہا تھا۔ جبکہ وہ لوگ کل شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کا کہہ رہے تھے۔ ساری تیاری مکمل تھی اور میں ان کے گھر چلا آیا تھا۔ ”تم ٹھیک تو ہونا؟“ میری ذات کا خالی پن شاید وہ بھی محسوس کر چکی تھی۔ کیوں نہ کرتی آخر اس نے اک لمبا عرصہ میرے ساتھ گزارا تھا۔

”ہوں“ میرا مختصر سا جواب سن کر وہ چونکی! ”کھڑے کیوں ہو۔“ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ایمان کے ڈرامہ شاید آج ہی بولتیک سے تیار ہو کر آئے تھے۔ ”فخر تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ ”وہ بے چین ہو گئی۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”کہو کیا بات ہے؟“ ”کیا تم ایک بدکردار شخص سے شادی کرنا چاہو گی؟“

”کیا مطلب یہ؟“ اس کا رنگ بدلا تھا۔ ”مطلب کہ اگر میں بدکردار ہوتا تو پھر بھی تم مجھ سے شادی کر لیتیں؟“ میرا لہجہ اور انداز بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ ایمان بے دم سی ہو کر صوفے پہ گر گئی۔ ”بولو ایمان مجھ سے شادی کرو گی؟“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ پھٹ پڑی۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں میں تمہیں اندھیرے میں رکھ کر زندگی نہیں گزار سکتا ایمان مجھ سے گناہ ہوا ہے میں نے اپنے گھر کی ملازمہ پہ ہاتھ ڈالا ہے۔“

میں نے وہ سب کہہ دیا جو مجھے دنیا کی نظروں میں گرانے کے لیے کافی تھا اور میں گر گیا تھا۔ ایمان نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ علی مجھے متسخرانہ نظروں سے دیکھتا

رہا اور زری آپا کئی دن میرے گھر ہی نہیں آئیں۔ ایمان سے شادی کا انکار سب کے لئے دھماکہ ثابت ہوا تھا لوگ طرح طرح کی باتیں اور سوال کر رہے تھے اور میں گردن جھکائے ہوئے تھا۔

ایمان سے شادی کا انکار، شمیم سے پھر شادی کرنا بے حد مشکل مراحل تھے جو مجھے طے کرنا تھے اور کر بھی لیے تھے کئی انگلیاں انھیں سزا تو بھگتنا تھی سو بھگتی۔ آخر گناہ کیا تھا نیلی تو نہیں کی کہ بدلے میں مجھے پھولوں کے بار پہنائے جاتے۔ لوگوں کی کاٹ دار نظروں کا سامنا کرنا تھا۔ پھر بھی وہی کیا جو اللہ کی رضا تھی۔ نکاح کے چھ ماہ بعد شمیم نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا اور میں رونے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

بلکہ اب تو میں تنہائی میں اکثر ہی اللہ کے حضور رو پڑتا تھا شاید اپنے گناہ کی ندامت کچھ مزید بڑھ جاتی تھی۔ میں شمیم کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن وہ گم سم سی رہتی تھی۔ میں اس کی نظروں میں کیا تھا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا جبکہ میں اس کی عزت اور قدر کرتا تھا۔ اسے اس محبت سے بھی بڑھ کر چاہا جو مجھے ایمان سے تھی کیونکہ ایمان میری رضا تھی اور شمیم میرے رب کی رضا تھی اسے میرے رب نے میری زندگی میں شامل کیا تھا۔ اسے اپنانے کا فیصلہ مسجد میں نماز پڑھتے اور دعا مانگتے ہوئے مجھ پہ وارد ہوا تھا اور میں اس فیصلے سے کیسے منکر ہو سکتا تھا۔

بس کبھی کبھی دل کی کیفیت اور ایمان کے کھوجانے کا احساس جاگتا تھا اور اس کے ساتھ ہی پچھتاوے نوچنے لگتے تھے۔ تب اللہ کو یاد کرتا تو سب کچھ بھول جاتا تھا۔

اللہ سے معافی مانگتے مانگتے اکثر رات گزر جاتی تھی۔ اگرچہ میری زندگی معمول پہ آگئی تھی اور میرے بیوی بچے بھی خوش تھے لیکن پھر بھی میں اندر سے خوش نہیں تھا۔ کیوں کہ ندامت کا احساس میرے دل میں آج بھی کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔

☆.....☆.....☆



کہانیاں زندگی کی
(مختصر کہانیاں)

ترتیب: زیم رفیق

مگرے کی آپ بیتی

صفیہ نعل شاہ

میں ایک بکرا ہوں، قربانی کا بکرا..... ارے نہیں نہیں..... میں کوئی ”بے چارہ شوہر“ نہیں ہوں۔ سچ سچ کا بکرا ہوں۔ یہ تو معلوم نہیں کہ میرے دادا کس ریاست کے نواب تھے یا اماں کس شہنشاہ یا رئیس کی راجداری تھیں۔ مگر بحرِ حال میں ایک خاندانی بکرا ہوں..... اعلیٰ نسل کا خاندانی بکرا۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ میں ایک بکرا ہوں۔ میری جائے پیدائش بھی کچھ کنفرم نہیں کیونکہ جنم پرچی اماں نے بنوائی ہی نہیں۔ اس لیے میری تاریخ پیدائش بھی معلوم نہیں۔ مگر بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ خربوزوں کا موسم تھا، ہاں اس دن گرمی بہت تھی۔ خیر چھوڑیں..... بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ میں اٹھیلیاں کرتا اماں کے پیچھے پیچھے چلا کرتا تھا۔ یعنی پورا ”لیا“ ہوا کرتا تھا۔ نہ فکر نہ فاق..... ہر وقت عیش کرتا تھا۔ اماں کے ساتھ ساتھ جس کھیت میں چاہتے، ٹھس جاتے اور مزے سے کھاتے جاتے۔ جب تک کھیت کے مالک کو خبر ہوتی، ہم کسی اور کھیت میں ٹرانسفر ہو چکے ہوتے..... پھر نجانے کیسے؟؟ ہم..... میں اور اماں ایک گوالے کے ہتھے چڑھ گئے۔

ہاں یاد آیا..... میں چھپر کے پاس سے گزرتے ہوئے اس میں نہاتی گائے، بھینسوں کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ پتہ ہی نہ چلا کہ کب کہاں سے ایک گوالہ نمودار ہوا اور مجھے لاوارث سمجھ کر اپنی بھینسوں کے ساتھ یاکنے لگا..... اماں جو مجھے ڈھونڈتی، پکارتی ہوئی آرہی تھی وہ بھی اریسٹ ہوگئی.....

اول اول تو ہم ماں بیٹا بہت گھبرائے..... پھر سمجھ آئی کہ بھینسوں کا یہ چھوٹا سا باڑہ اتنا بھی برا نہیں..... یعنی گزارہ ہو ہی جائے گا۔ غریب سا گوالہ اب بھینسوں کے ساتھ بکریوں کا دودھ بھی پیچنے لگا تھا۔ اس کی گھر والی گائے بھینسوں کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی خیال رکھنے

لگی اور ہاں..... اس کا چھوٹا بیٹا جیدہ تو میرا دوست بھی بن گیا تھا..... یونہی بنتے کھیتے گزرنے لگی زندگی..... جوانی بھی مجھ پر خوب چڑھی..... ماں تو بلائیں لیتی نہ تھکتی تھی میری..... یہ ٹکڑا سڈول اور مینڈسم جسم..... یہ موٹی موٹی آنکھیں..... بچ چوراہے میں کھڑا جب ادا سے دم بلاتا تو بستی کی کئی بکریاں آہیں بھرتی تھیں..... جیسی تو اماں کہتی تھی کہ میرا بیٹا تو پورا ”بہرو“ لگتا ہے..... مگر..... اماں کا یہ بہرو بھری جوانی میں اس سے بچھڑ گیا۔

آہ..... جناب ہوا یوں کہ میرے مالک سے ملے ایک پٹھان آیا..... شاید پشاور یا افغانستان کا تھا۔ ارہ نجانے کس کام سے آیا تھا مگر تھا پکا اٹھائی گیر..... راست ٹھہر کر اگلے صبح گجی تو بڑی شرافت سے چلا گیا..... مگر آدمی رات کو پلٹ آیا..... جی ہاں گھر کی دیوار کو دکر..... ال خانہ اندر کمروں میں محو خواب تھے۔ اس نے گائے ل کھونٹے سے کھولا..... شامت اعمال جو میں نے شہر چانا چاہا تو میرا کان مروڑ کر کھینچا۔ تب پتہ چلا کہ وہ آدمی تھے۔

بس جناب وہاں سے چڑھے ایک ٹرالے میں ادا لگی صبح ہمیں ایک کھلے میدان میں اتارا گیا۔

وہاں جو دیکھتا ہوں تو میری کانی برادری ٹاٹ تھی..... میں سمجھا کوئی شادی وادی کا فنکشن ہے..... ساری برادری آدھمکی ہے۔ جی بڑا شاد ہوا۔ شناسائی نہ تھی مگر پھر بھی گزرتے گزرتے کئی ایک کا حال احوال پوچھا..... بال بچوں اور روزی روٹی کے حالات اگلی دریافت کیے..... اور انہی خیر خواہوں کے ذریعہ انکشاف ہوا کہ یہ کوئی شادی کا فنکشن یا بکروں کا مقام حسن نہیں بلکہ بکروں کی منڈی لگی ہوئی ہے۔

مسکرا کر دریافت کیا ”تو بھائی اس میں کہا کیا ہے؟؟“ مخاطب نے اسی ادا سے مسکرا کر کہا ”قرہالی..... بس صاحب پھر جو تفصیلات معلوم ہو میں تو ہاں طبق روشن ہو گئے بلکہ یوں کہیے کہ کلیجہ ہی ہاں آ گیا.....

اب جو نظر اس اجتماع عام پر ڈالی تو سارا منظر ہی بدلا ہوا پایا..... یہاں بکرا برادری کے علاوہ گائے کی برادری بھی موجود پائی..... اور تو اور چاچا اونٹ بھی موجود تھے دنبہ خاندان اور کسی خیمے میں چھتروں کا میلہ لگا تھا۔

ادھر میرا اپنا خود ساختہ مالک..... میرے کان مروڑتا، رسی تھینچتا، اپنے ساتھی کے پاس لے گیا اور کھونٹے سے باندھ دیا..... جی تو چاہا کہ چیخ چیخ کر اس ظالم بلکہ چور کے مظالم کا اعلان کروں۔

”ہائے میری ماں، میری جدائی کیسے برداشت کرے گی..... میں تو اس کے بڑھاپے کا واحد سہارا تھا..... ظالم نے ماں سے اس کا جوان ”بہرو“ جدا کر دیا اور لے کہاں آیا..... اس خیال کے آتے ہی ساری منڈی پر دوبارہ بھیجی نظر ڈالی تو ہر کوئی مظلوم ہی لگا..... سب جانور منہ لٹکائے اداس اداس تھے۔ جو جانور بک جاتا اس کا منہ لٹک کر مرزید لہبا ہو جاتا تھا۔

میں ایک سرد آہ بھر کر خاموش بیٹھ گیا کہ اس نقارخانے میں ”بکرے“ کی آواز کون سنے گا۔ میرے اس احاطے میں پہلے سے چند بکرے اور گائے موجود تھیں شاید کوئی اونٹ وغیرہ مالک کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ ساری رات اسی غم کی نظر ہوئی گھر اگلی صبح کافی بدلی ہوئی تھی۔ سب ساتھی چارے سے شغل فرما رہے تھے اور میں ان کو ”دیکھ“ رہا تھا۔

آخر بک تک صبر کرتا..... یہ جو ظالم پیٹ لگا سے نا سب نخرے بھلا دیتا ہے..... پھر کیا تھا جناب میں بھی چارے پر ٹوٹ پڑا..... یوں حالات کافی حد تک نارمل ہوتے چلے گئے مگر..... مگر دل میں جو پھالس چسپی تھی وہ برقرار تھی۔

چند دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک بڑے نفیس اور شریف سے صاحب تشریف لائے اور میرے پاس آ کر رک گئے۔ میرا مالک دنیاں نکالتا آگے بڑھا کہ آسامی ٹیکڑی لگ رہی تھی۔ ان صاحب کے ساتھ آئے دو ملازموں میں سے ایک قدرے بوڑھا ملازم میرے

معائنے میں مشغول ہو گیا۔ دنبہ دوسرا فیدہ مالک باں زیب تن کیے ہاتھ باندھے مودب سا ”صاحب“ سے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

”ایک دم پرفیکٹ ہے صاحب جی“ میرا مالک میری شان میں بالکل ایسے ہی قصیدے پڑھنے لگا جیسے بنی کے لیے رشتے لے کر آنے والوں کے سامنے ماتیں پڑھتی ہیں۔ معائنے اور ایکس رے کرنے کے بعد بوڑھے ملازم نے مجھے پاس کر دیا..... وہ تو کرنا ہی تھا۔ آخر مجھ میں کوئی نقص کہاں تھا۔

آہ! میری ماں تو..... آج ماں، میری اس طرح بولی لگتے دیکھتی تو کیسا کلیجہ منہ کو آتا۔ اچھا ہی ہوا وہ یہاں نہیں تھی..... میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ میرا سودا بھی ہو گیا۔

نجانے کیا معاملہ طے ہوا مگر اتنا تو مجھے یقین تھا کہ مالک نے خوب قیمت وصول کی ہوگی۔

معلوم نہیں خدا نے اسے پوچھنا یا نہیں، مگر یہاں مجھے ”پوچھنے“ کے لیے کافی لوگ تھے..... جو بنی میں اس خوبصورت کوکھی کے پچھلے احاطے میں پہنچا..... تمام گھر والے مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے مصر سے فرعون کی کوئی ”ممی“ پکڑ لائی گئی ہو..... دادا، دادا سب میرے بارے میں لانے والے سے سوال جواب میں مصروف تھے۔ دو بڑے ہی پیارے بچے، میرے پاس کھڑے تھے۔ لڑکا چارہ پڑے مجھے بڑے پیار سے کھلا رہا تھا اور لڑکی مجھ سے ذرا دور تھی۔ دونوں کے چہروں پر خوشی دیدنی تھی۔

تو جناب پھر کیا تھا تمام اہل خانہ جوش و خروش سے عید کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ عید کا سامان لایا جا رہا تھا..... دھڑا دھڑ شاپنگ ہو رہی تھیں..... گھر کی صفائیاں زوروں پہ تھیں یعنی..... سب اپنے کاموں میں مگن تھے اور..... میرے غم، میرے دکھ کا کسی کو احساس نہیں۔ یہاں تک کہ دو پیارے سے بچے بھی اب مجھے باہر گھما رہے نہیں لے جاتے تھے۔ میں اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ کہیں سے دادی اماں کی آواز آئی۔

لی آربی بھتی رہے گی

دوست محمد خان دلو

”بیٹا! اپنی مصروفیت میں قربانی کے جانور کو مت بھول جانا۔“ انہوں نے تیزی سے باہر جاتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے کو کہا تھا۔ وہی موصوف جو مجھے بکر منڈی سے لائے تھے۔ اتنے عرصے میں، میں سب گھر والوں کو پہچاننے اور جاننے لگا تھا۔ اس آواز پر جی بڑا شاد ہوا کہ چلو، کسی کو تو میری فکر ہے۔

داوی اماں کی بات سن کر وہ مسکراتے ہوئے میرے پاس آئے اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ میں بھی تابعداری سے سر جھکائے گھڑا ہا..... پھر یکدم انہوں نے اپنا موبائل نکالا اور نمبر ملانے لگے..... اور فون پر باتیں ہونے لگیں..... باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے..... وہ صاحب کسی نامی گرامی ”قصائی“ سے معاملہ طے کر رہے تھے..... آخر میں Done کہہ کر چلتے بنے اور میں کھڑا شور مچاتا رہ گیا۔

میرے دن رات شور مچانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے تو ہر طرح کا احتجاج کر ڈالا..... دھرنا، بھوک ہڑتال مگر سب بے اثر.....

اور جناب! آج میری آخری رات ہے..... اندر سب گھر والے اگلے دن کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ مہمان بھی آ جا رہے ہیں اور..... باہر میں تنہا، بیٹھا تصور میں اپنے سامنے موت کو قرض کرتے دیکھ رہا ہوں..... اور اسی اداسی میں قوم کے نام اپنی یہ داستان لکھ رہا ہوں۔ امید تو یہی ہے کہ کل میری زندگی کا آخری دن ہوگا بلکہ گھر کی نئی نویلی ”بہو“ نے تو منمن کی کئی ڈشز بنانے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

میں ماضی اور حال کا احوال یہاں تک لکھ چکا ہوں..... مستقبل کے اندازے بھی لگا لیے۔ ہاں مگر اس بات کا اطمینان ہے کہ میں خدا کی ادنیٰ مخلوق ہوں..... لیکن ”خدا کی راہ“ میں جان قربان کرنے کی سنت ابراہیمی کو زندہ کرنے کا ذریعہ بنا ہوں..... خدا کی خوشنودی کا وسیلہ بنا ہوں اور میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔

☆.....☆.....☆

رات انتہائی تاریک اور خاموش تھی۔ فضا میں پھیلی ہوئی تاریکی نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا راتیں بہت زیادہ تاریک ہوں تو خوف ناک منظر دکھائی دیا کرتے ہیں۔

لیکن یہ رات خوفناک ہونے کے باوجود زیادہ بھیانک معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ مادر وطن کے سپوت ہر طرف چوکس کھڑے تھے۔

پنجاب، رجسٹ کے جانباز نائیک نور زمان نے اپنی نظریں دشمن کے جھمکنوں پر لگائی ہوئی تھیں کیونکہ دشمن نیامی گاؤں میں داخل ہو چکا تھا اور گاؤں کے لوگ لی آربی نہر کی دوسری جانب آ چکے تھے۔ دشمن کے سپاہی نئے مورچے بنا کر مورچہ بند ہو رہے تھے۔ ابھی تک بھارتی سوراوٹوں کا سامنا پاکستانی جیالوں سے نہیں ہوا تھا۔ لی آربی نہر کے دفاع کے لئے پاک فوج کی صرف دو کمپنیاں موجود تھیں اور نائیک نور زمان لی آربی نہر کے کنارے بلند جگہ پر کھڑے ہو کر دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا اور اس کے ماتحت سپاہی مورچوں میں ہر لمحہ تیار نائیک نور زمان کے حکم کے منتظر تھے۔

6 ستمبر 1965ء جبکہ سرحدی گاؤں کے لوگ سوئے ہوئے تھے دشمن کی توپوں نے ان پر گولہ باری شروع کر دی تھی بھارتی لڑاکا طیاروں نے سرحد کے قریب کئی ایک گاؤں پر بمباری کی دشمن کے لڑاکا جہازوں نے دھونگل لگھڑ منڈی، وزیر آباد اور راہوالی کے ریلوے اسٹیشنوں پر کھڑی مسافر گاڑیوں پر بم برسائے دشمن کی اس بزدلانہ حرکت سے کئی مسافر زخمی اور شہید ہو گئے۔ ان شہیدوں میں وطن کی ایک بیٹی عابدہ طوسی بھی تھی۔

محمد بن قاسم کو بھی ایک مظلوم لڑکی نے مدد کے لیے پکارا تھا اور اس وقت کا حکمران حجاج بن یوسف رومال پر

خون سے لکھی ہوئی چند سطریں پڑھ کر ہلبلا اٹھا تھا۔

مسلمان قوم کی مظلوم بیٹی نے جب اپنی قوم کو پکارا تو اس کی قوم نے اسے مایوس نہیں کیا تھا بلکہ مسلمانوں کے گھوڑوں کی ناپوں سے روئے زمین کے تمام دشمن لرز اٹھے تھے۔ محمد بن قاسم آندھی کی طرح اٹھا اور طوفان بن کر چھا گیا تھا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی عابدہ طوسی کی پکار پر اچانک پاک فضائیہ کے شاہباز فضا میں نمودار ہوئے اور انہوں نے دشمن کے لڑاکا جہازوں کو فضا میں ہی جہنم رسید کر دیا۔ لاہور کے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور ان کا رخ باؤندری لائن کی طرف تھا لاہور میں عجیب کیفیت تھی لوگوں کے چہرے شہادت کی آرزو میں الال سرخ ہو رہے تھے۔ اس دن ساڑھے بارہ بجے صدر پاکستان فیملڈ مارشل محمد ایوب خان نے اپنے خطاب میں قوم سے فرمایا تھا۔

”عزیز ہم وطنو السلام وعلیکم! دس کروڑ پاکستانی عوام کی آزمائش کا وقت آ گیا ہے کیونکہ بھارتی حکمرانوں نے اپنی روایتی بزدلی اور چالاکئی سے کام لیتے ہوئے ہماری مقدس سرحدوں کو پامال کرتے ہوئے ہم پر جنگ مسلط کر دی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دشمن کو دندان شکن جواب دیا جائے۔ حالات نے دشمن کے مقابلے کے لیے لاہور کے غیور عوام کا سب سے پہلے انتخاب کیا ہے۔ پاکستان کے عوام جن کے دلوں میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے مقدس کلمات بے ہوئے ہیں۔ وہ اس وقت تک جین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک بھارتی توپوں کو خاموش نہ کر دیں۔

بزدل بھارتی حکمران یہ نہیں جانتے کہ انہوں نے کس بہادر قوم کو لالکا رہا ہے۔

عزیز ہم وطنو! دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ شکست دشمن کا مقدر ہے۔ مردانہ وار آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔

صدر پاکستان کی اس پر عزم تقریر نے پوری قوم کو

سیسہ پلائی دیوار بنا دیا تھا تو دوسری طرف پاکستان لی بہادر فوج کے سپاہیوں میں بھی ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

نائیک نور زمان کے دل پر بھی صدر پاکستان کی تقریر نے بہت زیادہ اثر کیا تھا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ لی آربی نہر کا دفاع کر رہا تھا۔ دفاعی انتظامات مکمل ہو چکے اور وہ خود کار ہتھیاروں کے ساتھ اپنے جوانوں کے ہمراہ تھا۔

رات کے میب سنائے میں بھارت کی ایک پیادہ کمپنی نے ٹینکوں اور توپوں کی مدد سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ٹینکوں کے ہولناک شور نے نائیک نور زمان کو اور زیادہ مستعد کر دیا تھا۔ دشمن کے پیادہ دستوں کی اطلاع نور زمان نے اپنے کمپنی کمانڈر کو دی اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ دشمن کے سپاہی ایڈوانس کرنے لگے تو نائیک نور زمان مورچہ زن ہو کر ان پر دتی بینڈ گرنیز اور فائرنگ کرنے لگ گیا۔ دشمن اس اچانک فائر پر رگ گیا اس کی پیش قدمی کی رفتار سست پڑ گئی۔ لیکن پھر چند گھنٹوں بعد اس نے اپنی صف بندی کر کے دوبارہ پیش قدمی شروع کر دی۔

نائیک نور زمان نے اپنی کمپنی سے رابطہ کرنا چاہا۔ مگر رابطہ ٹوٹ چکا تھا دشمن کی فائرنگ سے رابطے کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ نور زمان نے بہت نہ ہاری بلکہ دشمن پر جوابی فائرنگ کرتا رہا حالانکہ یہ بہت سنگین حالات تھے۔ مگر ہر مشکل سے نبرد آزما ہونا پاکستان کے سپاہی کی شان ہے۔

نور زمان چونکہ وطن کا سپاہی تھا اور سپاہی کا کام آزمائشوں سے گزرنا ہے۔ اس نے ایک اچھی سی نگاہ سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو کہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز دشمن پر کاری ضرب لگانے میں مصروف تھے۔ اپنے جانثاروں کے حوصلے بلند دیکھ کر اس کا مزید حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے دوبارہ ایٹ مشین گن میں ایڈجسٹیشن ڈالا اور تاک تاک کر دشمن کے سپاہیوں پر فائر کرنے لگا۔ اس کے دل و دماغ میں صرف ایک ہی

اپنا زخمی بازو اوپر اٹھا کر ساتھیوں سے کہا..... ساتھیو جاؤ میرا زخمی چہرہ اس وقت تمہارا مسکرا کر استقبال کرے گا جب تم دشمن کو پسپا کر کے میرے پاس پہنچو گے۔
خدا حافظ بی آر بی کو بسترے رہنا چاہیے یہ الفاظ رک رک کر اس نے کہے اور وہ قوم کی آن بی آر بی کی شان پر قربان ہو گیا۔

نور زمان لاہور کی دلیلیز پر قربان ہونے والا پہلا شہید تھا نور زمان کی شہادت کے دوسرے روز اس کی بیالین نے دشمن کے پرچے اڑاتے ہوئے دشمن کو بی آر بی نہر سے بہت پیچھے کی طرف دھکیل دیا تھا.....

☆.....☆.....☆

نصیبوں جلی

نثار احمد حسرت

شہناز خالہ کا شمار میرے شہر کے ایک معزز خاندان کی ہر دلعزیز بہنیتوں میں ہوتا تھا۔ ان کے شوہر مجید احمد کا اپنا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ مجید احمد ایک اچھے شوہر اور ایک شفیق باپ بھی تھے۔ جو اپنی تمام تر ذمہ داریوں سے بخوبی واقف تھے۔ شہناز خالہ کا اخلاق بہت ہی اچھا تھا۔ کوئی بھی مہمان ان کے گھر آ جاتا وہ اس کی خاطر مدارت کیے بغیر نہیں جانے دیتی تھیں۔ جب ان کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا اس وقت ان کا بیٹا فاروق احمد فرسٹ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا۔ دونوں بیٹیاں نوشین اور فرحین جن کی عمر بمشکل دس اور بارہ سال تھی سکول میں پڑھتی تھیں۔

اتوار کا دن تھا۔ سکول سے چھٹی ہونے کی وجہ سے دونوں بیٹیاں گھر پر تھیں۔ اچانک شہناز خالہ کی کچھ رشتہ دار خواتین آ گئیں۔ خالہ دوپہر کے کھانے کے لیے بریانی بنا رہی تھیں۔ انہوں نے فرحین کو پیسے دے کر قریب ہی دوکان سے دبی لینے کے لیے بھیج دیا اور خواہ مہمان خواتین سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔

”امی فرحین کو گئے ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ ۱۱

مقصد تھا کہ کسی طرح رات بھر دشمن کو الجھائے رکھے اور اس کا یہی جذبہ اسے موت کے انگاریوں پر بھی زندہ رکھے ہوا تھا۔ حالانکہ وہ اور اس کے ساتھی موت کے منہ میں تھے پاکستان کے دفاع کے پہلے مورچوں کا وجود خطرے میں تھا۔ گھڑیاں نازک جتنی جاری تھیں اور دشمن بھرے ہوئے دریا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نائیک نور زمان نے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر آخری فیصلہ کر لیا تھا.....

اس کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ اگر پہلا مورچہ تباہ ہو گیا تو بی آر بی نہر کا دفاع مشکل میں پڑ جائے گا اور کینہ پرور دشمن بی آر بی کو عبور کر کے لاہور کے دروازہ تک پہنچ جائے گا۔

نور زمان جو ابھی تک مورچہ زن ہو کر دشمن پر فائرنگ کر رہا تھا۔ اس نے دشمن کے ٹینکوں اور پیدل دستوں کو دوبارہ آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنے مورچہ سے باہر نکل کر کافی دور جا کر دشمن کی طرف کئی ایک گرنیڈ پھینکے حالانکہ یہ بہت مشکل کام تھا۔ لیکن وطن کی سالمیت اور آبرو اسے اپنی جان سے بڑھ کر پیاری تھی دشمن نور زمان کی اس جنگی چال سے ہلکا گیا اس کی ترتیب نوٹ گئی نور زمان نے موقع مناسب سمجھا اور دشمن کی طرف رینگ کر ایڈوانس کرنے لگا ابھی اس نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ دشمن کے ایک ٹینک نے ایک برسٹ مار نور زمان کی دائیں سائیڈ زخمی ہو گئی اور اس کا سارا بدن لہو میں بھیک گیا نور زمان زخموں کی پروا کیے بغیر دیوانہ وار دشمن کی سمت بڑھنے لگا۔ مگر سپاہی کرم الہی نے اسے مورچے کی طرف کھینچ لیا نور زمان زخموں سے چور تھا مگر اس کا حوصلہ بلند تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا مجھے جانے دو، دشمن کا زور بڑھ رہا ہے۔

ابھی میں نے اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ اور سانس اکھڑ رہی تھی الفا کمپنی کے کچھ جوان پہنچ گئے.....

اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر پوری قوت سے اس نے

خزل

برسوں کسی کے ناز اٹھاتے رہے ہیں ہم
نس نس کے ہر فریب بھی کھاتے رہے ہیں ہم

غیروں کا ذکر کیا تجھے اے جان انجمن
اپنی نگاہ سے بھی بچاتے رہے ہیں ہم

مٹ جائے کسی طور شب غم کی تیرگی
یہ سوچ کر ہی دل کو جلاتے رہے ہیں ہم

اپنوں سے زخم جو بھی ملا دل میں رکھ لیا
زخموں کا ایک جہان بساتے رہے ہیں ہم

تاریکی حیات مٹانے کے واسطے!
اپنے ہی گھر کو آگ لگاتے رہے ہیں ہم

تہائیوں کی قید میں آنکھوں کی راہ سے
اپنے جگر کا خون بہاتے رہے ہیں ہم

کانٹے قدم قدم پہ بچھاتے رہے ہیں دوست
راہوں میں ان کی پھول بچھاتے رہے ہیں ہم

نظروں سے اپنی ہم کو گراتے رہے ہیں وہ
جن جن کو اپنے دل میں بساتے رہے ہیں ہم

﴿افضال عاجز، لاہور﴾

گیا ہے مگر وہ ابھی تک نہیں لوٹی ہے آپ اسے جا کر
دیکھیں۔“ نوشین نے امی کو اطلاع دی تو انہیں وقت کا
احساس ہوا۔

”ارے شہناز تم بھی کن تکلفات میں پڑ گئیں۔ یہ
کھانے کے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔“ رشتہ
دار خاتون بولی!

”صفیہ آپا! میں ذرا فرحین کو دیکھ کر آتی ہوں۔
آپ لوگ بیٹھیں کھانا تیار ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جلدی
جلدی دکان پر پہنچیں۔ مگر دکان بند دیکھ کر سوچنے لگیں
کہ دکان بند ہونے کی وجہ سے شاید فرحین کسی اگلی دکان
پر چلی گئی ہو! وہ تھوڑا آگے بڑھی تھیں کہ انہیں فاروق
کالج سے آتا دکھائی دیا۔

”امی اتنی دیر پہر کو آپ کیا چیز لینے نکلی ہیں۔ لائینس
میسے مجھے دیں کیا لانا ہے۔“

”بیٹا میں نے فرحین کو دہی لینے کے لیے بھیجا تھا
مگر دکان کو بند سے شاید وہ آگے کسی دکان پر چلی گئی ہو!
کافی دیر ہو گئی ہے۔“

”امی میں نے کتنی بار آپ کو منع کیا ہے کہ بہنوں
کو دکانوں پر مت بھیجا کرو۔ اس وقت آپ کو اسے
دکان پر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوپہر کے وقت تو
وہیں بھی گلیاں وغیرہ سنانا ہوتی ہیں۔ آپ گھر
جائیں میں فرحین کو دیکھ کر آتا ہوں۔“ فاروق غصے میں
بولتا ہوا چلا گیا اور شہناز بیگم بے ترتیب سانسوں اور
لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ان کے دل میں طرح طرح کے سو سے آ رہے
تھے۔ تھوڑی دیر بعد فاروق ناکام لوٹ آیا تو شہناز بیگم
کی پریشانی عروج پر پہنچ گئی۔

انہوں نے پڑوس اور فرحین کی سہیلیوں کے گھر
فرحین کو ڈھونڈنا شروع کر دیا مگر اس کا کہیں نام و نشان
نک نہ ملا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ شہناز بیگم زار و قطار رو
ری تھیں۔ پڑوس والے اور رشتہ دار خواتین انہیں تسلیاں
اے رہی تھیں۔ لیکن انہیں کسی پل بھی چین نہیں آ رہا
تھا۔ انہیں دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں فرحین کے ساتھ کوئی

اس کی حالت بہت نازک تھی۔“ مجید صاحب اسے لے کر فوراً ہسپتال روانہ ہو گئے۔

فاروق احمد یہ منظر دیکھ کر ہوش حواس سے بے گانہ ہو گیا۔ وہ سجاد کے گھر پہنچ گیا۔ سجاد کا بیٹا گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ فاروق اس وقت غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اپنی معصوم بہن کی حالت دیکھ کر اس کے دل میں جو طوفان اٹھا تھا۔ اس کا زور اس وقت ٹوٹا۔ جب اس نے سجاد کے بیٹے کو چھری کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یوں اس کے گھر پر ایک بار قیامت ٹوٹ پڑی۔

فرحین ایک ظالم درندے کی درندگی کی بھیبت چڑھ گئی۔ جب کہ ان کا نوجوان اکلوتا بیٹا جس کے مستقبل کے خواب وہ جاگتی آنکھوں سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ قتل کے کیس میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔ اس واقعے کی بازگشت پورے علاقے میں پھیل گئی تھی۔ اور سب کی زبان پر اس کا چرچا تھا۔

فرحین ہسپتال سے گھر آگئی تھی مگر کوئی اسے دیکھ کر سرگوشیاں کرتا تھا۔ اسے ذلت آمیز نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ مجید صاحب نے اس ذلت اور رسوائی سے بچنے کے لیے ہمیشہ کے لیے اپنے شہر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور وہ کراچی سے لاہور شفٹ ہو گئے۔ اس دوران وہ فاروق سے ملنے اکثر جیل آتے رہے۔ اس کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

فاروق احمد کو سزائے موت تو نہیں ہوئی تھی۔ مگر عمر قید کی سزا ہو گئی تھی۔ یوں اس کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ وقت کا پیچھے پر لگا کر اڑتا رہا، نوشین اور فرحین جوان ہو گئیں۔ نوشین کی شادی کے بعد شہناز بیگم کو فرحین کی شادی کی فکر ہوئی۔ نوشین کو اس کی خالہ نے اپنی بہو بنا لیا تھا۔ مگر فرحین کے لیے خاندان سے کوئی بھی رشتہ نہیں آ رہا تھا۔

شہناز بیگم نے اس کے رشتے کے لیے کئی عورتوں سے بات کی، آخر ایک خاندان میں اس کے رشتے کی

براواقعہ پیش نہ آ گیا ہو۔

مجید احمد صاحب کو اطلاع ملی تو وہ بھی اپنے سارے کام چھوڑ کر فوراً گھر پہنچ گئے۔

فاروق اور اس کے دوستوں نے فرحین کو ہر جگہ تلاش کیا محلے کا کونہ کونہ جہان مارا، محلے کی مسجد میں اعلان بھی کرایا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

”مجھے تو لگتا ہے تمہاری بیٹی کو خدا نخواستہ اغواء کیا گیا ہے، آج کل اس قسم کے بہت واقعات ہو رہے ہیں۔“

ان کی ہمسائی جلیلہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس بات پر شہناز بیگم دہل سی گئیں۔

”بھائی آپ نے فرحین کو کیا کہہ کر بھیجا تھا۔“ ان کے پڑوسی آصف نے پوچھا۔

”آصف بھائی میں نے فرحین سے یہی کہا تھا کہ کلڑ والی دکان سے دبی لے آؤ۔ مگر آج دکان بند ہے۔ اس لیے شاید پھر وہ آگے کسی دکان پر چلی گئی ہو!“ شہناز بیگم شکل ضبط کرتے ہوئے بولیں۔

”آصف بھائی..... آج سجاد بھائی کی دکان کیوں بند ہے حالانکہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ خود دکان پر نہ بھی ہوں تو ان کا بیٹا موجود ہوتا ہے۔ چلیں آس، پاس والی دکانوں سے پتا کرتے ہیں۔“

آصف صاحب مجید احمد کو ساتھ لے کر دودھ والی دکان پر پہنچے! انہوں نے ساتھ والی دکان سے پوچھا تو ایک دکاندار نے بتایا کہ سجاد کی دکان آج ان کے بیٹے نے کھولی تھی۔ مگر وہ دوپہر کو اچانک دکان بند کر کے چلا گیا ہے۔

آصف نے سجاد کی رہائش کا پتا دکاندار سے لیا اور ان کے گھر پہنچ کر زبردستی ان سے دکان کھولنے کا اصرار کیا۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ آصف اور مجید احمد بھی دکان کھلوا کر اندر داخل ہوئے تو وہاں کا منظر دیکھ کر مجید صاحب کی دردناک آواز گونجی.....

”فرحین یہاں ہے.....“ فرحین کو سجاد کے بیٹے نے ہوس کا نشانہ بنا ڈالا تھا۔ وہ ابھی تک زندہ تو تھی مگر

بات طے گئی۔

”شہناز تم نے ان لوگوں کو فرحین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں تو بتا دیا ہے ناں۔“
مجید احمد نے اپنی بیگم سے پوچھا۔

”آپ کا ذہن تو ٹھیک کام کر رہا ہے ناں۔ اگر میں ان لوگوں کو یہ بات بتا دیتی تو بھلا وہ فرحین سے شادی کے لیے تیار ہوتے۔ آج کل تو اچھی بھلی پڑھی لکھی لڑکیاں رشتے کے انتظار میں بیٹھی بوزھی ہو رہی ہیں۔ بھلا حقیقت جاننے کے بعد کون فرحین کو اپنے گھر بیاہ کر لے جانے کے لیے تیار ہوگا۔“ شہناز خالہ نے تنک آ کر کہا۔

”کچھ بھی ہے اگر کل ان لوگوں کو پتا چل گیا تو پھر اچھا نہیں ہوگا۔ یہ بات تو ایک دن کھانا ہی ہے۔ اس واقعے کی وجہ سے کیا تباہی نہیں ہوئی۔ فاروق نیل کی سلاخوں کے پیچھے ہے اور انہیں شہر چھوڑنا پڑا۔ یہ بات بھلا چھپی رہ سکتی ہیں۔“

”میں کہتی ہوں آپ خاموش رہنے میں عافیت سمجھیں۔ ایک ہفتے بعد فرحین کی منگنی ہے اور ایک ماہ بعد شادی بس آپ خدا سے دعا کریں کہ یہ وقت خیر سے گزر جائے۔“

فرحین کی منگنی ہو گئی تو شہناز بیگم نے سکھ کا سانس لیا۔ مگر تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ شادی سے تین دن پہلے مہندی کی تقریب میں لڑکے کی دور کی ایک رشتہ دار عورت جو کہ شہناز بیگم کے پرانے حملے سے متعلق رکھتی تھی۔ اس نے شہناز بیگم کو پہچان لیا۔ پھر کیا تھا اس نے فرحین کا سارا ماغی کھول کر لڑکے والوں کے سامنے رکھ دیا۔ لڑکے کی والدہ نے شہناز بیگم کو خوب جلی کٹی سنائیں اور رشتہ ختم ہو گیا۔

شہناز بیگم کے گھر کہہ ام سا بچ گیا۔ فرحین جو کہ مایوں کا بیٹا جوڑا اپنے بیٹھی تھی۔ شہناز بیگم اس کی قسمت کو کوٹنے لگی۔ وہ نصیبوں جلی چپ چاپ اپنی قسمت پہ آنسو بہاتی رہی۔ اب ماں نے بھی اچھے بیٹھے فرحین کو

ملنے دینے شروع کر دیے۔ کافر حسین تو باہل ہے، نسور تھی۔ یوں وہ معسوم سی قلی ہو پہلے ہی بہت اداس راتی تھی اب اور بھی زیادہ اداس رہنے لگی۔

وہ چھپ چھپ کر روتی راتی اور انشورس چا لرتی تھی کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں مجھ نہ نصیب کا کیا تصور ہے۔ ایک دن اس کی ماں نے غصے میں اسے بے طرح سنا ڈالیں۔

”محسوس تو زندہ کیوں ہے تیرا بھائی صرف تیری وجہ سے زندہ درگور ہو گیا ہے۔ مجھے تیری صورت سے بھی نفرت ہے۔ تو ہے ہی۔ نصیبوں جلی۔ میرے سامنے سے چلی جا خدا کے لیے میری جان چھوڑ دے۔“ شہناز بیگم غصے سے آگ بگولا ہو رہی تھیں۔

فرحین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے خود سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ روتی ہوئی کمرے میں چلی گئی اور دروازے کو اندر سے لاک کر لیا۔ اسے یوں کمرے میں بند ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تو شہناز بیگم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”فرحین، فرحین، اٹھ بھی جا کیا آج کھانا نہیں پکانا۔ اب اٹھ بھی جا کیوں رو رو کر درخواست پھیلائی ہوئی ہے۔“ وہ دروازے پر کھڑی چیختی رہیں۔ مگر جب دروازہ پینے پر بھی فرحین باہر نہ نکلی تو انہیں فکر لاحق ہوئی۔ اسی اثناء میں مجید صاحب نے اس کمرے کے دروازے کو توڑ ڈالا۔ اندر فرحین اوندے منہ بستر پر پڑی تھی۔ اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ جس سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اس نے زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ اپنی محرومیوں اور حسرتوں کو دل میں دبائے وہ یہ دنیا چھوڑ چکی تھی۔ شہناز بیگم جو پہلے بیٹی کی منگنی ٹوٹنے پر نفسیاتی مر ایضہ بن گئی تھیں۔ فرحین کی موت کے بعد بالکل ہی پاگل ہو گئیں۔ جب کہ مجید صاحب اس آس پر زندہ ہیں کہ ایک دن فاروق واپس لوٹ آئے گا اور ان کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔

☆.....☆.....☆

میرا پہلا آدم خور چیتا

مقبول جہانگیر / محمد طلحہ

ملنے ہی میں اسکول سے نکل کر ادھر ادھر گھومنے چلا جاتا۔ پنجاب کے شہر گجرات میں 1903ء میں میری پیدائش ہوئی اور پانچ سال کی عمر میں مجھے مشن اسکول گجرات میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی جماعت میں میرا جی نہ لگتا اور جو بھی مجھے کوئی بہانہ ملتا اسکول سے نکل کر ارد گرد کے تالابوں یا ندی نالوں پر پہنچ جاتا۔ ان دنوں مجھے مچھلی کے شکار سے خاصی دلچسپی تھی اور میں نے چھری کاٹنے وغیرہ کا خود ہی انتظام کر لیا تھا۔ مچھلیاں پکڑنے سے فرصت پاتا، تو اونچے دشوار درختوں پر چڑھنے کی مشق شروع کر دیتا۔ درختوں پر چڑھ کر پرندوں کو پکڑنا یا ان کے انڈے بچے چرا لینا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ سارا سارا دن ایسی ہی جگہوں پر بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا، لیکن شوق میں کمی نہ آئی۔ آہستہ آہستہ میں نے غلیلیں اور تیر کمان بھی بنا لئے۔ ان ہتھیاروں سے پرندوں کو شکار کرنا بہت آسان ہو گیا۔ غرض مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ شکار کا جنون میرے رگ و پے میں خون کی طرح گردش کرنے لگا۔

گیارہ برس کا ہوا تو میرے دائرے میں مزید وسعت پیدا ہو گئی اور میں نے ذرا اونچی اور خطرناک مہموں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ بعض لوگوں سے شیروں اور چیتوں کی ذراونی داستانیں بھی سنیں۔ ان داستانوں نے میرے شوق کو ہمیز لگائی اور طبیعت جنگل میں جانے اور درندوں سے دودو ہاتھ کرنے کے لئے مضطرب رہنے لگی، مگر افسوس کہ گجرات کے آس پاس اس زمانے میں شیر یہ تھے نہ چیتے۔ ہاں دریائے چناب میں مچھلیاں بکثرت تھیں اور کبھی کبھار کوئی بڑا سا مگر مجھ بھی سیلاب کے زمانے میں آ جاتا۔

دریائے چناب ہمارے مکان سے کوئی سات میل کے فاصلے پر تھا۔ سکول جانے کی بجائے میں دریا کا رخ

اگر آپ کو بڑے شکار سے دلچسپی ہے، لیکن آپ نے ابھی تک مرکزی ہندوستان، یعنی مدھیہ پردیش کے جنگل نہیں دیکھے تو یقین فرمائیے، کہ آپ ان تمام نعمتوں اور لطائف سے محروم ہیں جو ان خطرناک جنگلوں میں پچے پچے پر کسی بھی شکاری کو میسر آ سکتے ہیں۔ مجھے دیکھنے تیرہ برس کی عمر میں ان جنگلوں کا ایسا اسیر ہوا کہ تقسیم ملک کے بعد بھی پاکستان کی شہریت اختیار نہیں کر سکا، حالانکہ میرے تمام فریبی عزیز رشتے دار سب پاکستان میں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگل اگر ایک مرتبہ کسی کو اسیر کر لے، تو پھر وہ کہیں اور نہیں جاسکتا۔ میں اتنا بڑا شکاری تو نہیں ہوں جتنے بڑے شکاری آنجہانی جم کاربٹ یا کینتھ اینڈرسن جیسے لوگ تھے، تاہم یہ بات یقینی ہے کہ ان دونوں عظیم شکاریوں کی زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان کے انہی جنگلوں میں بسر ہوا اور یہاں آج بھی لوگ انہیں یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان انگریز شکاریوں نے بے شمار آدم خوروں سے معصوم اور نستے دیہاتیوں کو نجات دلائی تھی..... یوں کہنے کو میں نے بھی اپنی بھرپور شکاری زندگی میں کوئی ڈیڑھ سو چیتے ہلاک کئے ہیں۔ ان میں سے اکثر مردم خور تھے اور بعض تو ایسے بھی اٹکلے جو سینکڑوں انسانی جانوں کو اپنا لقمہ بنا چکے تھے اور کسی طرح قابو میں نہ آتے تھے۔

میرے شکاری بننے کی داستان بھی عجیب ہے۔ بچپن ہی سے اگرچہ مجھے ویرانوں اور غیر آباد جگہوں پر پھرنے کا شوق تھا، تاہم یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں ایک دن پیشہ ور شکاری بنوں گا۔ میرے گھرانے میں بھی سوائے بڑے بھائی امیر مرتضیٰ کے اور کسی کو شکار وغیرہ سے لگاؤ نہ تھا کہ خیال ہوتا شاید مجھ میں اپنے آباؤ اجداد یا خاندان کے دوسرے افراد کا کچھ اثر آیا ہو گا۔ یہ بھی درست ہے کہ پڑھنے لکھنے سے کچھ دلچسپی نہ تھی اور مون

بڑے بھائی کا مہربان منت نہیں رہا تھا۔ میرا ہیڈ کوارٹر قصبہ پدھر میں تھا اور آہستہ آہستہ میرے کاروبار کی شاخیں بیٹول مدھیہ پردیش کے تمام اضلاع میں پھیل گئیں۔ تاہم یہ کاروبار ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ میری اولین دلچسپی شکار ہی سے رہی جس کا نتیجہ بار بار یہ نکلا کہ میرے ملازموں نے جی بھر کر مجھے لوٹا اور کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ پھولی کوڑی میری جیب میں نہ رہی، یہاں تک کہ مجھے مزدوری کرنی پڑی۔ اسی دوران میں میری شادی ہو گئی تھی اور میں دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ چند سال کی محنت کے بعد میں نے دوبارہ اپنا کام بحال کیا تھا۔ 1939ء میں جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو افسروں نے ارزاہ کرم مجھے ریکورنگ افسر بنا دیا اور یوں میرا ہیڈ کوارٹر پدھر سے بیٹول میں منتقل ہو گیا۔ 1947ء تک کئی دور ایچھے اور برے بھجے پر گزرے اور آخر میں ایسا ہوا کہ مجھے ایک ایک کر کے اپنے دفتر کی تمام برائیاں بند کرنا پڑیں۔ پھر میں نے ناگ پورہ میں آل ون کو پرمیٹڈ میں بحیثیت ایجنٹ ملازمت کر لی۔ یہ فیرم بڑے بڑے آدمیوں کے لئے معقول معاوضے پر جنگلوں میں شکار کا انتظام بھی کرتی ہے۔ کچھ عرصے بعد میں نے ”مانیگر ٹریل“ کے نام سے اپنی ایک فرم قائم کر لی جو غیر ملکی شکاریوں کی نہ صرف رہنمائی کرتی ہے، بلکہ جنگل میں ان کے لئے بڑے شکار کا بندوبست بھی کرتی ہے۔

یہ میری مختصر داستان حیات..... آئیے اب مانیگر اور اقل پٹلیں اور..... جنگل کی طرف چلیں جہاں نت نئی اور نہایت ہولناک مہمیں ہماری منتظر ہیں۔ جنگل کی یہ وہ دنیا ہے جہاں باہر کا قانون نافذ نہیں ہے۔ یہاں انسان کا حکم چلتا ہے یا درندہ کا..... درمیان کی کوئی راہ نہیں ہے۔ سمجھی انسان کا بس چلتا ہے، تو وہ درندہ کو ناپود کر دیتا ہے اور سمجھی درندہ کا نصیب یاور ہوتا ہے، تو نہ صرف اپنی جان بچا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ شکاری کی تکا بونی بھی کر ڈالتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے درندوں اور دیہات کے معصوم لوگ جن کے پاس جدید ہتھیار نہیں ہوتے، انہی درندوں کے رحم و کرم پر

کرتا۔ خوب نہاتا اور مچھلیاں پکڑتا۔ پھر میں نے سانپ پکڑنے شروع کئے۔ اس مشغلے میں میرا بڑا جی لگا۔ شاید اس لئے کہ یہ جان جو کھوں کا کام تھا۔ چناب کے دونوں کناروں کا جنگل میں نے اچھی طرح چھان مارا۔ ان دنوں ایک ایک دن میں سولہ سولہ میل علاقے کے اندر آسانی سے گھوم لیا کرتا تھا۔ میری اس آوارہ خیالی اور آوارہ گردی سے گھر والے نالاں تھے۔ انہوں نے مجھے راہ راست پر لانے کی بہتری کوشش کی، مگر مجھ پر شکار کا نشہ روز بروز چڑھتا ہی گیا۔ اس زمانے میں بڑے بھائی امیر مرتضیٰ صاحب مدھیہ پردیش میں ٹھیکے داری کا کام کرتے تھے، چنانچہ ملے پایا کہ مجھے ان کے پاس روانہ کر دیا جائے اور وہ مجھے درست کریں۔ تیرہ برس کی عمر تھی کہ میں اپنے بڑے بھائی کی خدمت میں پہنچا جو ان دنوں ریاست بھوپال میں ایلی پان کے مقام پر ٹمپرے ہوئے تھے۔ بڑے بھائی نے مجھ سے سخت مشقت لی۔ ان کی نیت یہ تھی کہ میں اس قدر مشقت سے بہت جلد پناہ مانگ کر واپس گجرات جانے کی خواہش کا اظہار کروں گا اور اس وعدے پر مجھے بھیج دیا جائے گا کہ میں دوبارہ پڑھنے لکھنے میں دھیان دوں، لیکن الٹی ہو گئیں، سب تدبیریں، کچھ بھی نہ دوانے کا کام کیا۔ اندھا چل کے گھٹے اور خطرناک جنگل دیکھ کر طبیعت اور ہری ہو گئی۔ اور شکار کے جنون میں ناگفتہ بہ اضافہ ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں جنگلوں سے باہر نہیں نکل سکا، جب کہ دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو چکا، برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، لاکھوں مسلمان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ مگر میں اب بھی انہی جنگلوں میں ہوں اور بدستور ہندوستان کا شہری۔

میری عمر سولہ برس کی تھی کہ میں نے بارہ یورپی بندوق سے پہلا شکار کیا اور اسی عمر میں پہلا آدم خور چیتہ کو ٹھکانے لگایا جو نہ جانے کتنے انسانوں کو ہڑپ کر چکا تھا۔ انیس برس کا ہوا تو میرے والد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت تک میں فارسٹ کنٹرکٹر کی حیثیت سے اپنا بوجھ خود اپنے کندھوں پر اٹھا چکا تھا اور

عمریں گزر دیتے ہیں اور صحیح معنوں میں عذاب ان بے گناہوں پر اس وقت نازل ہوتا ہے، جب کوئی شیر یا چیتا کسی انارڑی شکاری کی حماقت سے مردم خور ہو جاتا ہے۔ مردم خور بننے کے بعد درندے کی چالاکی، مکاری، عیاری اور خونخواری اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ عام شکاری کے قابو میں نہیں آتا اور لگاتار وارداتیں کرتا چلا جاتا ہے۔

ایسی کہانیاں عام ہیں کہ شیر یا چیتے نے انسانی لہو اور گوشت کا ذائقہ چکھنے کے بعد بستیوں کی بستیاں ویران کر ڈالیں۔ سو سو دو دو انسانوں کو ہڑپ کر جانا معمولی بات ہے..... اور اگر ایسے درندے کو ختم نہ کیا جائے تو وہ اتنا دلیر ہو جاتا ہے کہ دن دیہاڑے مکانوں میں گھس کر عورت یا بچے کو اٹھالے جانے میں کوئی حجب محسوس نہیں کرتا۔ درندہ ایک بار مردم خور بننے کے بعد جنگل کے کسی اور جانور کو شکار کر کے اس کے گوشت سے پیٹ نہیں بھرتا، بلکہ آدمی ہی کو تلاش کرتا ہے، بہر حال یہ طے شدہ بات ہے کہ درندے کو مردم خور بنانے میں بڑا ہاتھ شکاری کا ہوتا ہے۔ وہ اسے زخمی کر ڈالتا ہے اور زخمی شیر یا چیتا پھر تیل پن سے محروم ہو کر جب جنگلی جانوروں کو پکڑنے کے قابل نہیں رہتا اور جھوکا مرنے لگتا ہے تب وہ انسان پر حملہ کرتا ہے اور یہ کام درندے کے لئے بہت آسان ہوتا ہے۔ یوں فطری طور پر شیر نہایت شریف النفس اور بہادر جانور ہے۔ خواہ مخواہ انسانوں سے الجھنا پسند نہیں کرتا اور یہ تو میرا بارہا کا تجربہ ہے کہ جنگل میں اگر شیر سے آنا سامنا ہو گیا تو وہ شرافت سے راستہ بدل کر دوسری طرف چلا گیا۔

1918ء میں ضلع بوشنگ آباد کے ایک گاؤں میں مجھے کچھ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا..... گاؤں جنگل کے کنارے آباد تھا، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس کے چاروں طرف جنگل ہی جنگل تھا اور جنگل میں ان گنت درندے بھرے ہوئے تھے۔ درندوں کے علاوہ یہاں سور اور وحشی کتے بھی کثرت سے تھے اور روز بروز ان کی تعداد بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ان دنوں میرے بھائی امیر

مرتضیٰ صاحب بھی یہیں تھے اور سیٹھ کرم الہی کے مکان پر قیام تھا۔ سیٹھ کرم الہی نہایت مہمان نواز اور نفیس آدمی تھے، انہیں خود بھی جنگل کی زندگی سے گہرا لگاؤ تھا۔ اند پورا کے جنگل میں موروں اور جنگلی مرغوں کی بھی بہتات تھی۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ موروں اور جنگلی مرغوں کو پکڑنے کے لئے پھندے لگاتے ہیں، اور روزانہ دس دس بیس بیس مور اور مرغ پکڑ لیتے ہیں۔ یہ جانور بازار میں مناسب قیمت پر فوراً بک جاتے تھے۔ ان شکاریوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی پھندے لگا کر مور اور مرغ پکڑنے کا شغل اختیار کیا اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ یہ پرندے زیادہ تر ہمارے پیٹوں ہی میں اترتے رہے۔ یاد رہے کہ اس وقت میری عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے، ہم دن بھر مرغ اور مور پکڑنے کے بعد مکان کے احاطے میں چار پائیوں پر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ رات کے نو بجے ہوں گے کہ ندی کی طرف سے ایک بارہ سنگھے اور وحشی کتوں کے چنگھاڑنے کی مشترکہ آوازیں آئیں۔ ندی ہماری قیام گاہ سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ہوگی۔ جنگل کے تمام جانور اسی پر آ کر پیاس بجھایا کرتے تھے۔ جب دیر تک بارہ سنگھے اور کتوں کی چیخ و پکار ہمارے کانوں میں آتی رہی اور یہ سمجھ لیا گیا کہ ایسے تل غنڈے میں آرام کی نیند سونا ممکن نہیں، تب میرے بڑے بھائی نے کہا:

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگلی کتوں نے بارہ سنگھے کو گھیر لیا ہے اور غریب اپنی جان بچانے کے لئے ندی میں کود گیا ہوگا، اب کتے ندی کے باہر بھونک رہے ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ بارہ سنگھا کب پانی سے باہر آتا ہے! بارہ سنگھے کو بہر حال ندی سے باہر نکلتا ہوگا اور جو بھی وہ باہر آئے گا، جنگلی کتے اس کی تھکابونی کر ڈالیں گے۔“

میرے لئے یہ بے حد دلچسپی کی بات تھی۔ میں نے امیر مرتضیٰ سے کہا:

”کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ان جنگلی کتوں کو دہاں سے بھگا دیں اور بارہ سنگھے کو خود پکڑ کر حلال کر ڈالیں، اس کا

گوشت تو بہت لذیذ ہوتا ہے۔“

بڑے بھائی کو یہ تجویز پسند آئی۔ اگرچہ رات زیادہ بیت چکی تھی اور اس وقت ندی پر جانا مناسب نہ تھا، لیکن بارہ سنگھ کے لذیذ گوشت نے ہمیں بے چین کر دیا! چنانچہ ہم نے دو گوند نوکروں کو ساتھ لیا، بندوقیں ہاتھ میں سنبھالیں اور ندی کی جانب روانہ ہو گئے۔ آسمان صاف تھا اور لاتعداد ستاروں کی روشنی میں ندی کا چمکتا ہوا پانی ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بڑے بھائی کا قیاس سولہ آنے درست نکلا۔ جنگلی کتے ندی کے کنارے پڑاؤ کئے ہوئے تھے اور ایک قوی الحسبہ بارہ سنگھ ندی کے عین درمیان پناہ لئے ہوئے تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے دو تین کتوں نے جرات کی اور پانی میں کود کر بارہ سنگھ کی جانب بڑھنے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی چند اور کتے بھی پانی میں کود گئے، لقیہ کتے پہرہ دے رہے تھے کہ بارہ سنگھ ندی سے نکل کر جنگل کی طرف بھاگنے نہ پائے۔

بارہ سنگھ نے کتوں کو تیرتے ہوئے اپنے قریب آتے دیکھا، تو سب سے آگے والے کتے کو چھل کر اس زور سے لات جمانی کہ کتے کا منہ پھر گیا اور اس کے ساتھ کتے ڈر کر واپس کنارے کی جانب ہٹ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹے تک یہ حیرت انگیز تماشہ ہوتا رہا۔ بالآخر ہم نے بارہ سنگھ کو موت و زیست کی اس کش مکش سے آزاد کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے ساتھ آنے والے گوند نوکروں نے خشک بانس جلانے شروع کئے اور جب یہ بانس دھڑ دھڑ جلنے لگے تو ان کی روشنی دیکھ کر جنگلی کتوں نے راہ فرار اختیار کی اور اس سے پہلے کہ ہم بارہ سنگھ پر فائر کرتے، وہ جنگلی کی طرح ندی سے نکلا اور پلک جھپکتے میں جنگل کے اندر غائب ہو گیا۔ ہم دونوں بھائی ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

اس واقعے کے بعد ایک اور انتہائی دلچسپ واقعہ دیکھنے میں آیا۔ یہ اسی ندی پر ایک شیر اور جنگلی سور کی خون ریز جنگ تھی جو دن کی روشنی میں برپا ہوئی۔ سور واقعی بہت زبردست سور ثابت ہوا، اس نے اپنے داؤ پیچ سے

شیر کے چھکے چھڑا دیئے اور اسے کاری زخم لگائے۔ گاؤں کے لوگ مختلف درختوں اور ٹیلوں پر چڑھ کر شیر اور جنگلی سور کی یہ ہولناک لڑائی دیکھ رہے تھے۔ آخر میں شیر نے اس کی لاش وہیں چھوڑ دی اور اس زور سے گر جا کہ زمین کا پٹنے لگی۔ تماشائیوں میں بچے، بوڑھے، جوان اور عورتیں سچی شامل تھیں۔ شیر کے یہ تیور دیکھ کر بے تحاشا ادھر ادھر پناہ لینے بھاگے۔ خود میں نے بھی ایک درخت پر پناہ لی۔ شیر غراتا اور گر جتا ہوا بانس کے گھنے ذخیرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد لوگ جمع ہوئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ شیر وہاں سے جاتے ہوئے اپنے شکار کو بھی گھسیٹ کر لے جا چکا ہے۔

ہندوستان کے قدیم باشندوں میں بھیل اور گوند نمایاں ہیں اور لوگ عموماً درندوں کے شکار کئے ہوئے جانور اٹھالانے میں ماہر ہیں۔ میرے ساتھ گوند یہ دیکھ چکے تھے کہ شیر نے مولے تازے سور کا شکار کر لیا ہے اور اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کر جنگل میں لے گیا ہے، لیکن وہ اس قدر تھکا ہوا اور زخمی تھا کہ اس وقت سور کو کھانا شروع نہیں کیا، ہوگا اور سور کی لاش کسی جھاڑی کے اندر پڑی ہو گی..... سور کا گوشت گوند لوگوں کی انتہائی مرغوب غذا ہے! چنانچہ میں نے دیکھا کہ یہ لوگ سور کے تصور ہی میں ہونٹ چاٹ رہے تھے اور اس فکر میں تھے کہ جنگل کے اندر جا کر سور کی لاش اٹھالائیں۔ اپنی نادانی اور ناتجربے کاری کے باعث میں بھی ان کے ساتھ جنگل میں جانے کو تیار ہو گیا۔ مگر بعض عمر رسیدہ اور دانا آدمیوں نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا اور سمجھایا کہ میاں دیوانے ہوئے ہو..... زخمی شیر کے تعاقب میں بھی یوں کوئی جایا کرتا ہے؟ شیر یقیناً سور کی لاش کے قریب ہی کہیں چھپا بیٹھا ہوگا اور جو شخص بھی اس کے نزدیک جائے گا، اسے چیر پھاڑ کر برابر کر دے گا۔

خدا ان کا بھلا کرے کہ بروقت مجھے اس حماقت سے روک دیا، ورنہ آج میں یہ داستان سنانے کو موجود نہ

ہوتا۔ بہر حال میں واپس اپنے ٹھکانے پر چلا گیا اور مجھے خبر نہیں کہ وہ گونڈ سوری لاش ڈھونڈنے جنگل میں گئے یا نہیں گئے۔ اسی روز میں ایک اور قریبی گاؤں گیدا میں گیا اور وہاں مجھے معلوم ہوا کہ ایک انگریز فوجی افسر ادھر شکار کھیلنے آیا ہے اور ایک شیر کی تاک میں ہے۔ اس انگریز شکاری کے ساتھ صرف ایک نوکر تھا اور اس نے جنگل کے اندر ہی اپنا خیمہ لگا رکھا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ انگریز شکاری نے شیر کو پھانسنے کے لئے لڑتے رات ایک درخت سے گائے کا بچھڑا باندھا اور خود شیر کے انتظار میں ایک بچان بندھوا کر اس پر بیٹھا۔ آدھی رات کے بعد شیر ادھر آیا اور شکاری صاحب کی نظروں کے عین سامنے بچھڑے کو ہلاک کیا اور اٹھا کر چلتا ہوا جب وہ اپنے شکار کو جڑوں میں دبا کر جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، تب شکاری نے اس پر فائر کیا گولی شیر کی پیٹھ پر معمولی زخم پہنچاتی ہوئی نکل گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ شیر کی ریڑھ کی ہڈی بھی ایک جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ زخمی ہو کر شیر اس قوت سے دھاڑا کہ آدمی تو آدمی جنگل کے درخت تک لرز گئے۔ انگریز شکاری نے یک لخت ہمت سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور طے پایا کہ گاؤں کے لوگوں کو جمع کر کے ہانکا کرایا جائے۔ ہانکے کے بعد شیر اپنی کمین گاہ سے نکلنے پر مجبور ہو گا اور پھر اسے ہلاک کر دینا آسان رہے گا۔

گاؤں کے غریب لوگ تو ویسے ہی ہر حکم کے پابند ہوتے ہیں، پھر جب انہیں روپے پیسے کا لالچ بھی دیا جائے تو جان کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہاں تو حکم بھی انگریز بہادر کا تھا اور اس کے نادر شاہی حکم کے ساتھ ساتھ روپے کی تھیلیاں بھی تھیں، چنانچہ پچاس ساٹھ آدمیوں کو اٹھا کر کے جنگل میں ہانکا کرایا گیا۔ یہ لوگ جب غل غپاڑہ مچاتے اور ڈھول کمنتر پیٹتے ہوئے آگے بڑھے تو زخمی شیر بہت تملایا اور اس نے ایسی دھمکی دی کہ سب کا پتا پانی ہو گیا۔ انگریز شکاری تو پہلے ہی ایک اونچے بچان پر اطمینان سے بیٹھا تھا۔ ہانکا کرنے والے شیر سے ڈر کر ایسے بھاگے کہ تاش کے پتوں کی طرح کھڑ

گئے۔ انہوں نے درختوں پر پناہ لی۔ شیر اس قدر غیظ و غضب میں تھا کہ پناہ بخدا! اپنے بچوں سے اس نے جھاڑیاں ادھیڑ ڈالیں، زمین کھرچی، پھر ان درختوں کی طرف منہ اٹھا کر وحشیانہ انداز میں دھاڑا جس پر ہانکا کرنے والے چڑھے ہوئے تھے۔

اس افراتفری میں لوگوں نے جب دیکھا کہ گاؤں کا ایک نوجوان لڑکا کریم ابھی تک درخت پر نہیں چڑھ سکا اور ایک جھاڑی کے عقب میں دبکا ہوا ہے تو ان کی خوف سے چیخیں نکل گئیں۔ شیر ایک ہولناک گرج کے ساتھ کریم کی طرف لپکا۔ وہ تو یوں کہیے کہ لڑکے کے ہوش و حواس برقرار رہے، ورنہ اس کے مارے جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس نے شیر کو اپنی طرف آتے دیکھا تو قریبی درخت کی طرف دوڑا۔ یہ درخت زیادہ اونچا نہ تھا اور خدشہ تھا کہ شیر اگر پوری قوت سے جست لگائے، تو کریم کو پکڑ سکتا ہے، لیکن زخمی ہونے اور خون زیادہ بہہ جانے کے باعث ہر لمحہ شیر کی قوت میں کمی واقع ہو رہی تھی، اس لئے دو تین چار چھلانگیں لگانے کے باوجود کریم کو پکڑ نہیں پایا! حالانکہ کریم شیر کی پہنچ سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ کریم نے خود کو درخت کی شاخ سے سائب کی طرح لپٹا لیا تھا اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھی۔ اب ہر لحظہ یہ خدشہ تھا کہ وہ اگر اسی طرح ڈرتا رہا تو درخت سے گر پڑے گا۔ شیر بار بار پلٹ کر اس درخت پر آتا اور دانت نکال کر غراتا۔ پھر بچوں سے درخت کا تنا ادھیڑنے لگتا۔

انگریز شکاری کی بدحواسی دیکھتے کہ مکر نکر یہ تماشا دیکھ رہا ہے اور فائر نہیں کرتا۔ غالباً شیر کا یہ جاہ و جلال دیکھ کر اس کے اعصاب بھی بچان پر بیٹھے بیٹھے جواب دے گئے تھے۔ اس لمحے مجھ پر یہ حسرت طاری ہوئی کہ کاش میرے پاس اس وقت بندوق ہوتی، تو شیر کا قصہ پاک کر دینا کچھ دشوار نہ تھا۔ بھاگتے وقت کریم کے جوتے اور گچڑی جھاڑیوں ہی کے پاس رہ گئی تھی۔ شیر کا غصہ اتنا بڑھا کہ اس نے جوتوں اور گچڑی کو تار تار کر دیا۔ کریم کا حال یہ ہوا کہ دہشت سے اس کا پیشاب بھی خطا نہ

گیا..... وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اب ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ اگر شیر کو وہاں سے ہٹایا نہ گیا، تو کریم لازماً درخت سے گرے گا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس درخت سے کوئی دس گز کے فاصلے پر کریم کا باپ امیر خان ایک دوسرے درخت پر پناہ لئے ہوئے تھا اور اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کئی بار چلا چلا کر انگریز شکاری سے کہا:

”صاحب بہادر، فائر کیجئے، بندوق چلائیے۔“

لیکن صاحب بہادر جیسے تھے ویسے ہی بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ صاحب بہادر کی جانب سے مایوس ہو کر امیر خان نے ایک عجب تدبیر کی اس نے جھٹ سے اپنی مگڑی سر سے اتاری اور شیر کو لاکر کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے یہ مگڑی زمین پر گرا دی۔ شیر مشتعل ہو کر مگڑی کی طرف جھپٹا اور اسے نوچنا شروع کر دیا۔ مگڑی پھینکنے سے امیر خان کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ شیر کا دھیان کریم سے ہٹ کر مگڑی کی طرف منتقل ہو جائے اور دوسرا یہ کہ اس دوران میں شکاری شیر کو اپنی گولی کا نشانہ بنا سکے۔ امیر خان کا ایک مقصد تو پورا ہو چکا تھا، مگر دوسرا نہیں پورا ہوا تھا۔ حالانکہ شیر اب شکاری کے چپان کے بالکل سامنے اور بہت قریب آن کر مگڑی کو نوچ رہا تھا۔ گوشت شکاریوں نے بھی چیخ چیخ کر انگریز کو خبردار کیا کہ فائر کرو۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ شکاری کو ہوش آیا اور اس نے بندوق کندھے سے لگا کر شیر کا نشانہ لیا اور ٹھوڑا دبا دیا۔ گولی چلنے سے چند سیکنڈ پہلے شیر نے شکاری کو چپان پر بیٹھے دیکھا اور دھاڑتا ہوا ادھر گیا۔ مبین اس وقت شکاری کی بندوق نے شعلہ اگلا اور گولی شیر کی گردن میں لگی۔ شیر الٹ کر گرا اور تھوڑی دیر توڑنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

شیر کے مرتے ہی ان سبھی نے اطمینان کا سانس لیا جو درختوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے کانپ رہے تھے۔ یاد رہے کہ اگر یہ رشی شیر اس وقت مارا نہ جاتا تو باکا کرنے والوں اور شکاری سب کورات بھر انہی درختوں پر لٹکے رہنا پڑتا اور کوئی نیچے اتر کر اپنے گھر تک جانے نہ

پاتا۔ یہ ایسا افسوس ہے کہ میں ابھی بھول نہیں ہوا کہ آٹھ سال بعد میں بہت سے واقعات ایسے ان میں رشی درندے کے غیظ و غضب اور اشتعال دیکھنا ملا اور اندازہ ہو گیا کہ اعصاب اکرم مضبوط ہوں بھی انسان اپنے ہوش و حواس برقرار رکھ سکتا ہے اور اعصاب کو پر ہلوان رکھنا بے حد مشکل کام ہے۔

اس دلچسپ شکار کے چند روز بعد ہی دوسرا واقعہ پیش آیا۔ میں اپنے مکان پر موجود تھا کہ جنگل کی طرف سے چند قلی بانیٹے کا نچتے آئے اور انہوں نے بتایا کہ قریب ہی ایک درخت پر چیتا پناہ لئے ہوئے ہے اور جنگلی کتوں نے اس کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ میں نے قلیوں سے کہا کہ اب تک تو چیتا اور جنگلی کتے وہاں سے کئی کوس دور جا چکے ہوں گے۔ یہ سن کر قلی کہنے لگے:

”خیر، آپ ان جنگلی کتوں کی حرکتوں سے واقف نہیں ہیں۔ یہ اگر شیر یا چیتے کو گھیر لیں، تو ہفتوں ان کا گھیراؤ جاری رکھتے ہیں اور شکار کو فیل بھاگنے کی مہلت نہیں دیتے۔ روز بروز اپنا گھیراؤ تنگ کرتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے قابو چڑھنے والا جانور بھوک اور پیاس سے تنگ آ کر گھیراؤ توڑنے کی کوشش کرتا ہے اور جنگلی کتے آنا فانا اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں ایسے عالم میں چیتے، شیر یا جنگلی سور کا چپنا محال ہوتا ہے۔ جنگلی کتوں کی وہشت کا یہ حال ہے کہ شیر بھی ان سے لڑتے ہوئے گھبراتا ہے۔“

انگریز شکاری ابھی تک اپنا ذریعہ خیمہ اسی گاؤں میں جمائے ہوئے تھا۔ ہم نے طے کیا کہ یہ مہم بھی اسی سے سرکاری جائے۔ چنانچہ میں انہی گوشت قلیوں کو لے کر شکاری کے پاس گیا اور اسے چیتے کے جنگلی کتوں سے ڈر کر درخت پر پناہ لینے کا قصہ سنایا۔ شکاری نے جھٹ پٹ اپنی بندوق سنبھالی اور ہمارے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ بھاگ بھاگ ہم جنگل کے اس حصے میں پہنچے جہاں قلیوں نے جنگلی کتوں کو چیتے کا گھیراؤ کرتے دیکھا تھا۔ کچھ فاصلے ہی سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ قلیوں کا بیان درست ہے۔ دریا کے کنارے کا ہو کے درختوں میں سے ایک درخت پر درمیانی قد و قامت کا چیتا چڑھا ہوا

تھا اور درخت کے نیچے آس پاس اور دریا کے کنارے تک پچاس ساٹھ جنگلی کتے پہرہ دے رہے تھے۔ چیتا شاخوں کے درمیان دبکا ہوا تھا۔ بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہمیں اس کی موجودگی کا پتہ چلا۔

گوئڈ کلیوں نے صاحب بہادر کو مشورہ دیا کہ آپ بے خوف ہو کر درخت کے قریب جائیں اور چیتے پر فائر کر کے اسے گرا دیجئے۔ جنگلی کتے اول تو آپ کی صورت دیکھتے ہی بھاگ جائیں گے اور اگر وہ نہ بھاگے، تو ان کی طرف بھی ایک فائر جھونک دیجئے گا وہ فورو ہو جائیں گے۔ مشورہ بہت مناسب تھا، مگر صاحب بہادر اس پر عمل کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جنگلی کتے تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور عین ممکن ہے وہ بھاگنے کی بجائے پلٹ کر ہم ہی پر حملہ کر دیں اور یوں چیتے کو مارنے کی بجائے ہم لوگ خود ان جنگلی کتوں کے خونخوار جڑوں اور نوکیلے پنوں کا شکار بن جائیں۔ دراصل صاحب بہادر پر چیتے سے زیادہ ان جنگلی کتوں کی ہیبت طاری تھی۔ بلاشبہ یہ ہیبت اپنی جگہ صحیح تھی۔ جنگلی کتا چیز ہی ایسی ہے کہ اس سے بڑے بڑے شکاری خشک تنکے کی طرح لرزے کا پتہ دیکھ گئے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اس مخلوق کے ہتھے چڑھنے کے بعد جنگل کا بادشاہ ہو یا اس کا نائب چیتا، جنگلی بھینسا ہو یا بارہ سنگھا، جان بچا لینا امر محال ہے۔ بلیک جھپکتے میں بڑے سے بڑے جانور کی تکا بونی کر ڈالنا جنگلی کتوں کا ادنیٰ سا کتبہ ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جنگلی کتے فطری طور پر انسان سے خوفزدہ رہتے ہیں اور حتی الامکان انسان کا سامنا نہیں کرتے، لیکن جب انہیں فرار کا موقع نہ ملے، تو بے جگری کا ثبوت بھی دیتے ہیں اور میدان کا رزار سے بھاگنے کے بجائے ایک ایک کر کے مر جانا ہی بہتر جانتے ہیں۔ جنگلی کتے کا حلیہ بجائے خود نہایت خوف ناک ہے۔ جلد کا رنگ گہرا سرخ، کانوں کے سرے، دم اور منہ اندھیری رات کی طرح کالا..... دم اور کانوں پر گھنے اور سخت بالوں کے گچھے، اس کا قد عام شہری کتے کے برابر، یعنی ناک سے

دم تک کوئی ساڑھے تین چار فٹ لمبا، سوافٹ سے پونے دو فٹ تک اونچا اور وزن پچاس ساٹھ پونڈ کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ دانت اور پنچے وہ زبردست ہتھیار ہیں جو قدرت نے جنگلی کتے کو اپنے بچاؤ اور حملے کے لئے عطا کئے ہیں۔ دونوں ریزر بلیڈ کی مانند تیز ہوتے ہیں جن کے ذریعے یہ آنا فانا اپنے شکار کو چیر پھاڑ کر برابر کر ڈالتا ہے۔

ان کی عادت یہ ہے کہ چالیس پچاس کے گروہ میں جنگل کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر درندے بھی راستہ بدل لیتے ہیں اور اگر بد قسمتی سے کوئی جانور ان میں گھر جائے، تو زندہ نہیں بچ سکتا۔ بعض اوقات انسان کو بھی گھیر کر اپنا کھانا بنا لیتے ہیں اور کینہ پرور ایسے کہ کوسوں میلوں اپنے شکار کا تعاقب کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی چٹان، کھوہ یا کسی درخت پر پناہ لے لے، تو ہفتوں تک گھیراؤ جاری رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ خود کو ان کے خون آشام جبروں کے حوالے کر دیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شکار کے گھیراؤ کے دوران میں جنگلی کتے باری باری خوراک اور پانی کی تلاش میں جاتے ہیں اور اپنی ضرورت کو پورا کر کے دوبارہ ”ڈیوٹی“ پر حاضر ہو جاتے ہیں۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ آپس میں سمجھی نہیں لڑتے اور نہ آج تک انسان سے مانوس ہوئے ہیں۔ آپ بڑے شوق سے شیر یا چیتا تو گھر میں پال سکتے ہیں، لیکن کتا نہیں پال سکتے۔

غرض میں نے اور گوئڈ کلیوں نے صاحب بہادر سے بہت کہا کہ آپ بے دھڑک چیتے پر فائر کریں۔ جنگلی کتے خود ہی ڈر کر بھاگ جائیں گے، لیکن صاحب بہادر پر واقعی چیتے سے زیادہ کتوں کی دہشت طاری تھی، اور وہ خوف زدہ نظروں سے کتوں کو چلتے پھرتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے بار بار ان کی ہچکچاہٹ اور فائر کرنے میں تاثر پر طیش آ رہا تھا۔ بس نہ چلتا تھا، ورنہ میں بندوق صاحب بہادر کے ہاتھ سے چھین کر خود فائر کرتا۔ آخر میں نے دلی زبان سے کہہ ہی دیا کہ اگر آپ کتوں سے ڈر رہے ہیں تو آئیے واپس چلیں..... سن کر صاحب بہادر نے جھرجھری لی اور چیتے پر گولی چلانے کے لئے آمادہ

ہوئے۔ چیتا اب اپنی پہلی جگہ چھوڑ کر کچھ اور سامنے آ گیا تھا۔ غالباً وہ اپنی دانست میں کتوں کا گھیرا توڑ کر نکل بھاگنے کی فکر میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ درخت سے کودے، ہمارے صاحب بہادر نے دانست بھینچ اور آکھ میچ کر گولی چلا دی۔ چیتا کودنے کے لئے بالکل موٹن میں تھا کہ گولی دھانئیں سے چلی اور چیتے کے پیٹ میں لگی۔ ایک لرزہ خیز گرج کے ساتھ چیتا فلا بازیاں کھاتا ہوا بھد سے زمین پر گرا۔ چیتے کے گرتے ہی کتوں نے جھپٹ کر اسے نوچنا چاہا۔ مگر صاحب بہادر نے فوراً ہی دوسرا فائر کیا اور اس مرتبہ ایک کتا خون میں نہا گیا۔ اپنے ساتھی کو ترستے دیکھ کر کتوں نے بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی اور بجلی کی طرح وہاں سے روف پکر ہو گئے۔

جنوری 1919ء میں مجھے ضلع ہوشنگ آباد ہی کے ایک قصبہ لودھی دھانہ میں جانا پڑا۔ جہاں لکڑی چیرنے کا ایک کارخانہ میری نگرانی میں دیا گیا۔ یہ قصبہ جنگل کے عین مرکز میں تھا اور جنگل کے ایک سرے پر اونچی سی پہاڑی بھی جو گاؤں سے کوئی آدھ میل دور ہوئی۔ لکڑی چیرنے کا یہ کارخانہ اسی پہاڑی ڈھلوان پر بنا ہوا تھا اور اس کے بالکل نزدیک ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی جہاں گرمیوں کے موسم میں جنگل کے دور دراز حصوں سے طرح طرح کے جانور آ کر پیاس بجھاتے تھے۔ میرے یہاں پہنچنے کے کچھ عرصے بعد ہی بڑے بھائی امیر مرتضیٰ صاحب بھی آ گئے۔ ان دنوں مرتضیٰ صاحب کے پاس بارہ بونکی ہندوق تھی، مگر میرا حال یہ تھا کہ ہندوق کی مدد کے بغیر ہی شکار کا شوق مختلف تدبیروں پر عمل کر کے پورا کر لیا کرتا تھا۔ یعنی تیر کمان اور نخلیل سے کام چلاتا یا جال ڈال کر پرندوں کو پکڑا کرتا۔ مقامی باشندے بھی اس مشغلے میں شریک رہتے۔ ہمارا اولین کام جنگلی موروں کو گرفتار کرنا تھا۔ جنگل کے ایسے حصے میں جہاں وزنی مور کثرت سے تھے، ہم چار پانچ آدمی مختلف مقامات پر جھاڑیوں کے اندر چھپ جاتے اور موروں کو ادھر سے ادھر بھگانا شروع کر دیتے۔ مور اپنے وزن کے باوجود دوڑ تو سکتے تھے، لیکن اڑنے کے قابل نہ تھے! چنانچہ جب

یہ ادھر سے ادھر دوڑ دوڑ کر بے جان ہو جاتے، تو ہم آسانی سے انہیں گرفتار کر لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ ہوا ذرا تیز ہوتی تو یہی وزنی مور اڑ کر ہمارے ہاتھ سے نکل جاتے اور ہم اپنی محنت پر کف افسوس ملتے ہوئے واپس چلے آتے۔ مور کے مقابلے میں مورنیاں چونکہ ہلکی ہوتی ہیں اس لئے وہ ہمارے ہاتھ نہیں آتی تھیں۔ ایک دن میں نے عجب تماشا دیکھا کہ ایک جھاڑی کے اوپر بڑا سا عقاب بیٹھا ہے۔ حیرت ہوئی کہ عقاب تو آسمان کی بلند یوں پر اڑنے والا پرندہ ہے یہاں جھاڑی پر بیٹھنے سے کیا مطلب؟ مگر بہت جلد اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ جھاڑی کے اندر ایک مور دبا ہوا ہے اور عقاب چونکہ جھاڑی کے اندر جا کر مور کو پکڑنے سے معذور تھا، اس لئے باہر ہی ٹھہر کر مور کے جھاڑی سے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک یہ منظر دیکھنے کے بعد میں اپنے کام سے روانہ ہو گیا۔ خبر نہیں، عقاب مور کو پکڑنے میں کامیاب رہا یا مایوس ہو کر اڑ گیا!

یہی سال تھا جب میں نے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کیا اور طے کر لیا کہ مجھے ایک بڑا شکاری بننا ہے۔ یہ ارادہ ایک مہم کے بعد کیا گیا جس کا آغاز بڑے طریق پر ہوا۔ میرے بڑے بھائی امیر مرتضیٰ صاحب اپنی بارہ بور ہندوق سمیت لودھی دھانہ سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ یہ ہندوق وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مجھے اجازت نہ تھی کہ اسے ہاتھ بھی لگاؤں..... وجہ یہی کہ وہ نیک نیتی سے چاہتے تھے کہ میں شکاری نہ بنوں اور اپنی زندگی برباد نہ کر ڈالوں۔ ایک روز دو پہر کو ایک بچے کے لگ بھگ جینوا گوالی گاؤں کے چند آدمی بدحواسی کی تصویر بنے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ چیتے نے ان کا ایک بچہ مار ڈالا ہے اور بچہڑے کی لاش کو گھسیٹ کر گاؤں سے کچھ فاصلے پر لے گیا ہے۔ یہ لوگ دراصل میرے بڑے بھائی سے چیتے کی شکایت کرنے آئے تھے کہ بھائی صاحب بھی اتنے شکاری تھے اور بارہ بور ہندوق کے مالک..... لیکن بھائی صاحب اس وقت موجود نہ

تھے، لہذا قرقہ فال میرے نام نکل آیا۔ میں نے ان لوگوں سے عذر کیا کہ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟ چیتے سے مقابلہ کرنے کے لئے غلیل اور تیرکمان کافی نہیں ہیں۔ یہاں تو بندوق یا رائفل کی ضرورت ہے اور میری بد قسمتی کہ میں ان ہتھیاروں سے ابھی تک محروم چلا آتا ہوں۔ خود اتنا بمقدور نہیں کہ بندوق خرید سکوں۔ بھائی صاحب ہوتے تو وہ اپنی بندوق کو کام میں لا کر چیتے کو مار سکتے تھے۔ تم لوگ ان کی واپسی کا انتظار کرو۔ یہ سن کر وہ لوگ سخت پریشان ہوئے اور کہنے لگے۔

”نہ جانے آپ کے بھائی صاحب کب واپس آئیں، ادھر چیتے کے منہ کو کچھڑے کا خون لگ گیا ہے، اگر اسے روکا نہ گیا تو ایک ایک کر کے ہمارے تمام موسیخوں کو ہڑپ کر جائے گا اور پھر ہو سکتا ہے انسانوں کی باری بھی آجائے، لہذا ہر قیمت پر چیتے کا قصہ پاک کرنا ضروری ہے۔“

میں نے کہا: ”ٹھیک ہے، لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ تنہا آدمی کر ہی کیا سکتا ہے۔ تم لوگ چاہتے ہو کہ میں چیتے کا شکار ہو جاؤں؟“

بہت سوچ بچار کے بعد آخر یہ راہ نکالی گئی کہ میں گاؤں کے نمبردار کی منزل لودنگ بندوق مستعار لوں اور اس سے چیتے کو ہلاک کرنے کی کوشش کروں۔ منزل لودنگ بندوق بلاشبہ نہایت کارآمد ہتھیار ہے، لیکن اسے بھرنا بجائے خود ایک فن ہے جس میں اس وقت طبعی انارٹی تھا۔ بہر حال اللہ کا نام لے کر میں نے بندوق لود کی اور ان لوگوں کے ساتھ ہی جینوا گوالی کی طرف روانہ ہوا۔ لودھی دھانہ سے یہ گاؤں صرف دو میل دور تھا۔

آپ اس وقت میرے جذبات و احساسات اور جوش و خروش کا شاید احساس نہ کر سکیں کہ میں بندوق ہاتھ میں لیے بغض نفیس کسی سرپرست کی رہنمائی کے بغیر ایک موذی چیتے سے دو دو ہاتھ کرنے جا رہا تھا۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ میرے ہوش و حواس اور اوسان معمول کے مطابق کام کر رہے تھے، تو یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ میرے دل کی دھڑکن اسی رفتار سے تیز ہو رہی تھی جس رفتار سے

میں جائے واردات کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا! تاہم میں نے کوشش کر کے اس بدحواسی اور دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکن پر قابو پایا اور جینوا گوالی کے نواح میں پہنچ کر کچھڑے کی لاش دیکھی جسے چیتے نے ہلاک کیا تھا، لیکن اسے ہڑپ کرنے کا موقع کسی نامعلوم سبب سے نہیں ملا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چیتا قریب ہی کہیں موجود ہوگا اور شکار پر نگاہیں جمی ہوں گی۔ شام کے سائے تیزی سے ارد گرد پھیل رہے تھے۔ فضا میں اچھا خاصا جس تھا اور جنگل پر غیر معمولی خاموشی طاری تھی۔ پرندوں نے اپنے ٹھکانوں پر ابھی لوٹنا شروع نہیں کیا تھا۔ میں نے طے کیا کہ چیتے کے انتظار میں بچان باندھ کر اس پر بیٹھنا فی الحال پیشوار بھی ہے اور غیر ضروری بھی..... بچان باندھنے کا موقع نہ تھا اور نہ اتنا وقت کہ گاؤں سے بچان باندھنے کا سامان وغیرہ لایا جاتا۔ میں نے ایک درخت پر چڑھ کر چیتے سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ زمین سے کوئی پندرہ فٹ کی بلندی پر میں نے اپنا ٹھکانا بنایا اور سمجھ لیا کہ چیتے کے انتظار میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ یہ یقینی تھا کہ چیتا آس پاس ہی موجود ہے۔ اب اسے میری تاثر بہ کاری کہہ بیٹھے یا نادانی کہ میں اس خیال میں مبتلا تھا کہ جس طرح انسان اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتا، اس طرح جانور بھی اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتا! حالانکہ اب سوچتا ہوں، تو حیرت ہوتی ہے کہ اس رات چیتے نے مجھے زندہ کیوں چھوڑ دیا تھا، کیونکہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس نے گھپ اندھیرے کے باوجود نہ صرف مجھے اچھی طرح دیکھ لیا، بلکہ حملہ کرنے کے لئے دبے پاؤں درخت پر چڑھنے کی کوشش بھی کی تھی۔

چیتے کے بارے میں مختصر طور پر میں یہاں چند ضروری باتیں بتاتا چلوں تاکہ آپ کو اس مکار دہندہ کی ان حرکتوں کا علم ہو سکے جو رات کی تاریکی میں اس سے سرزد ہوتی ہیں۔ تمام جنگلی جانوروں میں چیتا سب سے زیادہ تیز، پھرتیلا اور عیار جانور ہے۔ شیر درخت ہ نہیں چڑھ سکتا جبکہ چیتا بلی کی طرح آسانی سے درخت پر چڑھ جاتا ہے۔ زخمی ہونے کے بعد چیتے کے غیلا

ہو گئیں اور گھبراہٹ کی وہ لہر جو بار بار میرے اندر سے اٹھ رہی تھی، دفعۃً غائب ہو گئی۔ کچھ ایسا یقین میرے قلب کو ہو گیا تھا کہ میں جیتے کوٹھکانے ضرور لگا دوں گا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد میں نے سامنے والی جھاڑیوں میں کھڑی بڑی آواز سنی۔ میرے کان کھڑے ہوئے اور پھر میں نے جیتے کا سایہ جھاڑیوں کے اندر دیکھا۔ چیتا خود کو چھپانے میں شاید کامیاب ہو جاتا لیکن وہ اپنی ان زرد آنکھوں کو چھپانے میں بالکل ناکام تھا جو رات کے اس اندھیرے میں انکاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ اسے وہم تھا کہ میں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دبے پاؤں جھاڑیوں سے نکلا اور سیدھا اس درخت کی طرف آیا جس پر میں چھپا ہوا تھا۔ چیتے نے منہ اوپر اٹھا کر فضا میں کچھ ہونکھا۔ پھر چپکے چپکے درخت کی پشت پر آن کر اس انداز سے تنکنے لگا جیسے اوپر آنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ اپنی جی داری اور حوصلے کے باوجود میں پسینے سے تر ہو گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے جنبش کی، تا کہ چیتا اگر درخت پر چڑھے تو میں اسے گولی مار دوں، لیکن اتنی سی جنبش ہی قیامت ہو گئی۔ چیتے نے غرا کر زقد بھری اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں مزید تین گھنٹے دم بخود درخت پر بیٹھا چیتے کی واپسی کا منتظر رہا۔ لیکن وہ نہ آیا۔ بالآخر میرا حوصلہ جواب دے گیا اور میں نے گاؤں والوں کو آوازیں دینا شروع کیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ آئے اور مجھے درخت سے اتار کر اپنے ساتھ لے گئے۔ میرے جاتے ہی چیتا وہاں آیا اور پتھرے کی لاش سے کام وہ دہن کی لذت کے بعد اپنی کمین گاہ کی طرف اوٹ گیا۔ اس کے بعد میں نے مسلسل کئی دن اس چیتے کا تعاقب کیا، مگر وہ اتنا چالاک نکلا کہ میرے تنھے نہ چڑھ سکا۔ دوسری طرف لوہی دھانہ کے نمبردار صاحب اپنی بندوق کے فراق میں بے چین تھے اور مجھے بھائی جان..... کے واپس آ جانے کا ڈر بھی تھا اس لئے اس چیتے کو مارنے کا ارمان دل میں لئے میں واپس اپنے علاقے میں چلا گیا۔

وقت گزرتا گیا اور جنگلی جانوروں کے بارے میں

غضب اور اشتعال کی انتہا نہیں رہتی۔ وہ انسانوں کے لئے سخت خطرناک بن جاتا ہے۔ شکار کو ہلاک کر کے پہلے پیٹ چاک کرتا ہے، آنتیں ادھر ادھر تکھیرتا ہے اور پھر پیٹ کا گوشت ہڑپ کرتا ہے۔ یہ درندہ اپنی ایک عجیب و غریب فطری حس کے باعث شکاری کی پیش بندی اور منصوبے سے آگاہ ہو جاتا ہے اور آسانی سے قابو میں نہیں آتا۔ اس کی یہ عادت بھی ہے کہ شکار کو ہلاک کر کے اونچے درختوں کی کھنی شاخوں میں چھپا دیتا ہے اور کئی دن مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ اسے فریب دینے کے لئے درخت کے ساتھ اگر آپ بکری یا بچھڑے کو باندھیں گے، تو ادھر سے کبھی نہیں گزرے گا۔ وہ خوب جانتا ہے کہ چچان پر شکاری بندوق لئے بیٹھا ہے۔ چیتے کی ایک خطرناک خصوصیت یہ ہے کہ کبھی سامنے آ کر وار نہیں کرتا۔ ہمیشہ پیچھے سے دھن پر حملہ کرتا ہے۔ شیر کے برعکس شکاری پر چیتے کی دہشت زیادہ سوار رہتی ہے کہ اس درندے کے سامنے چچان کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ شکاری کی بے خبری میں وہ چچان پر آ جاتا ہے اور ایک ہی نچے میں گردن توڑ ڈالتا ہے۔

چیتے کی ان خصوصیات کا مجھے اس وقت مطلق علم نہ تھا۔ جب میں مزل لوڈنگ بندوق سنبھالے جینوا گوالی گاؤں کے ایک درخت کی شاخوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ یہ خصوصیات تو مجھے بہت بعد میں طویل شکاری زندگی بسر کرنے کے بعد معلوم ہوئیں اور ان سے میں نے بہت فائدہ بھی اٹھایا جس کا تذکرہ انشاء اللہ آئندہ کروں گا۔

مجھے جنگل میں اکیلا چھوڑ کر گاؤں والے واپس چلے گئے اور کہہ گئے کہ ضرورت پڑنے پر میں اگر حلق پھاڑ کر پکاروں گا تو وہ لائیاں اور جلتی ہوئی شعلیں لے کر فوراً حاضر ہو جائیں گے۔ میں نے نیچے میں آ کر کہہ دیا کہ شاید اس کی ضرورت نہ پڑے کہ میں چیتے کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پتھرے کی لاش اس درخت سے جس پر میں براہمان تھا۔ کوئی دس پندرہ گز دور پڑی تھی اور میں اپنی جگہ سے جس وحشت لاش پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس

میری معلومات بروقت چلی گئیں۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہوئی کہ بھائی صاحب نے مجھے باضابطہ شکاری تسلیم کر لیا تھا اور کھلی اجازت دے دی تھی کہ میں جس طرح چاہوں شکار سے جی بہلاؤں۔ اس سال یعنی 1919ء کا ذکر ہے، جون کا مہینہ تھا اور قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ میں چرپالہ گاؤں گیا ہوا تھا اور دن بھر کی مصروفیات کے بعد گھر کے صحن میں لیٹا بے خبر سو رہا تھا کہ چند مقامی باشندوں نے مجھے چکایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا، دیکھا کہ یہ گونڈ لوگ ہیں اور ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ میں نے پوچھا:

”خیر تو ہے؟“

انہوں نے بتایا کہ ایک آدم خور چیتا بنو خان کے مکان میں واردات کی نیت سے داخل ہوا۔ مگر گھر والوں کو پتا چل گیا، انہوں نے کمال جرات سے کام لے کر چیتے کو مکان کے اندر قید کر دیا ہے اور اب یہ لوگ کریم ٹیل کو بلانے آئے ہیں، تاکہ وہ اپنی بندوق لے کر چلے اور اس چیتے کو کھانے لگا دے۔ میں جس مکان میں ٹھہرا ہوا تھا وہ کریم ٹیل کا تھا۔ کریم عمر میں بڑا ہونے کے باوجود میرا بہترین دوست تھا۔ میں نے گاؤں والوں کو بتایا کہ کریم ٹیل اس وقت موجود نہیں ہے اور کسی کام سے ہروا گاؤں گیا ہے۔ یہ سن کر وہ مصر ہوئے کہ میں چلوں اور اس آدم خور چیتے کو مار ڈالوں..... میں نے ان سے کہا کہ میں بالکل تیار ہوں۔ گاؤں والوں نے کریم ٹیل کی بیوی سے بندوق مانگی۔ سب لوگ اسے بیگم بیگم کہتے تھے۔ جب بیگم نے سنا کہ بندوق میرے لئے مانگی جا رہی ہے اور میں آدم خور چیتے کو مارنے کا ارادہ رکھتا ہوں، تو وہ سخت ناراض ہو کر بولیں:

”کیا یہ لونڈا جشید اس آدم خور چیتے کو مارے گا جس نے ابھی چند دن پہلے ہمارے ایک نوکر کو ہڑپ کیا ہے؟ اس کے علاوہ وہ نہ جانے کتنے آدمیوں کو کھا چکا ہے۔ جشید کل کا بچہ اور نا تجربہ کار ہے۔ میں اسے بندوق دے کر موت کے منہ میں بھیجنا نہیں چاہتی۔ اگر خدا نخواستہ وہ چیتے کا نوالہ بن گیا، تو میں اپنے شوہر اور

جشید کے بھائی مرتضیٰ کو کیا جواب دوں گی؟“ غرض بیگم نے بندوق دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ادھر گاؤں والوں کا اصرار تھا کہ آدم خور چیتا اس وقت بنو خان کے مکان میں زیر حراست ہے اور یہ اسے ہلاک کرنے کا بہترین موقع ہے، اگر یہ موقع ضائع کر دیا گیا، تو چیتا آئندہ نہ جانے کتنے افراد کو ہڑپ کر جائے گا۔ بصد منت سماجت بیگم اس پر راضی ہوئیں کہ اگر گاؤں کے تین ذمے دار شخص بندوق مانگیں، تب جشید کو بندوق دی جاسکتی ہے اور یہ تینوں آدمی سب کے سامنے اس بات کا اقرار کریں کہ جشید کو بندوق دی جاسکتی ہے اور یہ تینوں آدمی سب کے سامنے اس بات کا اقرار کریں کہ اگر جشید مارا گیا، تو یہی لوگ جواب دہ ہوں گے! چنانچہ تین ذمے دار آدمیوں نے ضمانت دی اور بیگم نے بارہ بور بندوق دو کار تو سوں سمیت میرے حوالے کی۔

میں بھاگم بھاگ بنو خان کے مکان پر پہنچا، دیکھا کہ لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ جب انہوں نے مجھے دیکھا اور انہیں بتایا کہ یہی ”بچی“ آدم خور چیتے کو مارنے آیا ہے تو مایوسی سے ان کے چہرے لنگ گئے۔ وہ میری نوعمری پر نظر کرتے اور کبھی اس بندوق کو دیکھتے جو میرے ہاتھ میں تھی۔ بعض نے دلی زبان سے مجھے منع بھی کیا اور بعض نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس لونڈے کی قضا اسے یہاں پہنچ لائی ہے۔ کئی ایسے بھی تھے جو منہ پھیر پھیر کر ہنس رہے تھے۔ میں نے ان باتوں کی بالکل پرواہ نہ کی اور مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اوپر جا کر میں نے چھت کی اینٹیں اکھاڑیں اور اندر جھانکا۔ پہلے تو مجھے آدم خور چیتا کہیں نظر نہ آیا، لیکن جب غور سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ مکار درندہ لکڑی کے اس پلیٹ فارم کے نیچے چھپا ہوا ہے جو برتن وغیرہ رکھنے کے لئے کمرے میں بنایا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس طرح میں چیتے کو گولی نہیں مار سکتا تھا اور چیتے کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اتنی محفوظ جگہ سے نکل کر خود کو ہلاکت میں ڈالتا؟ میں نے اوپر سے تین چار اینٹیں اور پتھر کمرے میں چھینکے۔ لیکن چیتا غرانے کے علاوہ اس سے مس نہ ہوا۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ

نہ تھا کہ میں مکان کے اندر جاؤں اور کمرے کا دروازہ کھول کر چیتے کو گولی مار دوں۔

میرا یہ حوصلہ دیکھا تو وہی لوگ جو چند لمحے پہلے میرا مذاق اڑا رہے تھے، اب جی بڑھانے اور ہمت افزائی کرنے لگے۔ میں نے ان سے کہا، مہربانی کر کے مکان سے دور ہٹ جائیں۔ اگر چیتا آزاد ہو گیا، تو ایک آدھ کو اپنے ساتھ لے مرے گا۔ یہ سنتے ہی مجمع کافی کی طرح بھٹ گیا اور لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ میں نے دو بہادر گونڈ اپنے ساتھ لئے، ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے اور یہ لوگ پہلے بھی شیروں اور چیتوں سے جنگل میں مقابلہ کر چکے تھے۔ بندوق میرے ہاتھ میں تھی، ہم نے مکان کا اندرونی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ اندر جانے کے بعد ہم نے یہ بیرونی دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ تاکہ چیتا کسی صورت میں باہر نہ جاسکے۔ اب ہمارے سامنے وہ کمرہ تھا جس میں آدم خور چیتا بند تھا۔ غالباً ابھی وہ پلیٹ فارم کے اندر ہی دبکا ہوا تھا۔ میں نے بندوق کا کندہ آہستہ سے کمرے کے بند دروازے پر مارا۔ اندر سے آدم خور کے غرائی کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے سوچا لکڑی کے اس دروازے میں اتنا سوراخ کر لوں کہ اس میں سے چیتا نظر آجائے اور پھر اسی سوراخ میں بندوق کی نالی رکھ کر فائر کر دوں، لیکن مصیبت یہ تھی کہ کارٹوس میرے پاس دو ہی تھے۔ اگر یہ ضائع ہو گئے تو بیگم سے مزید کارٹوس حاصل کرنا محال تھا کہ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ گھر میں دو ہی کارٹوس باقی ہیں، اگر ان سے چیتے کو مار سکوں، تو مار لینا۔ چنانچہ میں نے دروازے میں سوراخ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک گونڈ کو حکم دیا کہ بڑھ کر دروازہ چوپٹ کھول دے۔

ادھر گونڈ نے دروازہ کھولا، ادھر آدم خور چیتا برق کی طرح لپک کر اس پر آیا۔ دوسرے گونڈ نے بے مثل جی داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا نیزہ تاک کر مارا۔ یہ نیزہ لکڑی کی دیوار میں پیوست ہو گیا اور چیتے کی توجہ ایک سیکنڈ کے لئے نیزے سے ایک طرف مبذول ہوئی۔ میں اسی لمحے میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی

چیتے کے دماغ پر ٹیٹھی، اس کی کھوپڑی لے پر پنے اڑ گئے۔ مرتے مرتے بھی وہ اچھل کر میری جانب آیا۔ میں نے دھانئیں سے دوسری گولی بھی چلائی۔ یہ گولی بھی گردن میں لگی اور چیتا میرے قدموں پر گر کر ذمیر ہو گیا۔ چیتے کے مارے جانے سے لوگ اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا اور سارے گاؤں میں لئے لئے پھرے۔ یہ چیتا لم و بیش دس بارہ آدمیوں کو ہڑپ کر چکا تھا اور جو موسیقی اس نے ہلاک کئے، وہ تو تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ اس کا حوصلہ یہاں تک بڑھ چکا تھا کہ دن ڈھاڑے لوگوں کے کچے مکانوں میں، جھونپڑیوں میں ٹھس کر بچوں کو اٹھا لے جاتا۔ بعد میں جب اس کی لاش کا معائنہ کیا گیا، تو پتا چلا کہ اس کی ٹانگ مدت سے زخمی تھی اور یہ کسی ایسے انڈی شکاری کا کارنامہ تھا جس نے چیتے کی ٹانگ پر گولی مار کر اسے شکار کھینے کی پھرتی اور چالاکی سے محروم کر دیا تھا۔ مجبوراً یہ درندہ آدمیوں کے گوشت اور لہو سے اپنا پیٹ بھرنے لگا۔ یہ پہلا آدم خور چیتا تھا، جسے میں نے سولہ برس کی عمر میں مانگے مانگے کی بندوق سے ہلاک کیا۔ اس کامیابی نے جہاں میرے حوصلے بلند کئے، وہاں مجھے مستند شکاری ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ لدھیہ پردیش کے جنگلوں سے یہ خبر نکل کر پنجاب کے شہر گجرات تک پہنچی اور خاندان کے لوگوں نے اس پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا بالآخر میں نے اپنے لئے ایک راستہ چن ہی لیا۔

اور یہ راستہ تھا چوٹیں گھٹنے اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرنے کا۔ ایسے واقعات کی کمی میری زندگی میں نہیں رہی جن میں سے ہر واقعہ ایسا ہی ہے، گویا مجھے دوبارہ جننے کا موقع خدا نے فراہم فرمایا۔ جس سال میں نے آدم خور چیتے کو مارا، اس سے اگلے برس سردیوں کے دن تھے..... میں علی السبیل مزے مزے میں پیدل چلتا ہوا گاؤں گا سن سے قصبہ دھانہ جا رہا تھا کہ راستے میں گھنڈن گھاٹ پر میری ملاقات اچانک ایک ہر شیر سے ہو گئی۔ شیر مجھ سے صرف دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ دلچسپ

لوگ جب اس قسم کے واقعات سنتے تو پیش گوئیاں کر دیتے کہ یہ لڑکا کسی دن ضرور شیر یا چیتا کا لقمہ بن جائے گا۔ مگر 45 برس اسی طرح گزر گئے اور مجھے خراش تک نہ آئی، حالانکہ اسی مدت میں کوئی ڈیڑھ سو درندوں زمین پر کھڑے ہو کر دو دو جنگ کے بعد ہلاک بھی کیا۔ قصبہ لودھی دھانہ جنگل کے مرکز میں تھا اور مجھے شکار ڈھونڈنے کے لئے زیادہ دور جانے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ ان دنوں اس جنگل میں شیر، چیتے، ریچھ، سور اس کثرت سے تھے کہ دنیا کے بہت کم جنگلوں میں ہوں گے۔ روزانہ کسی نہ کسی درندے سے ڈھبڈھوتی ہی رہتی تھی..... درندے تو خیر درندے تھے، ابکہ روز جب میں ندی میں نہار ہاتھا، مگر چمچھ نے میری ماٹا

بہت دیر انتظار کے بعد مگر مجھ نے اپنی ہی تھوٹنی پانی سے باہر نکالی اور کنارے کی طرف آیا۔ ہم نہایت صبر سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کنارے پر آن کر مگر مجھ بہت دھیمے دھیمے چھپکلی کی طرح ہماری طرف بڑھنے لگا۔ میں کن کنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ خاصا قریب آ گیا تو میں نے جھٹ بندوق اٹھائی اور اس کے پیٹ میں گولی ماری۔ گولی کھا کر مگر مجھ الٹا ہو گیا۔ بابو خان نے رسی کا پھندا بنا کر اس کی تھوٹنی میں ڈالا اور ہم دونوں نے سخت جدوجہد کے بعد اسے کنارے سے دور کھینٹ لیا۔ ہم سمجھے کہ وہ مر گیا، حالانکہ وہ صرف بے ہوش ہوا تھا اور اس میں خاصی جان باقی تھی۔ مگر مجھ کو ہم نے نیل گاڑی پر لا دیا اور گاڑوں لے چلے۔ ہم دونوں اس کی طرف سے پیٹھ موڑے بیٹھے باتیں کرتے جا رہے تھے کہ ہماری بے خبری میں اسے ہوش آیا اور اس نے منہ کھول کر پہلے تو رسی کے پھندے سے آزادی حاصل کی، پھر ایک کر بابو خان کا بازو اپنے جبرے میں دبا لیا۔ اس خوف اور دہشت کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے جو اس موذی مگر مجھ کو زندہ دیکھ کر ہم دونوں پر طاری ہوئی۔ میرے قریب ہی گوشت کاٹنے کا لمبا سا چھرا اڑا تھا۔ میں نے وہی چھرا اٹھایا اور پوری قوت سے مگر مجھ کی تھوٹنی کے نچلے حصے میں گھونپ دیا۔ خون کا زبردست فوارہ برآمد ہوا، میں نے بے درپے کئی وار کئے اور اس وقت چھرا ہاتھ سے رکھا جب مگر مجھ کو دم نکل گیا۔

کنارہ

محمد سدید اعوان



وصل کے موسم میں بھی بجر کے صدے سہول
ہے یہی قسمت میری شاید اسی قابل ہوں میں

صدیق اور سدرہ گاؤں کے ایک ہی سکول میں
اکٹھے پڑھتے تھے اور رشتے میں سدرہ صدیق کی ماموں
تھے۔ میٹرک تک دونوں نے گاؤں کے ایک سکول ہی
میں پڑھا۔ میٹرک سے پہلے ہی دونوں کی آپس میں
بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے
کی بیٹی تھی۔ دونوں بہت خوبصورت اور ذہین

کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔

میٹرک کے بعد صدیق نے گورنمنٹ ڈگری کالج مظفر آباد میں داخلہ لے لیا۔ جبکہ سدرہ کے گھر والوں کا یہی فیصلہ تھا کہ اسے آگے نہیں پڑھائیں گے۔ کیونکہ کالج گاؤں سے کافی دور ہے۔ لیکن سدرہ کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اور وہ صدیق کے بغیر رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ سدرہ بار بار اپنے والدین سے کہتی کہ مجھے آگے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن سدرہ کے گھر والے کہتے تھے کہ کالج کی لائف اور سکول کی لائف میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

سدرہ کے والد کا نام مفتی اکبر تھا۔ جبکہ صدیق کے والد خطیب تھے۔ دونوں مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

سدرہ کے والد نے کہا۔ ”دیکھو بیٹا ہم بہت عزت والے لوگ ہیں۔ کالج کی لائف بہت خراب ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے میری عزت پر کوئی آنچ آئے۔“ سدرہ رونے لگی اور بولی۔

”میں ایک باکردار لڑکی ہوں۔ سکول کی لائف میں بھی آپ کو کوئی شکایت نہیں ملی۔ تو انشاء اللہ کالج کی لائف میں بھی آپ کو نہیں ملے گی۔ مجھے اپنے گھرانے کی عزت کا بہت پاس ہے۔ ابوجی پلیز مجھے کالج جانے دیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ملے گی۔ گاؤں کی اور لڑکیاں بھی جاتی ہیں۔ کیا وہ سب خراب ہیں۔ میں ان کے ساتھ جاؤں گی اور ساتھ ہی واپس آؤں گی۔“

بالآخر سدرہ کے والد مان ہی گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم کالج جاؤ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تمہاری کوئی بھی شکایت مجھے مل گئی تو وہ دن تمہارے کالج کا آخری دن ہوگا۔“

آخر کار سدرہ کو کالج جانے کی اجازت مل گئی۔ صدیق نے بھی بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ دونوں کے کالج کافی دور دور تھے۔ کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی۔ کسی کو بھی

ان دونوں کے بارے علم نہیں تھا۔ کہ وہ ایک دوسرے کو کس حد تک چاہتے ہیں لیکن بد قسمتی سے دونوں کے والدین کی ایک دوسرے سے نہیں بنتی تھی۔ دونوں کے گھر والے شروع ہی سے ایک دوسرے سے ناراض تھے۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں بھی شریک ہونے کے روادار نہیں تھے۔

سدرہ اور صدیق نے آپس میں فیصلہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کا جیون ساتھی بن کے ہی رہیں گے تاکہ ان کے والدین کی پرانی ناراضگیاں بھی ختم ہو جائیں۔ صدیق نے کہا۔ ”اگر میں رشتے کے لیے اپنے والدین کو بھیجوں گا تو اس طرح مزید حالات خراب ہو جائیں گے۔“

سدرہ نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم دس بارہ سال سے سچا پیار کر رہے ہیں اور مجھے پکا یقین ہے کہ ہمارا آپس میں رشتہ طے ہو جائے گا۔ بس تم نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ کیونکہ اللہ پاک خود ارشاد فرماتا ہے کہ صبر اور نماز سے کام لو۔ ہو سکتا ہے حالات سدرہ کے ساتھ ساتھ ہمارے والدین بھی ایک ہو جائیں۔“

صدیق نے کہا۔ ”پچھلے تیس سالوں میں نہیں ہوئے تو آنے والے وقت میں کیسے ٹھیک ہو جائیں گے۔“

سدرہ بولی۔ ”تم اللہ پر بھروسہ رکھو۔“ سدرہ جب کالج کی میں پڑھتی تھی۔ تب ہی اس کے رشتے آنے شروع ہو گئے تھے جیسے ہی کوئی رشتہ آتا تو سدرہ بہانہ تراشتی کہ ابوجھے تو اور آگے پڑھنا ہے۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس طرح سدرہ اپنے گھر والوں کو مال دیتی تھی۔ وہ اس کوشش میں تھی کہ ہو سکتا ہے ہمارے گھر والوں کے تعلقات صدیق کے گھرانے سے ٹھیک ہو جائیں۔

صدیق انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ کورس ختم ہونے کے ساتھ ہی اس کو نوکری مل گئی جبکہ سدرہ ابھی ایم اے فائنل میں تھی۔

استعارہ

سنو!

ایسا نہیں کرنا

رابطہ تو رکھنا ہے

محبت کا ہو یا بیگانگی کا

سلسلہ تو رکھنا ہے

انہی سلسلوں میں، اے جانناں!

زندگی کی سانسیں ہیں

جو ہم سے کھتی ہیں

یہی زندگی کا استعارہ ہے

کہ جو نہ مل سکے

وہی جاں سے پیارا ہے

﴿اشفاق شاہین، کراچی﴾

بی سوچوں میں کم تھا۔ امی صدیق کے کمرے میں آئیں اور انہوں نے پوچھا۔

”بیٹا کیا وجہ ہے۔ تم نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے؟ آج تم بہت پریشان لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟“

”نہیں امی جان کوئی بات نہیں۔“

”نہیں بیٹا مجھے پتا ہے۔ آج تم بہت ڈسرب لگ رہے ہو۔ مجھے بتاؤ تو سہی۔ آخر کیا بات ہے؟“

صدیق کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ صدیق کی امی نے صدیق کا سراپا گود میں لیا۔ ”بیٹا مجھے بتاؤ تو سہی آخر کیا بات ہے؟“

تب صدیق نے ہمت کی اور کہا۔ ”امی ہو سکتا ہے کہ آپ میری بات نہ مانیں۔“

”بیٹا ایسی کیا بات ہے۔ جو ہم نہیں مانیں گے۔ بتاؤ تو سہی بات ہے کیا؟“ امی نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

”امی وہ سدرہ.....!“

ایک دن سدرہ کالج میں جانے کے بجائے صدیق کے دفتر چلی گئی۔ وہاں سے دونوں ایک ریسٹورنٹ چلے گئے۔ دونوں نے وہاں اکٹھے کھانا کھایا۔ سدرہ نے کہا۔ ”دیکھو صدیق آج کالج جانے کے بجائے آپ کے پاس آئی ہوں۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میری تعلیم کا آخری سال ہے۔ بلکہ چار مہینے رہ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ہماری ملاقات نہ ہو سکے۔ کیونکہ کالج کے بہانے ہم ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں۔ اور اب میرے رشتے بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے گھر والے کسی جگہ میرا رشتہ طے کر دیں۔ ویسے بھی میرے ابو کہہ رہے ہیں کہ سدرہ کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہم جلد ہی اس کی شادی کر دیں گے۔ اس لیے تم اپنے والدین کو فوراً ہمارے گھر رشتے کے لیے بھیجیو۔“

صدیق نے کہا میں کس طرح اپنے گھر والوں کو بھجواؤں۔ وہ نہیں مانیں گے۔ سدرہ نے کہا:

”تم ایک دفعہ اپنے گھر والوں سے بات تو کر کے دیکھو۔ میں ایک لڑکی ہو کر اتنی ہمت کر رہی ہوں اور تم مرد ہو کے بزدلی دکھا رہے ہو۔“ صدیق کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر بولا۔

”نہیک ہے میں اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر رشتہ لینے ضرور بھیجوں گا۔ لیکن اگر تمہارے والدین نہیں مانے تو.....؟“

”تو کیا ہوگا؟“ سدرہ نے کہا۔

”وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ ہمارا بچپن کا ساتھ ہے۔ اور ہم نے ایک ساتھ جیسے مرنے کی قسمیں کھائی ہیں تمہیں یاد ہے کہ نہیں؟“

صدیق نے کہا ”یاد تو ہے۔“

صدیق دفتر سے سیدھا گھر گیا تو وہ کچھ پریشان سا دکھائی دے رہا تھا اور سوچوں میں گم تھا۔ اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے والدین کو سدرہ کے گھر جانے کے لیے کہے کیوں کہ اسے پتہ تھا کہ اس کے والد طبیعت کے بہت سخت ہیں۔ وہ نہیں مانیں گے۔ وہ ان

”کون سدرہ.....؟“

”امی وہ جو سدرہ ہے نا.....“

”بیٹا بولو کون سی سدرہ کیا ہوا سدرہ کو؟“ امی نے

پوچھا۔

آخر صدیق نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے ہمت سے کام لیا۔

”وہ..... امی جان میں سدرہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ آپ اور ابو جان سدرہ کے گھر جائیں اور اس کے گھر والوں سے سدرہ کا ہاتھ مانگیں۔“

امی جان نے کچھ دیر سوچا اور بولیں۔ ”بیٹا آپ کے ابو جان نہیں مانیں گے۔“

”امی جان آپ ابو کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔“ صدیق نے اصرار کیا۔

”ٹھیک ہے بیٹا میں موقع دیکھ کر تمہارے ابو سے بات کروں گی۔“

صدیق کی امی کمرے سے چلی گئیں اور جا کر صدیق کے ابو کو سب کچھ بتا دیا۔ صدیق کے ابو یہ بات سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔ انہوں نے صدیق کو اپنے کمرے میں بلایا۔ صدیق اپنے ابو کے کمرے میں چلا گیا۔

”بیٹا تم کو پتہ ہے کہ ہم اور سدرہ کے گھر والے پچھلے 30 سالوں سے ناراض ہیں اور ہم کسی کی خوشی اور غمی میں بھی شریک نہیں ہوتے۔ تم ایک پڑھ لکھے نوجوان ہو۔ تم سدرہ کے علاوہ کسی اور لڑکی کا ہتاؤ میں جاؤں گا۔ لیکن میں سدرہ کے گھر والوں کے پاس نہیں جاسکتا۔ بلکہ ان کے گھر جانا میرے لیے ناممکن ہے۔ تمہارے لیے رشتوں کی کوئی کمی ہے۔ تم پڑھ لکھے اور خوبصورت جوان ہوں۔ اور نوکری بھی لگی ہوئی ہے۔“

صدیق نے کہا۔ ”ابو جان آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں۔ میں سب جانتا ہوں۔ لیکن میں دونوں خاندانوں کو ایک کرنا چاہتا ہوں۔ پچھلے 30 سالوں میں جو کچھ بھی ہوا وہ سب بھلا کر ایک ہو جائیں اور ایسا تب ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ آپ سدرہ کا رشتہ میرے لیے

مانگ لیں۔ ویسے بھی ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ ہم نے سکول کے دور سے ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ ہمارا سچا پیار ہے۔ ہم نے اپنے اپنے گھر میں اس لیے نہیں بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں خاندانوں کے حالات ٹھیک ہو جائیں۔

لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ آخر کب تک ایسی ناراضگی رہے گی۔ کیا آپ آئندہ آنے والی نسل کو بھی یہی پیغام دے کر جائیں گے۔“

صدیق نے کہا۔ ”میں سدرہ کے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتا۔ نہ وہ میرے بغیر ایک پل زندہ رہ سکتی ہے۔ مجھے آپ کا گھر چھوڑنا منظور ہے۔“

صدیق اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی امی نے اپنے شوہر سے کہا کہ آپ سدرہ کے گھر رشتہ لینے ضرور جائیں۔ اس میں کیا حرج ہے۔ لیکن صدیق کے ابو نے صاف انکار کر دیا۔

صدیق اپنے کمرے میں گیا اور اپنے کپڑے جو تے ایک بیگ میں ڈالے اتنے میں اس کی امی جان اس کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ انہوں نے کہا۔

”بیٹا یہ کیا کر رہے ہو اور تم کدھر جا رہے ہو۔“

”بس امی جان اب مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔ میں جا رہا ہوں۔“ صدیق نے اپنا بیگ اٹھایا اور گھر سے چلا گیا۔ امی نے صدیق کے ابو سے کہا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ جانے دو۔ دو چار دن کے بعد خود ہی واپس آ جائے گا۔

صدیق نے اپنے دفتر کے نزدیک ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا اور وہیں رہنے لگا۔

ایک دن صدیق نے سدرہ کو فون کیا:

”ہاں سدرہ جی کیسی ہو۔“

”میں ٹھیک ہوں تم کیسے ہو۔“

صدیق نے کہا۔ ”میں بھی ٹھیک ہوں۔“

سدرہ بولی۔ ”تم نے اتنے دن مجھ سے رابطہ کیوں

نہیں کیا۔“

اندھا

میاں بیوی مارلیٹ جا رہے تھے تو ایک فقیر نے کہا۔ ”شہزادی دس روپے دے دو، میں اندھا ہوں۔“
شہزاد نے کہا۔ ”بچم اسے پیسے ضرور دو، وہیں شہزادی کہہ رہا ہے تو یقیناً اندھا ہوگا۔“
(اکبر عظیم، ملتان)

سے خود ملوں گی۔ سدرہ سیدی صدیق کے گھر چلی گئی۔
گھر میں داخل ہوتے ہی صدیق کے ابو نے۔
”ہاں بیٹی اندر آ جاؤ۔ کیسی ہو۔“
”جی چھو پھا میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔“
”میں ٹھیک ہوں۔“

اتنے میں سدرہ کی چھو پھی بھی آ گئیں انہیں بھی سدرہ نے سلام کیا۔

صدیق کی والدہ نے کہا۔ ”بیٹی تم آج کس طرح ہمارے گھر آ گئی ہو۔“

سدرہ بولی۔ ”یہ میرا گھر ہے۔ میں اب یہاں آتی رہوں گی۔ بلکہ یہیں رہیں گی۔“

صدیق کے ابو نے کہا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا۔“
سدرہ نے کہا۔ ”صدیق نے آپ کو بتایا نہیں۔“
”بتایا تو ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

سدرہ نے کہا۔ ”مجھے پتا ہے کہ ہمارے گھر والے اور آپ لوگ ناراض ہو۔ میں اور صدیق نہیں چاہتے کہ آپ ناراض رہوں۔ ہم دونوں خاندانوں کو راضی کرنے کے لیے ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

صدیق کے ابو نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔“
سدرہ رونے لگی۔ ”چھو پھا! دونوں خاندانوں کی ناراضگیاں اپنی جگہ پر۔ لیکن ہم دونوں کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔“

سدرہ نے چائے بھی نہیں پی اور روتی ہوئی۔

صدیق نے کہا۔ ”سوری! میں کچھ دن سے بہت پریشان تھا۔“

سدرہ نے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے والدین سے بات کی؟“

صدیق بولا۔ ”ہاں بتایا تو ہے لیکن مجھے جس چیز کا ڈر تھا وہی ہوا۔ میرے ابو نہیں مان رہے۔ میں نے گھر چھوڑ کر ہوٹل پر کمرہ کرایہ پر لے لیا ہے اور ادھر ہی رہتا ہوں۔“

صدیق نے اپنا ایڈریس دیا اور کہا تم ادھر ہی آ جاؤ۔ ہم بیٹھ کر کچھ فیصلہ کریں گے۔

سدرہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں کل کالج جانے کے بجائے سیدی تمہاری پاس آ جاؤں گی اور تم کل دفتر مت جانا۔“

صدیق بولا: ٹھیک ہے میں کل دفتر سے چھٹی کر لوں گا۔

صدیق بھی اپنی محبوبہ کے دیدار کے لیے کافی بے چین تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ ہوٹل کے باہر کھڑا ہو گیا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ سامنے سے سدرہ کو آتے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

”ہاں سدرہ کیسی ہو۔“
”میں ٹھیک ہوں۔“ سدرہ نے کہا۔
”ٹھیک ہے، کمرے میں جا کر باتیں کرتے ہیں۔“

دونوں کمرے میں چلے گئے۔ صدیق نے کہا۔ ”میرے ابو جان نے صاف انکار کر دیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ اسی لیے میں گھر بھی چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ کیا میں خودکشی کر لوں۔ میرے پاس یہی راستہ باقی ہے۔“

”نہیں صدیق تم نے ایسا ہرگز نہیں کرنا۔“ سدرہ نے کہا۔

”تو پھر کیا کروں تم ہی بتاؤ۔“ صدیق بولا۔
دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے۔

کافی دیر بعد سدرہ بولی:
میں اب تمہارے گھر چلتی ہوں اور اپنے چھو پھا

واپس صدیق کے پاس آ گئی۔“

”دونوں نے پھر رونا شروع کر دیا۔ سدرہ بھر گھر واپس چلی گئی۔“

سدرہ نے گھر جا کر اپنی امی کو کہا۔ ”امی جان میں صدیق کو چاہتی ہوں۔ اور اسی سے میری شادی ہوگی۔ ورنہ میں شادی نہیں کروں گی۔“ سدرہ کی ماں نے کہا۔ بیٹی دیکھو تمہیں معلوم ہی ہے کہ صدیق کے گھر والوں سے ہمارے تعلقات بہت زیادہ خراب ہیں اور تمہارے ابو یہ بات ہرگز نہیں مانیں گے۔“

سدرہ نے کہا۔ ”امی آپ ابو سے بات کر کے تو دیکھیں۔“

جب سدرہ کی امی نے اس کے ابو کو بتایا تو وہ آگ بگولہ ہو گئے۔

سدرہ کے ابو بولے۔ ”کیا اسی لیے میں نے تم کو کالج میں داخل کرایا تھا کہ تم صدیق سے پیار کرنے لگو۔ میں نے تم کو پہلے دن ہی کہا تھا کہ کالج کیائف خراب ہوتی ہے۔“

سدرہ کہنے لگی۔ ”ابو اس سے کالج کا کیا تعلق ہے۔ ہمیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔“

”میں نے تم کو اسی لیے پڑھایا لکھایا ہے کہ تم مجھے سبق پڑھانے کی کوشش کرو؟ خاموش ہو جاؤ اور یہاں سے چلی جاؤ۔“

سدرہ کمرے میں باپ کا رویہ دیکھ کر باہر آ گئی۔ اس کی امی بھی آ گئیں۔ انہوں نے بھی سدرہ کو دلاسا دیا۔

”بیٹی خاموش ہو جاؤ۔ آپ کے ابو کے سامنے میں کچھ نہیں کر سکتی وہ تو ویسے بھی میری کوئی بات نہیں مانتے۔“

سدرہ کے ابو کے ایک دوست کا نام فاروق تھا۔ ان کا ایک بیٹا شکیل بہت خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھا۔

سدرہ کے ابو نے اپنے دوست سے کہا کہ آپ اپنے بیٹے کا رشتہ سدرہ سے کر لیں۔ فاروق صاحب نے حامی بھر لی۔ دوسرے دن شکیل اپنے والدین کے

ساتھ ان کے ہاں پہنچ گیا اور اسے سدرہ پسند آ گئی۔

اس سے پہلے بھی سدرہ کے بہت رشتے آتے تھے لیکن سدرہ یہ کہہ کر مال دیتی تھی کہ میں ابھی پڑھ رہی ہوں۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی لیکن اب سدرہ کی تعلیم بھی مکمل ہو گئی تھی اور رشتہ بھی معقول تھا لہذا سدرہ کے ابو نے زبردستی رشتہ دینے کی ٹھان لی۔

سدرہ نے کہا۔ ”ابو مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

سدرہ کے ابو بولے۔ ”تم کون ہوتی ہو صدیق سے شادی کرنے والی۔ والدین اپنی اولاد کے لیے بہتر فیصلہ کرتے ہیں۔ تم خاموش رہو۔“

دوسرے دن سدرہ کے ابو نے فاروق صاحب کو کہا کہ دس دن کے اندر اندر آپ شادی کریں لیکن بارات بڑی دھوم دھام سے آئے۔ انہوں نے فاروق صاحب کو سب کچھ بتا دیا تھا کہ میری اپنے رشتے داروں سے نہیں بنتی ہے۔ اس لیے شادی دھوم دھام سے ہونی چاہیے۔ تاکہ میرے رشتے داروں کو پتہ چلے۔

فاروق صاحب نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، اسی طرح ہوگا۔“

سدرہ کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ تاکہ وہ صدیق سے کوئی رابطہ نہ کر سکے۔

دس دن کے بعد جب بارات آئی تو سدرہ کو دلہن بنانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سدرہ کی سہیلیاں بھی آ گئیں۔ اس نے اپنی سہیلیوں کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کس سے پیار بھی کرتی ہے۔ جب سدرہ کی سہیلیاں سدرہ کو دلہن بنانے لگیں تو سدرہ نے کہا کہ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے واش روم جانا چاہتی ہوں۔ سدرہ نے واش روم میں جا کر اپنے والدین کو خط لکھا۔

”پیاری امی جان اور ابو جان!
السلام علیکم!

آپ نے میری شادی صدیق سے نہیں ہونے دی اور مجھے زبردستی شکیل کی دلہن بنایا جا رہا ہے۔ اس لیے میں اپنی

زندگی کا خاتمہ کرنے جاری ہوں۔ مجھے معاف کرنا۔

خدا حافظ

آپ کی بد قسمت بیٹی سدرہ

ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر دریائے جہلم بہتا تھا۔ سدرہ نے فیصلہ کیا کہ وہ دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے گی۔

اس نے اپنی سہیلیوں کو بھی کچھ محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ سیدھی دریا کی طرف چل پڑی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر اپنی آنکھوں کے سامنے باندھا۔

جس جگہ سدرہ موجود تھی وہاں سے قریب ہی ایک بازار تھا۔ اور کوئی کا ایک پل بھی بنا ہوا تھا جہاں سے لوگ سامان کی خرید و فروخت کے لیے گزرتے تھے۔

اس وقت میں اور میرے دوست اسی بازار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک میری نظر سدرہ پر پڑی۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا۔

”دیکھو وہ لڑکی اپنی آنکھوں پر دوپٹہ باندھ رہی ہے۔ کوئی پاگل تو نہیں۔ کیونکہ دور سے اس کو پہنچنا مشکل تھا۔ اتنے میں سدرہ نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ جدھر سے سدرہ نے چھلانگ لگائی تھی اس جگہ کی اونچائی دو سو فٹ سے زیادہ تھی۔

میں اور میرے دوست دوڑ کر دریا کے پاس پہنچے کہ ادھر سے ہم اس کو پکڑ لیں گے۔ تقریباً پانچ منٹ تک ہم ادھر کھڑے رہے لیکن وہ نظر نہ آئی۔ ہم نے سوچا شاید وہ ڈوب گئی ہو۔

پھر ہم پل کے پار پہنچے وہاں سے دریا زیادہ بہتر طریقے سے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ سدرہ پل کے نیچے سے ہوش حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

سدرہ نے اپنی طرف سے تو پانی میں چھلانگ لگا دی تھی۔ لیکن اس کی خوش قسمتی کہ وہ رستہ جگہ پر گر پڑی تھی۔ اسی لمحے وہاں بہت زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔

ادھر گھر میں سدرہ کی تلاش شروع ہوئی تو وائس روم سے اس کا خط مل گیا۔

”سہیلیوں نے سدرہ کے والدین کو یہ خط دے دیا اتنے میں گھر والوں تک بھی خبر پہنچ گئی تھی کہ کسی لڑکی نے دریا میں چھلانگ لگا دی ہے۔ جب ان کو سدرہ کا خط ملا تو ان کو یقین آ گیا کہ وہ سدرہ ہی ہے۔

پھر سدرہ کے گھر والے بارانی اس جگہ پر پہنچ گئے صدیق کے گھر والے بھی وہاں پہنچ گئے۔

میں نے صدیق کو فون کر کے صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت صدیق بہت زیادہ جذباتی تھا۔ اس نے آتے ہی دریا میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن میں اور میرے دوستوں نے اس کو پکڑ لیا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ سدرہ نے میری خاطر اپنی جان دے دی ہے۔ اب مجھے بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ دھڑیں مار کر رو رہا تھا۔ اسی دوران سدرہ کو کنارے پر لایا جا چکا تھا۔ یہ دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی کہ وہ زندہ ہے اور صرف بے ہوش ہے۔

ہوش آنے پر جب سدرہ نے دیکھا کہ میرا محبوب جس کی خاطر میں نے اپنی جان دے دی تھی۔ وہ میرے پاس ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

صدیق اور سدرہ کے والدین بالکل خاموش کھڑے تھے۔ اس وقت سدرہ کو شاید دنیا کی ساری خوشیاں مل گئی تھیں۔

اسی وقت سدرہ کے چچا اسلم بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے خود سدرہ کا نکاح دریا کے کنارے ہی صدیق سے کر دیا۔

سدرہ اور صدیق کی اس وقت خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ آج سدرہ اور صدیق کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ سدرہ ایک سکول میں چھپر ہے اور صدیق اپنے دفتر میں ملازمت کرتا ہے۔ دونوں بہت اچھی اور خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں اور دونوں کے والدین بھی اپنی پرانی دشمنی بھلا کر ایک ہو گئے ہیں۔

☆.....☆.....☆

واپسی

ایس۔ امتیاز احمد

وہ ایتھے دنوں کی آس میں ہر دکھ
درو-ہتار ہا لیکن وقت کی بے رحمی
میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ
آگ نے اس کے دامن کو لپیٹ میں لے لیا۔

ایک لڑکی کا قصہ، وہ محبت کو روند کر دولت کے مینار بنانا چاہتی تھی



ٹوٹے ہیں کیسے خواہشوں کے آئینے کو دیکھ
پلکوں کی تہہ میں بکھری ہوئی کرچیوں کو دیکھ

ان کے دل میں ایک درد سا اٹھا اور آنکھیں پھٹک
آئیں۔ ڈھولک کی تھاپ پر گیت پوری شوخی سے فنا
میں تیرتا پھر رہا تھا۔

ہم تو کھائیں گے لکھیں لایچی، سیاں کو بیڑے کھائیں گے
اے ساسا تم کو پتیل کا پتا اور چونا چٹوانیں گے
سلمیٰ بیگم کے جڑے جکڑ گئے۔ ہاں یہ سچ ہے!
آج کل کہ بہوئیں سچ بچ ساس کو پتیل کے پتے ہی
چٹوانی ہیں۔ ان سے گیت کے باقی بول نہ سنے گئے۔
کھڑکی زور سے بند کر کے وہ دوبارہ پلنگ پر آ بیٹھیں۔
لیکن کروشیا نہیں اٹھایا کچھ دیر یوں ہی ادھر ادھر دیکھی
رہیں۔ پھر بڑھ کر تکیہ اٹھایا غلاف کے اندر ہاتھ ڈال
کر ایک کارڈ سائز فونو ڈکالا اور غور سے اسے دیکھنے
لگیں۔

یہ فونو شاید کا تھا۔

شاید..... ان کا بیٹا..... ان کی بیوی اور بڑھاپے کا
سہارا۔ ایک جوگ گویا تھا انہوں نے اس کو پالنے اور
پروان چڑھانے میں اور جب وہ خشی منی کو بیل سے
ایک تناور درخت بنا تو وہ اس کی چھایوں سے محروم،
زندگی کی لکڑی دھوپ میں تنہا کچل رہی تھیں۔

شاید..... جس کی سعادت مندی پر ان کو ناز تھا،
جس نے بھی آنکھ ملا کر ماں سے بات نہیں کی تھی۔ وہ
اب ایسا بکا نہ بن گیا تھا، ایسا کٹھور ہو گیا تھا کہ ہفتوں کیا
مہینوں صورت تک نہ دکھاتا تھا۔ بس ایک یہ کرم ضرور
کرتا کہ مہینے کی شروع تاریخوں میں پانچ ہزار روپے کا
منی آرڈر بھیج دیتا تھا۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے وہ منی
آرڈر کرتا تھا اور خود آنا بھی گوارا نہ کرتا۔ یہ پانچ ہزار
روپے کی خیرات وہ شاید اور اس کی دلہن کو دکھا کر
محتاجوں کو دے دیا کرتیں۔ خدا کا شکر تھا کہ وہ آج بھی
محتاج نہیں تھیں۔ اپنے شوہر کے پیسے سے اخراجات
پورے کرتی تھیں، ان کے محروم شوہر اپنے دونوں مکان
ان کے نام کر گئے تھے۔

چھوٹے مکان میں وہ خود رہتی تھیں۔ بڑے کے
آنکھن میں دیوار اٹھوا کر دو حصے کر دیئے تھے، جو معتدل

برابر کے مکان میں ڈھولک کی تھاپ پر ایک نیا
گیت گایا جا رہا ہے۔ سلمیٰ بیگم کے کان کھڑے ہو گئے۔
کروشیا، دھاکے کا گولہ اور چوڑی سی لیس کو پلنگ پر ڈال
کر وہ کھڑکی کے پاس آ گئیں۔

کئی روز سے بڑا بنگامہ چل رہا تھا۔ رات کو دیر تک
ڈھولک کی آواز کانوں کے پردے پھاڑا کرتی تھی۔
دماغ پر ہتھوڑے سے برساکرتے تھے۔ خدا خدا کر کے
آج دلہن رخصت ہو کر آئی تھی۔ سلمیٰ بیگم کو پوری امید
تھی کہ یہ بلا آج ختم ہو جائے گا۔ لیکن ابھی نہیں شاید
رات گئے تک ختم نہ ہو گا۔ وہ پڑوسن کے اصرا پر دلہن کو
دیکھ آئی تھیں۔ پتلی دہلی سی بڑی پیاری لڑکی تھی..... لڑکی
جواب بہو بن گئی تھی۔ بہو بن کر یہ کتنی سی لڑکی اللہ
جانے کون کون سے ستم نہ ڈھائے گی۔ ان کی پسندیدگی
ایک عجیب سی نفرت اور بیزاری میں بدل گئی اور وہ چپ
چاپ وہاں سے چلی آئیں۔ کیسا دکھ ہوا تھا۔ ان کا دل
جیسے مواد بھرا ہوا پھوڑا تھا کہ کوئی ذرا سا جھیرے اور وہ
رستے لگے۔

کھڑکی کی سلاخیں تھام کر وہ سامنے کے جگہ گاتے
دروازے کو تکتے لگیں۔ لوگ اندر آ رہے تھے، باہر جا
رہے تھے، چپکے ہوئے ایک دوسرے سے مذاق کرتے
ہوئے۔

کبھی ان کے دروازے پر بھی ایسی ہی روشنی اور
گہما گہمی ہوتی تھی۔ پڑوسن کے کھلے ہوئے پھرے اور
کانوں تک پھیلی ہوئی مسکرائیں ان کا عکس تھیں۔ وہ بھی
تو خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ اللہ! مدتوں کی
آرزو پوری ہوئی تھی۔ ان کا اکلوتا لاڈلا بیٹا دولہا بنا تھا
اور پر یوں کی شہزادی جیسی دلہن بیاہ لایا تھا۔ سلمیٰ بیگم نے
ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں میں سے ضرور صبا کا
انتخاب کیا تھا۔ ہر پہلو دیکھ کر، اچھی طرح سمجھ کر، چھان
بین کر کے اسے چنا تھا۔ صورت، مزاج، عادات، تعلیم،
خاندان کیا کچھ نہیں تھا اور جب بہو نے گھر کے اندر
قدم رکھا تو سلمیٰ بیگم کو محسوس ہوا کہ آنکھن میں سورج اتر
آیا ہے۔ سارے جہاں کی خوشیاں سمٹ آئی ہیں۔

بزرگ ہیں، اب تک گھر چلائی آئی ہیں۔ ابھی اس جنجال سے مجھے الگ ہی رکھیے۔“

مگر وہ یاقوتی لب نہ مسکرا سکے، نہ کوئی جملہ ادا کر سکے۔ وہ خاموش رہے۔ کھینچے کھینچے سے رہے اور ان کا یہ کھینچاؤ دن بہ دن بڑھتا ہی گیا۔ گھنی بھنوں کے درمیان مستقل سلوٹ رہنے لگی، اس کے ہاتھوں میں سارا گھر تھا۔ شوہر تھا اور سلمیٰ بیگم بھی تھیں جو حالات کے تیز و تند وھاروں میں ایک خاموش جزیرہ بن گئی تھیں، لیکن صبا پھر بھی مطمئن نہیں تھی۔ شاید اس کو وہ آزادی نہیں مل رہی تھی..... جس کی وہ آرزو مند تھی۔ اس کو شاید یہ بے ضرر سلمیٰ بڑی ناکارہ شے نظر آنے لگی تھیں۔ شروع میں سلمیٰ بیگم کسی بات پر پیار سے اس کو ٹوک دیا کرتی تھیں۔ صبا خاموش تو رہتی لیکن اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ صاف بتا دیتے کہ یہ روک ٹوک اس کو کس قدر ناگوار گزری ہے۔ پھر اس نے دے دے لہجے میں ساس کی مخالفت شروع کر دی۔ مثلاً انہوں نے کہا۔

”دین، اللہ رکھے اب تمہارا پاؤں بھاری ہے وقت بے وقت باہر نہ جایا کرہ اور صبا نے بھنا کر جواب دیا۔“

”اللہ..... بھئی آپ بھی کس قدر دقیانوسی باتیں کرتی ہیں۔ ایسے میں تو زیادہ سے زیادہ گھومنا پھرنا چاہیے۔“ سلمیٰ بیگم دم بخود رہ گئیں.....

یہ کلی کی لڑکی اس ننھے سے بات کرے۔ پھر یہی وہ عقل مند تھیں اور اپنی عزت اپنے ہاتھ رکھنا چاہتی تھیں، اس لیے کوئی ناگوار چھوڑ دیا۔ صبا کا جو جی چاہتا کرتی۔ وہ خاموش نمائشی بنی دیکھا کرتی۔ شاید دیکھتے ہی دیکھتے بدل گیا تھا، اب نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ آفس جاتے وقت صبا جہاں بھی ہوتی وہیں پہنچ کر خدا حافظ کہتا اور سلمیٰ بیگم کو دور ہی سے۔

”اچھا بھئی چل دیے۔“ کہہ کر گویا لٹھ مار دیتا۔ کوئی پوچھتا سلمیٰ بیگم کے لبوہان دل سے شاید نے ان کو امی کہنا بھی چھوڑ دیا تھا، پاس آنا بھی گوارا نہ کرتا۔ وہ محبت اور ممتا کی ماری اس کے پیچھے پیچھے حصار باندھتی، بھونک مارتی، دروازے تک جاتیں اور کواڑ تھامے

کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ یہ آمدنی ان کی ایک اکیلی جان کے لیے کافی تھی۔ بلکہ زیادہ بھی..... اسی آمدنی میں انہوں نے بیوگی کے اتنے ڈھیر سارے دن گزار دیئے تھے، شاید کو پڑھایا لکھایا تھا، اس کا ہر شوق پورا کیا تھا..... اپنی ہر خواہش، ہر آرزو کو پس پشت ڈال کر انہوں نے شاید کو کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ یتیم کا سے اور اب وہی شاید..... وہ آنسوؤں سے دھندلی ہوئی ہوئی لگا ہوں سے تصویر کو غور سے دیکھنے لگیں۔ رتی بھر بھی تو مختلف نہ تھا اپنے باپ سے ارشد کی نوجوانی کی یہ تصویر اور یہ تصویر ساتھ رکھ دی جاتی تو لوگ یہی سمجھتے کہ ایک ہی شخص کے دو پوز ہیں۔

صورت میں اس قدر مماثلت اور مزاج میں، عادات و اطوار میں زمین و آسمان کا فرق۔ ارشد صاحب نے بیوی کے مقابلے میں ماں کو ناکارہ شے سمجھ کر بھلا نہیں دیا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہیں ارشد صاحب ان کی جوتیاں سر پر رکھتے رہے، مگر یہ بھی نہیں کہ بیوی کو حقیر سمجھا ہوا، ان کو پوری محبت اور پوری توجہ نہ دی ہو، وہ بیک وقت ایک سعادت مند اور خدمت گزار بنے بھی تھے اور ایک مہمان اور کامیاب شوہر بھی خود سلمیٰ بیگم ساس کی محبت اور شوہر کی توجہ اور محبت کا بھرپور مزہ پاتے ہوئے ایک مثالی بیوی بن کر رہیں۔

ساس ان کو بیٹی سمجھتی تھیں۔ انہوں نے سچ سچ بیٹی بن کر دکھایا اور جب وہ خود ساس بنیں تو اپنی ساس کی مانند اپنی خوبصورت بہو کو ویسی ہی متاوی جس کا مزہ وہ بہو بن کر اٹھا چکی تھیں۔ سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ چایوں کا گچھا بہو کے حوالے کر دیا۔ وہ اس چایوں کے گچھے کے بڑے بڑے قے سے چکی تھیں کہ ساس اور بہو کے جھگڑوں کی یہی جڑ ہوتی ہے۔ انہوں نے اس جڑ کو اکھاڑ پھینکا۔ گھر کو پوری طرح بہو کو سونپ دیا۔ حد یہ کہ جب شادی کے بعد شاہد تنخواہ لے کر آیا تو انہوں نے پوری تنخواہ مسکراتے ہوئے بہو کی گود میں ڈال دی۔

اس مسکراہٹ کے جواب میں ان کو صبا کے یاقوتی لبوں سے یہ سننے کی تمنا تھی..... ”امی جان..... آپ

تھیں۔ دنیا جہاں کاسکون مل جاتا تھا ان کو۔
اگر وہ نیا آشیانہ بنا کر نہ چلا گیا ہوتا تو یہ آنگن اس
کے بچوں کی چکروں سے گونجا کرتا۔ یہ سونا پن ناگ
بن کر ان کو نہ ڈستا۔

بچے..... شاید کے بچے..... انہوں نے تصور میں
کئی پھول سے بچوں کو دیکھا اور مسکرا انہیں۔ صبا اور شاہد
کی ملی جلی مسکرائیں، گلاب، چنبیلی۔

پھر اچانک ان کی یہ مسکراہٹ دم توڑ گئی، وہ دونوں
ایک ایسے وقت میں الگ ہوئے جب قدم قدم پر کسی
شفیق ہستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صبا کو خدا رکھے چھٹا
مہینہ تھا انہوں نے حساب لگایا اور چونک پڑیں یعنی اب
نواں مہینہ، تین مہینے ہو رہے تھے ان کو گئے ہوئے نہ
کوئی خیر..... نہ کوئی خیر.....

اللہ! وہ نا تجربہ کار لہڑکی اور وہ لالہابی لڑکا۔ ان کا
دل مسوس اٹھا۔

جانے آج وہ دونوں اس قدر کیوں یاد آ رہے
تھے۔ گھر کا سونا پن اس بری طرح کیوں محسوس ہو رہا
تھا۔ وہ تل کے پاس جا کر وضو کرنے لگیں۔ جب دل
بہت بے قرار ہوتا تو وہ اپنے رب سے لو لگائیں، ان کو
سکون حاصل جاتا، ڈھارس سی بندھ جاتی۔

ابھی سلگنی بیگم جائے نماز پر کھڑی دوپٹے سر کے گرد
باندھ ہی رہی تھیں کہ دروازہ دھیرے سے کھلا..... کون
ہو سکتا ہے؟..... وہ حیران سی ہو کر دیکھنے لگیں۔

وہ بہت آہستہ آہستہ اندر آیا۔

وہ..... بابا وی..... ان کا شاید..... ان کا بیٹا.....

ان کا کھوا ہوا سکون..... ان کے دل کی ٹھنڈک

وہ صبح کا گھر بھولا ہوا شام کو واپس آیا تھا۔

سب کچھ بھول کر سارے گلے شکوے پس پشت

ڈال کر دونوں ہاتھ پھیلا کر وہ تڑپ کر بولیں..... ”میرا

بیٹا..... میرا چاند.....“

شاہد تیری طرح آیا اور ماں کی کھلی بانہوں میں تان گیا۔

”امی..... امی.....“ وہ رو رہا تھا۔ بچپن سے اس

کا سارا جسم لرز رہا تھا۔

اللہ رکھے! پورا جوان مرد اوریوں بلک بلک کر
روئے۔ وہ بے اختیار ہنس پڑیں۔ زور سے شاہد کا سر
سینے سے بچھینچ کر بولیں۔

”خیر تو ہے؟ تو تو ایسے رو رہا ہے جیسے کسی لڑکے
نے تیری گیند پھینچ لی ہو..... ایسے ہی روتا آتا
تھا.....؟ یاد ہے تجھے۔“

”امی.....“ شاہد اسی طرح روتے ہوئے بولا۔

مجھے معاف کر دیجئے امی..... میں اب آپ کو چھوڑ کر
نہیں جاؤں گا..... اس خوبصورت آرام دہ فلیٹ میں
میرا دم گھٹتا ہے امی۔

”میرے بچے!“ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ زور سے
ہنس، زور سے رو میں۔

”اور امی، صبا نے پچھلے ہفتے ایک خوبصورت بچے
کو جنم دیا ہے۔“

”میرا پوتا..... میرے لال کا لال.....“ انہوں نے

شاہد کا سر چوم لیا۔

”اور امی.....“ شاہد کہتا رہا۔ ”میں نے دیکھا کہ

صبا بچے کے ساتھ رات بھر جاگتی ہے۔ جب کہ اس کو
اپنی نیند اس قدر عزیز تھی کہ رات کو جگائے جانے پر
لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتی تھی۔ بچے کے آرام کی خاطر
وہ اپنا آرام بھول گئی ہے۔

پھول کی طرح اسے دل سے لگائے رہتی ہے۔

تب امی..... میں نے سوچا کہ آپ نے بھی مجھے اسی

طرح پھول بنا کر رکھا تھا..... میرا یہ احساس اس قدر

بڑھا کہ میں..... کہ میں آج آپ کی گود میں واپس

آ گیا۔ نہ صرف میں بلکہ صبا بھی بہت شرمندہ ہے۔

اس نے آپ سے الگ ہو کر بڑی ٹکفیں اٹھائی ہیں۔“

”اے سے، تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ میری

پھول سی دلہن اور ٹکی سا بچہ ابھی تک باہر ہیں۔“

وہ گرتی پڑتی دروازے کی طرف دوڑیں، بالکل

اسی روز کی طرح جب پھولوں سے لدی کاریں صبا دلہن

بن کر آئی تھی۔

سچی بات

انٹرویوئی صفحات میں

دیباے رنگ ڈیر - آپ کے لہائی - پارک گیار - پادری خانہ - شہزادہ
برجوں کا طسم کدہ - غمگینی - ٹوک جھونک - آپ کے مسائل کا روحانی حل

دنیا رنگ و نور

سلطان راہی..... ایک عظیم اداکار

﴿دوست محمد خان ڈٹو﴾

ہوئے فنکار نے ہمت نہ ہاری کیونکہ اسے خدا کی ذات پر مکمل ایمان تھا اور اسے یقین تھا کہ آج میں جن

راہوں پر پیدل
خاک چھان رہا
ہوں۔ ان ہی
راستوں پر ایک دن
خوبصورت گاڑی
میں سفر کروں گا تو
لوگ میری ایک
جھلک دیکھنے کے
لئے بے قرار ہوں
گے ایسے حسین بنے
وہ سوتے جاتے
دیکھا کرتا تھا۔

اس نے بڑی
غربت اور بے بسی
کے دن دیکھنے کے
باوجود اپنی تشہ لب
حسرتوں کا سفر
جاری رکھا لیکن بے
پناہ کوششوں اور
منت سماجت کے

باوجود فامی پندتوں نے اسے کوئی بھی کردار نہ دیا تو شوق کی تکمیل کے لئے وہ ایکسٹرا اداکاروں کی صف میں شامل ہو کر دیباڑی دار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس طرح اس کے پیٹ کی آگ بھی بجھنے لگی اور خوانش کی تکمیل بھی ہونے لگی۔ اس دوران سیٹ پر کوئی فلم ساز

وہ راولپنڈی کے ایک دور افتادہ گاؤں سے آنکھوں میں حسین سپنوں کی جوت جگائے فلم انڈسٹری

کے مرکز لاہور میں آیا
تھا اس زمانے میں
بلیک اینڈ وائٹ فلمیں
بنا کرتی تھیں اور فلم
انڈسٹری اپنے عروج پر
تھی اس جیسے کئی ایک
من چلے دل میں
اداکاری کا شوق لیے
لاہور کی سڑکوں پر
پریشان حال پھرا
کرتے تھے۔ مگر ان
کے دلوں میں جوان
امنگوں اور چلتی تمناؤں
کا کوئی بھی پرسان حال
نہیں تھا..... ابتدائی
دنوں میں اس نے بھی
جس فلم ساز یا ہدایتکار
سے بات کر کے اپنے
اندر چھپے فنکار کو
روشناس کرانے کی

کوشش کی اسے نفرتوں کی ہرزہ سرائی کے علاوہ کچھ نہ مل
سکا۔ اس پر طنزیہ ہنسی کے قہقہے لگائے گئے۔ وہ اکثر
لاہور کے فامی مرکز رائل پارک سے فلم سٹوڈیو تک پیدل
سفر کرتا جیب میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے وہ کئی کئی
وقت فاقوں کی حالت میں رہتا لیکن اس کے اندر چھپے

یا پھر ہدایتکار کسی سے پانی مانگتا تو وہ فوراً بھاگ کر پانی پیش کر دیتا لیکن پھر بھی وہ ہمدردیاں حاصل نہ کر سکا۔ کئی سالوں کی انتھک محنت کے بعد وہ ایکسٹریسے فائٹر بن گیا مگر اس نے اپنی محنت لگن اور کوشش کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا چند سالوں کی ریاضت کے بعد اللہ نے مہربانی کی اس کی لگن رنگ لائی۔ فلم ساز سلیم اشرفی نے اس کے جسم میں بے پناہ پھرتی اور چستی کو بھانپ کر اپنی فلم جھانجر میں ایک اچھا کردار دیا اس نے اپنے جسم کی ساری توانائیاں خرچ کر کے اس کردار کو امر بنا دیا اسی کردار سے اس کی پہچان بنی اور وہ سلطان سے سلطان راہی بن گیا پھر سلیم اشرفی نے اسے اپنی فلموں میں کئی مختصر کردار دیئے اس نے محنت اور خلوص کے ساتھ وہ کردار ادا کیے تو فلمی دنیا میں سلطان راہی کا نام سنائی دینے لگا۔

وہ بلا کا پھر تیتلا اور ایکشن میں تاک تھا کئی فلمسازوں نے اسے ولن بنا دیا وہ اردو اور پنجابی فلموں میں یکساں طور پر ولن بنا مگر اس کے ذہن میں ہیر و ہننے کا شوق گردش کرتا رہا۔

ہدایتکار اسلم ڈار نے اپنی پنجابی فلم ”بشیرا“ میں سلطان راہی کو نائل رول دے کر اس کے نقشہ لب جذبوں کی پذیرائی کر دی یہ پہلی فلم تھی جس میں سلطان راہی نے ایک مشکل اور مرکزی کردار میں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا تھا۔ سلطان راہی بھی کچھ ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے بشیرا کے کردار میں ڈوب کر کچھ ایسی بے مثال اداکاری کی جس فلم سینما گھروں میں ریلیز ہوئی تو فلم بین سلطان راہی کی بے ساختہ اداکاری دیکھ کر سلطان راہی کے دیوانے بن گئے۔

لاہور کی گلیوں، بازاروں، سڑکوں حتیٰ کہ ہر جگہ سلطان راہی کا نام گونجنے لگا۔ ”بشیرا“ نے کامیابی کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے اور سلطان راہی فلم سازوں کی ضرورت بن گیا وہ فلم ساز جو کبھی اس پر طنز یہ ہنسی مانتے تھے اور قہقہہ لگایا کرتے تھے وہ راہی صاحب کہتے کہتے سلطان راہی کے پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے۔

بشیرا کی باس آفس کامیابی نے بعد سلطان راہی پر کامیابی نے بے درازے مل کر تھے اقبال آباد کی فلم باہلی کامیابی نے بعد ان راہی نے وہ فلم قاسمی کے افسانے گنڈا سے لے کر لڑکھائی فلم، دنی جٹ بنائی جس کا مرکزی کردار سلطان راہی کو دیا گیا وحشی جٹ نے بھی بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ فلم، دنی جٹ کا فلم بینوں نے فقید المثال استقبال حاصل کیا۔ سلطان راہی نے ہی شوٹنگ کے دوران نماز قائم کرنے کے رجحان میں اضافہ کیا۔ وہ کسی بھی جگہ شوٹنگ میں مصروف ہوتا نماز کے وقت شوٹنگ ختم کر کے نماز ضرور پڑھتا تھا۔ سلطان راہی نے کئی بے کس اور مجبور لوگوں کو بیٹیوں کے جبینے کے لئے پیسے دیئے وہ داتا دربار پر بکثرت جایا کرتا تھا اور دینی مجالس میں شرکت کر کے راحت محسوس کرتا تھا۔

وہ ایک ہمدرد انسان اور بے مثال فنکار تھے وہ سال با سال سے فن اور آجنگ کی دنیا میں موجود تھے عیش و عشرت دولت شہرت ان کے گھر کی کنیریں تھیں لیکن وہ شخص ڈمگانے کی بجائے نیکی اور زہد و عبادت کی طرف بڑھتا چلا گیا سلطان راہی نے اپنی گرہ سے بے شمار لوگوں کو فائز فراہم کر کے فلمیں بنوائیں۔ انہوں نے کئی دفعہ ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا لیکن فلم انڈسٹری کے لوگوں نے اپنی اولاد کا واسطہ دے کر انہیں دوبارہ کام کرنے پر مجبور کر دیا۔

8 جنوری 1996ء رات ایک بے گوجرانوالہ بائی پاس کے قریب سلطان راہی جس کار میں سفر کر رہے تھے اس کا ٹائر پھٹ گیا۔ سلطان راہی کا ڈرائیور ٹائر تبدیل کر رہا تھا وہ نامعلوم ڈاکوؤں نے سلطان راہی کو قتل کر دیا اور بیس ہزار کی رقم بھی لے گئے اس طرح فلمی دنیا کا ایک سنہرا باب ختم ہو گیا۔ لیکن فلم انڈسٹری کی تعمیر و ترقی میں سلطان راہی مرحوم کے کردار کو فلم انڈسٹری کا مورخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

☆.....☆.....☆



اپنے فلمی کیریئر کا آغاز پاشا نے عباس مستان کی فلم ”اجنبی“ سے کیا اور اس فلم کے لیے بہترین پرفارمنس پر فلم فیئر بیسٹ فیملی ڈیبت ایوارڈ حاصل کیا۔ یوں فلمی دنیا میں ان کی کامیابیوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ 2002ء میں ان کی فلم ”راز“ نے سال کی کامیاب ترین فلم کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کے بعد 2003ء میں بننے والی فلم ”جسم“ میں ان کا رول سب کی توجہ کا مرکز رہا۔

2011ء پاشا کے مطابق ان کے لئے بہت اہم اور معنی خیز ثابت ہوا۔ اس معنی خیزی سے یقیناً ان کی مراد جان ابراہم سے بریک اپ کا ناخوشگوار واقعہ ہے۔ جان ابراہم سے ان کی رفاقت نو، دس سال کے طویل عرصے پر محیط تھی لیکن پاشا نے بڑے حوصلے کے ساتھ زندگی کی اس حقیقت کو قبول کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ سال انہیں بہت سے نئے تجربات حاصل ہوئے لیکن وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی عادی نہیں۔

پاشا کا کہنا ہے کہ میں زیادہ دیر تک کسی غم کو، اس سے لگائے رکھنے کی قابل نہیں..... میری پالیسی ہے، دوستوں کے ساتھ ملنا جلنا اور زندگی کو انجوائے کرنا۔ اور

پاشا باسو 7 جنوری 1979ء کو نئی دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق ایک ہندو بنگالی فیملی سے ہے۔ وہ تین بہنیں ہیں، جن میں پاشا کا نمبر دوسرا ہے۔ وہ بچپن ہی سے ڈاکٹر بننے کی خواہش مند تھیں لہذا انہیں تک انہوں نے سائنس کے مضامین پڑھے لیکن دوران تعلیم ہی وہ حادثاتی طور پر ماڈلنگ کی جانب آگئیں اور پھر اسی کو اپنا کیریئر بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر بننے کی خواہش کو خیر باد کہنے کے بعد انہوں نے کامرس کے مضامین کا انتخاب کر لیا اور اس دوران ماڈلنگ اور ریپ شوز میں حصہ لیتی رہیں۔ پاشا نے 16 سال کی عمر میں بطور پارٹ ٹائم ماڈلنگ کا آغاز کیا تھا۔

یہ سلسلہ جاری تھا کہ اسی دوران ان کی ملاقات مشہور ماڈل مہر جیسا سے ہوئی۔ انہوں نے پاشا کو ایک سپر ماڈل کو ٹیسٹ میں حصہ لینے کا مشورہ دیا۔ پاشا نے اس مشورے پر عمل کیا اور اس مقابلے کی فاتح قرار پائیں۔ سپر ماڈل کا ٹائٹل جیتنے کے بعد وہ امریکہ، برازیل، کینیڈا جہاں سے انہوں نے اپنے کامیاب ماڈلنگ کیریئر کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کی عمر شخص 17 سال تھی۔



ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر میں یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ جب تک میں شادی نہیں کر لیتی، مسئلہ ہی کہلاؤں گی۔ ویسے شادی کرنے کے لیے تو میں تیار ہوں۔ لیکن کوئی موزوں ساتھی بھی تو ملے!

کہنے کو تو پاشا نے یہ کہہ دیا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی عادی نہیں..... لیکن بیتے ہوئے دنوں کی یاد بہر حال دل میں محفوظ رہتی ہے۔ اپنی سابقہ رفائقوں کے بارے میں پاشا کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ ”مجھے ڈیو موریہ اور ملند سومن کی رفاقت میں بہت محبت حاصل ہوئی لہذا ہم اب بھی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ لیکن یہاں انہوں نے جان ابرہم کا ذکر نہیں کیا..... آخر وہ بھی تو ان سے محبت کے دعوے دار تھے۔

اپنے کام کے حوالے سے پاشا کہتی ہیں کہ نئی بات یہ ہے کہ میں اپنے کام کے ہر مرحلے کو بے حد انجوائے کرتی ہوں۔ آج کا فلم بین ایک ماس پلیٹ قسم کی فلم دیکھنا چاہتا ہے لہذا میری آنے والی زیادہ تر فلمیں اسی طرز کی ہیں۔ حال ہی میں پاشا باسو کی فلمس ویڈیو کو بہت پذیرائی ملی ہے۔ اس سلسلے میں وہ مزید کام کرنے کے لیے بہت پر جوش و کھماں دیتی ہیں۔ پاشا کے مطابق

میری فلمس Love your self، DVD زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اسی لیے میں اگلی DVD پر کام کرنے کی خواہش مند ہوں۔ لیکن اداکاری کی طرف مصروف ہونے کی وجہ سے فی الحال میں اس پر کام نہیں کر سکتی۔ امید ہے کہ اگلے سال کے دوران میں اس کے لیے ضرور ٹائم نکال پاؤں گی۔ میرا ارادہ ہے کہ میری اگلی ویڈیو عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے یکساں مفید ثابت ہو۔ جبکہ میری پچھلی ویڈیو صرف عورتوں کی فلمس پر مبنی تھی۔





آپ اور آپ کے مہمانوں کی جان
چٹ پیٹے اور مزیدار پکوان

ترتیب: مشعل فاروقی

عید الاضحیٰ اسپیشل

کر بلکی آج پر پکنے رکھ دیں۔ جب گوشت گلنے پر
آجائے تو نمک، دہی اور آئل ڈال کر اتنی دیر بھونیں
کہ نمٹاڑ اچھی طرح گل جائیں اور تیل علیحدہ ہو
جائے۔ آخر میں ادک اور ہرا دھنیا چھڑک کر بلکی آج
پر تین سے چار منٹ دم پر رکھ دیں۔ پھر ڈش میں نکال
کر نان یا پرائشوں کے ساتھ اس زبردست کڑاہی کا
مزہ لیں۔

☆.....☆.....☆

تاش کباب

اجزاء:

بکرے کا گوشت آدھا کلو
نمک حسب ذائقہ
ادک لہسن کچلا ہوا دو کھانے کے چمچ
پیاز سلاکس کئے ہوئے دو عدد درمیانے
آلو قتلے کئے ہوئے تین عدد درمیانے
شملہ مرچ گول کٹی ہوئی ایک سے دو عدد
دہی آدھی پیالی
کالی مرچ کٹی ہوئی ڈیڑھ چائے کا چمچ

مٹن گرین کڑاہی

اجزاء:

بکرے کا گوشت ایک کلو
لہسن کچلا ہوا دو کھانے کے چمچ
ادک باریک کٹی ہوئی ایک کھانے کا چمچ
نمک حسب ذائقہ
دہی پھینٹا ہوا آدھی پیالی
ہری مرچیں پس پی ہوئی ایک کھانے کا چمچ
سفید زیرہ ایک کھانے کا چمچ
ثابت دھنیا ایک کھانے کا چمچ
ہرا دھنیا آدھی گٹھی
آئل آدھی پیالی

ترکیب:

کڑاہی میں ایک کھانے کا چمچ آئل ڈال کر
درمیانے آج پر ایک سے دو منٹ گرم کریں پھر اس میں
لہسن اور گوشت ڈال کر چار سے پانچ منٹ بھونیں۔
ہری مرچیں، کالی مرچ، سفید زیرہ اور ثابت دھنیا ڈال
کر دو سے تین منٹ بھونیں۔ پھر ایک پیالی پانی ڈال



اجوائں آدھا چائے کا چمچ نمک
آئل چار کھانے کے چمچ اورک لبسن پسا ہوا

ترکیب:

گوشت کی چھوٹی بوٹیاں کر کے اس میں اورک لبسن، نمک، کالی مرچ اور اجوائں ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور ایک سے دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر اسی مصالحے میں گوشت کے ساتھ آلو، پیاز، نمائز اور شملہ مرچ ڈال کر بلکے ہاتھ سے ملا لیں تاکہ سبزیوں پر بھی مصالحہ اچھی طرح لگ جائے۔ پندرہ سے بیس منٹ بعد سبزیوں کو احتیاط سے علیحدہ نکال لیں، گوشت میں آئل ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور درمیانی آٹے پر ڈھک کر پکنا رکھ دیں۔ بیس سے پچیس منٹ بعد جب گوشت ادھ گلا ہو جائے تو پہلے پیاز اور آلو پھر نمائز اور آخر میں شملہ مرچ کی تہ لگا دیں دوبارہ سے ملکی آٹے پر اتنی دیر پکائیں کہ گوشت مکمل گل جائے۔ اس ترکی ڈش کو احتیاط سے اسی طرح تہ در تہ ڈش میں نکالیں اور ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

☆.....☆.....☆

بوٹی کباب اور روے میدے کے پراٹھے

اجزاء:

بغیر ہڈی کی بوٹیاں آدھا کلو

آدھا کلو میدہ لے کر اس میں آدھی پیالی

کے لیے:

روے میدے کے پراٹھے بنانے

کے لیے:

سے سات منٹ فرائی کرنے کے بعد ہری مرچیں شامل کر دیں اور ایک سے دو منٹ مزید فرائی کر کے چولہے سے اتار لیں۔ ڈش میں نکالتے ہوئے ان مزیدار اسٹیکس پر حسب پسند کٹی ہوئی کالی مرچ چھڑک دیں اور انہیں مشروم ساس کے ساتھ پیش کریں۔

☆.....☆.....☆

گرٹ والے چاول

اجزاء:

تین پیالی	چاول
دو سے ڈھائی پیالی	گرٹ (کٹا ہوا)
دو انچ کا ٹکڑا	دار چینی
تین سے چار عدد	چھوٹی الائچی
(باریک کٹا ہوا) حسب پسند	خشک ناریل
ایک کھانے کا چمچ	خشک ش
تین سے چار کھانے کے چمچ	گھی

ترکیب:

چاولوں کو دھو کر بیس منٹ کے لیے بھگو دیں، پھر دس سے بارہ پیالی پانی میں چٹکی بھر نمک ڈال کر ابال آنے دیں۔ ابال آنے پر چاول ڈال کر دس سے بارہ منٹ یا مکمل کپنے تک درمیانی آنچ پر ابالیں اور چھانی میں ڈال کر پانی نکال دیں۔ گرٹ کو ایک پیالی پانی میں بھگو کر رکھ دیں اور جب اچھی طرح گھل جائے تو اسے چھان لیں۔ پین میں گھی کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ گرم کریں، اس میں دار چینی اور الائچی ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور ڈھک کر دم پر رکھ دیں۔ دس سے بارہ منٹ کے بعد ڈھکن کھول کر اچھی طرح ملا لیں۔ سردیوں کے موسم میں گرم گرم بھاپ اڑاتے ہوئے چاولوں کا لطف اٹھائیں۔

☆.....☆.....☆

سو جی، چٹکی بھر نمک اور ایک کھانے کا چمچ گھی ڈالیں۔ آدھی پیالی دودھ ڈالتے ہوئے گوندھ لیں اور پندرہ بیس منٹ کے لیے لمل کے گیلے کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیں۔ چھوٹے چھوٹے چوکور پراٹھے تیل کر گھی ڈالتے ہوئے سینک لیں۔ بوٹی کباب کو ڈش میں نکال کر اسے برا دھنیا، ہری مرچیں اور پیاز کے لچھوں سے سجالیں اور گرم گرم پراٹھے کے ساتھ پیش کریں۔

☆.....☆.....☆

گریک اسٹیک

اجزاء:

پسندے	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
ادرک پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
لہسن پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
کالی مرچ پسپی ہوئی	آدھا چائے کا چمچ
سفید سرکہ	دو کھانے کے چمچ
پیاز باریک کٹی ہوئی	دو عدد درمیانی
ہری مرچیں	چار سے پانچ عدد
آئل	چار کھانے کے چمچ

ترکیب:

پسندوں کو دھو کر ہاکا ہاکا کچل لیں، ایک پیالے میں نمک، ادرک، لہسن، کالی مرچ اور سرکہ ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ پسندوں کو کچھیر سے میریٹ کر کے ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں، پین میں ڈال کر ڈھک کر بلکی آنچ پر پکھنے رکھ دیں۔ اتنی دیر پکائیں کہ اس کا پانی خشک ہو جائے۔ فرائیٹنگ پین میں آئل کو درمیانی آنچ پر ایک سے دو منٹ گرم کریں اور اس میں پیاز اور پسندے ڈال کر تیز آنچ پر فرائی کریں۔ پانچ

کچن گائیڈ

سالن میں مرج کم کرنے کے لیے:

اگر سالن میں مرج تیز ہو جائے تو ایک پیاز تل کر اخبار پر پھیلا دیں۔ تھوڑی دیر میں جب پیاز خستہ ہو جائے تو اسے ہاتھ سے پھیل کر سالن میں ڈال دیں اور ساتھ ہی ایک لیموں بھی نچوڑ دیں۔ مرج کم ہو جائے گی۔

کھانسی دور کرنے کے لیے:

اگر کسی بھی وجہ سے کھانسی ہو جائے تو رات میں سونے سے پہلے ایک گلاس گرم دودھ میں آدھا چائے کا چمچ پسلی ہوئی سفید مرج ڈال کر پی لیں کھانسی ختم ہو جائے گی۔

مصالحوں کو محفوظ رکھنے کے لیے:

مصالحوں کے ڈبوں کے اندر 2 سے 3 قطرے مونگ پھلی کے تیل کے لگانیں پھر مصالحہ رکھیں۔ آپ کے مصالحے بہت دن تک محفوظ اور بالکل تازہ رہیں گے۔

سینڈوچ اور برگر نرم رکھنے کے لیے:

برگر کا بند یا سینڈوچ کی ڈبل روٹی کچھ دیر تک باہر رکھیں تو وہ سوکھنے لگتے ہیں۔ اگر ان کے اوپر گرم دودھ لگا دیں تو یہ کئی گھنٹوں تک نرم رہیں گے۔

زیادہ مزیدار مرغی کے تکوں کے لیے:

مرغی کے تکوں میں مصالحے لگا کر فریزر میں رکھ دیں۔ جس وقت کھانے کے لیے پیش کرنے ہوں اس سے ایک گھنٹہ پہلے فریزر سے نکالیں اور پھر انہیں سینوں پر لگا کر سینک لیں اس طرح سے مرغی کے تکے زیادہ مزہ دیں گے۔

تازہ بسکٹوں کے لیے:

پیکنگ کھولنے کے بعد بسکٹس بہت جلدی نرم ہو کر خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر بسکٹوں پر ذرا سی چینی چمڑک کر بند ڈبے میں فرج میں رکھیں تو بسکٹس کئی دنوں تک تازہ رہیں گے۔

تازہ ہری مرچوں کے لیے:

اگر تازہ ہری مرچیں چاہیے تو ہری مرچوں اور لال مرچوں کو ہاکا سا پھل کر نمک اور تیل لگا کر فریزر میں رکھ دیں۔

سالن کے تیز رنگ کے لیے:

بعض اوقات بہت کوشش کے باوجود سالن میں اچھا رنگ نہیں آتا۔ اگر دہلی مرچوں کو ابال کر پیس لیں اور پھر اسے سالن میں ڈالیں تو اس سے سالن میں بہت تیز رنگ آئے گا۔

آٹے کو کیڑوں سے بچانے کے لیے:

چندر روز رکھنے کے بعد آٹے، مین یا میدے کو کیڑا لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر آٹے، مین یا میدے میں دو سے تین نیچے ڈال دیں تو ان میں کیڑے نہیں پڑیں گے۔

تھکن کا احساس دور کرنے کے لیے:

ناشتے کے بعد ایک کھانے کا چمچ دہلی کھالیں، آپ کو سارا دن تھکن کا احساس نہیں ہوگا۔

انار نہایت خوش مزہ رسیلا پھل ہے۔ مزے کے لحاظ سے کھٹا، میٹھا اور کھٹ میٹھا تین قسم کا ہوتا ہے۔ قندھاری انار جس کے دانے سرخ یا قوتی رنگ کے ہوتے ہیں

کھٹا اور کھٹ میٹھا انار غذا کو ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ان کے دانوں کو سکھا کر چورنوں میں ملاتے ہیں، جو ہضم غذا کے لئے کھائے جاتے ہیں۔

انار دانہ پانچ تولے، سونٹھ، زیرہ سفید، نمک سیاہ ہر ایک ایک تولہ کو کوٹ کر ایک جان کریں۔ یہ نہایت لذیذ چورن بن جاتا ہے۔



رسیلا چاشنی دار ہوتا ہے۔ پرانے حکیم انار کے غذائی اور دوائی فائدوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ جدید تحقیقات بھی اس کی

تصدیق کرتی ہے۔ چنانچہ انار میں اجزاء، پروٹین، شکر، چونہ (کیلشیم) فولاد اور فاسفورس جیسے کارآمد اجزاء پائے جاتے ہیں، جو خون کی پیدائش اور بدن کی پرورش میں کام آتے ہیں اور خون کو حالت اعتدال پر قائم رکھتے ہیں۔

انار کے پتوں کو پیس کر ٹکیہ بنا کر باندھنے سے دھستکی آنکھوں کا درد اور سرخی دور ہو جاتی ہے۔

انار کا چھلکا جس کو ”ناسپال“ بھی کہتے ہیں، اپنے دوائی فائدے کے لئے مشہور ہے۔ اس میں ایک خاص جوہر ہوتا ہے، جو اعضا کی ساختوں کو سکھاتا اور ان کو مضبوط بناتا ہے۔ چنانچہ اس کے جوشاندے سے کلیاں کرانے سے ذہیلے مسوڑھے مضبوط ہو جاتے ہیں۔ کوالنک آیا ہو تو اس کے غرارے کرانے سے وہ اصلی حالت پر آ جاتا ہے۔ اس کا جوشاندہ تیار کر کے پلانے سے یا سفوف بنا کر کھلانے سے دست اور پیچش بند ہو جاتے ہیں۔

ان سب باتوں نے اس پھل کو غذائی اور دوائی دونوں اعتبار سے بہترین پھل بنا دیا ہے۔ اس کا چاشنی دار رس طبیعت میں خوشی پیدا کرتا ہے، پیاس بجھاتا اور ساتھ ہی بدن کو اچھی غذائیت بھی دیتا ہے۔ صفراوی اور خونی بخاروں میں جب مریض کے لئے محسوس غذاؤں کا استعمال مناسب نہیں ہوتا، انار کا رس مریض کی پیاس کو بجھاتا اور حرارت کو کم کرتا ہے اور غذائیت کی وجہ سے اس کی امزجی کو قائم رکھتا ہے۔

اگر صفراوی بخار کے مریض کو قے اور متلی کی شکایت ہو، دست آ رہے ہوں تو وہ بھی اس کے استعمال

ریشمی سندیسے

ریشمی قارئین کے نام پیغام

میرے پیارے ساتھیو ”ریشم“ کے ذریعے میرا پیغام آپ سب کے لیے ہے۔ پلیز دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی طرف بھی توجہ دیں۔ انگلش تو فرفر بوتے ہیں۔ لیکن کلمہ نہیں آتا۔ قرآن مجید کی تلاوت نہیں کرتے۔ نمازیں ہماری قضا ہوتی ہیں۔ بلکہ پڑھتے ہی نہیں۔ پلیز دنیا کی رنگینیوں میں کم نہ رہیے، مذہب، نماز، قرآن پاک کی تلاوت کو معمول بنائیے تاکہ آخرت میں سرخرو ہو سکیں۔ یہی ہماری سفارش کریں گے پلیز.....

(مجید احمد جانی آف ملتان، 0301-7472712)

0301-7472712

AS کے نام

کس طرح میں اپنے آپ کو یقین دلاؤں کہ تم مجھ سے دور ہو مگر کیا کروں سمجھ میں ہی نہیں آتا؟ میں تمہیں بھولنا چاہوں بھی تو نہیں بھلا سکتا۔ میرے دل میں تیرے لیے اتنا ہی پیار ہے جتنا پہلے تھا۔ اگر ہو سکے تو پلیز لوٹ آنا، ایک دینا کا ستایا ہوا تیرا آج بھی انتظار کر رہا ہے۔

(ایم ارشد وفا، گوجرانوالہ، 0312-4406374)

0312-4406374

ملک عاشق حسین ساجد کے نام

ساجد بھائی میں آپ کا احسان پوری زندگی نہیں بھولوں گا۔ آپ نے مجھے ریشم ڈائجسٹ سے روشناس کرایا

سندیہ سب کے لیے

چھوٹا سا مگر بہت پیارا سا پیغام، عزت دل میں ہوئی چاہیے لفظوں میں نہیں ناراضگی لفظوں میں ہوئی چاہیے دل میں نہیں

(ریاض حسین تبسم، فیصل آباد)

0345-4001612

”عافیہ“ کے نام

ہم نے ہر دکھ کو محبت کی عنایت سمجھا ہم کوئی تم تھے جو اوروں سے شکایت کرتے

سب دوستوں کے نام

بانٹ جی بھر کے اسے دہر کے صحراؤں میں پیار دولت تو نہیں ہے کہ جو گھٹ جائے گی (اشفاق شاہین، کراچی)

0345-4001614

اللہ دتہ بے درد کے نام

میرے پیارے شاگرد جی! مری کیا گئے، بھول ہی گئے۔ ٹھنڈی، ٹھنڈی ہوائیں، اونچے اونچے پہاڑ، صاف و شفاف چشمے پسند آ گئے۔ خوب انجوائے کرو بابا..... لیکن ہم بھی آپ کے منتظر ہیں۔ دیکھو تمہاری یاد نے ہمیں کمزور سا کر دیا ہے۔ اپنی خیریت دیجئے یقیناً ”ریشم“ آپ کے ہاں چمکتا دمکتا ہوگا۔

آپ جی کی وجہ سے میری ریشم میں ایک پہچان بنی آپ نے اتنی محبت سے اتنی چاہتوں سے اور دل سے مجھے آواز دی کہ آپ ریشم میں آجائیں یہ لیں ساجد بھائی آپ نے آواز دی اور ہم ریشم میں آگئے آپ نے میرا نام لے کے مجھے آواز دی کہ ہم آپ کے منتظر ہیں۔ یہ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے ساجد بھائی آپ ایک عظیم راسخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان اور اچھے دوست بھی ہیں۔ میں آپ کے قلم کا بہت بڑا فین ہوں میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوش رکھے۔ (آمین)

باجی بشری مسرور اینڈ ریشم کی ٹیم کے نام
آپی جی آپ کا تھینکس کہ آپ نے سالگرہ مبارک میں میری سنووری کو نمایاں جگہ دی اور ریشم میں ایک انوکھے انداز میں مجھے متعارف کرایا میری ایک پہچان بنائی یہ میرے لیے بڑے ہی فخر اور اعزاز کی بات ہے اور عرفان راسے بھائی بڑے زبردست ایڈیٹر ہیں میری طرف سے آپ جی بشری مسرور، عرفان راسے، علی شیر اور ریشم کے سب راسخوں کو گزشتہ عید مبارک جو عید والے دن آپ سب نے کیا کیا دکھایا میرے خیال میں گوشت پہ پی باتھ صاف کرتے رہے ہوں گے خوش رہیں، خوش رکھیں۔

(ایم اشفاق بٹ، لالہ موہی، 0335-4669590)

شہزاد خاور جانی مظفر گڑھ کے نام

بھائی شہزاد خوش قسمت لوگ ہیں وہ جو روز آپ کا دیدار کرتے ہیں۔ ہم آپ کی سالگرہ میں ضرور شرکت کریں گے۔ ریشم کے ذریعے بتا چلا ہے کہ بند روڈ لاہور فیکٹری میں آگ لگنے سے آپ کے کزن وفات پا گئے ہیں۔ اس موقع پر ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

(بشر حسین بیڈ بگانی، 0312-6401351)

راشد ترین اور نعیم اکبر کے نام
میرے پیارے دوستو! کیسے ہیں آپ۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے نا۔ عید قربان کسی غزری۔ سارا گوشت خود کھایا یا غریبوں میں بھی کچھ بانٹا۔ بھائی نعیم اکبر صاحب آپ بزم ابرار میں مدیر بننے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

(شہزاد خاور، مظفر گڑھ، 0313-6184084)

0313-6184084

محترم معاویہ عنبر وٹو کے نام

”ریشم“ کے حوالے سے آپ کی ادبی خدمات قابل تحسین ہیں۔ مگر اس قدر خاموشی اور ”ریشم“ سے دوری بھی اچھی نہیں لگتی۔
پلیز!!!! اپنی حاضری کو ریگولر بنائیں۔

محترم راشد خاں ترین کے نام

”ریشم“ رنگ خیال میں انچارج بننے پر دل سے ڈھیروں مبارکباد قبول کریں۔ مگر اس کا یہ مقصد نہیں کہ آپ دیگر عنوانات اور باقی سلسلوں سے غائب ہو جائیں آپ چونکہ ماشاء اللہ ادب کی دنیا میں ایک خاص اور منفرد مقام رکھنے والے مایہ ناز شاعر، مخلص دوست اور عظیم انسان ہیں لہذا اپنی ذاتی تخلیقات سے محروم نہ کریں۔

دوستوں کے نام

آپ کی آمد ”ریشم“ میں اچھی لگی آتے رہے۔
شہزاد خاور، مبشر حسین، مجید احمد جانی، ایمان بٹ، ریاض تبسم چوہان، انجم خاں لدھی، ایم اکبر، حسین امجد اور محترمہ سکینہ راشد آپ سب کی خدمت میں سلام اور دعائیں۔

(ملک عاشق حسین ساجد، ہیدالائی)

(مظفر گڑھ 0308-6783157)

0308-6783157

اور شیخ جی نے رکھی ہیں گھر میں تہ لگا کر
رستہ جو پوچھ بیٹھا میں سنتری سے اک دن
پھر جان میری چھوٹی کچھ اُس کو دے دلا کر
کھانا پکانا بیگم مجھ کو سکھا رہی ہیں
کہتی ہیں، میں کھلاؤں کیا عمر بھر پکا کر؟
کس سے یہ دل لگاؤں، اُستاد نے کہا تھا
تم کام جو بھی کرنا، کرنا وہ دل لگا کر
☆.....☆.....☆

اب بچھتائے کیا ہوت

یہ کہا تھا مرے سر جی نے
میری بیٹی کو بیاہ لو ورنہ
تم پہ انوا کا کیس کردوں گا
دس برس جیل میں سڑو گے تم
دس برس ہو گئے ہیں شادی کو
سوچتا ہوں یہ کیا کیا میں نے
میں اگر جیل ہی چلا جاتا
آج آزاد ہو گیا ہوتا
☆.....☆.....☆

مزاحیہ قطعات

سڑک پار کرتے ہوئے آج شام
جو جاں سے گئے کر کے سب کو ملول
وہی تھے جنہوں نے لکھی تھی کتاب
سڑک پار کرنے کے نادر اصول
☆.....☆.....☆

محفل میں وہ بھی آئے دیکھو مگر یہ قسمت
پہننے ہوئے نہیں تھا میں چشمہ ابصارت

رہنمائے عاشقان

عشق میں تم دردِ دل دردِ جگر پیدا کرو
سب سے پہلے تم مگر تابِ نظر پیدا کرو
تھپ کے ملنے کے لیے دیکھو مناسب جگہ
اور پولس آجائے تو راہِ مفر پیدا کرو
اُس کے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی دو تم نایاں
اور بزرگوں میں بھی کچھ اپنا اثر پیدا کرو
تم پہ لازم ہے بجا لاؤ جو ہوں فرمائش
مانگ لے تم سے اگر تو تم قمر پیدا کرو
گیٹ کے دربان سے گاڑھی نہ چھتی ہوا اگر
کوئی پچھلے راستے سے بھی گذر پیدا کرو
گر بھی تم سیکھو رقیبوں سے نمٹنے کے لیے
کچھ بھی ہو اُن کے دلوں میں اپنا ڈر پیدا کرو
کر جو لے ترکِ تعلق تم سے وہ جان بہار
اُس کے دل میں اپنا گھر بار دگر پیدا کرو
ہاں اگر دامن چھڑا لے تم سے وہ انجام کار
صبر کا دامن پکڑ لو، یہ ہنر پیدا کرو
☆.....☆.....☆

نمکین غزل

دو اشک اُن کے در پر آیا تھا میں گرا کر
ٹکے ہیں آج گھر سے وہ پانینچے اٹھا کر
سترہ سنائیں اُس نے، ہر بار یہ جتا کر
چاہوں گا میں اجازت بس یہ غزل سنا کر
بولیں کہ لیٹ جانا چادر کہیں بچھا کر
پہلے مگر سلا دو بچوں کو تھپ تھپا کر
کتوں کو عقدِ اول ہوتا نہیں میسر

اکلوتی جیب

سب کی نظر میں ہے مری اکلوتی جیب ہی
مہنگائی ہے سبھی کو پریشاں کیے ہوئے
عید آ رہی ہے بیوی کی فرمائش ادھر
بکرا ادھر ہے مجھ کو ہراساں کیے ہوئے
(شمس کنول، ساہیوال)

میں تو جب بھی دیر سے گھر میں گھسا پکڑا گیا

جو ڈولی سے اتریں ہماری دلہن
تو حیرت میں ہم ہمتا ہو گئے
سلامی میں اکیس توہیں چلیں
نشانے مگر سب خطا ہو گئے

بیگم نے فون میرا اٹھا کر کہا، بلو
اور بند جب کیا تو وہ غصے سے لال تھی
میں نے جو پوچھا تھی کوئی miss-call، تو کہا
miss-call تو نہیں تھی کسی miss کی call تھی

سل فون اور دلہن میں کیا قدر مشترک ہے
یہ جانتا تو میں بھی جُت ہزار کرتا
ماتا مجھے بھی بہتر اور پائیدار ماڈل
کچھ دن اگر ٹھہرتا اور انتظار کرتا

اک دکان میں جو گیا میں کہ خریدوں جوتا
پیر میں ڈالا دُکندار نے موزوں جوتا
دام سن کر جو میں چونکا تو وہ بولا مجھ سے
تم خریدو گے اسے یا میں اتاروں جوتا؟

وہاں اُن دنوں میں حال دل ہی لیکن
اسے نہیں تھے اس دن وہ آواز سماعت

آئی جو صبح عید تو آئے ہیں اہل خیر
ہر شخص کہہ رہا ہے، مجھے اپنی کھال دیں
بیگم مگر بضد ہیں کہ چھوڑیں یہ کھال وال
ایسا کریں کہ پہلے پچھنی نکال دیں

آنے جانے کے وسائل ہو رہے ہیں تیز تر
گاڑیاں، ریلیں، بسیں بہتر سے بہتر آگئیں
میں تو سمجھا تھا گئی ہیں تو لگیں گے چار دن
چار گھنٹوں میں ہی وہ میکے سے ہو کر آگئیں

یہ زمانہ اور ہے، پہلا زمانہ اور تھا
مرد اُس سے کم نہیں ہے، گھر کی جو خاتون ہے
کس لئے ہو خوف بیگم کی عدالت کا اُسے
اب تو توہین عدالت کا نیا قانون ہے

میکدے پر پڑ گیا چھاپہ تو سب پکڑے گئے
میں بھی تھا ان میکشوں میں، شرمسار و سرنگوں
سب کو تھانیدار نے چھوڑا مگر مجھ سے کہا
تجھ کو استثنیٰ نہیں حاصل بتا اب کیا کروں

میاں نے آکے خوشخبری سنائی جب یہ بیگم کو
کہ اپنی زندگی کا آج ہم بیمہ کرا لائے
کہا بیگم نے یہ تم نے بہت لہجھا کیا لیکن
خوشی سچی تو وہ ہوگی کہ پیسہ ہاتھ میں آئے

جب سویرے یہ سنا کہ گھر میں چوری ہوگئی
حیرتوں کے جال میں سمجھو کہ میں جکڑا گیا
بچ کے بیگم کی نظر سے چور آیا کس طرح

خود کلامی

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

وقت کے پاس نہ آنکھیں ہیں نہ احساس نہ دل
اپنے چہرے پہ کوئی درد نہ تحریر کرے
(اشفاق شاہین، کراچی)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

یوں لگے دوست تیرا مجھ سے خفا ہو جانا
جس طرح پھول سے خوشبو کا جدا ہو جانا
(سہرینا خان، راولپنڈی)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

مجھ سے جان چھڑائی یوں
زندگی عذاب ہو جیسے
(ناز سلوش زشتہ، میرپور)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

ہاں نکل جاؤں گا میں عید منانے فیصل
اس طرح بام پہ آؤ کہ یقین آجائے
(محمد فیصل، کراچی)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

آئی ہے عید کوئی بھی سماں نہ ہو سکا
اب کے برس بھی گھر میں چراغاں نہ ہو سکا
(تمینہ، کراچی)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

تیرے چہرے کو کسی چاند سے تشبیہ دے کر
ایک عالم میں اجالا ہی اجالا کر دوں
(شام، لاہور)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

یہ بھی اچھا ہوا عید اب کے تنہا گزری

ستمبر کا انعام یافتہ شعر

خوشیاں ہزار تم کو ملیں ساگرہ پر
دیتے ہیں ہم دعا تمہیں عمر درازی

انعام اعجاز ملتان

کو تازہ شمارہ بطور انعام ارسال کیا جا رہا ہے۔

جانے کیوں آپ کے رخسار مہک اٹھتے ہیں
جب کبھی چپکے سے کہا عید کا چاند
(سمیرا اکرم، کراچی)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

دنیا میں کسی عید کی وہ شان نہیں ہے
پہلا سا کوئی صاحب ایمان نہیں ہے
(امیر زاہد، ملتان)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

دستور ہے دنیا کا مگر یہ تو بتاؤ
ہم کس سے ملیں کس سے کہیں عید مبارک
(انعم، راولپنڈی)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

مرے جذبات یا ذوق عقیدت کا تقاضا ہے
کس کی راہ میں آنکھیں بچھائیں عید کا دن ہے
(ابرار احمد، لاہور)

♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥♥

دل میں ہزاروں درد ہیں آنکھیں ہیں اشکبار
تھا یوم عید کا یہی تحفہ مرے لیے
(تمینہ سراج، وہاڑی)

میں گلے لگ کے بہت روتا جو آپ آجاتے
(عزیز انکم، میانوالی)

تحریر میں ڈھل کر چلی آئی ہے تیری تصویر
(محمد خاں انکم، دیپالپور)

کیا لطف عید ہے گر تم سے دور ہوں
گزرے گا روز عید تصور میں تمہارے
(عبید عقیل، لاہور)

دل کی تنہائیوں کا کیا کہنا
آپ ہی آپ تھے جہاں تھے ہم
(صوفیہ اصغر، لاہور)

روز ہی دیکھتا ہوں وہ چہرہ
روز ہی میری عید ہوتی ہے
(عابد حسین، ملتان)

یہ کیا ہوا کہ بات کا لہجہ بدل گیا
آنکھیں بدل گئی ہیں کہ چہرہ بدل گیا
یا خشک ہو گئی ہیں محبت کی آب جو
یا ہاتھ کی لکیروں کا نقشہ بدل گیا
(خاطر علی، قصور)

جدائی پر قائم ہے نظام زندگانی بھی
بچھڑ جاتا ہے ساحل سے گلے مل کر پانی بھی
(مجید احمد جانی آف ملتان، ملتان)

لوگ کہتے ہیں کہ مکان ہے ہونٹوں پہ مرے
کون جانے کہ تصور میں بنایا کس نے
(شازیہ عابد، لاہور)

اس کی یاد کا خزانہ ہی تو اثاثہ ہے میرا
کہ اس کو بھول جاؤں تو فقیر ہو جاؤں
(ڈاکٹر طارق محمود آکاش، ڈسکہ)

زندگی تو ہی بتا تجھ کو نبھانے والے
کس طرح آگ کے دریا پہ سفر کرتے رہیں
(سہاس گل، رحیم یار خان)

روز روز کا پیٹا مجھے پسند نہیں
کبھی نہ ہوش میں آؤں وہ جام دے ساقی
(امین مراد انصاری، کراچی)

نہ خود سے اور نہ دل کی صدا سے پوچھتے ہیں
جو کچھ بھی کرتے ہیں تیری رضا سے پوچھتے ہیں
(شاہ روم، کراچی)

خط دیکھ کے ہوتا ہے گماں تو خود ہے مخاطب

کوین برائے خود کلامی (دسمبر 2012ء)

شہر کا نام

نام

پسندیدہ شعر

(ادارہ)

نوٹ: خود کلامی میں شرکت کیلئے اپنا پسندیدہ شعر اس کوپن پر تحریر کر کے ارسال کریں۔

ترتیب: ریم رفیق

آپریٹر جس کی رس بھری آواز کی وجہ سے سارا دن رائگ کالز آتی تھیں، نوکری چھوڑ چکی ہیں۔ اس لیے اب ہمیں بے سری بھونڈی آواز والی آپریٹر کی ضرورت ہے تاکہ صرف ضرورت مند کالز کریں۔
(ایس، امتیاز احمد، کراچی)

عید مبارک

ہجر کی ساری
افیت اس پل ہو گئی تمام
جب دھیرے سے
چاہت بھرے وصل لحوں کی
مہک کے ساتھ
اس سے کہا ”عید مبارک“

(صوفیہ اصغر، لاہور)

چھ امیدوار

گلتا ہے آج کھال اتاریں گے آپ کی
ہونٹوں پہ دھمکیاں ہیں تو منہ پر جلال ہے
عاصی امیدوار ہیں پیچھے کس کو خوش کریں
بکرا ہے ایسا جس کی فقط ایک کھال ہے
(بلال نیاز، لاہور)

عید گاہ جانا

عید گاہ میں عید کی نماز کے لیے جانے والے کے لیے مستحب یہ ہے کہ نماز کے بعد دوسرے راستے سے واپس آئے۔

بعض کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جس راستے سے گئے تھے، اس کی زمین آپ کے حق میں گواہی دیتی تھی، اس لیے آپ اس راستے سے عید گاہ تشریف لے گئے مگر بعض کا کہنا ہے کہ آپ جاتے وقت ایک قبیلہ کے راستے سے گئے اور واپس دوسرے قبیلہ کے راستے سے ہوئے تاکہ دونوں قبائل آپ کے دیدار کا شرف حاصل کر سکیں اور دونوں کو برابر کا ثواب حاصل ہو۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
”اے نبی! ہم نے تمہیں جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

بعض کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ پیغمبروں اور ولیوں کے نیچے جو زمین آتی ہے وہ چونکہ سب سے زیادہ فخر کرتی ہے۔ اس لیے آپ مختلف راستوں سے جاتے تھے تاکہ ہر طرف کی زمین کو برابر کا ثواب ملے۔

ضرورت آپریٹر

ہماری کمپنی کو ایک لیڈیز ٹیلی فون آپریٹر کی ضرورت ہے، جس کی آواز سن کر لگے کہ جیسے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جا رہا ہے، ہماری سابقہ ٹیلی فون

سنہری باتیں

- 1- سب سے بڑی بہادری دشمن کو معاف کر دینا ہے۔
- 2- اگر تم زندگی کی قدر پوچھنا چاہتے ہو تو آخری سانس لینے والوں سے پوچھو۔
- 3- جن لوگوں کے دلوں میں اچھے خیالات آباد ہیں وہ کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔
- 4- بے موقع گفتگو انسان کی قدر گھٹا دیتا ہے۔

(شائستہ ساجد، لاہور)

شوق فرمائیں

سخت مہنگا ہے آج کل آنا
تم کہو ہم غریب کیا کھائیں
بے نیازی سے کہہ گئے اتنا
آپ بسکٹ سے شوق فرمایا کریں
(محمد خاں انجم، دیپالپور)

دولت

”دولت ہی دنیا میں سب کچھ نہیں ہوتی“ ایک
کرور پتی نے اپنے بیٹے سے کہا۔
”اگر ایک شخص کے پاس آٹھ کرور روپے ہیں تو
وہ بھی اتنا ہی خوش ہے جتنا دس کرور والا۔“
(عزیز، کراچی)

زندگی

زندگی کیا ہے؟ یہ سوال ہر لب پر ہوتا ہے۔ کسی نے
زندگی کو اس طرح کہا۔ کسی نے زندگی کو کلشن تو، کسی نے درد
میں ادا سمندر کہا مجھ سے پوچھو تو۔ زندگی ایک حسین
فرہ ہے، جس میں اونچائی، گہرائی، ہمواری، ناہمواری،

تھکن، محبت کے جذبے ہوتے ہیں۔ زندگی میں اگر
خوشیاں مل جائیں تو بہت خوب لیکن اگر زندگی نے کسی
نغم سے دو چار کر دیا تو لوگ شکوے شکایات کے انبار
لگاتے نہیں تھکتے۔

(شائلہ، ملتان)

بیوی کی قیمت

جمیلہ نے اخبار کے ایک مضمون میں پڑھا۔
ہندوستان میں آج بھی کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں دو
سوروپے میں لڑکی کو خریداجا سکتا ہے۔
اس نے حیرت سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔
شوہر نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں، ایک اچھی بیوی کی
اتنی قیمت تو ہونا ہی چاہیے۔“

(حرا، کراچی)

تھیلا کیا ہے؟

نانگ زخمی ہوئی ہاتھوں پہ خراشیں آئیں
راہ گیروں نے بھی دیکھا یہ تماشا کیا ہے
لے گئیں گوشت کے شاپر کو جھپٹ کر چلیں
آج احساس ہوا ہے مجھے تھیلا کیا ہے
(نبیل، لاہور)

دیوی

مس زبیدہ پرائمری سکول کی پچاس لڑکیوں کو لے
کر آرٹس کونسل گئیں۔ جہاں یونانی دیو مالائی تصویروں
کی نمائش ہو رہی تھی۔ مختلف تصویروں کو دیکھتے اور ان
کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے بچیاں
ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی کی تصویر کے پاس پہنچیں۔
”یہ کون ہے مس؟“

ابرو کھینچ کھینچ سے آنکھیں جھکی جھکی سی
 باتیں رگی رگی سی لہجہ تھکا تھکا سا
 الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
 بن جائے جنگلوں میں جیسے کہ راستہ سا
 پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
 وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا سا
 (پرنس افضل شاہین، بہاولنگر)

غار

”منہ اور کھولے۔“ دندان ساز نے مریض کے منہ میں
 سر ڈالتے ہوئے کہا۔ تو منہ تھوڑا سا اور کھل گیا۔ مریض کا
 دانت اتنا خراب ہو چکا تھا کہ دندان ساز حیرت کا اظہار کیے
 بنا نہ رہ سکا۔ ”افوہ، آپ کا دانت تو غار بن گیا ہے۔“
 ”دہرائے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“ مریض نے
 اسی طرح منہ کھولے کھولے دندان ساز کو ڈانٹا۔
 ”قسم لے لیجئے جو میں نے دہرایا ہو۔“ دندان ساز
 نے کہا۔
 ”وہ تو میری آواز کی بازگشت تھی۔“
 (شمس الدین، وہاڑی)

تعریف

ایک شخص اپنی بیوی کی کبھی تعریف نہیں کرتا تھا،
 بیوی بھی اس بارے میں بے حس ہو گئی تھی۔ ایک روز
 شوہر اپنے دوست کے گھر سے واپس آیا جہاں اس کا
 دوست سارا وقت اپنی بیوی کی تعریفیں کرتا رہا تھا۔ شوہر
 نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اپنی بیوی کی تعریف کرے گا۔
 چنانچہ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کے
 حسن کی تعریف شروع کر دی۔ تعریف سنتے بہت دیر ہو
 گئی تو بیوی رو پڑی..... ”کیا بات ہے جیسی؟“ شوہر
 نے گھبرا کر پوچھا۔

”یہ منرو ہے۔“
 ”کیا منرو شادی شدہ تھی؟“
 ”نہیں بچو!،“ مس زبیدہ نے مسکراتے ہوئے
 کہا۔ ”منرو قتل و دانش کی دیوی تھی۔“
 (عروج عالیہ، ساہیوال)

پانچ نصیحتیں

حضرت کمیلؑ نے بیان کیا ہے کہ حضرت علی کرم
 اللہ وجہہ مجھے پانچ نصیحتیں فرمائیں۔ آپؑ نے فرمایا
 کمیل! جو شخص مال کے بل بوتے عزت حاصل کرتا
 ہے۔ اس کی عزت مال کے ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتی
 ہے۔ لیکن جو شخص علم کے ذریعے عزت حاصل کرتا
 ہے۔ اس کی عزت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔
 کمیل! میں تمہیں پانچ نصیحتیں کرتا ہوں۔

- 1- اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھو۔
- 2- سوائے اپنے گناہ کے کسی سے نہ ڈرو۔
- 3- اگر تم سے کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کا
 تمہیں علم نہ ہو تو یہ کہتے ہوئے نہ شرماؤ کہ ”میں نہیں
 جانتا“
- 4- اگر تمہیں کسی بات کا علم نہ ہو تو اسے معلوم
 کرنے میں تکلیف نہ کرو۔

5- صبر اختیار کرو کیونکہ صبر کا تعلق ایمان سے ایسا
 ہے جیسا سر کا تعلق بقیۂ جسم سے۔ اس جسم کا کوئی فائدہ
 نہیں جس کا سر ہی نہ ہو۔ اسی طرح اس ایمان کا کوئی
 فائدہ نہیں جس کے ساتھ صبر نہ ہو۔
 (شہزاد خاور، مظفر گڑھ)

برسوں کے بعد

برسوں کے بعد دیکھا اک شخص دلربا سا
 اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا

”ٹم کو چپک نکل آئی ہے، میگی کو بخار ہے، وکٹر کو دست آرہے ہیں اور تم ہو کہ نشے میں دھت گھر واپس آئے ہو.....“

(عظیم خاں، لاہور)

غزل

رات کے آدھے پہر اک تنہا وجود
اندھیرے میں پہلو بدلتا رہا
چاند ڈھلتا رہا
میرے خوابوں، خیالوں، سپنوں میں کوئی
آکے چپکے سے یونہی ہنستا رہا

رہا

رہا

رہا

رہا

چاند ڈھلتا رہا
شب اندھیری رہی لوگ ڈرتے رہے
رات بھر ایک ہی ستارا چمکتا رہا
چاند ڈھلتا رہا
میں موتی پہ موتی گرانی رہی غم گھٹاتی رہی
کوئی رات بھر یہ موتی چتا رہا
چاند ڈھلتا رہا
(ناز سلسوٹ زشے، میرپور)

گدھا

ایک دیہاتی کا گدھا گم ہو گیا، اس نے کافی
ڈھونڈا لیکن نہ ملا۔
تھک کر وہ ایک درخت کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔
نیچے ایک لڑکا اور لڑکی باتیں کر رہے تھے۔
لڑکا تمہاری آنکھوں میں نیچے دونوں جہاں نظر
آتے ہیں۔
دیہاتی اوپر سے بولا: تو دیکھ کر بتاؤ کہ میرا گدھا
کہاں ہے۔
(ارشاد وفا، گوجرانوالہ)

بدل جاتے ہیں

زندگی تغیرات کا نام ہے، وقت بدل جاتا ہے
حالات بدل جاتے ہیں۔

موسم بدل جاتے ہیں۔ لوگ! جگہ مقام بدل
جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کچھ منظر کوئی موسم کوئی جگہ کوئی
مقام اور کچھ لوگ دل میں اتر جاتے ہیں۔ بلکہ گھر
کر جاتے ہیں بلکہ ایک حسین یاد بن کر زندگی میں
ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔

(ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ)

شادی سے پہلے

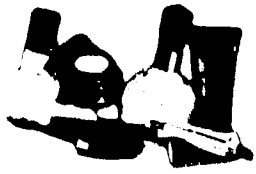
شیر کی شادی ہو رہی تھی۔ برات روانہ ہونے
لگی تو ایک چوہا برات کے آگے ناپنے لگا۔ شیر نے
پوچھا۔
”تم چوہے ہو، شیر کی شادی سے تمہارا کیا
تعلق؟“

چوہے نے مسکرا کر جواب دیا۔
”شادی سے پہلے میں بھی شیر تھا۔“

(مبشر حسین، ہیڈ بکائی)

پاکستان میں.....

☆ سب سے بڑا بیراج سکھر بیراج ہے۔ یہ
دنیا کا بھی سب سے بڑا بیراج ہے۔
☆ سب سے زیادہ بارش والا ضلع یا لکوٹ ہے۔
☆ سب سے بلند سڑک شاہراہ قراقرم ہے۔
☆ سب سے بڑا فوجی اعزاز نشان حیدر ہے۔
(شہزاد خاور، مظفر گڑھ)



بی بی کی پیوٹی ٹپس

عائشہ مصطفیٰ

خوبصورت ناخن حسن کا اثاثہ

ناخنوں کی ٹوٹ پھوٹ اور خشکی کا سبب

ناخنوں کی ٹوٹ پھوٹ کا سبب پانی ہوتا ہے۔ جی ہاں پانی۔ جب بات ناخنوں کی ٹوٹ پھوٹ کی آتی ہے تو پانی ہی ان کی تباہی و بربادی میں سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس لئے اپنے ناخن ہمیشہ خشک رکھیے کائن لائن والے ربر کے دستانے پہنہ بغیر کوئی کام نہ کریں۔ اور چاہے آپ کے ہاتھ کتنے ہی چھوٹے کیوں نہ ہوں سب سے بڑے ساز کے دستانے خریدیں۔ اگر آپ ہاتھ کے ساز کی مناسبت سے دستانے خریدیں گی تو اس میں پسینہ آنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ جب کہ آپ نمی سے بچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

نیل ٹپس

☆ سفید آئیوڈین ناخنوں کو مضبوط بناتی ہے اور انہیں اکھڑنے سے روکتی ہے۔ اسے ہر رات صاف ستھرے اور غیر پالش شدہ ناخنوں پر سات راتوں تک لگائیں۔ پھر اس کے بعد تینے میں صرف ایک مرتبہ لگائیں۔

☆ اپنے ناخنوں کو ریتی سے مرلے شیب میں فائل کریں۔ بیضوی شیب کی بجائے قدرے سیدھے انداز میں تاکہ ان کے ٹوٹنے کا امکان کم سے کم رہے۔

☆ بغیر پالش ناخنوں کو مست چھوڑیں۔ یہ وہ حفاظتی تہہ جیاتی ہے جس کی نرم ناخنوں کو ضرورت ہوتی ہے۔

☆ اپنے تینے کوٹ کو ناخن کی ٹپ کے اوپر اور نیچے اطراف میں لگائیں تاکہ ناخنوں کو مضبوطی عطا ہو اور ٹوٹ پھوٹ سے بچے رہیں۔

ناخن لمبے کرنے کا تیز ترین طریقہ

آپ کے ناخن لائے نہیں لیکن آپ فوری طور پر لمبے ناخنوں کی خواہش مند ہیں۔ آپ ایکر انلک کے ناخن پہنیں۔ جو مختلف شیب اور لمبائی میں دستیاب ہیں۔ لیکن نیچرل لک کے لئے آپ میں آرٹسٹوں کا سا ذوق ہونا چاہیے۔

اب فاسٹ نیل ہارڈ نرپلس ریپلنگ نے آپ کو لمبے ناخن عطا کر دیئے ہیں۔ لیکن آپ نیل ٹپس کی مدد سے لمبے دکھائی دینے والے ناخن چاہتی ہیں۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ پر عمل کریں۔

☆ ایک نیل ٹپ کٹ خرید لیں۔

☆ پلاسٹک کا وہ مصنوعی ناخن منتخب کریں جو آپ کی انگلی پر فٹ آ رہا ہو اور اسے صاف ستھرے ناخن پر گلو کریں۔

☆ اس کے بعد ٹائلٹ پیپر کے ایک پرزے کو اپنے پلاسٹک ناخن کے پیچھے کے حصے میں گلو کریں تاکہ آپ کا ناخن اور مصنوعی ناخن دونوں ہی یکساں گہرائی میں آ جائیں۔

☆ اسے خشک ہونے دیں اور پھر فائل کر لیں (اس مقام پر جہاں آپ کا اصلی ناخن اور مصنوعی ناخن مل رہے ہوں۔۔۔۔۔)

حتیٰ کہ ایک ہموار سطح بن جائے۔ اب آپ اس پر نیل پالش لگا سکتی ہیں۔

ناخنوں سے تشخیص

اگر آپ کے ناخن اچانک بیمار سے دکھائی دینے لگیں یا ناخن اپنی نیچے کی جلد سے مختلف نظر آنے لگیں، گہری دھاریاں سی ابھر آئیں، پھڑیاں سی اترنے لگیں۔ یا حد درجہ بھر بھر سے ہو جائیں تو پھر فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھائیں، ناخنوں کی صحت آپ کی مکمل جسمانی صحت کا ایک اشارہ بھی ہو سکتی ہے۔

پالش کو اسٹور کرنا

پالش کو ریفریجریٹر میں رکھیں۔ اس میں جراثیم پیدا نہیں ہوتے (اس لئے کہ اس میں پانی شامل نہیں ہوتا) ٹھنڈک اسے گاڑھا ہونے سے روکتی ہے اور بخارات بننے کا عمل نہیں ہوتا۔ جس سے یہ پالش مائع کی شکل میں دیر تک قائم رہتی ہے۔ اس کی رنگت میں بھی قدرے تبدیلی آ جاتی ہے۔ اس لئے اپنے مینی کیور کرنے سے قبل پالش کو ریفریجریٹر میں سے نکال لیں اور بوتل کو آدھے گھنٹہ کے لئے الٹا رکھ دیں۔ پھر تیزی سے ہلائیں۔

مینی کیور میمو

1- ریوور میں بھگوئی کاٹن سے پرانی نیل پالش ہٹا دیں۔ کاٹن کو اپنے ناخن کے اوپر 15 سیکنڈ تک دبائے رکھیں۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ (کیونیل سے ٹپ کی جانب) پالش کو صاف کر دیں۔

2- ناخنوں کو فائل کریں (ریتی سے گھس لیں، لیکن پہلے یہ یقین کر لیں کہ آپ کے ہاتھ اور ناخن مکمل طور پر خشک ہیں)

3- اپنی انگلیوں کو اپنے کسی بھی پسندیدہ کیونیل نرم کرنے والے لیکوینیڈ میں تر کر لیں (جیسے کہ ہینڈ کریم، زیتون کا تیل، گرم جھاگ دار پانی)

4- نیل برش کی مدد سے اپنے ناخنوں اور انگلیوں کی پوروں کو صاف کر لیں۔

5- انگلیوں کو خشک کر لیں۔ کیونیل کریم لگائیں پھر کاٹن یا اسٹیشل ربرٹڈ کیونیل پش میں لپیٹی ہوئی اورنج اسٹک کی مدد سے کیونیل کو تیزی سے پیچھے گھمائیں۔

6- کاٹن لپیٹی ہوئی اسٹک کو صابن کے پانی میں ڈبوئیں اور اپنے ناخنوں کے اندر کی صفائی کریں۔

7- اسٹک کو ہائیڈروجن پراکسائیڈ میں ڈبوئیں تاکہ ناخن ٹپ کے اندر کا حصہ مزید ہلکا ہو جائے۔

8- ایک حفاظتی کلیریس کوٹ لگائیں۔

9- پہلے نیل ریش اور پھر پلاسٹک ٹپس لگائیں۔

10- اپنے منتخب کردہ کمر کے دو کوٹ لگا کر فٹش کر لیں اور کلیر سیلر کا ایک کوٹ لگائیں۔

نیل پالش لگانے کا درست طریقہ

پالش کا ہر کوٹ تین اسٹروک میں لگائیں۔ پہلا اسٹروک ناخن کے وسط میں لگائیں۔ پھر دونوں جانب کی کسی بھی خالی جگہ پر اسٹروک لگائیں تاکہ یہ اسٹروک درمیانی اسٹروک سے مل جائے اور اس پر اوور لیپ ہو جائے۔ برش کو بوتل میں دوبارہ مدت ڈبوئیں۔ بوتل میں ایک مرتبہ کا ڈوبا ہوا برش ایک مکمل ناخن کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ہمیشہ برش کو فلیٹ انداز میں چلائیں، برش کو توجہ انداز میں ناخن پر افقی چلائیں۔ صرف اس کی نوک ہی استعمال مت کریں۔ فلیٹ انداز سے مراد پتلی تہ جمانا ہے۔ جس سے زیادہ پروفیشنل فنشنگ حاصل ہوتی ہے۔

پالش اتارنا

روٹی کو ریوور سے تر کر لیں۔ پھر اسے ناخن پر رکھ کر دبائیں اور دھیرے دھیرے 15 تک گنتی گنیں۔ پھر ایک ہی بار میں تیزی سے جھکا دینے والے انداز میں رگڑیں تاکہ تمام نیل پالش ایک ہی بار رگڑنے سے اتر جائے اس طرح بار بار رگڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اور ریوور کو پالش کی تمام تہوں میں اندر تک جانے کا وقت مل جاتا ہے۔



رنگ خیال

ترتیب ہزارا شد ترین

تو اس زمانے کی طشتہ کی کو
میں ایک پل میں پلٹ کے رکھ دوں
مجھے یقین ہے
مجھے یقین ہے کہ اب بھی مدتی
کسی بھی بنجر زمیں پہ اتروں
کسی بھی صحرا میں پاؤں رگڑوں
اداس صحرا میں ایک چشمہ اہل پڑے گا
مجھے یقین ہے
مجھے یقین ہے کہ اب بھی مدتی
میں چشم حسرت کو کر کے زندہ
میں خواہشوں پہ حجاب ڈالوں
میں جو بھی چاہوں
وہ کر دکھاؤں
مجھے یقین ہے
مجھے یقین ہے

غزل

زندگی سے اب اذیت ہے مجھے
تیرے ملنے کی ضرورت ہے مجھے
تم سے ملنے کی تمنا آجکل
اب بھی پہلی سی محبت ہے مجھے
تم نے سوچا ہی نہیں ہے جان جاں
تیرے در سے اب بھی نسبت ہے مجھے
وقت کی رفتار مجھ میں رہ گئی
اب بچھڑنے کی ندامت ہے مجھے
وصل کے ہر ایک موسم میں کبھی
اس نے لکھا تھا فراغت ہے مجھے
جاتے جاتے اس نے نازش یہ کہا
پھول چہروں سے محبت ہے مجھے
نہیلہ نازش راؤ، اکاڈہ

محمد مدتی خدا، مظفر گڑھ

♥♥♥♥♥♥♥♥

ذرا تم یاد کرو!

پیار کے وہ لمحات ، ذرا تم یاد کرو!
پھولوں کی سوغات، ذرا تم یاد کرو!
چاند سے چہرے پر جب زلفیں بھگی تھیں!
وہ ظالم برسات، ذرا تم یاد کرو!
ساتھ نبھانے کی جب قسمیں کھائی تھیں!
کیسے تھے وہ لمحات، ذرا تم یاد کرو!
چپ چپ کر وہ دن کو ملنا کیسا تھا!

♥♥♥♥♥♥♥♥

تلخیاں

مجھے یقین ہے
کہ اب بھی مدتی
میں سائلوں پہ قدم دھروں تو
میں بہتے دریا کا رخ بدل دوں
میں چڑھتی موجوں کو تیشہ کر دوں
مجھے یقین ہے
مجھے یقین ہے کہ اب بھی مدتی
سبھی حوالت کو چھو کے گزروں

نہ لپے سالت، ذرا تم یاد کرو!
اپنا لاکٹ اور انگٹھی اپنا وہ رومال!
دیئے تھے جو اس رات، ذرا تم یاد کرو!
کس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا تم نے یہ!
جنیں، مریں گے ساتھ، ذرا تم یاد کرو!
چاندنی میں جب کھلیا کرتے تھے!
ہاتھ میں لے کر ہاتھ، ذرا تم یاد کرو!
عزیز کبھی نہ ساتھ تمہارا چھوڑیں گے!
اپنے منہ کی بات، ذرا تم یاد کرو!
(میاں معاویہ عنبرو، ہڑپہ)



ہمیں سب سے جدار کھنا

تمہیں معلوم ہے کہ ہم
دلوں میں موجزن جذبول کے جیسے ہیں
خیالوں کے کسی گلدان میں مہکے ہوئے
پھولوں کے جیسے ہیں
دسمبر کے دنوں

اور جنوری کی بھیکتی شاموں کے جیسے ہیں
جنہیں کرنا ضروری بھی نہیں ہوتا
مگر وہ دوش پراک قرض ہوتے ہیں
نماز عشق پڑھتی ہو تو پھر سن لو
تمہارے واسطے ہم فرض ہوتے ہیں
تو جاناں تم پہ لازم ہے
کہ اس خوابوں کے بے آباد صحرا میں
ہمارے خواب سب سے ماوراء کھنا
ہمیں سب سے جدار کھنا

(ارشاد ملک، راولپنڈی)



غزل

شب نے کروٹ جو لی دل یہ چلتا رہا

آنکھ پتھرا گئی دل پچھلتا رہا
میں نے دیکھا اسے آنکھ بھر کے ابھی
دیکھ کر مجھ کو پہلو بدلتا رہا
میں نے خوابوں کی تعبیر دیکھی نہیں
ایک سایہ مرے ساتھ چلتا رہا
چاند خوش ہے اگر چاندنی رات سے
وقت کٹتا رہا میں سنبھلتا رہا
چاندنی رات خوابوں میں ڈھلتی رہی
آنکھ رونے لگی دن نکلتا رہا
اس نے غیروں کو ہر دم سہارا دیا
اور میں تھا کہ ہاتھوں کو ملتا رہا
لوگ کرتے رہے دشمنی بھی مگر
عمر بھر کا سفر یونہی چلتا رہا
اس نے جاوید چھوڑا تو کس موڑ پر
غم کے ماروں کا دل یہ سلگتا رہا
(محمد اسلم جاوید، فیصل آباد)



نظم

اک روز تمہاری یاد آئی
دل اپنا بھی بے چین ہوا
اس وقت تمہارے رستوں پر
کچھ خواب سجا کر نکلے تھے
صحرا کی جھلکتی دھوپوں میں
پھر گاؤں کے براک کوپے میں
آواز لگائے پھرتے تھے
ہم نام تمہارا لیتے تھے
کچھ لوگ تو پاگل کہتے تھے
افسوس کہ تم نے ملنے سے
اس وقت بہت انکار کیا
اس دل پر تم نے وار کیا

ہم لوگ تو پاگل لوگ ہوئے
ہم لوگ تو پاگل لوگ ہوئے

﴿مجید احمد جانی، ملتان﴾

♥♥♥♥♥♥♥

محبوبہ سے مکالمہ

پیار کرو گی؟

سوچوں گی.....

اقرار کرو گی؟

سوچوں گی.....

تم میری بنو گی؟

سوچوں گی.....

یہ سوچوں گی

وہ سوچوں گی

کیا سوچوں گی؟

اچھا تو میں چلتا ہوں

میں بولی کیوں چلتے ہو؟

وہ بولا! بس جلدی ہے

میں بولی!

کچھ بات کرو

وہ بولا! کیا بات کروں؟

میں بولی ناراض ہو تم؟

وہ بولا! سچ بات کہوں؟

میں بولی! ہاں بات کہو

وہ بولا! سچی بات ہے مجھ کو پیار نہیں

اب مجھ سے تکرار نہیں

اس دن سے دل بھی ٹوٹ گیا

جیسے سب کچھ روٹھ گیا

﴿فرید و فری، لاہور﴾

♥♥♥♥♥♥♥

غزل

محبت جھوٹ لگتی ہے ترا کردار جھوٹا ہے

یہ دنیا ٹھیک کبھی ہے تمہارا پیار جھوٹا ہے
کبھی رزمیں محبت کی نبھانا بھی تو پڑتی ہیں
یہ قسمیں مت اٹھاؤ تم ترا اقرار جھوٹا ہے
مرے قاتل کے ہاتھوں پر لہو کا رنگ دیکھو گے
وہ جو کچھ بھی کہے گا سب پس دیوار جھوٹا ہے
یہ سب چلتا ہوا عالم مری نظروں کا دھوکہ ہے
یہ سارے لوگ جھوٹے ہیں یہ کاروبار جھوٹا ہے
یہ سب رسم وفا جھوٹا یہ سب اہل وفا جھوٹے
ترے لب سے محبت کا یہ سب اسرار جھوٹا ہے
کہو یہ پیار کی باتیں فقط دل کی تسلی ہیں
ترا دعویٰ محبت کا مری سرکار جھوٹا ہے
تری باتوں پہ اب فوری یقین مجھ کو نہیں آتا
تری باتیں بھی جھوٹی ہیں ترا اظہار جھوٹا ہے
﴿نور یہ احسان رانا، حاصل پور﴾

♥♥♥♥♥♥♥

غزل

جسے میں ڈھونڈتا تھا کہکشاں میں
ملا میرے ہی وہ دل کے مکاں میں
بقا کی خواہشوں سے ہیں وہ عاری
بچے جو چار تنکے آشیاں میں
چلن جب سے گلوں نے نیچ ڈالا
رہا نہ سوز بلبل کی فغاں میں
فسون رنگذر میں جو ہوئے گم
بھٹکتے ہیں غبار کارواں میں
زہر ترک وفا کا پی تو لیں ہم
یہی اک تو نہیں ہے غم جہاں میں
عجب دوزخ سے گزرا ہے یہ انسان
بوس کی تتلیوں کے سانپاں میں
جسے شبنم نے پھولوں پر لکھا تھا
مرا بھی نام تھا اس داستان میں

﴿بشیر انجبار﴾

تم عظیم شاعر ہو

نوجوان نسل کے تم عظیم شاعر ہو
خوبصورت گفتگو

والہانہ زندگی

شاعروں کی محفل میں تم الگ تھلک سے ہو
محفلوں میں اکثر تم نظم جو سناتے ہو

خوب داد پاتے ہو

ہر طرف تمہارے ہی تذکرے تو ہوتے ہیں
لڑکیوں کے جھرمٹ میں

ہر طرف تمہارا ہی نام لوگ لیتے ہیں

شہرتیں، بلندیاں کے چھو رہے ہو آسماں

سوچتی ہوں جان جان

شہرتوں کی دنیا میں تم مجھے بھلا نہ دو

اس لیے تو ذرتی ہوں

آج کل زمانے کی لڑکیوں میں Famous ہو

تم عظیم شاعر ہو

میں شریک زندگی

شہرتوں سے ذرتی ہوں

تم مری محبت ہو

تم مری محبت ہو.....

سارے جگ سے لڑ بیٹھے ہیں
اک تری توقیر کی خاطر
اپنی قید میں کر لو ان کو
پاؤں ہیں زنجیر کی خاطر
لحمہ لحمہ قرب میں گزرا
خواب کی اک تعبیر کی خاطر
تاروں سے بے ناطہ جوڑا
چاند کی اک تفسیر کی خاطر
ہاتھ کٹانے پڑ جاتے ہیں
بٹی اور ہمیشہ کی خاطر
ہم ہیں آج بھی پیار کے مجرم
حاضر میں تعزیر کی خاطر
اپنے آپ سے الجھ پڑا ہوں
ہاتھوں کی تقدیر کی خاطر
شاہد روزی ڈھونڈ رہا ہوں
آگن کی تعبیر کی خاطر
﴿شاہد خاکوانی، خان گڑھ﴾



خود فریبی

میں بس رہا ہوں
عجیب نگری میں بس رہا ہوں
جہاں کی چکی حویلیوں سے
لبو کے چشمے ابل رہے ہیں
سک رہے ہیں، بلک رہے ہیں
کہ لوگ سارے ہی خود فریبی میں جل رہے ہیں
میں بس رہا ہوں
عجیب نگری میں بس رہا ہوں
جہاں پہ چہرے لبو سے تریں
وجود سارے بکھر رہے ہیں

﴿نگینہ راشد، مظفر گڑھ﴾



غزل

تری اک تصویر کی خاطر
دل کی اس جاگیر کی خاطر
جانے لیا کیا صدمے جھیلے
آنکھوں کی تصویر کی خاطر
اپنا سر ہے آج بھی حاضر
دشمن کی شمشیر کی خاطر

نقوش مٹتے ہی جا رہے ہیں
کہ دل میں نشتر اتر رہے ہیں
میں بس رہا ہوں

عجیب نگری میں بس رہا ہوں
جہاں کا سورج بھی بادلوں میں چھپا ہوا ہے
کہ چاند گرہن میں آچکا ہے

ستارے سارے ہی بجھ رہے ہیں
کہ گرد چہروں پہ اٹ چکی ہے
کہ لوگ فردا سے بے خبر ہیں

یہ لوگ ماضی سے کٹ چکے ہیں
میں بس رہا ہوں
عجیب نگری میں بس رہا ہوں

﴿محمد نندا، مظفر گڑھ﴾

♥♥♥♥♥♥♥

غزل

جفا اس نے مجھ پہ سر عام کر دی
مری زندگی جس نے ناکام کر دی
میں سمجھا تھا جس کو صبح زندگی
اسی زندگی نے میری شام کر دی
چھپاتا رہا جس کو دنیا سے میں بھی
قلم نے محبت وہ بدنام کر دی
ملا کر نگاہیں بدل جانے والے
مری زندگی تو نے جم جام کر دی
اداسی مرے دل پہ چھائی ہے رضوی
مگر زندگانی تیرے نام کر دی
﴿سید فیصل امام رضوی، لنگر سرائے﴾

♥♥♥♥♥♥♥

غزل

مرا دل ٹوٹ کے بکھرا سمیٹوں کس طرح اس کو
ہزاروں کرچیاں بکھریں سمیٹوں کس طرح ان کو

ہزاروں غم ملے مجھ کو غموں سے ہار نہیں لاتا
مری تو ہر خوشی جانے کہاں پر کھو گئی ہو کی؟
میں ساری رات روئی تھی میں ساری رات نہیں سوتی
مری تو سسکیوں میں بھی اسی کا نام آتا ہے
کبھی تو آئے گا میری وہ تربت پر بہت رونے
میں پوچھوں گی اسے اس وقت کہ ایسا کیوں کیا اس نے
مری ہر بات جھوٹی تھی تو اس کا پیار بھی جھوٹا
مری جو ڈائری جھوٹی تھی تو اس کی شاعری جھوٹی
مجھے بادل بھی روکیں گے بڑی بارش میں روئے گی
مگر واپس نہ آؤں گی اسے میں چھوڑ جاؤں گی
میں اس کو پھر بھلا دوں گی میں خود بھی ٹوٹ جاؤں گی
سمیٹو اب نہیں مجھ کو ورنہ ٹوٹ جاؤں گی
تمہیں بھی توڑ جاؤں گی تمہیں میں چھوڑ جاؤں گی

﴿شازیہ باز خان، لاہور﴾

♥♥♥♥♥♥♥

غزل

وقت مجھ کو کہاں پہ لے آیا
مجھ سے باغی ہوا میرا سایہ
کوئی ایسا نقیب آئے جو
چھین لے میرا سارا سرمایہ
تیری یادوں نے پھر سے کروٹ لی
پھر مرا دل ہے آج گھبرایا
غم تو یہ ہے بھری بہاروں میں
آرزوؤں کا پھول مرجھایا
تجھ کو کھو کر نہ مسکرائی کبھی
میں نے آنچل کبھی نہ لہرایا
رنج و غم کے بغیر تمثیلہ
میرے حصے میں کچھ نہیں آیا

﴿تمثیلہ لطیف، جود خاں﴾

♥♥♥♥♥♥♥

باتیں صحت کی

ڈاکٹر اظہر سعید

12 دن کے اندر وزن میں نمایاں کمی ممکن ہے

اتنا ہے کہ اپنی خوراک میں ایک تازہ گریپ فروٹ یا پھر گریپ فروٹ جوس ہر کھانے میں پروٹین کے ساتھ شامل کر لیں۔ اس پلان کو اختیار کرنے کے دوران آپ کے جسم کو ہر روز 800 سے 1000 اوسط درجے کی کیلوریز ملنی چاہیے۔

گریپ فروٹ ڈائنٹ 1930 سے کی جارہی ہے۔ گریپ فروٹ ڈائنٹ اس نظریے پر مبنی ہے کہ گریپ فروٹ ایک ایسا طاقتور جز ہے جو وزن کم کرنے میں مدد کرتا ہے، خاص طور پر جب اس کے ساتھ پروٹین بھی شامل ہو۔ اس ڈائنٹ پلان میں دیگر ڈائنٹ



”گریپ فروٹ ڈائنٹ“ دراصل چند معیاری ضابطوں کا مجموعہ ہے جن پر کھانے کے اوقات میں عمل کرنا ہوگا۔
 ۱۰: ہر روز 8 گلاس پانی پیئیں۔
 ۱۱: جب کھانا کھائیں تو پیٹ بھرتے ہی کھانا بند کر دیں۔
 ۱۲: کھانے کا جو پلان ذیل میں دیا گیا ہے اس میں کوئی رد و بدل نہیں کریں۔ وہ سب کھائیں جو فہرست

پلان کی نسبت بہت بڑی تعداد میں کیلوریز میں کمی آتی ہے۔ گریپ فروٹ ڈائنٹ کی زیادہ سے زیادہ مدت 12 دن ہوتی ہے تاہم اگر مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں تو دو دن کے وقفے کے بعد اس پلان کو دوبارہ شروع کیا جاسکتا ہے۔

اپنے وزن میں بغیر کسی نقصان کے کمی کرنے اور اپنی ہاڈی کو شیپ میں لانے کے لئے آپ کو بہت زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو کرنا صرف

میں درج ہے۔ اس دوران کوئی اسٹیک نہ لیں۔
 ۱۲ ڈائنٹ دن کے لیے ہے، جس کے
 بعد 2 دن کا وقفہ لینا ضروری ہے۔

ناشتہ

آدھے گریپ فروٹ یا 8 اونس گریپ فروٹ کا
 جوس، 2 انڈے (جیسے چاہے تیار کریں)، 2 گوشت
 کے ٹکڑے۔

دوپہر کا کھانا

آدھے گریپ فروٹ یا 8 اونس گریٹ فروٹ کا
 جوس، آپ کی اپنی پسند کی ڈریسنگ کے ساتھ سلاڈ،
 حسب خواہش گوشت۔

رات کا کھانا

آدھے گریپ فروٹ یا 8 اونس گریپ فروٹ کا
 جوس، اپنی پسند کی ڈریسنگ کے ساتھ سلاڈ، حسب
 خواہش گوشت۔

سوتے وقت کی غذا

ایک پیالی اسکمڈ دودھ یا مائٹلر کا جوس۔
 گریپ فروٹ جوس چربی جلائے میں
 معاون ثابت ہوتا ہے جب کہ کافی چربی کو جلانے سے
 روکتی ہے، اس لیے اس ڈائنٹ کے دوران اگر ہو
 سکے تو کافی نہ پیئیں، بصورت دیگر صرف ایک پیالی
 کافی پیئیں۔ البتہ ایک سے دو پیالی چائے پینے میں
 کوئی مضائقہ نہیں۔ اس ڈائنٹ پلان میں گوشت
 کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں ہے اس کے ساتھ
 ساتھ عام طور پر ورزش کرنے کی ہدایت بھی دی
 جاتی ہے۔

فوائد

سب سے اہم فائدہ اس پروگرام کا ہے کہ بہت

آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے

آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے چہرے کی خوبصورتی
 کو داغدار کر دیتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات
 ہو سکتی ہیں۔ بے آرامی..... دیر تک جاگنا
 یا کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے۔ ٹھنڈے پانی
 میں روئی کے دو بچاے۔ بھگو کر نیچو لیں اور
 ان پر تھوڑا تھوڑا عرق لگایا چھڑک کر ان
 بچاہوں کو آنکھوں پر رکھ کے سکون سے
 15 منٹ کے لیے لیٹ جائیں۔ اسے روز
 کریں اور پھر کچھ عرصہ بعد دیکھیں، حلقے دور
 ہونے لگیں گے۔

کم عمری میں اچھا خاصہ وزن کم کیا جاسکتا ہے۔ اس
 پلان کا ایک اور فائدہ صحت مند غذا کا معمول کی خوراک
 میں شامل ہونا ہے۔ گریپ فروٹ ڈائنٹ اختیار کرنے
 والے ایک کم کیلوری غذا یعنی گریپ فروٹ کھاتے ہیں
 جس میں طاقتور وٹامن سی اور ریشہ دار فروٹ کی وجہ
 سے لمبے وقت کے لیے بھوک نہیں لگتی۔

خرابیاں

اس بات کا کوئی بھی سائنٹیفک ثبوت نہیں ہے
 کہ گریپ فروٹ ڈائنٹ واقعی وزن کم کرتی ہے، تاہم
 ڈائنٹ کرنے والوں کا یہ تجربہ ہے کہ ان کا وزن کم ہوا
 ہے۔ البتہ جب ڈائنٹ کرنے والے دوبارہ اپنی
 معمول کی خوراک کی طرف آتے ہیں تو وزن پھر سے
 بڑھ جاتا ہے۔ اتنی تھوڑی کیلوریز لینے کی وجہ سے جسم
 کا پورا نظام آہستہ کام کرنے لگتا ہے۔ آپ تھکے
 ہوئے اور چڑچڑے ہو جاتے ہیں اور نچکر آنے لگتے
 ہیں کیونکہ آپ کم از کم 1200 کیلوریز روزانہ نہیں
 لے رہے۔

☆.....☆.....☆

شخصیت

لمحے تو سرمایہ ہیں

اوقات کار کا بجٹ بنائیں:

جس طرح انسان اپنے ماہانہ خرچ کے لیے بجٹ بناتا ہے تاکہ اس کے پیسے فضول چیزوں میں ضائع نہ ہوں بالکل اسی طرح اپنے اوقات کار کی تقسیم کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ اس کے لیے ایک ہفتے تک روزانہ ڈائری لکھ کر جائزہ لیں تو زیادہ آسانی ہوگی کہ ہم ایک ہفتے کے 168 گھنٹے کن کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جائزہ فارم بھی بنایا جاسکتا ہے جس میں اس طرح کے کالم ہوں۔

1- اپنی ذات / شخصیت کے لیے خرچ کیا جانا والا

وقت

2- عبادات

3- معاملات، خصوصاً رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے کتنا وقت صرف کیا؟

4- گھر والوں (بیوی و بچوں) کے لیے مناسب

وقت

5- کاروبار ملازمت پر پڑھائی پر صرف ہونے والا

وقت

6- گھر یلو امور کی انجام دہی کے اوقات وغیرہ

ہم میں سے اکثر افراد وقت کا ایک بہت بڑا حصہ

ان کاموں میں صرف کر دیتے ہیں۔ ٹیلی ویژن دیکھنا،

گھر یلو امور کی انجام دہی، انٹرنیٹ کا استعمال

اور شاپنگ وغیرہ۔ ان تمام امور سے بہت معمولی خوشی

حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی

ذاتی زندگی Career اور گھر والوں کے لیے مزید

وقت خرچ کرنا چاہیے۔

Laura vander kam اپنی نئی کتاب

”168 Hours“ میں لکھتی ہیں کہ ”آپ کے پاس

زیادہ وقت ہوتا ہے جتنا کہ آپ سوچتے ہیں، کیونکہ

آپ کے پاس ایک ہفتے میں مسلسل 168 گھنٹے ہوتے

ہیں۔ اگر آپ 50 گھنٹے کام کریں اور 56 گھنٹے سوئیں

(روزانہ رات میں آٹھ گھنٹے کی نیند لیں) تو پھر بھی

آپ کے پاس 62 گھنٹے باقی بچیں گے۔ یقیناً اس میں

سے کچھ افراد گھر کے کاموں میں اور کچھ نوکری کرنے

میں اپنا مزید وقت صرف کرتے ہیں پھر بھی ان کے

پاس 8/10 گھنٹے فارغ ہو جاتے ہیں اس لیے اگر

وقت کی درست منصوبہ بندی کی جائے تو بہت خوشگوار

اور خوبصورت زندگی گزارنی جاسکتی ہے۔“

اسی کتاب میں مصنف لکھتی ہیں کہ ”ہم ایک ایسی

دنیا میں رہتے ہیں جہاں پر بے شمار مختلف النوع قسم کی

مصروفیات اور مشاغل ہیں۔ اس لیے اگر انسان اپنے

وقت کو سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بندی کے ساتھ نہ گزارے

تو اس کا وقت بہت سے فضول، بے مصرف، بے مقصد

اور بے فائدہ کاموں میں ضائع ہونے لگے، بحیثیت

مسلمان ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم منصوبہ بندی کے

ساتھ با مقصد کاموں میں اپنا وقت صرف کریں کیونکہ

قیامت کے روز ہم سے ہمارے اوقات، اعمال، وسائل

اور معاملات سب کا حساب لیا جائے گا۔ پھر اس نقطہ نظر

سے مسلمان کی تو یہ سوچ ہونی چاہیے کہ اس کا ہر لمحہ

بہترین طریقے سے گزرے، اچھے مقاصد کے حصول

کے لیے گزرے یوں اگر اگلے ہی لمحے اسے موت کی

دعوت کو قبول کرنا پڑے تو اس کے لیے حساب دینا

آسان ہوگا۔

اہداف کا تعین کریں:

اہداف کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ منصوبہ بندی کی جائے۔ منصوبہ بندی درحقیقت ذہنی تیاری کا نام ہے۔ مقابلے کی اس دنیا میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آپ میدان میں اتریں تو پوری تیاری کر کے اتریں۔

مغربی مفکر Chris Guillebeau اپنی کتاب The Art of Nonconformity میں لکھتا ہے کہ آپ اپنے اصول و ضوابط طے کریں، ایسی زندگی گزاریں جیسی آپ چاہتے ہیں اور پوری دنیا کو تہیہ مل کر لیں۔ اپنی زندگی کی مکمل پلاننگ یا منصوبہ بندی کریں اور پھر اس کو ایک سال اور پانچ سال کے اہداف میں تقسیم کریں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی زندگی با مقصد طریقے سے گزاریں اور اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ ایسے کاموں میں صرف کریں جو پر لطف بھی ہوں اور با مقصد بھی۔“

سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ اپنی ترجیحات طے کریں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ آپ اپنا فارغ وقت مزید کن کاموں میں گزار سکتے ہیں۔

آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟:

ہم سب کے پاس مختصر اور محدود وقت ہوتا ہے جس میں ہمیں بہت کچھ کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے اوقات کا رکی منصوبہ بندی کے متعلق سوچیں اور اپنا تجزیہ کریں کہ کیا میں خوش ہوں؟ اگر میں خوش نہیں ہوں تو اس کے متعلق مختلف باتیں سوچیں جن کو اختیار کر کے خوش رہا جاسکتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم دوسروں کو خوش مہیا کریں تو خود بھی خوش رہیں گے۔

اکثر خواتین اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ گھر والوں کا خیال رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے اچھے سے اچھا کھانا پکائیں، صفائی کا خیال رکھیں، لٹج بنا

شک

ماں (منے سے): ”باورچی خانے میں ت جانا وہاں جن رہتے ہیں۔“
منا: ”تو پھر پھل اور مٹھائی بھی وہی کھاتے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کرتی ہیں۔“
(مہربان، فیصل آباد)

کر دیں، کپڑے دھوائیں، خوشی اور غم کے مواقع میں شریک ہوں وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت و نشوونما اور دیکھ بھال کرنا بھی ضروری ہے۔ گھر کے کاموں کے لیے اگر آپ کا بجٹ اجازت دے تو نوکر، ماسی رکھی جاسکتی ہے۔ اس طرح آپ کے پاس مزید وقت بچ جائے گا جو آپ کتب کے مطالعے یا بچوں کے ساتھ مختلف مشاغل میں خرچ کر سکتی ہیں۔

جس طرح پیسے کو خرچ کرنا ہمارے اختیار میں ہے بالکل اسی طرح ہم وقت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکتے ہیں۔ اس بات کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ دونوں چیزیں (دولت، وقت) ہماری ترجیحات کے مطابق خرچ ہو رہی ہیں یا نہیں تاکہ ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ اس کام کو کرنے کا ہمارے پاس وقت نہیں ہے یا پیسے نہیں ہیں۔

فارغ اوقات کو استعمال کریں:

اگر آپ پورے ہفتے میں صرف دس گھنٹے کام کرتے ہیں اور اپنی ملازمت کے لیے مزید تیس گھنٹے خرچ کرتے ہیں تو اس کے بعد مزید دس گھنٹے بچ جاتے ہیں آپ کو چاہیے کہ پانچ سے دس گھنٹے انٹرنیٹ پہ گزارنے کے بجائے دیگر کوئی مفید اور با مقصد سرگرمی میں مصروف ہوں مثلاً کوئی زبان سیکھ لیں، کوئی ناول لکھ لیں، اپنی ریڈیو منٹ کے متعلق پلاننگ کریں یا اپنے اہداف کی جانب پیش قدمی کریں۔

☆.....☆.....☆

روحانی معالج

لڑکیوں کیلئے اچھے رشتے آنے کا عمل

بعد نماز فجر اول آخر 3 مرتبہ درود شریف اور تین مرتبہ سورۃ مستحکم پڑھ کر دعا کریں لڑکی خود نہ پڑھ سکے تو گھر میں کوئی اور پڑھ لے۔ انشاء اللہ بہتر رشتے آنا شروع ہو جائیں گے۔

☆.....☆.....☆

مسافر کیلئے بخریت منزل پر پہنچ جائے

جو کوئی سفر پر جا رہا ہو۔ تو اسے چاہیے کہ اول آخر 3 مرتبہ یا 7 مرتبہ درود شریف 41 مرتبہ الحمد شریف پڑھ کر دعا کرے، انشاء اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

☆.....☆.....☆

برائے درد گردہ

جس شخص کو درد گردہ کی شکایت ہو۔ وہ فجر کی نماز دو سنت اور فرض کے درمیان 41 مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھے۔ طریقہ یہ ہے کہ پہلے 3 مرتبہ اول آخر درود شریف پھر سورۃ فاتحہ بسم اللہ کے ساتھ بسم اللہ کی میم کو الحمد کے ساتھ ملا کر (الرحیم الحمد) رحیم کی میم کو ال کے ساتھ جوڑ کر پڑھیں۔ آب زم زم پر یا سادہ پانی پر دم کر کے مریض کو پلائیں انشاء اللہ افاق ہوگا۔

☆.....☆.....☆

جو بچہ زیادہ روئے

بچے کے گلے میں یہ آیت لکھ کر ڈال دیں گریہ بسیار نہ کرے گا۔

اذ قالت امراء یہ عمران رب انی نذرت
لک ما فی بطنی محرراً فتقبل منی انک انت
السمیع العلیم۔

ادائے قرض کیلئے

اول آخر تین مرتبہ درود شریف (درود ابراہیمی)
40 مرتبہ سورۃ اذا جاء بعد نماز فجر پڑھیں۔ انشاء اللہ
کامیابی ہوگی۔

☆.....☆.....☆

موافقت برائے زوجین

اول آخر تین مرتبہ درود شریف، 101 ایک مرتبہ
الحمد شریف پڑھ کر کسی میٹھی چیز پر دم کریں اور کھلائیں۔
ہفتہ اور منگل کے دن نہ کریں۔ ساعت مشتری زہرہ کی
ہو۔ نیا چاند ہو یعنی چاند کی چودہ تاریخ سے پہلے ہو تو
بہتر ہے۔

☆.....☆.....☆

برائے استخارہ

دو گانہ پڑھیں۔ (دو نفل) پھر ایک بار سورۃ کوثر
پڑھیں۔ پھر یار شہید ارشدنی و یا علیم علمنی من
الحال O اول آخر 3 مرتبہ درود شریف اور 360 مرتبہ
مندرجہ بالا آیت پڑھیں اور اپنے ہاتھوں پر دم کر کے سو
جائیں۔ کسی سے بات نہ کریں۔ کوشش کریں دلیاں ہاتھ
کال کے نیچے رکھ کر قبلہ رخ سو جائیں۔

☆.....☆.....☆

گمشدہ اشیاء کا ملنا

اول آخر 3 مرتبہ درود شریف، 40 مرتبہ سورۃ
یٰسین 7 دن تک پڑھیں۔ بعد نماز فجر یا عشاء
☆.....☆.....☆

الف سے اچھے، ب سے برے

کشتش سرور



معراج خالد، کراچی

ہم بقی

دکھا دیے۔ روٹی نے دانت گئے اور بولا: ”مبلغ تین عدد دانت نصف جس کے.....“

چچا جان دباڑ کر بولے: ”چپ نامعقول! یہ تین دانت کیا ہوتے ہیں بھلا؟“

روٹی مسکینی سے بولا: ”دو دانت پورے اور دو دانت آدھے آدھے، کل ہوئے.....“

چچا جان نے گھور کر روٹی کو دیکھا، پھر عینک ناک کی پینٹنگ پر جھانی اور بکرے کا معائنہ کرنے لگے۔ نہ جانے بکرے کو کیا سوچھی وہ اپنی پچھلی ناگوں پر کھڑا ہو گیا اور اگلے دنوں پاؤں چپا کے کندھے پر یوں رکھ

بچھلے برس کی بات ہے۔ ہم بکرا خریدنے گئے تھے۔ پچا شہرائی ساتھ ہوں تو سمجھ لیجئے کہ خریداری کم اور پریشانی زیادہ۔ دو اڑھائی گھنٹے تک وہ ایک ایک بکرے کا معائنہ فرما کر نامنظور کر چکے تھے۔ ادھر ہمارا یہ حال تھا کہ ہم تھکن سے چور اور پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ بکرا منڈی کے ایک کونے میں ایک شخص ایک مستطیل نما بکرے لیے ہوئے کھڑا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ لمبا چوڑا تو ضرور تھا، لیکن موٹائی برائے نام ہی تھی۔ اس سے پہلے کہ پچا شہرائی بکرے کا حسب نسب دریافت کرتے، بکرے نے خود ہی منہ پھاڑ کر دانت



جی ہر چیز آزما کر دیکھ لی۔ بکرا دائیں بائیں سر ہلا کر کہتا: ”ما آ آں“، یعنی نامعلوم۔

اس شام چچا شہزادی بازار سے پھل لائے تو بکرے نے شور مچا دیا، رسی تروا کر اپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت بے تکلفی سے پھلوں کی ٹوکری میں منہ ڈال کر کچر کچر جبانے لگا۔

بعد میں پتا چلا کہ خیر سے بکرا پھلوں کے علاوہ مٹھائی کا بھی بے حد شوقین ہے۔ خاص طور سے گلاب جامن، بیڑے، امرتی اور جلیبیاں تو بہت رغبت سے کھاتا ہے۔ صبح سویرے دو پرائے گرما گرم اور چائے پینے کا بھی عادی ہے۔

چچا دانٹ پیس کر کہتے: ”کم بخت! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیرے یہ نوابی ٹھانڈے ہیں تو میں تجھے ہرگز نہ خریدتا۔“

کبھی کہتے: ”بقر عید کے آنے تک یہ ہمیں دیوالیہ کر کے چھوڑے گا، دیکھ لینا، ایک ایک پانی کو محتاج کر دے گا ہمیں۔“

پھر آخر میں فرماتے: ”اللہ کرے، دھومی قسانی کی چھری تیرا خون چائے۔“

ہم نے بکرے کا نام بم بق رکھا۔ کیوں کہ یہ ٹکر بہت زور سے مارتا اور میا تا بہت تھا، رونی نے اسے ٹکر مارنے کا فن بہت محنت سے سکھایا تھا۔ جب اس سے کہتے: ”ایک..... دو تین بم بق۔“ اس کے ساتھ ہی میرا شیر بجلی کی طرح اپنے شکار پر لپکتا اور دھم سے ٹکر رسید کرتا اور دوسرے ہی لمحے شکار چاروں شانے چت پڑا ہوتا۔

عید کے دن جب دھومی قسانی اسے ذبح کرنے آیا تو ہمارا برا حال تھا۔ رونی تو یوں بلک بلک کر رو رہا تھا کہ جیسے دھومی، بم بق کے بجائے رونی کے گلے پر چھری چلانے والا ہو۔

دھومی قسانی نے چھری کی دھار پر انگلی پھیری اور مسکرا کر کہا: ”بکرے میاں! کب تک خیر منائیں گے؟“

دینے کہ جیسے وہ ان سے گلے ملنا چاہتا ہو۔ پھر وہ بہت بے تکلفی سے ان کے کندھے پر پڑا ہوا رومال چبانے لگا۔

”ہشت! کم بخت، تیرا ستیاناس جائے۔“ چچا نے بگڑ کر کہا۔

بہت مشکل سے بکرے کو علیحدہ کیا گیا۔ وہ اتنی دیر میں آدھا رومال کھا چکا تھا۔ اپنے رومال کا یہ حشر دیکھ کر چچا بھنا گئے: ”ارے لمخت! تجھ پر اللہ کی مار دھومی قسانی کی چھری تیرا خون چائے۔“

چچا اب بکرے والے سے مخاطب ہوئے: ”کیا قیمت ہے اس کی؟“

بکرے والا بولا: ”حضور! بہت سستا لگا دیا ہے یعنی تقریباً مفت۔ اس کی قیمت صرف ڈیڑھ ہزار ہے، لیکن یہ بکرا آپ کے لائق نہیں، میرا مطلب ہے کہ آپ اس کو خرید نہیں سکتے۔“

چچا جان کا پارا چڑھ گیا۔ وہ کاٹ کھانے والے لہجے میں بولے: ”کیوں؟ تو کیا سمجھتا ہے ہمیں؟ ہم فقیر ہیں کیا؟ بھکاری ہیں؟ یہ لے ڈیڑھ ہزار روپے۔“

چچا شہزادی نے ڈیڑھ ہزار روپے گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے اور بکرے کی رسی تمام کر بولے ”چلو بھئی۔“ بکرا خوشی خوشی ہمارے ساتھ چلنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ مدتوں ہمارے ساتھ رہنا پسند چلا آیا ہو۔

جب ہم بکرے کو لے کر گھر میں داخل ہوئے تو سب لوگ اس عجوبے کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ خالو اسد چیخ مار کر بولے: ”ارے یہ بکرا ہے یا گدھے کا بچہ؟“

بکرے نے اس بات کا برا مانا اور زور سے بولا: ”ما آ آ آں.....“

کسی نے قیمت کا پوچھا۔ چچا بولے: ”صرف ڈیڑھ ہزار روپے۔“

رونی نے سچ کی: ”جی نہیں۔ ایک ہزار پانچ سو پندرہ روپے۔ پندرہ روپے کا تو آپ کا رومال بھی تھا۔“ یہ بکرا بھی عجیب نکلا۔ گھاس پات، دال دلیا، جو،

”ہم بقی، ہائے ہم بقی!“ رونی صدے سے نیچ کر بولا۔

ہم بقی معاملے کی نزاکت بھانپ گیا۔ وہ گھوم کے قسانی پر چھینا اور اس سے پہلے کہ دھوی سنبھلتا، اسے اس زور کی ٹکڑسید کی کہ دھوی قسانی قلا بازی کھا کر گرا۔ اب وہ زمین پر چیت لیٹا ہائے داسے کر رہا تھا۔ ادھر ہم بقی دو تین قلا نچوں میں صحن پار کر گیا۔ بکرا آگے آگے اور بچوں اور بڑوں کا ہجوم پیچھے۔

بازاروں سے گزرے، گلیاں پار کیں اور دوڑتے بھاگتے ہم شہر سے باہر جانے لگے۔ راستے میں ہمارا پرانا دشمن چودھری مقصود عرف مقصود اکھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمارا خون شوشوں کر کے کھولنے لگا۔

رونی چیخ کر بولا: ”ہم بقی! اس کم بخت کو نہ چھوڑنا۔“

ہم بقی نے ہمارے حکم کی پوری طرح تعمیل کی۔ دو چار قدم پیچھے بنا اور پھر بجلی کی طرح اپکا۔ میرے شیر نے وہ ٹکڑسید کی کہ مقصود الٹھک کر نالے میں جا گرا۔ جب وہ کچھڑ میں لت پت باہر نکلا تو سب بچے اس کے گرد جمع ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر اس کا مذاق اڑانے لگے۔ اتنی دیر میں ہم بقی جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اللہ جانے، اسے زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔ شام تک ہم اسے ڈھونڈتے رہے۔ آخر تھک ہار کر گھر لوٹے۔

گھر میں پچا شہزادی دھاڑ کر بولے: ”اگر وہ کم بخت میرے ہاتھ آ گیا تو اسے الٹی چھری سے رگیدوں گا۔ ہاں!“

”ما آ آں۔“ بکرے نے باہر سے ہانک لگائی۔ ”اے لو، وہ خود ہی آ گیا ہے۔ اب اسے پکڑ لو جلدی سے۔“

لیکن صاحب! تو بے کھینچے۔ وہ تو چھلاوا تھا، چھلاوا۔ دو چار چھلائیں لگا کر یہ جاوہ جا۔ کھیتوں میں نہ جانے کہاں جا چھپا کہ ہم اسے ڈھونڈنے میں کام یاب نہ ہو سکے۔

اس دن ہم بھانے بہت فوری مانی لپکا بھانے تاب ہوں اپنا سا بولے ”مرود، مارو! اچھے الٹی چھری سے نہ رکھو! یہ انام مہی! الٹی نہیں۔“

اس دن ہم ”ب“ بولے اہاں۔ ”پنے“ تھے جھپ مٹانے کے لیے یوں ہی ذرا لپکتا تھا ہالی۔ کچھ مذاق ہو جائے۔ ہم نے ایک ہانڈی اٹھائے ہیں ہوا بھری۔ پھر دے پاؤں چلتے دوئے نالہ پاندہ نے پیچھے پیچھے اور اٹھانے پر زور مارا۔ اٹھانے ایٹ دھماکے سے پھٹا۔ بے چاری خالہ ڈر گئیں۔ ان سے ہاتھ سے رکائی چھوٹ کر کھڑکی سے باہر جا گری۔

خالہ پاندہ ہمیں دیکھ کر برسی پڑیں: ”میں تمہارے کھانے کا سامان لیے جا رہی تھی، کم بخت مارو! اب ساری جلیبیاں باہر جا گری ہیں۔“

ہم نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ہم بقی بہت شوق سے جلیبیاں کھا رہا تھا۔ ہم بھاگ بھاگ نیچے پینچے تو اس وقت ہم بقی آخری جلیبی کھا رہا تھا۔ دو جلیبیاں اس نے اپنے سینگوں میں پرو رکھی تھیں تاکہ جب بھوک لگے تو کھا لے۔ ہم ہم بقی کی عقل مندی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اسے پکڑنے کے لیے لپکے، لیکن وہ کہاں ہاتھ آنے والا تھا۔ ایک موڑ مڑتے ہی ایک آدمی سے میری زبردست ٹکڑ ہوئی۔ میرا سر اس کے پیٹ میں اس زور سے لگا کہ وہ قلا بازی کھا کر گر گیا۔ ادھر میں بھی دھڑام سے گرا اور چاروں شانے چیت۔

میں فرار کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ وہ مسکراتا ہوا اٹھا۔ شاید اس کے پاؤں میں چوٹ آئی تھی۔ وہ لنگڑاتا ہوا میری طرف آیا، مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کیا اور میرے کپڑے جھاڑنے لگا۔

”کیا تم چور سپاہی کھیل رہے تھے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میں بکا کر بولا: ”جی نہیں۔ میں ذرا ہم بقی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔“

اس آدمی نے پوچھا: ”کیا ہم بقی تمہارے دوست

نام ہے؟“

میں نے کہا: ”جی نہیں، یہ ہمارا بکرا ہے۔“

وہ قہقہہ لگا کر بولا: ”کیا چھناٹ کر نام رکھا ہے۔“

”جی ہاں، وہ بہت چھناٹا ہوا بکرا ہے۔“ رونی بولا۔

جلد ہی ہم یوں محل مل گئے جیسے برسوں پرانے

دوست ہوں۔ وہ فوٹو گرافر تھا۔ ہم نے اسے دھوی قسائی

کا قصہ سنایا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ چودھری صاحب

کی تصویر بنانے آیا ہے۔

ہم بقی کو جب بھوک لگی تو وہ واپس آ گیا۔ اگلے

دن سہ پہر کے وقت ہم اسے ساتھ لے کر سیر کرنے

کے لیے نکلے۔ اتفاق سے اسی وقت ہمارا وہی دوست

چودھری مقصود کی تصویر اتارنے میں مصروف تھا۔

چودھری نے آدھ گھنٹہ پوز بنانے میں لگا دیا پھر بھی وہ

پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔

چودھری مقصود نے زور سے کہا: ”ریڑی۔ ایک

..... دو..... تین، ہائے۔“ چودھری کے منہ سے ایک زور

دار چیخ نکلی، کیوں کہ عین اسی وقت ہم بقی نے دھم سے

انہیں ٹکر مار دی تھی۔

دراصل ہم بقی بہت دیر سے یہ تماشا دیکھ کر پور

ہو رہا تھا۔ وہ سمجھا کہ چودھری مقصود نے اسے ٹکر مارنے

کا حکم دیا ہے۔ اس نے فرماں برداری سے حکم کی تعمیل کی

اور ایک زور دار ٹکر رسید کی۔ چودھری صاحب کے منہ

سے ایک زور دار چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا کر آگے گرے۔

اس عرصے میں فوٹو گرافر نے ہن دبا دیا تھا اور چودھری

مقصود کے گرنے کا منظر کمرے میں محفوظ ہو گیا۔ فوٹو

گرافر نے جلدی سے دوسری تصویر بھی کھینچ لی۔ اس میں

چودھری صاحب زمین پر اوندھے پڑے تھے۔ ہمارا

فاتح ہم بقی اپنے شکار پر ٹانگ رکھے کھڑا، فاتحانہ انداز

سے مسکرا رہا تھا۔ چودھری کی پگڑی اس کے سیٹلوں پر

اٹکی ہوئی تھی۔

ہم اگلے دن اپنے فوٹو گرافر دوست سے ملنے کے

لیے گئے۔ وہ بہت تپاک سے ملا۔ اس نے ہنستے ہوئے

بتایا کہ چودھری مقصود کا فوٹو بہت لا جواب اترا۔ راتوں

پیشین گوئی

”میرے ڈاکٹر نے وعدہ کیا تھا کہ میں ایک ہفتے

میں اپنے قدموں پر چلے لگوں گا۔“ ایک صاحب نے

اپنے دوست کو بتایا۔

”پھر ہوا کیا؟“ دوست نے پوچھا۔

اس کی پیشین گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔

اس کا بل دیکھتے ہی مجھے اپنی گاڑی فروخت کرنا پڑ گئی

اور اب میں پیدل چل رہا ہوں۔“ ان صاحب نے

جواب دیا۔

(شرجیل عابد، لاہور)

رات اس کی فوٹو کی بے شمار کاپیاں بک گئیں اور مٹھائی

کی طرح گاؤں کے لوگوں میں تقسیم کی گئیں۔ لوگ اس

تصویر کو دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اگلی صبح جب چودھری

مقصود نے اپنی تصویر دیکھی تو اس کا پارا ایک سو ڈگری

چڑھ گیا۔ خوب پیچیم دھاڑ مچائی۔ سب لوگ منہ چھپا چھپا

کر ہنستے رہے۔ اس کے کچھ دن بعد ہمارا دوست فوٹو

گرافر ہم سے ملنے کے لیے آیا۔ بہت دیر تک چودھری

مقصود کی تصویریں دیکھ کر ہم ہنستے رہے۔ فوٹو گرافر نے

ہمیں بھی ایک بڑی سی تصویر دی۔ یہ وہی تصویر تھی جس

میں ہم بقی اپنے شکار چودھری صاحب پر پاؤں رکھے

کھڑا مسکرا رہا ہے۔

یہ بہر حال ہم بقی کی آخری تصویر ثابت ہوئی، اس

لیے کہ عید کے تیسرے دن جب اس کی طبیعت ہشاش

بشاش ہو گئی تو دھوی قسائی نے اسے ذبح کر دیا۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ اس کے جنت میں

جانے کے بعد جب ہم نے اس کے کھانے پینے کے

اخراجات کا حساب لگایا تو وہ بھی ڈیڑھ ہزار روپے نکلا،

یعنی اس کی قیمت کے برابر۔ خدا ایسا انوکھا بکرا کسی کو

نصیب نہ کرے۔

.....

غریب کی عید

عائشہ نیاز، لاہور

میرا نام احمد ہے، میں نے بی کام کیا ہوا ہے اور میں جاب کے سلسلے میں ناظم آباد جاتا ہوں، راستے میں چورنگی پر ایک لڑکا جس کی عمر بارہ سال ہوگی، وہاں غبارے بیچتا نظر آتا۔ میں اسے صبح شام دیکھتا اور سوچتا کہ نہ جانے کس مجبوری کے تحت وہ کام کر رہا ہے۔ ابھی تو اس کے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں۔

پھر وہ بچہ کئی دن تک نظر نہ آیا، میں نے سوچا شاید سکول جانے لگا ہو۔ میں اسے تقریباً بھول ہی گیا تھا کہ وہی بچہ مجھے دوبارہ نظر آ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ اتنے دن کہاں غائب رہا۔ ایک دن میں آفس سے جلدی اٹھا تو راستے میں بے اختیار اس بچے کو دیکھ کر بس سے اتر گیا اشارے سے میں نے بچے کو اپنے پاس بلایا وہ خوش ہو گیا اور آکر کہنے لگا۔

”صاحب غبارے لے لیں، آپ کے بچے کھیلیں گے۔“

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے غبارے نہیں لینے، تم سے باتیں کرنی ہیں۔“

”صاحب آپ کو مجھ سے کیا باتیں کرنی ہیں، اس نے پوچھا۔“ میرا نام احمد ہے اور تم مجھے صاحب نہیں کہہ سکتے ہو، یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟ میں نے سوال کیا۔

”میرا نام فضل ہے، اس نے جواب دیا۔“

”یہ بتاؤ پڑھنے کے بجائے غبارے کیوں بیچتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”حالات کی وجہ سے۔“ وہ بولا۔ ”کیسے حالات؟“ میں نے جاننا چاہا۔

دراصل ہم دس بہن بھائی ہیں۔ میرے ابا مزدور تھے۔ ان کو کبھی کام مل جاتا اور کبھی نہیں۔ آمدنی کم تھی اس لیے ہمارے گھر میں ماں

بہمیشہ ابا سے پیسوں کے لئے لڑائی جھگڑائی رہتی تھی۔ ابا کی محدود آمدنی میں گھر کا گزارا کرنا اور بارہ آدمیوں کا پیٹ پالنا مشکل ہو گیا تو ماں نے لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پونچھے کا کام شروع کر دیا۔ ہم میں سے ہر کوئی کچھ نہ کچھ کمانے لگا، تاکہ حالات میں سدھار آ سکے۔ مگر برہتی ہوئی مہنگائی نے ایسا نہ ہونے دیا۔ روز روز کی لڑائی سے تنگ آکر ابا نے ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ دیا اور وہ پلٹ کر نہ آئے، ان ہی حالات نے مجھے یہ کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ ”فضل نے جواب دیا۔“

اس کے حالات جان کر مجھے بے حد دکھ ہوا، میں نے اس سے اگلا سوال کیا۔ ”تمہارا پڑھنے کو دل نہیں چاہتا کیا؟“



”صاحب آپ کو مجھ سے کیا باتیں کرنی ہیں، اس نے پوچھا۔“ میرا نام احمد ہے اور تم مجھے صاحب نہیں کہہ سکتے ہو، یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟ میں نے سوال کیا۔

”میرا نام فضل ہے، اس نے جواب دیا۔“

”یہ بتاؤ پڑھنے کے بجائے غبارے کیوں بیچتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”حالات کی وجہ سے۔“ وہ بولا۔ ”کیسے حالات؟“ میں نے جاننا چاہا۔

دراصل ہم دس بہن بھائی ہیں۔ میرے ابا مزدور تھے۔ ان کو کبھی کام مل جاتا اور کبھی نہیں۔ آمدنی کم تھی اس لیے ہمارے گھر میں ماں



سہیلی بوجھ سہیلی

1- آندھی ہو یا تیز ہوا
کبھی بچھے نہ ایک دیا



2- چیز ہے اک بالکل بے جان
منہ میں اس کے نہیں زبان
بن بولے کرتی ہے باتیں
کیا جانے ان پڑھ انسان



3- گڑگڑ آؤں چھم چھم برسوں
خود باقی رہنے کو ترسوں



4- بال اتارو کھال اتارو
کھڑے کر کے جلدی کھا لو



5- آج ہے اس کا گھر گھر نام
کل ہے اس کا کام تمام



6- بن در کے ہے ایک حویلی
اس میں ہے اک جان اکیلی



میری بات سن کر وہ اداس لہجے میں بولا۔ ”دل تو
چاہتا ہے مگر حالات اجازت نہیں دیتے۔“

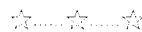
اس کی باتوں نے مجھے اداس کر دیا۔ میں نے
اسے خدا حافظ کہا اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف
روانہ ہو گیا۔ عید کا مہینہ شروع ہوا تو فضل مجھے وہاں
نظر نہ آیا۔ اسے روزانہ دیکھنے کی عادت جو ہو گئی
تھی۔ میں نے سوچا شاید وہ کہیں اور چلا گیا ہے یا
دوسرا کام کرنے لگا ہے۔ ایک دن میں اپنے
دوستوں کے ساتھ عید کی شاپنگ کے لیے طارق روڈ
گیا تو وہاں مجھے فضل نظر آیا، میں نے آواز دی وہ
رک گیا بیچان کر میرے قریب آیا اور سلام کیا۔ میں
نے سلام کا جواب دیا۔

میں نے اس سے اس کی خیریت پوچھی اور کہا کہ
اب تم وہاں چورنگی پر نظر نہیں آئے، کہاں ہوتے ہو؟“
صاحب عید آنے والی ہے اس لیے کوشش کر رہا تھا
کہ زیادہ سے زیادہ کماسکوں تاکہ عید پر کم از کم سنے
کپڑے تو پہن سکوں۔ وہ مزید بولا۔

”اس سے پہلے ہم عید کے دن پرانے کپڑے
پہنتے تھے۔ جہاں ماں کام کرتی ہے وہ دو سال کے بعد
اپنے بچوں کے پرانے کپڑے نکال کر دیتے ہیں اور ہم
انہیں عید کے دن پہن لیتے تھے۔“

میں نے اسے کچھ میسے دیئے۔ وہ لینے سے انکار کر
رہا تھا۔ مگر میرے بے حد اصرار پر اس نے شکر یہ کے
ساتھ پیسے لے لیے، میں نے فضل کی باتیں اپنے
دوستوں کو بتائیں۔ انہیں یہ باتیں سن کر بے حد دکھ
ہوا۔ انہوں نے مجھ سے کہا، اگر تم پہلے بتا دیتے تو ہم
بھی اس کی کچھ مدد کرتے۔“

واپسی پر میں یہی سوچتا رہا کہ اس مہنگائی کے دور
میں غریب کی عید کیا، اور زندگی کیا، عید کے روز بھی مجھے
رہ رہ کر فضل اور اس کے بہن بھائیوں کا خیال آتا رہا
کہ جانے انہوں نے کس طرح عید منائی ہوگی نا جانے
کس طرح؟



© 2012 by (9) (5) (4) (3) (2) (1)

(1) (2) (3) (4) (5) (6) (7) (8) (9) (10)

© 2012



ایک بچہ امتحان میں فیل ہو گیا اور گھر آ کر زور زور سے رونے لگا۔

باپ نے بچے کو چپ کرواتے ہوئے کہا: ”بیٹا صبر کرو، تمہاری قسمت میں یہی لکھا تھا۔“

بچہ (جلدی سے بولا): ”جی ابو! یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے پورے سال کچھ نہیں پڑھا ورنہ ساری محنت ضائع ہی جاتی۔“

(شعیر، ملتان)

☆☆☆☆

ایک صاحب بس میں ایک بڑا سا تھیلہ لے کر سوار ہوئے۔

کنڈیکٹر نے ان سے تھیلے کا بھی ٹکٹ مانگا۔ وہ پہلے تو انکار کرتے رہے لیکن جب کنڈیکٹر نے سختی سے کہا کہ آپ کو اس تھیلے کا بھی ٹکٹ خریدنا ہو گا تو انہوں نے مجبوراً تھیلہ کھول دیا اور بولے۔

بیٹا اب باہر نکل آؤ، اگر پورا ٹکٹ ہی خریدنا ہے تو تھیلے میں سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

(علی شعیر، لاہور)

☆☆☆☆

ایک بچہ اپنے والد کے ساتھ پانی کی ٹینکی دیکھنے گیا۔

اپنا ٹکٹ باپ ٹینکی میں گر جاتا ہے۔ بچہ جلدی دوڑتا ہوا گھر پہنچا اور امی سے کہنے لگا: ”امی، امی نوٹنی کھولیں، اندر سے اچھی بو نکلیں گے۔“

(سالمی، ملتان)

☆☆☆☆

مالک نے نوکر سے کہا۔ ”اس قدر مہنگائی ہو رہی ہے اور تم نے پراٹھے میں اتنا زیادہ لگی ڈالا ہے۔“

نوکر نے چٹپکاتے ہوئے کہا: ”معاف کیجئے گا مالک، غلطی سے میرا پراٹھا آپ کے پاس آ گیا۔“

(اسفند، پشاور)

☆☆☆☆

وکیل: ”تم نے پولیس آفیسر کی جیب میں جلتی ہوئی سگریٹ کیوں رکھی؟“

ملازم: ”جناب! انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ نام کروانا ہے تو پہلے میری جیب گرم کرو۔“

(منابل، لاہور)

☆☆☆☆

ایک شکاری (دوسرے سے): ”میں نے شیر کو چیر پھاڑ دیا، ہاتھی کو سونڈ سے پکڑ کر نیچے پٹخ دیا اور گینڈے کو مکا مار کر ڈھیر کر دیا۔“

دوسرا شکاری (حیرت سے): ”پھر کیا ہوا؟“

پہلا شکاری: ”ہونا کیا تھا۔ کھلونوں کی دکان کے مالک نے میری پٹائی کر دی۔“

(ٹافیہ، کراچی)

☆☆☆☆

ایک قیدی کو دوسروں کے چپک چپکے پر جعلی دستخط کرنے کے الزام میں جیل لایا گیا تو جیلر نے اس کو مخاطب کر کے کہا: ”یہاں تمہیں کوئی نہ کوئی کام بھی کرنا پڑے گا، کیا تمہیں کوئی کام آتا ہے؟“

قیدی بولا: ”جناب! بس پریکٹس کے لیے دو دن کا وقت دیں۔ میں اس کے بعد میں جیل کے تمام افسران سے ٹیپ مائن کر دیا کروں گا۔“ (نیل احمد، لاہور)

مبارک ہو بچو بڑی عید آئی

مبارک ہو بچو بڑی عید آئی
خدا سے محبت کا پیغام لائی
فرشتوں نے توحید کے گیت گائے
دلوں کو وہ پر کیف نغمے سنائے
مبارک ہو بچو بڑی عید آئی
خدا سے محبت کا پیغام لائی
یہ ایثار کی آج ارزانیاں ہیں
جدھر آنکھ اٹھتی ہے قربانیاں ہیں
مسرت کی ہر سوسو فراوانیاں ہیں
مبارک ہو بچو بڑی عید آئی
خدا سے محبت کا پیغام لائی
الہی مسلمان کو ہمت عطا کر
ہمارے ارادوں کو جرات عطا کر
ہمیں پھر تو پہلی سی رفعت عطا کر
مبارک ہو بچو بڑی عید آئی
خدا سے محبت کا پیغام لائی
بڑی عید کا جوش دل میں سلایا
وہ کونل نے بھی میٹھا کیا راگ گایا
تو نیر بھی کیا خوب تھنہ ہے لایا
مبارک ہو بچو بڑی عید آئی
خدا سے محبت کا پیغام لائی

﴿إمان اللہ نیرِ شوکت، لاہور﴾

کیا واقعی شتر مرغ اپنا سر

ریت میں چھپاتے ہیں

بچو! شتر مرغ تو آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے لیکن شتر مرغ کی کیا شکل ہوگا اور بعض بچے تو اس کے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے۔ شتر مرغ ایک ایسا پرندہ ہے جو جسامت کے لحاظ سے بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس کی ٹانگیں اور گردن بے حد لمبی ہوتی ہے۔ وہ انتہائی تیز دوڑتا ہے اور اپنی لمبی گردن کی بدولت اونچے درختوں سے بھی اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔

شتر مرغ کے بارے میں بڑی عجیب اور انوکھی باتیں منسوب ہیں مثلاً اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ شتر مرغ جب خطرہ محسوس کرتا ہے تو ریت میں اپنا سر چھپا لیتا ہے۔ درحقیقت شتر مرغ خوف زدہ ہونے پر اپنی گردن نیچے چھپا لیتے ہیں اور محتاط نگاہوں سے اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگتے ہیں۔ خطرہ فریب آنے پر شتر مرغ بھی وہی کرتے ہیں جو باقی جانور کرتے ہیں یعنی تیزی سے کھڑے ہو کر بھاگنے لگتے ہیں۔ جب کوئی شتر مرغ بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہے یا اسے اپنے گھونسلے اور انڈوں کی حفاظت کرنا ہوتی ہے تو وہ اپنی طاقتور ٹانگوں سے دشمن پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ شتر مرغ پرندوں میں سب سے بڑا پرندہ ہے اور یہ پودے اور حشرات الارض کھا کر گزارا کرتا ہے۔ اس کا انداز بھی بہت بڑا ہوتا ہے یعنی اس کا وزن ڈیڑھ کلو گرام ہوتا ہے۔ یہ تقریباً پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے۔ اس کی آنکھیں بہت دور تک دیکھ سکتی ہیں اسی لئے یہ فاصلے پر موجود اپنے دشمن کو بھی دیکھ لیتا ہے۔

(ماہم شہزادی، لاہور)